کمبلہ
محیّ الدّین نواب

دیباچہ

کرشن کا ایک نام مرلی منوہر بھی ہے۔ کرشن کی مرتیو چکر کی دہشت اس کے دشمنوں کے دل پر بیٹھی ہوئی تھی لیکن مرتیو چکر سے زیادہ مشہور اس کی بانسری تھی۔ آج بھی ہندو کرشن کی جس مورتی کی عبادت کرتے ہیں اس کی انگلی پر چکر نہیں ہاتھ میں مرلی ہوتی ہے۔

"سسپنس" کے مدیر صاحب محی الدین نواب کو فکشن (Fiction) کے مرلی منوہر کا خطاب دیتے ہیں............ اور یہ حقیقت ہے کہ محی الدین نواب واقعی فکشن کے مرلی منوہر ہیں۔

بندرا بن کا مرلی منوہر جب بانسری اپنے ہونٹوں سے لگاتا ہو گا تو اس کی سانسوں سے پھوٹنے والے سُر ماحول پر وجد طاری کر دیتے ہوں گے............ خامہ و قرطاس کے دنیا کا یہ مرلی منوہر جب قلم اٹھاتا ہے تو جانے کس روشنائی سے لکھتا ہے کہ ایک ایک لفظ نوکیلے تیر کی طرح سیدھا دل میں ترازو ہو جاتا ہے۔

مبالغہ نہیں کرتا، سچ کہتا ہوں تجربات کی جو کثرت، خیالات کی جو ندرت اور تحریر کی جو کاٹ میں نے محی الدین نواب کے ہاں دیکھی ہے، اردو ادب میں منٹو، کرشن چندر اور بیدی کے بعد صرف محی الدین نواب کا حصہ ہے۔

ادب کے جن تین Giants کا تذکرہ میں نے ابھی کیا ہے وہ بجا طور پر اردو کے بڑے افسانہ نگار مانے جاتے ہے۔ خوش قسمت ہیں یہ لوگ جن کی ادبی حیثیت کو ان کی زندگی میں بھی اور ان کی موت کے بعد بھی تسلیم کیا گیا، تسلیم کیا جاتا ہے۔

محی الدین نواب اُن بدنصیب قلم کاروں میں شامل ہیں، جن کے تخلیقی کام کو نام نہاد ناقدین ادب نے کبھی Acknowledge نہیں کیا کیونکہ ان پر "ڈائجسٹ کا لکھاری" ہونے کا ٹھپہ لگا ہے۔ وہ اکیلے نہیں ان جیسے اور بھی بہت سے دوسرے تخلیق کار بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔

خیر، اس سے محی الدین نواب اور ان کی قبیل کے دوسرے لکھاریوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عوامی پسند کا سرٹیفکیٹ انہیں ہمیشہ سے حاصل ہے اور ہمیشہ حاصل رہے گا۔

اس مجموعے میں محی الدین کی منتخب کہانیاں شامل ہیں، اگر آپ نے یہ دیباچہ پڑھنے کی زحمت کی ہے، تو آپ کے لیے میری پیش گوئی ہے.......... اور وہ یہ کہ یہ کہانیاں پڑھ کر آپ کو ضرور احساس ہو گا کہ کہنے والے اگر کہتے ہیں تو غلط نہیں کہتے کہ "محی الدین نواب کی کہانیاں زبان سے نہیں، آنکھوں سے نہیں، بلکہ دل کی دھڑکنوں سے پڑھی جاتی ہیں۔"

ایڈیٹر
ادارہ

فہرست

کمبل

ایک ایسے شخص کی داستانِ عجب۔
قدرت نے اسے حسین و جمیل بیوی عطا کردی تھی۔
وہ بیوی کے حسن بلاخیز کو دنیا کی نظروں سے چھپا کر رکھنا چاہتا تھا مگر عملاً ایسا ممکن نہ تھا۔

موسمِ سرما کی نصف رات گزر چکی تھی۔ سردی اپنے عروج کو پہنچ رہی تھی۔ پوری بستی میں بلا کی ویرانی تھی جیسے کوئی بلا بھری آبادی میں جھاڑو پھیر گئی ہو۔ کتے انسانوں کو دیکھ کر بھونکتے ہیں۔ انہیں بھونکنے کے لئے بھی کوئی نہیں مل رہا تھا۔ قبرستانوں میں گیدڑوں کی آوازیں ملتی ہیں جبکہ آبادی میں زندگی کے آثار نہیں تھے۔

ایسی ہی زندہ آبادی کے مُردہ سناٹے میں اچانک صورِ اسرافیل جیسی دہشتناک چیخ نے سب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ جو سوئے ہوئے تھے' وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے' جو آگ تاپ رہے تھے' وہ اچھل کر کھڑے ہوگئے۔ باہر اندھیرے میں نکل کر پوچھنے لگے۔ "کون ہے' یہ کون چیخ رہا ہے؟"

کسی نے کہا۔ "چیخ رہی ہے۔ دیکھو' سنو' عورت کی آواز ہے۔"

وہ آواز کی سمت کا اندازہ کرتے ہوئے دوڑنے لگے۔ گہرے سناٹے میں آواز چاروں طرف گونجتی ہو تو فوراً ہی سمت کا تعین نہیں ہوتا۔ کسی نے کہا۔ "جمیلہ کے گھر سے آواز آرہی ہے۔"

ایک نے کہا۔ "گوگی امام دین کی بیوی لڑنے میں حاتم ہے۔ وہی کمبخت اپنے مرد سے جوتے کھا رہی ہوگی۔"

وہ سب ایک گلی میں پہنچ کر ٹھٹک گئے۔ ایک مکان کا دروازہ بند تھا۔ احاطے کی نچلی دیوار کے باعث آگ کے لپکتے ہوئے شعلے دکھائی دے رہے تھے۔ عموماً شعلے اوپر کو لہراتے ہیں۔ ہوا کی زد پر لچکتے مٹکتے ہیں۔ شاید اسی لئے ایک اچھی رقاصہ کو شعلہ بدن کہتے ہیں لیکن اس احاطے کے اندر شعلوں میں لچک اور مٹک نہیں تھی۔ وہ شعلے اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے اور بھاگنے والی کی چیخیں بتا رہی تھیں کہ موت پیچھا پکڑ لے تو فرار کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔

آنے والے باہر سے پکارنے لگے۔ "جانو بھائی کیا ہوا؟"

دوسرے نے کہا۔ "دروازہ کھولو جانو بھائی؟"

چند ہٹے کٹے جوان احاطے کے گیٹ کو ٹکریں مارنے لگے۔ کچھ لڑکے ایک دوسرے

کو سیڑھی بنا کر دیوار پر چڑھ گئے۔ پھر اندر کا منظر دیکھتے ہی وہ چند لمحوں تک ساکت رہ
گئے۔ وہ جوان زندگی میں پہلی بار ایک عورت کو سر سے پاؤں تک شعلوں میں جلتے دیکھ
رہے تھے۔ جلنے والی کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ وہ جانو بھائی کی گھر والی آمنہ تھی۔

آمنہ شعلوں میں لپٹی چیختی چلاتی اچھل رہی تھی۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر بھاگ رہی
تھی۔ اسے فوراً کسی تدبیر سے بچانا تھا۔ آگ کو بجھانا تھا مگر تمام گھر والے دور بھاگ رہے
تھے۔ بھلا آگ کے قریب کون جاتا ہے۔ وہ اسے بچانے کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔
دور رہ کر بالٹی اور جگ سے اس پر پانی پھینک رہے تھے۔

ایک لڑکے نے دیوار سے احاطے کے اندر چھلانگ لگائی پھر دوڑتے ہوئے آکر گیٹ
کو کھول دیا۔ محلے والوں کی بھیڑ دندناتی ہوئی اندر آئی۔ کسی نے کہا۔ ”اور پانی لاؤ پانی۔“

کسی نے مشورہ دیا۔ ”اس پر مٹی پھینکو مٹی۔“

ایک نے گرج کر کہا۔ ”عقل سے کام لو۔ پانی سے آگ اور بھڑک رہی ہے۔ اس
پر کمبل ڈالو۔“

وہاں جس کی سمجھ میں جو آرہا تھا‘ وہ کر رہا تھا۔ کچھ لوگ پانی لا رہے تھے‘ کچھ لوگ
گلی کی مٹی بیلچے سے اٹھا کر اس پر پھینک رہے تھے۔ جانو بھائی ایک گوشے میں یوں دم
سادھے کھڑا تھا جیسے بیوی سے پہلے دم نکل گیا ہو۔ اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ ایک
چھوٹے سے بچے نے قمیض کا دامن پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ ”دادا‘ دادا! میری دادی کو
بچالو۔ میری دادی مرجائے گی۔“

دادا نے منہ پھیر لیا۔ اب آمنہ کو جلتے ہوئے دیکھنے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ اس کی
چیخیں برداشت نہیں ہورہی تھیں۔ چھ برس کا پوتا دادا سے مایوس ہو کر دوڑتے ہوئے
باورچی خانے میں گیا پھر ایک ننھے سے پھولدار مگ میں پانی لے کر آگیا۔ کوئی چار دن پہلے
دادی جمعہ بازار سے وہ مگ لائی تھی اور پوتے کو گود میں بٹھا کر پیار کرکے وہ مگ دیتے
ہوئے کہا تھا۔ ”یہ میں اپنے ساجد کے لئے لائی ہوں۔ میرا چاند اس میں پانی پئے گا اور
پیاس بجھائے گا۔“

ساجد نے معصومیت سے کہا تھا۔ ”دادی ماں! پانی سے آگ بجھاتے ہیں‘ پیاس بھی
کوئی بجھانے والی چیز ہے۔“

دادی ہنس پڑی تھی۔ ”ہاں میرے چاند! اس مگ سے آگ بھی بجھائی جاسکتی ہے۔“

اس کے دماغ میں دادی کی یہ بات کہانی کے کسی جاندار فقرے کی طرح نقش ہوگئی
تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے مگ اٹھائے دادی پر پانی پھینکنے قریب جارہا تھا۔ باپ نے لپک

کر اسے پکڑ لیا۔ وہ باپ کی گرفت میں مچلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”چھوڑ دو مجھے‘ میں دادی کے
اوپر پانی ڈالوں گا۔ مجھے چھوڑ دو‘ چھوڑ دو۔“

محبت حد سے گزرے تو آگ کو گلزار بنانے والی [illegible] بن جاتی ہے۔ بیٹا آگ سے
دور رہ کر ماں کی سلامتی چاہتا تھا۔ پوتا سلامتی کے لئے [illegible] ے گزر جانا چاہتا تھا۔

بڑا بیٹا قمرالدین اپنے بستر سے کمبل کھینچ کر دوڑتا ہوا نلکے کے پاس آیا پھر اسے پانی
کے ڈرم میں ڈال کر اچھی طرح بھگو کر کمرے کے باہر احاطے میں آیا۔ آگ سے ذرا فاصلہ
رکھ کر اس نے ماں پر کمبل کو پھینکا‘ جب وہ کمبل میں چھپ گئی تو دوڑ کر کمبل سمیت ماں
سے لپٹ گیا۔ اس کے ساتھ فرش پر گر پڑا۔

شعلے یک لخت بجھ گئے تھے۔ کمبل جدھر سے ذرا ذرا کھلا تھا اُدھر اُدھر سے دھواں
نکل رہا تھا۔ لوگ ماں بیٹے پر بالٹیوں سے پانی ڈال رہے تھے۔ احاطے کے اندر اور باہر گلی
میں محلے والوں کے سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ آگ بجھنے سے سب ہی کو ذرا اطمینان ہوا
تھا۔

آمنہ فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ قمرالدین ماں کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا تھا۔ جانو بھائی
نے قریب آکر منہ پر سے کمبل ہٹایا تاکہ آمنہ سانس لے سکے۔ پھر اس کا جلا ہوا چہرہ نہ
دیکھ سکا۔ اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ وہ چہرہ کہیں کوئلے کی طرح سیاہ ہوگیا تھا اور کہیں چربی
پگھلنے کے باعث سفیدی جھلک رہی تھی۔

محلے کی عورتیں اور مرد ایک دوسرے کو ہٹا کر قریب آکر دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ مر
چکی ہے یا زندہ ہے۔ ایک عورت نے پوچھا۔ ”سانس چل رہی ہے نا؟“

آمنہ کی بہو نے کہا۔ ”ہاں چل رہی ہے؟“

دوسری بہو نے کہا۔ ”اماں کو جلدی سے اسپتال لے چلو۔“

دوسرے بیٹے امیرالدین نے بیوی سے سرگوشی میں کہا ”ڈاکٹر کو بلانے کی بات کرو۔
اسپتال لے جانے کو کہو گی تو محلے والے کہیں گے‘ بہویں ساس سے پیچھا چھڑا رہی ہیں۔“

بیوی نے کہا۔ ”محلے والے کب نہیں کہتے کہ اب ان کے کہنے سے ڈر جاؤں گی۔“

بڑی بہو ساس کی صورت دیکھ کر ابکائی کرنے کے انداز میں ”اونک اونک“ کی آواز
نکالتے ہوئے غسل خانے میں چلی گئی۔ آمنہ نے ایک آنکھ کھول کر دیکھا۔ دوسری آنکھ کا
پپوٹا آگ کی حرارت سے چپک گیا تھا۔ اب وہ آنکھ کبھی نہیں کھل سکتی تھی۔ اس نے
دھندلائی ہوئی ایک آنکھ سے اپنے شوہر جانو کو دیکھا۔ اس کے جلے ہوئے ہونٹ ہولے
ہولے لرز رہے تھے۔ جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو اور کہہ نہ پا رہی ہو۔

جانو نے فرطِ محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ تکلیف کی شدت سے تڑپ گئی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ ہٹا لیا پھر بیٹے سے پوچھا۔ "کوئی ایمبولینس کے لئے گیا ہے؟"

پڑوسی نے کہا۔ "میرا بیٹا چیختی ہے۔ ابھی گاڑی آجائے گی۔"

ایک بوڑھی نے کہا۔ "ہاں۔ بیچاری کی دوسری آنکھ نہیں کھل رہی ہے۔"

دوسری خاتون نے کہا۔ "یہ حسرت سے دیکھ رہی ہے' کچھ کہنا چاہتی ہے۔"

جان محمد عرف جانو نے کہا۔ "میں سمجھ رہا ہوں' یہ پوتے کو دیکھنا چاہتی ہے۔ ساجد کہاں ہے۔ اسے بلاؤ۔"

بہو نے اپنے کمرے سے کہا۔ "ساجد سو رہا ہے۔"

وہ ساجد پر جبراً لحاف ڈال کر اسے تھپک رہی تھی۔ اس نے مچلتے ہوئے کہا۔ "میں جاگ رہا ہوں۔ مجھے دادی کے پاس جانے دو۔"

وہ سرگوشی میں ڈانٹ کر بولی۔ "چپ رہ کمبخت! آنکھیں بند کرلے۔"

قمرالدین نے آکر کہا۔ "کیوں محلے والوں کے سامنے تماشا کر رہی ہو۔ اسے دادی کے پاس جانے دو۔"

وہ بولی۔ "کس دادی کے پاس جانے دوں؟ جسے یہ معصوم جانتا ہے اس دادی کا چہرہ تو باقی نہیں رہا۔ یہ دیکھتے ہی ڈر جائے گا۔ کبھی یقین نہیں کرے گا کہ وہ دادی ہے۔ بچے کے دل میں دہشت رہ جائے گی۔"

قمرالدین نے تائید میں سر ہلایا۔ اسی وقت ایمبولینس آگئی۔ جانو نے آمنہ کے بدن پر کمبل کو درست کیا پھر اسے دونوں بازوؤں میں اٹھالیا۔ اس کے ہاتھ سخت اور کھردرے تھے لیکن آمنہ کے لئے برسوں کے آشنا تھے۔ یہ ہاتھ لگاتا تھا تو وہ جذبات کے آسمان پر اڑنے لگتی تھی۔ آج وہ تمام جذبات سے عاری تھی۔ اگر سانس لینے کا ہی نام زندگی ہے تو بس وہ سانسوں کے حوالے سے زندہ تھی۔ تمام جذبے سو گئے تھے۔ اس کی آنکھیں بند ہوچکی تھیں' جیسے موت سے پہلے ہی جذبات میں گرفتار کرنے والے تمام رشتوں کو دیکھنے سے انکار کر رہی ہو۔

☆=========☆=========☆

وہ آنکھیں بند کئے پھولوں کی سیج پر بیٹھی ہوئی تھی۔ تصور میں جان محمد عرف جانو کو دیکھ رہی تھی۔ اگرچہ اس نے جانو کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس سے منسوب ہونے کے بعد خوابوں اور خیالوں میں جان پہچان ہوتی رہتی تھی۔ ہونے والا مجازی خدا جیسا بھی ہو' اپنا ہوتا ہے۔ محبت کرنے کے لئے اس کا نام ہی کافی ہوتا ہے۔ مشرقی رواج کے مطابق مجازی خدا پہلے دکھائی نہیں دیتا۔ گھونگھٹ اٹھانے کے بعد نظر آتا ہے۔

بزرگوں کے دستور کے مطابق دلہا دلہن کو سہاگ رات سے پہلے بند مٹھی کی طرح رہنا چاہئے تاکہ سیج پر مٹھی کھلے تو وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں کی لکیریں بن جائیں۔ انسان کو نئی چیز' نیا چہرہ' نیا جسم اور بالکل نئی محبت ملے تو وہ اسے جی جان سے چاہنے لگتا ہے۔ پردے کی یہ خوبی ہے کہ جب اٹھتا ہے تو اجنبی جلوہ کی تابانی میں کوہِ طور سے تجلّی کی سوغات لے آتا ہے۔

دروازہ کھلنے کی آواز اسے تصورات سے باہر لے آئی۔ خیالی شہزادہ سچ مچ آگیا تھا۔ وہ دل کی دھڑکنوں کو سنبھالنے لگی۔ اگرچہ گوٹے کناری والے گھونگھٹ میں پوری طرح چھپی ہوئی تھی۔ پھر بھی کہیں سے دیکھ لئے جانے کا خیال ستا رہا تھا۔ اس لئے حیا سے سمٹ رہی تھی۔ اس کی اداؤں میں مشرقی حسن اور حیا پرور تہذیب کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

وہ میٹرک پاس تھی۔ اس نے شاعری کی کتابیں خوب پڑھی تھیں۔ ہر کتاب اسے اپنے بدن کی طرح لگتی تھی۔ ہر شعر اس کے جذبوں کی طرح بولتا تھا اور بول کر بھی بہت کچھ چھپا جاتا تھا۔ اسے انتظار تھا' کوئی شعر فہم آئے۔ بڑے پیار سے اس کا دیوان کھولے اور ایک ایک شعر کی دیوانہ وار تشریح کرے۔ مگر جانو آیا اور آتے ہی اس نے ایک جھٹکے سے گھونگھٹ اٹھا دیا۔

آدابِ محبت بھی کوئی چیز ہے۔ اسے تالا کھول کر آنا چاہئے تھا۔ وہ توڑ کر آیا تھا۔ اس کا انداز کہہ رہا تھا' اپنا مکان ہے' وہ کھڑکی سے بھی آسکتا ہے۔ ویسے آنے والا اس کے حسن کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ دلہن بہت خوبصورت ہے۔ چندے

آفتاب اور چندے ماہتاب ہے۔ اس کے محلے میں آفتاب اور مہتاب نامی دو خسرے رہا کرتے تھے۔ جانو کا دھیان ان کے غازہ لگے ہوئے چہروں کی طرف چلا گیا تھا۔ بیچارہ بنگلہ دیش سے آکر پنجاب میں آباد ہوا تھا۔ اسے آدھی اردو' آدھی بنگالی اور آدھی پنجابی آتی تھی۔ اس لئے وہ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب کے معنی سمجھ نہیں پایا تھا۔

اس نے اپنے بھاری کھردرے ہاتھوں میں حنائی ہاتھ کو تھام لیا پھر ایک انگلی میں انگوٹھی پہناتے ہوئے بولا۔ "میرے کو بھولنے کی عادت ہے۔ میرے یار نے سمجھایا تھا' پہلے محبت سے دو چار باتیں سنا دینا۔ میرے کو اچھے سے بولنا نہیں آتا۔ پھر یار نے سمجھایا تھا' انگوٹھی پہنانے کے بعد منہ دیکھنا۔ چلو کوئی بات نہیں پہلے کیا بعد میں کیا۔ آخر پہنا تو دیا۔ اب آنکھیں کھولو۔ میں تمہارے کو دیکھ رہا ہوں۔ تم میرے کو دیکھو۔"

آمنہ نے شرماتے شرماتے آنکھیں کھول دیں پھر جانو پر نظر پڑتے ہی سہم گئی۔ ڈرپوک ہوتی تو خوف سے چیخنا شروع کردیتی۔ وہ ایسا ہی خوفناک چہرہ لگ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ دل کو سمجھایا' نہیں' یہ کوئی بھیانک خواب تھا۔ جھوٹی تسلی سے کیا ہوتا ہے۔ کبھی خواب میں بھی کالا شہزادہ نہیں آتا۔ وہ جاگتی آنکھوں کے سامنے آیا تھا۔ اس لئے حقیقت تھا۔ ایسی حقیقت جو منہ پھیرنے اور آنکھیں بند کرنے سے بھی نہیں بدلتی۔

ایسے ہی موقع پر کہتے ہیں' مجازی خدا جیسا بھی ہوتا ہے اپنا ہوتا ہے۔ اب وہ جیسا بھی تھا اپنا ہی تھا۔ وہ اس رشتے سے اس لئے انکار نہیں کرسکتی تھی کہ سوتیلی ماں نے بھی کمال دکھایا تھا۔ اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کو دلہا کے خلاف کچھ بولنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ بیٹی سے اس قدر جلتی تھی کہ غصے میں اسے مار پیٹ کر اس کے گورے مکھڑے پر کالک مل دیا کرتی تھی اور قسم کھا کر کہتی تھی۔ "تیری شادی کسی کالے کلوٹے بھوت سے کراؤں گی۔" آج اس نے یہ قسم پوری کردی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی۔ کیسے آنکھیں کھولوں؟ کس دل سے مجازی خدا کو دیکھوں؟ اس لمحے میں اندھی بھی ہو جاؤں' تب بھی یہ صورت حافظے کے دریچے سے جھانکتی رہے گی۔ اب تو کسی بھی صورت سے ایسی صورت والے کے ساتھ زندگی گزارنا ہے۔ یہ مشرقی رسم و رواج اچھے ہیں لیکن شادی سے پہلے دلہا دلہن کو ایک دوسرے سے چھپانا اکثر دلہن کو مہنگا پڑتا ہے۔ سہاگ کی سیج پر دلہا دلہن کے ہاتھ ایک دوسرے سے ضرور ملتے ہیں لیکن ہاتھ کی لکیریں نہیں ملتیں۔

بڑی دیر بعد جانو کی آواز سنائی دی۔ "آنکھیں کھولو۔"

وہ اپنے اندر آنکھیں کھولنے کا حوصلہ پیدا کرنے لگی۔ اس کی عادت تھی' کسی مشکل کام کا حوصلہ پیدا کرتے وقت درود شریف پڑھتی تھی اور وہ دل ہی دل میں پڑھ رہی تھی۔ وہ بولا۔ "میں سمجھ گیا۔ دنیا والے میرے کو کالا پہاڑ بولتے ہیں۔ تمہاری بند آنکھیں بھی میرے اوپر تھو تھو کر رہی ہیں۔"

اس نے یک لخت آنکھیں کھول دیں۔ جانو بے حد مایوس نظر آرہا تھا۔ جبکہ مایوس نہیں ہونا چاہئے تھا۔ جو تالا توڑ کر آسکتا ہے' وہ جبراً لوٹ مار بھی کرسکتا ہے۔ اس کی خاموشی بتا رہی تھی کہ وہ جبر کے لئے نہیں محبت کے لئے آیا ہے اور وہ ایسی صورت والا ہے جسے بھیک میں بھی محبت نہیں ملتی۔

آمنہ کو احساس ہوا کہ وہ رنگ دیکھ رہی ہے' اس کا ڈھنگ نہیں دیکھ رہی ہے جبکہ مرد اپنے ڈھنگ سے پہچانا جاتا ہے اور وہ چند منٹوں میں پہچانا جا رہا تھا۔

اس نے کہا۔ "میں بتی بجھا دیتا ہوں۔ اندھیرا ہوگا تو میرے کو دیکھ نہیں سکو گی۔ تم کچھ اور نہ سمجھنا' جب تک میرے کو قبول نہیں کرو گی تم کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ سوئچ بورڈ کی طرف جانے لگا۔ گویا خود اپنی توہین کر رہا تھا کہ روشنی میں قابلِ قبول نہیں ہے۔ آمنہ بری طرح نادم ہو رہی تھی۔ اسے روکنا چاہتی تھی مگر نئی دلہن تھی۔ ابھی بتی جلانے یا بجھانے کے مسئلے پر بول نہیں سکتی تھی۔

سوئچ آف ہوگیا۔ کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ ایسی گہری تاریکی جیسے سہاگ کے کمرے میں جانو کے بدن کی کالک پھر گئی ہو۔ آمنہ کو پہلے تو ڈر سا لگا جیسے وہ اب تب میں آنے والا ہو اور شب خون مارنے والا ہو لیکن وقت گزرتا گیا اور ایسی کوئی واردات نہیں ہوئی بڑی دیر بعد اندھیرے میں اس کی آواز سنائی دی۔ "ایک بات بولو۔ کیا تمہاری ماں نے میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا؟"

وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "بتا دیتی' تب بھی مجھے سوتیلی ماں کا گھر چھوڑنا تھا۔"

"تم مجبور ہو کر میرے پاس آئی ہو؟"

"خدا کے لئے ایسی بات دل میں نہ لاؤ۔"

وہ خاموش رہا۔ یہ بھی خاموش رہی۔ محبت نہ ہو' کوئی جذبہ نہ ہو' چوڑیاں نہ کھنکتی ہوں' سانسیں نہ بہکتی ہوں تو سہاگ رات کی تاریکی قبر کے اندھیرے کی طرح جکڑ لیتی ہے۔ وہ گھبرا کر بولی۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا میں چلا جاؤں؟"

"نہیں۔" دلہن کے منہ سے نکلا ہوا "نہیں" محض ایک لفظ نہیں تھا' ایک مکمل

فقرہ تھا کہ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ یعنی وہ کچھ زیادہ گیا گزرا نہیں تھا' وہ گزارہ کر سکتی تھی۔

اس نے کہا۔ "میں کالا پہاڑ ہوں مگر میرا دل تمہارے جیسا خوبصورت ہے۔ میرا یار کہتا تھا' اچھی صورت والا پہلی رات ہی میں دل کو بھاتا ہے اور اچھا دل والا ٹھہر ٹھہر کے سمجھ میں آتا ہے۔"

اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔ "ہاں' میں تمہیں سمجھ رہی ہوں۔"

اچانک روشنی ہوگئی۔ وہ سوئچ بورڈ کے پاس کھڑا کہہ رہا تھا۔ "اب تمہارے کو ڈر نہیں لگے گا۔ تم اِدھر اُدھر دیکھو۔ میرے کو مت دیکھو۔"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "مجھے اور شرمندہ نہ کرو۔"

وہ قریب آیا لیکن سامنے نہیں آیا پھر بولا۔ "میں تمہارے کو پاکر خوش نصیب ہوگیا ہوں۔ مگر تمہارے کو بد نصیب ہونے کا احساس نہیں ہونے دوں گا۔"

وہ تاریکی میں اس سے دو چار باتیں کر چکی تھی لیکن روشنی میں پھر شرم آرہی تھی۔ یہ بھی سمجھ رہی تھی کہ خاموش رہی تو وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتا رہے گا۔ وہ گھونگھٹ درست کرتی ہوئی بولی۔ "یہاں بیٹھ جاؤ۔"

وہ ہچکچانے لگا۔ کیسے سامنے آکر بیٹھے؟ اس کے دل میں جو بات آرہی تھی اسے وہ لفظوں میں بیان کرنا نہیں جانتا تھا۔ بات یہ تھی کہ اب اسے اس کے حسن سے ڈر لگ رہا تھا۔ ایک طرح سے جرم کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے اس نے نکاح نہ پڑھوایا ہو' اپنی اوقعات سے زیادہ حسین عورت کو اٹھا لایا ہو۔

وہ پھر آہستگی سے بولی۔ "کیا نہیں بیٹھو گے؟"

"وہ .... وہ بات یہ ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ اندھیرے میں تم کو ڈر لگتا ہے' روشنی میں میرے کو دیکھ کر ڈرتی ہو میں کیا کروں؟"

"میں اب نہیں ڈروں گی۔"

جانو نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر لائٹ آف کردی۔ اندھیرا ہوگیا۔ حسن کا سورج ڈوب گیا۔ گورے رنگ کی قدر و قیمت روشنی کے رہنے تک ہے' تاریکی میں رنگ کا فرق نہیں رہ جاتا۔ وہ پاس آکر بیٹھ گیا۔

ٹھیک ہے کہ اندھیرے میں دیدار کی جھلک زندہ رہتی ہے لیکن وہ خواب خواب سی لگتی ہے۔ وہ روشنی والا رعبِ حسن نہیں رہتا۔ اس نے دلہن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

☆=========☆=========☆

دلہن کو کراچی سے لاہور لے جانے کا مسئلہ تھا۔ جبکہ عام لوگوں کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا لیکن دلہن کچھ زیادہ ہی خاص قسم کی تھی۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے یوں لگتا جیسے نیگیٹو پازیٹو یا رات اور دن ساتھ ساتھ ہوں .... یا حور' لنگور کے پہلو میں چل رہی ہو۔

ہمارے ہاں میاں بیوی اَن میل' بے جوڑ ہوں تو مذاق بن جاتے ہیں۔ دیکھنے والے پھبتیاں کستے ہیں یا بے اختیار مسکراتے ہیں۔ مسکرانا اچھی بات ہے لیکن ایسے وقت مسکراہٹ گالی بن جاتی ہے۔

وہ لاہور پولیس میں حوالدار تھا۔ سرکار کی طرف سے کم اقساط میں ایک بڑا سا کوارٹر رہنے کو مل گیا تھا جہاں وہ تنہا رہتا آیا تھا اور اب آمنہ کو بیاہ کر لے جا رہا تھا۔ اگرچہ پردے کا قائل نہیں تھا لیکن اس کے لئے برقع خرید کر لے آیا تھا اس کی زندگی میں ایک ایسی عورت آگئی تھی جسے چھپا کر رکھنا ضروری تھا۔ بات صرف اتنی سی نہیں تھی کہ کالے گورے کی سنگت مذاق بن جاتی۔ بلکہ پریشانی یہ بھی تھی

اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے
جس نے ڈالی بری نظر ڈالی

پہلے وہ غریب تھا۔ تین وقت کی روٹیاں کھا کر مست رہنے والا حوالدار تھا۔ اب ایک خزانہ لے کر جا رہا تھا جس کے چرائے جانے کا دھڑکا ہمیشہ لگا رہتا۔ اندیشے تھے کہ بات بات پر دہلاتے تھے۔ اس نے سوچا' آمنہ کو لاہور تک زنانہ کمپارٹمنٹ میں لے جائے۔ مردانہ کمپارٹمنٹ میں وہ برقع کے اندر رہ کر بیس گھنٹوں تک سفر نہیں کر سکے گی اور نقاب اٹھائے گی تو تمام ہم سفر اور آنے جانے والے آنکھیں سینکتے رہیں گے۔

آخر اس نے زنانہ ڈبے کا ہی ٹکٹ لیا جس اسٹیشن پر گاڑی رکتی تھی' وہ دوڑ کر اپنے کمپارٹمنٹ سے آتا تھا' اسے اپنی جگہ بیٹھے دیکھ کر تسلی ہوتی تھی۔ وہ چائے پانی کے لئے اسے پوچھتا تھا پھر ٹرین چلنے پر دوڑتے ہوئے اپنے کمپارٹمنٹ میں سوار ہو جاتا تھا۔ جب وہ آمنہ کے پاس آکر باتیں کرتا تھا تو دوسری عورتیں کھڑکیوں سے جھانک کر اسے دیکھتی تھیں اور دوسری عورتوں کو بلا کر اُس کی طرف اشارے کرکے اس طرح دکھاتی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں۔

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

اسے اگلے کمپارٹمنٹ میں سیٹ ملی تھی اور آمنہ پچھلے کمپارٹمنٹ میں تھی۔ وہ ہر اسٹیشن پر تقریباً سو گز کی دوڑ لگاتا تھا۔ سفر کے اختتام پر یوں لگا جیسے کراچی سے دوڑتے

دوڑتے لاہور پہنچا ہو۔ اس کے باوجود ابھی یہ اچھی طرح سمجھ نہیں پایا تھا کہ اسے اندیشوں اور واہموں کے سائے میں ساری عمر دوڑتے رہنا ہے۔ پڑوس کے میاں بیوی اپنے جوان بیٹے بیٹی کے ساتھ دلہن کا استقبال کرنے اسٹیشن آئے تھے۔ پڑوسن نے کہا۔ ”ہمارے محلے میں بڑی چہل پہل ہے۔ سب تیری دلہن کا انتظار کررہے ہیں۔“

پڑوسن کے جوان بیٹے انور نے کہا۔ ”مگر بھابی تو برقع میں چھپی ہوئی ہیں۔ کہیں سے دلہن نظر نہیں آتی ہیں۔“

انور کی بہن صغریٰ نے کہا۔ ”جانو بھائی! یہ برقع اتروا دو۔ نئی دلہن کو کالے برقع میں نہیں لے جانا چاہئے۔“

جانو نے کہا۔ ”صغریٰ، جب تیری شادی ہوگی تب پتا چلے گا کہ دلہا کتنا ہی آزاد خیال ہو، اپنی دلہن کو ضرور پردہ کراتا ہے۔“

پڑوسن نے کہا۔ ”بیٹے جانو! دلہن گھونگھٹ میں رہے گی تب بھی وہ باپردہ ہی کہلائے گی۔“

پڑوسن خالہ کے اس پر بڑے احسانات تھے۔ وہ جانو سے صرف پانچ سو روپے ماہانہ لیتی تھی اور مہینے بھر تینوں وقت اچھا کھلاتی تھی۔ اس کے کپڑے دھوتی اور استری کرتی تھی۔ صغریٰ اس کے گھر کو صاف ستھرا رکھتی تھی۔ ماں اور بچے اس کا جتنا خیال رکھتے تھے اس کے پیشِ نظر پانچ سو روپے کچھ بھی نہ تھے۔

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”خالہ! تم کہتی ہو تو یہ گھونگھٹ میں ہی جائے گی۔ مگر ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد برقع اتارو۔ یہاں بھیڑ لگ جائے گی۔“

انور نے کہا۔ ”جانو بھائی چاہتے ہیں کسی کی نظر نہ لگے۔ برقع سے جھانکنے والے ہاتھ بتا رہے ہیں، بھابی بہت ہی خوبصورت ہیں۔“

جانو کو یوں لگا جیسے انور ہاتھ کے ذریعے برقع کے اندر کا سارا حسن دیکھ رہا ہو اور یہ سراسر بدنیتی تھی۔ حالانکہ وہ انور کو بنگلہ دیش سے دیکھتا سمجھتا آیا تھا۔ وہ نیت کا کھوٹا نہیں تھا چونکہ زندہ دل تھا اس لئے ہر ایک سے مذاق کرتا اور ہنستا بولتا تھا۔ محلے والے اس کی تعریفیں کرتے تھے۔

جانو اسے اچھی طرح جاننے اور سمجھنے کے باوجود اس کی زندہ دلی اور شرافت کو بھول گیا تھا۔ بس یہ بات بری لگ رہی تھی کہ اس نے برقع کے اندر جھانکنا شروع کیا ہے اب اس کے گھر میں بھی جھانکتا رہے گا۔

ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد وہ برقع اتر گیا۔ جانو سمجھ گیا کہ محلے والوں سے اور پڑوسیوں

سے وہ پردہ نہیں کرا سکے گا۔ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی پر روز جانا ہے اور آمنہ کو گھر میں تنہا چھوڑنا ہے۔ ایسی مجبوری میں باہر والوں پر اور گھر والی پر بھروسا کرنا ہی پڑے گا۔ فی الوقت یہی سمجھ میں آیا کہ شام تک بازار جائے گا۔ وہاں سے شیخ سعدیؒ کی گلستان بوستان اور ہدایت نامہ بیوی خرید کر آمنہ کو پڑھنے کو دے گا۔ حسین اور پُرکشش بیویوں کو صراطِ مستقیم پر چلانے کے لئے یہ نسخہ بہت پرانا ہے۔

گلی میں ٹیکسی داخل ہوئی تو دروازے کھلنے لگے۔ عورتیں باہر آنے لگیں۔ مرد حضرات اپنے گھروں کے سامنے کھڑے جھک جھک کر ٹیکسی کے اندر دیکھتے ہوئے جانو کو مبارک باد دے رہے تھے۔ پڑوسیوں نے اس کے گھر کو رنگ برنگی جھنڈیوں اور قمقموں سے سجا دیا تھا۔ بڑے بڑے ڈیک کے ذریعے فلمی گیت دور تک گونج رہے تھے۔ چند عورتیں جانو کے دروازے پر کھڑی ہوئی سہاگ کے گیت گا کر دلہن کا استقبال کررہی تھیں۔ شادی کا لطف یہاں آرہا تھا۔ وہاں تو اس نے بڑی خاموشی اور سادگی سے نکاح پڑھایا تھا۔ کراچی میں اس کے دور کے چند عزیز تھے جنہوں نے ایسی دھوم دھام نہیں کی تھی۔ بس آمنہ کو اس کی شریکِ حیات بنانے کا فرض ادا کردیا تھا۔

محلے کی عورتیں دلہن کو ایک سجے سجائے کمرے میں لے گئی تھیں۔ جانو کو دوستوں اور بزرگوں نے باتوں میں الجھا لیا تھا مگر اس کا دھیان دلہن کی طرف تھا۔ کیونکہ عورتوں کے ساتھ چند لڑکے بھی دلہن کا منہ دیکھنے اندر گئے تھے۔ اگرچہ وہ بارہ چودہ برس کے تھے لیکن چند برسوں میں جوان ہونے والے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ دلہن کا روپ رنگ دیکھ کر اسی کمرے سے جوان ہو کر نکلتے۔ یہ ناممکن نہیں تھا۔ آج کے بچے وی سی آر پر بھارتی فلمیں دیکھ کر اپنی عمر سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔

اس نے ایک بزرگ سے کہا۔ ”جہاں عورتیں ہوں وہاں لڑکوں کو نہیں جانا چاہئے۔“

بزرگ نے کہا۔ ”یہ لڑکے بڑے شرارتی ہیں، جہاں دیکھو وہاں گھس پڑتے ہیں۔ میں ابھی انہیں کمرے سے نکالتا ہوں۔“

بزرگ اپنی چھڑی اٹھائے کمرے میں گئے پھر عورتوں کی بھیڑ سے لڑکوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا لیکن خود باہر نہیں آئے۔ جانو انتظار کرتا رہ گیا۔ اسے فلم سکندرِ اعظم کا ایک منظر یاد آرہا تھا۔ سکندر کی محبوبہ نے دعویٰ کیا تھا۔ ”میں عورت ہوں، کسی کو بھی دیوانہ بنا سکتی ہوں۔ خواہ وہ جوان ہو یا بوڑھا۔“

سکندر نے کہا۔ ”جوانی میں مرد دل کی بات مانتا ہے اور بہکتا ہے۔ بڑھاپے میں

عقل سے کام لیتا ہے اور سنبھلتا ہے۔"

"عورت کے آگے کوئی سنبھل نہیں پاتا۔ تمہارا استادِ معظم ارسطو بھی میرا دیوانہ بن سکتا ہے۔"

"میرے استاد کی شان میں گستاخی نہ کرو۔"

"استاد دیوانگی سے باز رہے تو میں گستاخ کہلاؤں گی ورنہ نہیں۔"

دوسرے دن سکندر نے چھپ کر دیکھا۔ اس کی محبوبہ پائیں باغ میں وقت کے بہت بڑے فلسفی ارسطو سے پوچھ رہی تھی۔ "کیا میں حسین اور پُرکشش ہوں؟"

"ہاں، تمہاری کشش توبہ توڑ دیتی ہے۔"

"کیا میں کسی کو بھی دیوانہ بنا سکتی ہوں؟"

"بے شک، تمہیں خدا نے اسی لئے پیدا کیا ہے کہ مرد بے لگام ہو جائے۔"

"محترم ارسطو! تم اپنی لگام میرے ہاتھوں میں دے سکتے ہو۔"

"ضرور میں دیوانگی میں خود کو تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔ مگر اپنی دانائی تمہیں نہیں دے سکتا کیونکہ یہ عورت کے پاس نہیں رہتی۔"

"مجھے تمہارے فلسفوں کی نہیں، تمہاری ضرورت ہے۔ آؤ مجھے یہ لگام ڈالنے دو۔"

اس نے ارسطو کے منہ میں لگام ڈالی پھر لگام کے دونوں سروں کو تھام کر اسے گھوڑے کی طرح پائیں باغ میں دوڑانے لگی۔ سکندر اپنے استاد کی یہ ذلت برداشت نہ کر سکا۔ اچانک سامنے آکر ڈانٹتے ہوئے بولا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

محبوبہ نے کہا۔ "میں نے اپنا دعویٰ درست کر دکھایا ہے۔"

سکندر نے کہا۔ "استاد محترم! میرا سر شرم سے جھک گیا ہے۔"

استاد نے کہا۔ "میں نے پہلے دن تمہیں سمجھایا تھا کہ استاد کے ہر عمل کو سبق کی طرح سمجھا کرو۔ یہ بھی ایک سبق ہے کہ یہ مجھ پر لگام نہ ڈالتی، مجھ سے صرف میری دانائی لیتی تو ایک منفی عمل سے بچ جاتی لیکن اس نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت صرف جوان مرد کو ہی نہیں، بوڑھوں کو بھی تہذیب کی جنت سے نکال دیتی ہے۔ میرے ہونہار شاگرد، آج کا سبق یاد رکھنا۔"

سکندر نے وہ سبق یاد رکھا تھا یا نہیں لیکن جانو کو وہ یاد آ گیا۔ اصل جادو تو آمنہ کا تھا جو صرف جوانوں کو نہیں بوڑھوں کو بھی باؤلا کر رہا تھا۔ اس جادو کا توڑ یہی ہے کہ اسے سخت پردے اور پابندیوں میں رکھا جائے۔ اس نے دلہن کے کمرے کے پاس آکر ایک خاتون سے کہا۔ "وہ بے چاری لمبے سفر سے تھک کر آئی ہے اسے ذرا آرام کرنے دو۔"

خاتون نے ہنستے ہوئے دوسری عورتوں سے کہا۔ "سنا تم نے، یہ جانو اپنی دلہن کو بے چاری کہہ رہا ہے۔ بیچاری کی تھکن اتارنے کو کہہ رہا ہے۔"

وہ عورتیں کھلکھلانے لگیں۔ ایک نے کہا۔ "ہم بھی دلہن بن کر آئے تھے۔ ہمیں پتا ہے گھونگھٹ کے پیچھے تھکن بھی پیاری لگتی ہے۔"

کچھ اور عورتیں بھی قہقہوں میں شامل ہو گئیں۔ پڑوسن خالہ نے کہا۔ "ارے جانو! ذرا صبر کر، ابھی منہ دکھائی کی رسم ہو رہی ہے۔"

وہ بولا۔ "خالہ! سب کو منہ دکھانا کیا ضروری ہے؟"

وہ جانو کو ایک طرف لے جا کر رازداری سے بولی۔ "یہاں جسے دیکھو وہی منہ اٹھائے دلہن دیکھنے چلی آ رہی تھی۔ میں نے بھی سوچا مفت میں کیوں دکھاؤں؟ میری بہو ایسی گری پڑی نہیں ہے۔ دیکھنے والوں کو مہنگی پڑے گی۔ تب اس کی قدر و قیمت معلوم ہو گی۔ تُو دیکھتا جا، شام تک دو چار ہزار جمع ہو جائیں گے۔ ویسے کا خرچ نکل آئے گا۔"

وہ پولیس میں حوالدار تھا۔ اوپری آمدنی منہ کو لگی ہوئی تھی اس لئے خالہ کا یہ طریقہ کار برا نہیں لگا۔ اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے خالہ! مگر منہ دکھائی عورتوں تک ہی رکھو۔ میں مردوں کو دیکھنے نہیں دوں گا۔ یہ محلے والے میرے کوئی سگے نہیں ہیں۔ سب نامحترم ہیں۔"

"ارے نامحترم نہیں، نامحرم کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے، یہاں کوئی نامحرم نہیں آئے گا۔"

وہ پھر باہر مردوں میں آکر منجی پر بیٹھ گیا۔ ایک نے مسکرا کر کہا۔ "جانو کو قرار نہیں ہے۔ کبھی اندر جا رہا ہے کبھی آ رہا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "یہ عورتیں شام تک موقع نہیں دیں گی۔"

"بھئی اپنی چیز ہے، ایسی بھی کیا بے قراری ہے۔"

"کیوں نہ ہو بے قراری؟ سنا ہے دلہن لاکھوں میں ایک ہے۔"

ایک جوان لڑکے نے کہا۔ "اسی لئے دلہن پر ٹکٹ لگا دیا ہے۔"

جانو نے بھڑک کر کہا۔ "ابے تیری ماں پر بھی ٹکٹ لگایا تھا۔"

لڑکے باپ نے غصے سے اٹھ کر کہا۔ "جانو! زبان سنبھال کر بات کر، تُو میری گھر والی تک پہنچ رہا ہے۔"

وہ بولا۔ "تیرا بیٹا منہ دکھائی کی رسم کو ٹکٹ والا تماشا کہہ رہا ہے۔ کیا اس کی ماں تیری دلہن بن کر آئی تھی تو ٹکٹ لگایا تھا یا رسم ادا کی گئی تھی؟"

"ارے تو بچے کی بات پر لال پیلے کیوں ہو رہے ہو؟"

جانو نے کہا۔ ”یہ بچہ ہے؟ اس کی شادی کر دو۔ یہ چار بچوں کا باپ بن جائے گا اور جناب کی نظروں میں بچہ ہی ہے۔“

وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے تن گئے تھے۔ لوگوں نے انہیں دور کر دیا۔ سمجھا بجھا کر الگ الگ بٹھا دیا۔ ان کے بیٹھتے ہی اندر سے عورتوں کا شور سنائی دیا۔ پہلے وہ شور محدود تھا پھر لا محدود ہونے لگا۔ کئی عورتیں چیخ چیخ کر ایک دوسرے کی باتیں سنا رہی تھیں۔ پھر دو عورتیں اپنی اپنی گود میں بچے سنبھالتی ہوئی باہر آئیں۔ ایک نے جانو سے کہا ”تمہاری دلہن تمہیں مبارک ہو۔ ہم نے بڑی حور پریاں دیکھی ہیں۔ ایک اسے نہیں دیکھیں گے تو آنکھیں پھوٹ نہیں جائیں گی۔“

جانو نے کہا۔ ”آخر بات کیا ہے؟“

دوسری عورت نے اپنے روتے ہوئے بچے کو ہاتھ مار کر کہا۔ ”بات یہ ہے کہ تمہارے چاچا دلہن کو دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر تمہاری پڑوسن خالہ تو دلہن کے پاس اندرا گاندھی بن کر بیٹھ گئی ہے۔ فرماتی ہے‘ کوئی مرد دلہن کو نہیں دیکھے گا۔“

اس کی ساتھی عورت نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ”ذرا سوچو جانو! تمہارے چاچا کی عمر کیا ہے؟ تمہارے باپ کے برابر ہے۔ وہ بہو سمجھ کر اسے دیکھ لیں گے تو کیا قیامت آ جائے گی؟“

جانو نے کہا ”وہ تو ٹھیک ہے مگر..........“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اور تین چار عورتیں غصے میں باہر آئیں۔ ایک نے کہا۔ ”توبہ توبہ‘ دلہن نہ ہوئی چھوئی موئی کا پودا ہو گئی‘ پڑوسن خالہ تو ذرا ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔“

دوسری نے کہا۔ ”پڑوسن خالہ کا بیٹا انور پورا کا پورا جوان ہے مگر اپنا بیٹا ہے اس لئے وہ آتے جاتے دلہن کو دیکھ رہا ہے۔“

جانو نے کہا۔ ”چاچی! انور ہو یا چاچا ہوں‘ کسی نامحترم کو.......... میرا مطلب ہے کیا کہتے ہیں اسے؟ نامحرم کو دلہن کے پاس نہیں جانا چاہئے۔“

ایک خاتون نے پوچھا۔ ”کیا تم ہماری بہو بیٹیوں کو نہیں دیکھتے ہو؟ اس محلے میں کون تم سے پردہ کرتی ہے۔ کیا تم نامحرم نہیں ہو؟“

”میں ہوں لیکن یہاں جو سامنے آتی ہے‘ میں سامنا کرتا ہوں۔ کسی کے ہاں بلایا جاتا ہے تو جاتا ہوں۔ کسی کے گھر میں زبردستی نہیں گھس جاتا ہوں۔“

”کیا ہمارے گھر والے تمہارے ہاں زبردستی گھس رہے ہیں؟“

”چاچی! سمجھا کرو۔ میں پردے کی بات کر رہا ہوں۔ کیا ہمارے دین میں عورت کو پردہ کرانے کی تاکید نہیں کی گئی ہے؟“

”ہاں‘ آج کوہ قاف کی پری لے آیا ہے تو دین اور پردے کی بات کر رہا ہے۔ میں بھی دیکھوں گی کہ ایک محلے ایک گلی میں رہ کر تو اسے کہاں تک چھپا کر رکھے گا۔“

دوسری نے کہا۔ ”چلو بہن چلو۔ ہم یہاں تھوکنے بھی نہیں آئیں گے۔“

پہلے وہ پانچ عورتیں غصہ دکھا کر گئیں۔ پھر دوسری عورتیں بھی ناگواری سے بڑبڑاتی ہوئی جانے لگیں۔ ان کے ساتھ ان کے گھر والے بھی منجیوں اور کرسیوں سے اٹھ کر جانے لگے۔ تھوڑی سی دیر میں شادی والا گھر ویران ہو گیا۔ وہ اندر آیا۔ صغریٰ دلہن کے پاس بیٹھی منہ دکھائی کی رقم گن رہی تھی۔ انور لطیفے سنا کر دلہن کو ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پڑوسن خالہ کہہ رہی تھی۔ ”آمنہ بیٹی! یہ میرا بیٹا انور ہے۔ بڑا ہی زندہ دل ہے۔ اب گھونگھٹ اٹھا لو۔ باہر والے چلے گئے ہیں۔ میرے بیٹے سے پردہ نہ کرو۔“

جانو نے کمرے میں آ کر کہا۔ ”خالہ! تمہاری اسی بات نے تمام محلے والوں کو ناراض کر دیا ہے۔ پتا ہے ان لوگوں نے مجھے کتنی باتیں سنائی ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے‘ پردہ ہو تو سب سے ہو۔ انور میرا کون سا سگا ہے۔ نہ خون ایک نہ خاندان ایک۔“

خالہ نے پوچھا۔ ”اور تو نے باتیں سن لیں؟ کیا یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم سگوں سے بڑھ کر ہیں۔ خون اور خاندان کیا ہوتا ہے؟“

”تم نہ مانو دنیا والے تو مانتے ہیں۔ خون اور خاندان کے حساب سے ہی کسی کو محرم اور نامحرم کہا جاتا ہے۔ دین کو مانو تو انور بھی نامحرم ہے۔“

”کیا؟“ خالہ نے حیرانی سے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”یہ تُو کہہ رہا ہے؟ میری صغریٰ جوان ہے۔ تیرے سامنے آتی ہے۔ تیرے گھر کا کام کرتی ہے۔ میں نے کبھی تجھے نامحرم نہیں سمجھا اور آج ایک گوری چٹی دلہن لا کر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر رہا ہے۔ چل انور‘ اٹھ یہاں سے۔“

”خالہ! میری بات سمجھو۔ انور یہاں آتا رہا تو محلے والے خواہ مخواہ باتیں بنائیں گے۔“

”کیا میری بیٹی کے لئے باتیں نہیں بنائی گئی تھیں؟ میں نے تو سب ہی کو کھری کھری سنا دی تھیں۔ مگر تُو نہیں سنا سکتا۔ تُو بھی یہی چاہتا ہے کہ میرا بیٹا یہاں نہ آئے۔ اری او صغریٰ‘ کیوں دلہن کے پاس گھسی بیٹھی ہے۔ چل اٹھ وہاں سے۔ اپنا کلیجا نکال کر رکھ دو تب بھی پرایا‘ پرایا ہی رہے گا۔“

وہ صغریٰ اور انور کے ساتھ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ اس نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے پیچھے باہر تک آیا پھر ان کے جاتے ہی دروازے کو بند کر کے دلہن کے کمرے میں آ گیا۔ آمنہ نے گھونگھٹ اٹھا لیا تھا۔ وہ بولا۔ ”میرے کو سمجھ میں نہیں آتا' لوگوں کو اچھی بات بری کیوں لگتی ہے۔ تم نے دیکھا' ہماری خالہ دوسرے مردوں کو یہاں آنے سے روک رہی تھیں اور اپنے بیٹے کو ہنسنے بولنے کے لئے بٹھا لیا تھا۔“

آمنہ نے کہا۔ ”ان کی بیٹی آپ سے پردہ نہیں کرتی ہے۔ اس لئے وہ مجھے بھی انور بھائی کے سامنے گھونگھٹ اٹھانے کو کہہ رہی تھیں۔“

”کوئی انور بھائی وائی نہیں ہے۔ میں نے ایک بار چرس کا سگریٹ اسے پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ کیا ایسے آدمی کو میں تمہارے پاس آنے دوں گا۔ کیا میں نے خالہ سے کہا تھا کہ وہ بیٹی کو میرے سامنے آنے دیا کرے۔ محلے میں بہت سے گھروں کی بہو بیٹیاں میرے سامنے آتی ہیں۔ اگر وہ بہو بیٹیوں کو پردہ نہیں کراتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں بھی دین کے حیکام سے پھر جاؤں۔“

”حیکام نہیں احکام۔“

”میں بچپن سے حیکام بولتا آ رہا ہوں۔ یہ غلط ہوتا تو کوئی نہ کوئی ٹوک دیتا۔ تم کوئی عالم فاضل ہو؟ میرے کو عورت کا روکنا ٹوکنا بالکل اچھا نہیں لگتا۔“

اس نے خاموشی سے سر کو جھکا لیا۔ وہ پاس بیٹھ کر بولا۔ ”تمہاری ماں سوتیلی تھی اس لئے تمہیں نہیں بتایا کہ بیوی کو کیسے رہنا چاہئے۔ میں تمہارے کو ہدایت نامہ بیوی لا کر پڑھنے دوں گا۔“

”میں ایک سہیلی سے لے کر پڑھ چکی ہوں۔ اس میں لکھا تھا کہ شوہر سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسے محبت سے سمجھانا چاہئے۔ لوگ ایک دوسرے کے غلط تلفظ کو درست نہیں کرتے۔ دوسرے کی غلطیوں پر خوش ہوتے ہیں۔ خود کو برتر اور دوسرے کو کمتر سمجھتے ہیں لیکن میں آپ سے برتر نہیں ہوں۔ آپ کو اونچا دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس لئے کہتی ہوں کہ احکام صحیح لفظ ہے۔“

”اچھا اچھا ایسے بولو نا کہ میرے کو اوپر دیکھنا چاہتی ہو۔ ٹھیک ہے میں احکام بولا کروں گا۔“

”میرے یہاں آتے ہی پورا محلّہ آپ سے ناراض ہو گیا ہے۔ خالہ سے بھی رنجش ہو گئی ہے۔ میں خوش قدم نہیں ہوں۔“

”یہ بات نہیں ہے۔ اصل میں لومڑی کو انگور نہیں ملے تو وہ انگور کو کھٹے بول کر چلی

گئی۔ میں یہاں کے لوگوں کو تمہاری صورت دیکھنے نہیں دیا تو وہ مجھے برا سمجھ کے چلے گئے۔ میں تمہارے کو سمجھا دیتا ہوں۔ میں گھر نہ رہوں تو باہر والے گیٹ کی طرف نہ جانا۔ ان دو کمروں میں رہنا۔ کھڑکی سے باہر بالکل نہ جھانکنا۔ میں باہر گیٹ پر تالا ڈال کر جاؤں گا۔ تم باہر دیوار کے پاس جا کر پڑوسیوں سے بھی بات نہ کرنا۔ یہ بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔ میں تمہاری بھلائی کے لئے سمجھا رہا ہوں۔ یہ تمہارے سامنے کی بات ہے۔ میں پردے کی جائز بات کہہ رہا تھا اور وہ اس بات پر کڑھ کر چلے گئے کہ تمہاری صورت دیکھنے کو نہیں ملی۔ یہ تو خود غرضی ہے۔ بدنیتی ہے۔“

”میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں۔ ہم اتنی بڑی دنیا میں سب کو خوش نہیں رکھ سکتے۔ مگر کسی کسی کو تو خوش کر سکتے ہیں۔“

”کیسے خوش کروں؟ کیا تمہیں سب کے سامنے جانے دوں؟“

”میں یہ نہیں کہتی۔ پڑوسن خالہ سے برسوں کے تعلقات ہیں' آپ کسی وقت سہولت سے انہیں سمجھائیں کہ آمنہ خود بے پردگی پسند نہیں کرتی ہے۔ آپ انور بھائی کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے ہیں۔ آپ کو اعتراض نہیں ہے میں بھی سمجھا دوں گی کہ میں پردے کی سخت پابند ہوں۔“

”ہاں یہ ہوئی عقل کی بات۔ میں خالہ کو سمجھاؤں گا۔“

”ضرور سمجھائیں' میں شروع سے بدبخت ہوں۔ میرے پیدا ہوتے ہی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ میں دو برس کی عمر سے سوتیلی ماں کی مار اور گالیاں کھاتی آ رہی ہوں۔ اس جہنم سے نکل کر آئی ہوں تو یہاں پہنچتے ہی اس گھر کو اجاڑ رہی ہوں۔ جو آپ کے دوست تھے انہیں دشمن بنا دیا ہے۔ میں یقین دلاتی ہوں' یہاں کسی کا سامنا نہیں کروں گی۔ کسی عورت سے بھی بات نہیں کروں گی۔ مغرور اور نک چڑھی کہلاؤں گی لیکن کسی کو آپ کے خلاف کوئی رائے قائم نہیں کرنے دوں گی۔“

آمنہ نے سوچا تھا' سسرال میں ساس نندیں ہوں گی لیکن سوتیلی ماں کی مار پیٹ اور گالیوں سے نجات مل جائے گی۔ وہاں اس کی حمایت میں بولنے والا خاوند تو ہو گا۔ اتفاق سے سسرال میں ساس اور نندیں نہیں تھیں لیکن ان سے بھی بڑھ کر محلے کی عورتیں تھیں جو پہلے ہی دن اپنے تیور دکھا گئی تھیں۔ اس کی گوری رنگت کے سامنے احساسِ کمتری میں مبتلا رہنے والے جانو کی شکی طبیعت سے بھی ظاہر تھا کہ سسرال کا [illegible] ہمیشہ اجنبی اور اندیشوں سے بھرپور رہے گا۔

اس کی عقل نے فوری طور پر یہی سمجھایا کہ اگر وہ ایسے ماحول میں صرف اپنے مرد

کا ہی مستحکم اعتماد حاصل کرتی رہے گی تو باہر کی مخالفتوں سے بڑی حد تک محفوظ رہے گی۔
وہ پہلے ہی دن سے اپنے طور پر ذہانت کا ثبوت دینے لگی۔ اس رات اس نے جانو سے کہا۔ "یہ باہر گلی میں کھلنے والی کھڑکی کیا ضروری ہے۔ یہ کھڑکی نکال کر اینٹیں چنوا دیں۔"

آمنہ نے اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ "تم بہت سمجھدار ہو۔ فی الحال صبح ڈیوٹی پر جانے سے پہلے کیلیں ٹھونک کر کھڑکی کو بند کر دوں گا۔ سرکار نے ایسے کوارٹر بنا دیئے ہیں کہ ہر گھر کا پچھلا آنگن ایک دوسرے سے ملا ہوا ہے۔ صرف چھ چھ فٹ کی دیوار اٹھائی ہوئی ہے۔ چھ فٹ سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی بھی دیوار پھلانگ کر پڑوسیوں کے آنگن میں پہنچ سکتا ہے۔ میں چھٹی کے دن آنگن کی دیواریں اونچی کراؤں گا۔ راج مستری آئے گا تو کھڑکی میں اینٹیں چنوا دوں گا۔"

اس نے دوسری صبح یہی کیا۔ کھڑکی میں کیلیں ٹھونک کر اسے مستقل طور پر بند کر دیا۔ ڈیوٹی پر جاتے وقت باہر گیٹ پر بڑا سا تالا لگا دیا۔ محلے کی عورتیں جانو سے ناراض ہو کر آنے کے بعد سکون سے نہیں بیٹھی تھیں۔ ایک دوسرے کے گھر جا کر جانو کی برائیاں کر رہی تھیں اور نئی دلہن میں کیڑے نکال رہی تھیں۔ شاید انہیں رات بھر نیند بھی نہ آئی ہو گی۔ صبح جانو کو تالا لگا کر جاتے دیکھا تو ایک گھر سے کیسٹ ریکارڈر کی آواز آنے لگی۔ "ہم تم ایک کمرے میں بند ہوں اور چابی کھو جائے اور چابی کھو جائے۔"

کیسٹ ریکارڈر کو بار بار روک کر صرف وہی حصہ بجایا جا رہا تھا جہاں یہ الفاظ تھے کہ چابی کھو جائے۔ چابی کھو جائے۔ جانو نے چابی کو اوپری جیب سے نکال کر اندرونی جیب میں یوں سنبھال کر رکھا جیسے وہ سچ مچ کھو جائے گی۔

اس کی ڈیوٹی پولیس ہیڈ کوارٹر میں تھی۔ وہاں دوسرے سپاہیوں اور افسروں نے اسے شادی کی مبارک باد دی۔ اس نے افسر سے کہا "سر! میرا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ نئی دلہن گھر میں اکیلی ہے۔ میری چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں اس لئے حاضر ہو گیا۔ آج جلدی گھر جانا چاہتا ہوں۔"

افسر نے کہا۔ "کوئی بات نہیں' اور دو دن کی چھٹی کی درخواست لکھ کر چلے جاؤ۔ دلہن کو لاہور کی سیر کراؤ۔"

اس کے دل کی مراد پوری ہو گئی۔ وہ افسر کو دعائیں دیتے ہوئے اپنے ایک ساتھی کے پاس آیا اور چھٹی کی درخواست لکھوانے لگا۔ اسے خود اچھی طرح لکھنا نہیں آتا تھا۔ اردو کتابیں یا اخبارات اٹک اٹک کر پڑھتا تھا۔ لکھنے میں ہجے کی غلطی ہو جایا کرتی تھی۔ بہرحال اس کا کام ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد اسے چھٹی مل گئی۔

آمنہ گھر کی صفائی میں لگ گئی تھی۔ اس نے اپنے اتارے ہوئے کپڑے دھوئے' غسل کیا پھر انہیں دھوپ میں ڈالنے کے لئے پچھلے آنگن میں آئی۔ پچھلے آنگن سے دوسرے گھر کا آنگن ملا ہوا تھا۔ دونوں آنگنوں کے درمیان چھ فٹ کی دیوار تھی۔ دائیں طرف کا آنگن پڑوسن خالہ کا تھا اور بائیں طرف دوسرے پڑوسی کا۔ جب وہ کپڑے پھیلا کر جانے لگی تو ہلکی سی آواز سن کر رک گئی۔ پلٹ کر دیکھا' دوسرے پڑوسی کے آنگن کی دیوار کی ایک اینٹ آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ دوسری طرف سے کوئی اس اینٹ کو دیوار سے نکال رہا تھا۔

وہ اینٹ بہت پہلے سے الگ کی گئی تھی۔ اس لئے آسانی سے الگ ہو گئی۔ پھر اس خلا میں ایک مرد کا ہاتھ نظر آیا۔ اس ہاتھ میں ایک تہہ کیا ہوا کاغذ تھا۔ اس نے کاغذ کو آمنہ کے آنگن میں پھینکا پھر اس اینٹ کو پہلے کی طرح دیوار سے لگا دیا۔

آمنہ کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس دھڑکن میں تجسس بھی تھا اور بدنامی کا خوف بھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آنگن میں پڑے ہوئے اس چورنامے کو دیکھ رہی تھی۔ خوف کہہ رہا تھا کہ دنیا بھی دیکھ رہی ہے۔ اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ آنگن کی دیوار کے اس پار ایک پتلی سی گلی تھی۔ گلی کے بعد دوسرے مکانوں کی قطار تھی۔ اِدھر سے کوئی آمنہ کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ پڑوسن خالہ کی دیوار سے بھی کوئی نہیں جھانک رہا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی اس چور نامے کو وہاں سے اٹھانا چاہئے یا نہیں؟

کٹی ہوئی پتنگ ہو یا بھٹکا ہوا محبت نامہ' اگر وہ اپنے آنگن میں آئے تو اسے اٹھانے کا حق ہوتا ہے۔ پھر اسے اٹھا کر پڑھنے سے تجسس بھی ختم ہو جاتا ہے۔ وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں گئی پھر اس تہہ کئے ہوئے کاغذ کو اٹھا کر دوڑتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ بستر کے سرے پر بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگی جیسے چوری کر کے دور سے دوڑتی آ رہی ہو۔

اس نے تہہ کئے ہوئے کاغذ کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ "آج سسرال میں میرا دوسرا دن ہے۔ پھر یہ بدنامی میرے آنگن میں کیوں آئی ہے؟ یہ کاغذ جانو کے ہاتھ لگ جاتا تو میرے حق میں کیا ہوتا؟ برا ہی ہوتا۔"

اس نے اسے کھول کر پڑھا۔ لکھا ہوا تھا۔ "میری جان صغریٰ!"

آمنہ چونک کر خلا میں تکنے لگی۔ چشم زدن میں یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ پڑوسی سے صغریٰ کا چکر چل رہا ہے۔ وہ جانو کے گھر کی صفائی کرنے آتی ہو گی۔ پھر پچھلے آنگن میں جا کر دیوار کی اس اینٹ کو ہٹا کر پڑوسی کے ساتھ آنکھیں سینکتی ہو گی۔

اس نے سر جھکا کر اس محبت نامے کو دیکھا پھر پڑھا۔ لکھا تھا۔ میں کل سے تمہارے

دیدار کو ترس رہا ہوں۔ تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں۔ نئی دلہن آئی ہے اس لئے تمہیں آنگن میں تنہا آنے کا موقع نہیں مل رہا ہو گا۔ ابھی غسل خانے میں برتن دھونے کی آوازیں سن کر سوچا۔ دلہن سے پہلے دن کام نہیں کرایا جاتا ہے' یقیناً تم ہی برتن دھو رہی ہو۔ اس یقین کے ساتھ تمہیں پیار لکھ رہا ہوں کہ اگر یہ خط تمہیں مل گیا ہے تو تم اونچی آواز میں دلہن بھابی کو کچھ بولو۔ تمہاری آواز سن کر مجھے اطمینان ہو گا کہ یہ خط تمہارے ہی ہاتھ لگا ہے۔ کوئی موقع دیکھ کر جواب لکھ دو کہ آئندہ ہماری ملاقات کیسے ہو گی؟ کیا تم دلہن بھابی کو راز دار سہیلی بنا سکتی ہو؟ میں بے چینی سے تمہارے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔ فقط تمہارا دیوانہ' احمد حسین۔"

آمنہ نے خط کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ پڑوسی نے صاف طور پر صغریٰ کو مخاطب کر کے وہ محبت نامہ لکھا تھا اس لئے آمنہ پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی تھی لیکن بات کا بتنگڑ بنانے والے کہہ سکتے تھے کہ جانو صغریٰ کو اپنے گھر بلا کر پڑوسی سے عشق کراتا تھا۔ کسی کے گھر کی ایک اینٹ اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہو اور اس کی خبر گھر والے کو نہ ہو' یہ محلے والے تسلیم نہ کرتے۔

دانشمندی یہ تھی کہ یہ معاملہ گھر سے باہر نہ جائے۔ صغریٰ بھی بدنام ہو جاتی۔ اگرچہ وہ خطاوار تھی لیکن اس خطا کو چھپا کر اسے سمجھایا جا سکتا تھا کہ آئندہ ایسی غلطی کرے، گی تو بدنام ہونے کے بعد کہیں سے رشتہ نہیں آئے گا۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ شاید جانو آ رہا تھا۔ وہ گھر کی چار دیواری میں رہ کر اس کی آمد کو اس طرح سمجھ گئی کہ جب وہ باہر والے گیٹ پر تالا لگا کر جا رہا تھا تو گلی کے کسی گھر سے فلمی گیت کی آواز آ رہی تھی۔ "ہم تم ایک کمرے میں بند ہوں اور چابی کھو جائے' اور چابی کھو جائے۔"

آمنہ نے اس طنزیہ شرارت کو سمجھ لیا تھا۔ اب پھر گلی میں دوسرا فلمی گیت گونج رہا تھا۔ "اٹھ ری سجنیاں کھول کواڑ' تیرا ساجن آیا ہے تالے کی چابی لایا ہے۔"

اس نے کمرے کے دروازے پر آ کر سنا۔ گیٹ کا تالا کھلنے کی آواز آ رہی تھی۔ واقعی جانو آ گیا تھا۔ کھانے پکانے کا سامان لایا تھا۔ اس نے کمرے میں سامان لا کر رکھتے ہوئے پوچھا۔ "اکیلے گھبرا رہی تھیں؟"

وہ بولی۔ "کیا آپ میری فکر میں ڈیوٹی چھوڑ کر آئے ہیں۔"

"صاحب نے دو دن کی چھٹی دی ہے۔ تم بتاؤ' یہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

"ایک پریشانی کی بات ہے۔ آپ وعدہ کریں' ٹھنڈے دماغ سے میری باتیں سنیں

گے۔ غصہ نہیں کریں گے۔"

"تم بہت اچھی ہو۔ میں تمہارے اوپر غصہ نہیں کروں گا۔"

"آپ دوسروں پر بھی غصہ نہیں دکھائیں گے۔ وعدہ کریں۔"

وہ ایک دم سے تن کر غصہ سے بولا۔ "کیا کسی نے یہاں بدمعاشی کی ہے؟"

"دیکھئے آپ ابھی سے طیش میں آ رہے ہیں۔"

"ارے تو بجھول (پہیلی) کیوں بوجھا رہی ہو۔ بات کیا ہے جلدی بولو۔"

اس نے وہ خط دیتے ہوئے کہا۔ "یہ آنگن میں پڑا ہوا تھا۔"

"کیا ہے یہ؟"

"ادھر والے پڑوسی احمد حسین نے صغریٰ کو یہ خط لکھا ہے۔"

"تمہارے کو پڑوسی کا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"اس خط میں اس کا نام لکھا ہوا ہے۔"

"تمہارے کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ خط پڑوسی کا ہے؟"

اس نے بتایا کہ آنگن کی دیوار کی ایک اینٹ ایسی ہے جسے اس کی جگہ سے ہٹایا پھر وہیں لگایا جاتا ہے۔ جانو نے غصے سے بھڑک کر پوچھا۔ "کیا اس نے دیوار کے سوراخ سے جھانک کر تمہیں دیکھا ہے؟"

"اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ مجھے صغریٰ سمجھ رہا تھا۔ دیکھئے آپ غصہ میں زور سے بولیں گے یا پڑوسی سے جھگڑا کریں گے تو صغریٰ بدنام ہو جائے گی۔"

"بدنام ہوتی ہے تو ہونے دو۔ وہ اتنے دنوں سے میرے کو الو بنا رہی تھی۔ میرے گھر کو گناہ کا اکھاڑہ بنا رہی تھی۔"

"وہ نادان ہے۔ آپ اسے بہن کہتے ہیں۔ بھائی بن کر اس کی غلطی چھپائیں گے نہیں تو اس کا رشتہ کہیں سے نہیں آئے گا۔"

"تم چاہتی ہو میں الو بن جاؤں اور ان کا ناٹک چلتا رہے۔"

"میں چاہتی ہوں آپ خالہ سے اکیلے میں بات کریں۔ وہ اپنی بیٹی پر پابندیاں لگائیں گی۔ پھر آپ پڑوسی کو تنہائی میں تنبیہہ کریں' ہو سکتا ہے وہ صغریٰ سے شادی کر لے۔"

"ارے وہ تین بچوں کا باپ ہے۔ بیوی بچے پنڈ میں رہتے ہیں۔ اب معلوم ہوا' وہ ایسی ہی بدمعاشیاں کرنے کے لئے بچوں کو دور رکھتا ہے۔"

"اس خط کی صورت میں اس کی بدمعاشی کا ثبوت آپ کے پاس ہے۔ وہ آپ کے سامنے کان پکڑے گا۔ آئندہ ہمارے آنگن میں جھانکنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

"تم عورت کی عقل میرے کو مت سکھاؤ۔ میں محلے والوں کو اس کی بدمعاشی ضرور بتاؤں گا۔"

"محلے والے آپ سے ناراض ہو کر گئے ہیں۔ وہ الٹی باتیں کریں گے۔ وہ سمجھیں گے کہ جو پڑوسی صغریٰ کو ہمارے آنگن میں جھانک کر دیکھتا ہے وہ آئندہ مجھے دیکھتا رہے گا۔ آپ لاکھ دیواریں اونچی کریں' لوگ تو یہی سوچیں گے کہ وہ دیوار کی کوئی اینٹ ہٹا کر بدمعاشیاں کرتا ہے۔ کیا آپ مجھے بدنام کرنا چاہتے ہیں؟ ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچیں' آپ مردوں کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ صغریٰ کے ساتھ میں بھی مفت بدنام ہوتی رہوں گی۔"

بات اس کے مغز میں آ گئی۔ وہ یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ ایک پڑوسی اس کالے کی گوری کو پھانس رہا ہے۔ لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ گوری بھی پڑوسی کے ساتھ مل کر کالے کو الو بنا رہی ہے۔ وہ خط لے کر پڑوسن خالہ کے پاس چلا گیا۔

آمنہ بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی کہ صغریٰ کا معاملہ دانشمندی اور خاموشی سے ختم ہو جائے۔ کوئی بات الٹی نہ ہو۔ بڑی دیر بعد وہ پڑوسن خالہ کے ساتھ آیا۔ آمنہ سے بولا۔ "وہ اینٹ بتاؤ جو الگ ہو جاتی ہے۔"

اس نے آنگن میں آ کر اینٹ کی نشاندہی کی۔ جانو نے اس اینٹ کو وہاں سے ہٹا کر دیکھا پھر کہا۔ "دیکھو خالہ! میں صغریٰ کو بہن بولتا ہوں۔ مگر وہ میرے کو بھائی نہیں الو سمجھتی ہے۔"

خالہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "بیٹا! اس سے نادانی ہو گئی۔ اب میں اسے گھر سے نکلنے نہیں دوں گی۔ تو میری عزت رکھ لے۔ اس بات کو نہ اچھال۔ وہ خط میرے سامنے جلا دے۔"

"خالہ! یہ بات باہر نہیں جائے گی لیکن یہ خط پڑوسی کی بدمعاشی کا ثبوت ہے۔ اس کو جلانے سے وہ بدمعاش پارسا بن جائے گا۔ ٹھہرو ذرا میں اس کی خبر لیتا ہوں۔"

"نہیں بیٹے! بات بگڑ جائے گی۔ دلہن' اسے سمجھاؤ میرے سفید بالوں کا کچھ خیال کرے۔ اچھا ایسا کرو .... میں یہیں دیوار کے پاس اسے بلاتی ہوں یہیں رازداری سے باتیں کر لو۔"

وہ پڑوسی کو آوازیں دینے لگی۔ "احمد حسین! ادھر آؤ۔ میں دیوار کے پاس بلا رہی ہوں۔"

اس نے کئی بار پکارا مگر جواب نہ ملا۔ جانو نے کہا۔ "وہ بزدل منہ چھپا کر بیٹھا ہے۔ خالہ' سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا۔ میں جاتا ہوں۔"

"ٹھہر جا بیٹا! میں جاتی ہوں' اسے اس دیوار کے پاس لاؤں گی۔ خدا کے لئے تو نہ جا۔"

آمنہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "آپ خالہ کی بات مان لیں۔"

خالہ فوراً ہی وہاں سے چلی گئی۔ پھر ایک ہی منٹ کے بعد اندر آ کر بولی۔ "اس کے دروازے پر تالا ہے۔ وہ کہیں باہر گیا ہے۔"

جانو نے کہا۔ "وہ باہر نہیں گیا ہے۔ بھاگ گیا ہے۔ مگر گھر چھوڑ کر کہاں بھاگے گا۔ واپس آنا ہی پڑے گا۔"

وہ واپس نہیں آیا۔ دوسرے دن بھی دکھائی نہیں دیا۔ جانو نے راج مستری کو بلا کر آنگن کے دونوں طرف کی دیواریں دس فٹ تک اونچی کرا دیں۔ تیسرے دن وہ ڈیوٹی پر گیا تو پڑوسی احمد حسین پولیس ہیڈ کوارٹر کے گیٹ پر کھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "جانو بھائی! مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ میں عزت دار آدمی ہوں۔ بے عزتی کے ڈر سے محلے میں نہیں جا رہا ہوں۔ تم اپنے دفتر میں لے جا کر مجھے دو جوتے مار لو اور یہ معاملہ یہیں ختم کر دو۔"

"تیرے جیسا کمینہ پڑوس میں رہے گا تو معاملہ کبھی ختم نہیں ہو گا۔ میں نے دیوار اونچی کرا دی ہے مگر تو سیڑھی لگا کر میرے آنگن میں دیکھے گا۔ میری عورت بے پردہ ہوتی رہے گی۔"

"میں ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں' کبھی اپنے آنگن کی دیوار کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ میں تمہاری گھروالی کو اپنی بہن اور تم کو بہنوئی سمجھتا رہوں گا۔"

"میں ایک شرط پر تمہارے کو معاف کروں گا۔"

"تم ہزار شرطیں منوا لو۔"

"ابھی پنڈ جاؤ اور بیوی بچوں کو لے آؤ۔ اکیلا آدمی گھر میں شیطان ہوتا ہے۔ میں تمہارے کو اکیلے نہیں رہنے دوں گا۔"

"خدا تمہارا بھلا کرے۔ میں آج ہی پنڈ جاؤں گا اور دو چار روز میں بیوی بچوں کے ساتھ آ جاؤں گا۔ خدا تمہیں صلہ دے۔"

وہ سلام کر کے چلا گیا۔ جانو کو ذرا اطمینان ہوا کہ اس نے بیوی بچوں کے ساتھ رہنے کی شرط لگا کر دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی بیوی خود ہی شوہر کی پہریدار بن کر رہے گی اور اسے جانو کے آنگن میں جھانکنے نہیں دے گی۔

یہ وقتی اطمینان تھا۔ دماغ کے چور گوشے میں یہ بات پھنسی ہوئی تھی کہ بیوی حسین

ہے اور پڑوسی بدنیت ہے۔ دیوار آسمان تک اٹھا دینے سے چوری کا اندیشہ ختم نہیں ہو جاتا۔ عورت مہربان ہو جائے تو دیواروں میں شگاف ڈال دیتی ہے اور آنگن کی دیوار کی ایک اینٹ یہ ثابت کر چکی تھی۔ بعض عورتیں اپنے خاوند کو نیند کی دوا کھلا کر رات بھر کے لئے بے لگام ہو جاتی ہیں۔

غلطی صغریٰ کی تھی مگر شامت آمنہ کی آ رہی تھی۔ اس کے خلاف شکوک و شبہات پیدا ہوتے رہتے تھے۔ وہ ڈیوٹی پر ہوتا تو دھیان آمنہ کی طرف لگا رہتا تھا۔ وہ کیا کر رہی ہو گی؟ کسی کمرے میں ہو گی یا آنگن میں؟

وہ آنگن مصیبت بن گیا تھا۔ ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ وہ پولیس میں حوالدار تھا۔ آئے دن کوئی شوہر اور بچوں والی بے حیائی کے کیس میں پکڑی جاتی تھی اور اس کے سامنے لائی جاتی تھی۔ وہ غصے میں آ کر اس کی ایسی پٹائی کرتا تھا جیسے آمنہ کو لات جوتے مار رہا ہو۔ وہ گھر آ کر اسے ایسی عورتوں اور ان کے عاشقوں کے قصے سناتا تھا اور وہ گناہگار نہ ہوتے ہوئے بھی سر جھکا کر خاموشی سے سنتی تھی۔ خوب سمجھتی تھی کہ جانو کے اندر کیا لاوا پک رہا ہے۔ اس کی عقل کام نہیں کرتی تھی کہ کس طرح اس لاوے کو ٹھنڈا کرے۔ جیسے جیسے وقت گزرنے لگا وہ اپنے شوہر کو لاعلاج سمجھ کر اپنے کسی برے وقت کا انتظار کرنے لگی۔

ایک برس کے بعد اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ بیٹا بالکل اپنے باپ کی طرح سیاہ فام تھا۔ اس عرصے میں محلے والوں سے پھر علیک سلیک ہونے لگی تھی۔ کئی عورتوں نے آ کر مبارک باد دی۔ ایک عورت نے جانو سے پوچھا۔ "بیٹے کا نام کیا رکھا ہے؟"

وہ اپنے کالے سے بیٹے کو چومتے ہوئے بولا۔ "میرے چاند جیسے بیٹے کا نام قمرالدین ہے کیسا نام ہے چاچی؟"

"بہت اچھا ہے۔ بالکل بیٹے جیسا ہے۔"

ایسا طنزیہ کہا گیا تھا۔ اس طنز کو آمنہ نے سمجھا۔ جانو کی سمجھ میں اس لئے نہیں آیا کہ اسے اپنے چہرے اور اپنے رنگ سے بچپن سے محبت تھی۔ اس کی نظروں میں کالا رنگ پیارا تھا اس لئے بیٹا بھی پیارا اور بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ ماں کے لئے تو کالی گوری اولاد برابر ہوتی ہے۔ وہ جانو کو خوش دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ یوں شادی کے بعد دوسرا سال بھی گزر گیا۔ وہ اب تک قیدی کی سی زندگی گزار رہی تھی۔ جانو کا وہی دستور تھا کہ باہر گیٹ پر تالا ڈال کر جاتا تھا۔ محلے کی کوئی عورت دو گھڑی بیٹھنے اور باتیں کرنے نہیں آ سکتی تھی۔ کئی بوڑھی عورتوں نے جانو کو سمجھایا۔ "ارے پگلے! کیا اس بیچاری کو عمر

قید کی سزا دے رہا ہے؟ دنیا کے سارے مرد اپنی عورتوں کو گھروں میں چھوڑ کر کام دھندے پر جاتے ہیں۔ کیا وہ عورتیں اپنے مردوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاتی ہیں؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ .... کہ ...." وہ باتیں بنانے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر بوڑھیاں اس کے پیچھے پڑ جاتی تھیں۔ ان سے پیچھا چھڑانے کے لئے اس نے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ میں آمنہ کو محلے کے اس گھر میں جانے دوں گا جہاں پردے کی سختی ہو گی اور میں آمنہ کے ساتھ آیا کروں گا۔"

محلے کی بہت سی عورتوں نے جیسے قسم کھالی تھی کہ آمنہ کو کسی طرح کال کوٹھڑی سے باہر نکالیں گی۔ قسم اس لئے نہیں کھائی تھی کہ آمنہ سے ہمدردی تھی۔ دراصل یہ حسد اور جلاپا تھا کہ وہ ایسی کیا حور پری بنا دی گئی ہے کہ کسی کی نظر اس پر نہیں پڑتی ہے اور کیا ان کے گھروں کے مرد بدنیت اور بدمعاش ہیں کہ حور بی بی کو بھگا لے جائیں گے۔ تمام بہو بیٹیاں دوسروں کے سامنے آتی جاتی تھیں۔ آمنہ کے کون سے سرخاب کے پر لگے تھے؟ اگر لگے تھے تو وہ عورتیں ان پروں کو نوچ ڈالنا چاہتی تھیں۔

جب پہلی بار جانو آمنہ کو گھر سے نکال کر سامنے والی چاچی کے گھر میں چائے پینے آیا تو اس کی اس شرط پر مجبوراً عمل کیا گیا کہ آمنہ، چاچی کے گھر والے مردوں کے سامنے نہیں آئی۔ یعنی کوئی مرد سامنے نہیں آیا۔ ابتدا میں اتنا ہی کافی تھا کہ وہ عورتیں مل بھگت سے دو سال بعد آمنہ کو باہر لے آئی تھیں۔

دوسرے دن دوسرے گھر میں کھانے کی دعوت دی گئی۔ تیسرے دن تیسرے گھر میں بلایا گیا۔ جانو ایک گھر جانے کے بعد دوسروں کے ہاں جانے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ جب یہ سلسلہ چل پڑا تو آمنہ نے ایک رات اس سے کہا۔ "میں نے سنا ہے، لاہور شہر بہت خوبصورت ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "تو پھر؟"

"ہماری شادی کو یہ تیسرا برس ہے، اب تو اس شہر کی سیر کرا دیں۔"

اس نے گھور کر دیکھا پھر کہا۔ "اچھا تو محلے کے دو چار گھروں میں جاتے ہی تمہارے پاؤں لمبے ہو گئے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا، کوئی ضد نہیں کر رہی ہوں۔"

"تم کیا ضد کرو گی؟ منہ توڑ کر ہاتھ میں رکھ دوں گا۔ میں جانتا تھا، میرے کو اچھی طرح معلوم تھا، دو چار عورتیں ملیں گی تو تمہارے کو ضرور بھڑکائیں گی۔"

"مجھے کسی نے نہیں بھڑکایا ہے۔ مجھ سے بھول ہو گئی، اب کوئی فرمائش نہیں کروں

گی۔"

آمنہ ایک فرمائش کر کے مشکل میں پڑ گئی تھی۔ اب یہ سوچ کر ڈر رہی تھی کہ وہ محلے پڑوس میں جانے سے منع کر دے۔ شاید وہ ایسا کرتا لیکن محلے کی عورتوں کا اتحاد بڑا مستحکم تھا۔ اب محلے کے بزرگ بھی اس بات کے لئے پیچھے پڑ گئے تھے کہ اسے گیٹ پر تالا ڈال کر نہیں جانا چاہئے۔ اس طرح وہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی گھر والی کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے۔ اگر ٹھیک ہے تو اسے بھی دوسری عورتوں کی طرح محلے کی حد تک آزاد چھوڑ دینا چاہئے۔

وہ مانتا تھا کہ بزرگ درست فرماتے ہیں لیکن حسین سرمائے کو تجوری سے باہر نکالتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اسے کچھ وقت کے لئے بزرگوں کو ٹالنے کا موقع مل گیا۔ ان ہی دنوں آمنہ نے دوسرے بیٹے کو جنم دیا۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح تھا۔ اس کا نام امیرالدین رکھا گیا۔ شادی کو تیسرا سال بھی گزر گیا تھا۔ وہ حالات سے مکمل طور پر سمجھوتا کر چکی تھی۔ گھر کی چار دیواری کو بہت بڑی دنیا سمجھ کر جی رہی تھی۔

بڑا بیٹا قمرالدین چار برس کا ہو رہا تھا۔ وہ باہر جا کر بچوں کے ساتھ کھیلنے کی ضد کرتا تھا لیکن گیٹ پر تالا ہوتا تھا۔ ایسے وقت آمنہ بولنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ "آپ میری طرح بچوں کو بھی قیدی بنا رہے ہیں۔ آپ انہیں کب تک تالے چابی میں رکھیں گے۔"

وہ آمنہ کو ایک ہاتھ جماتے ہوئے بولا۔ "میں ان کا باپ ہوں۔ میرے کو معلوم ہے ان کو گلی کے آوارہ بچوں سے کیسے دور رکھنا چاہئے۔"

"قمرالدین چار برس کا ہو گیا ہے۔ کیا یہ مسجد میں پڑھنے نہیں جائے گا۔"

"جائے گا۔ مگر کیسے جانے دوں۔ کیسے گیٹ کھول کے جاؤں! میں تیرے کو سرخی پاؤڈر لا کر نہیں دیتا ہوں پھر بھی الوّ کی پٹھی چاند کے جیسے چمکتی ہے۔ تیرا کیا ہے' کوئی اٹھا کے لے جائے گا تو چلی جائے گی۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

"جانو! میں دو بچوں کی ماں بن گئی ہوں۔ اب تو مجھ پر بھروسا کرو۔"

"ارے جاؤ۔ دس بچوں کی مائیں بھی شوہر اور بچوں کو چھوڑ کر کسی عاشق کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں۔ پھر گرفتار ہو کر حوالات میں پہنچ جاتی ہیں۔ میں بڑے بڑے تماشے دیکھتا ہوں۔"

"تماشے دیکھتے ہو تو یہ بھی سمجھا کرو کہ اکثر عورتیں اپنے خاوند کے ظلم و ستم سے گھبرا کر گھر چھوڑ دیتی ہیں۔"

جانو نے ایک زبردست طمانچہ مارتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو میرے کو ظلم و ستم والا بول

رہی ہے۔ تیرا بھی ارادہ بھاگنے کا ہے۔"

وہ بولتا جا رہا تھا اور پٹائی کرتا جا رہا تھا۔ وہ چپ چاپ تھوڑی سی مار کھا لیا کرتی تھی لیکن اُس روز وہ رونے اور چیخنے چلّانے لگی۔ کیونکہ وہ بڑی بیدردی سے مار رہا تھا۔ محلے پڑوس والے گھروں سے نکل آئے تھے اور اس مقفل گیٹ کو دیکھ کر اندازہ کر رہے تھے کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ ایک بزرگ نے کہا۔ "بس کر جانو! تُو نے گھر کو بھی تھانہ بنا لیا ہے۔ ایسے مار رہا ہے جیسے چور کو مارتے ہیں۔"

ایک بوڑھی عورت نے کہا۔ "ارے خدا سے ڈر۔ وہ تیرے بچوں کی ماں ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو تجھے پھانسی ہو گی اور بچے دربدر ہو جائیں گے۔"

اس نے ہاتھ روک لیا۔ آمنہ بھی منہ پر آنچل رکھ کر خاموشی سے آہیں بھرنے اور سسکنے لگی۔ قمرالدین اور امیرالدین باپ سے سہم کر ایک طرف چپ بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگ مقفل گیٹ کے پیچھے خاموشی اور سکون دیکھ کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اب گھر میں آئے دن کچھ نہ کچھ ہونے لگا تھا۔ ایک روز قمرالدین کو تیز بخار اور شدید کھانسی تھی۔ جانو نے ایک خوراک دوا پلا کر آمنہ سے کہا۔ "ابھی بخار اتر جائے گا۔ چھ گھنٹے بعد پھر دوا پلا دینا۔ میں جا رہا ہوں۔"

وہ گیٹ پر تالا لگا کر چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد ہی بچے کی حالت بگڑنے لگی۔ بخار تیز ہونے لگا۔ آمنہ نے پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹی رکھی۔ بخار میں وقتی طور پر کمی ہوئی لیکن کھانسی نے شدت اختیار کر لی۔ وہ پریشان ہو کر کبھی دروازے کی طرف دیکھتی کبھی بچے کے پاس آ کر اسے تسلیاں دینے لگتی۔

یہ ایسا برا وقت ہوتا ہے کہ اپنوں اور غیروں کو مدد کے لئے پکارا جاتا ہے۔ گھر میں اپنا کوئی نہیں تھا۔ باہر والوں سے اس نے کبھی بات نہیں کی تھی۔ ایک تالے نے اسے دنیا والوں سے دور کر دیا تھا لیکن جب قمرالدین نے کھانستے کھانستے قے کر دی اور رک رک کر سانس لینے لگا تو ماں چیخ پڑی۔ دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر آئی پھر گیٹ پر ہاتھ مار مار کر پکارنے لگی۔ "خالہ! صغریٰ! چاچی! دینو چاچا جلدی آؤ۔ میرے بچے کی سانس جا رہی ہے۔ دوڑو۔ خدا کے لئے میرے بچے کو بچاؤ۔"

وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ مرد عورتیں بچے بوڑھے سب ہی گیٹ پر جمع ہو گئے۔ ایک عورت کہہ رہی تھی۔ "آمنہ کا بیٹا بیمار ہے۔ معلوم ہوتا ہے طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔"

آمنہ نے اندر سے چیخ کر کہا۔ "میرا قمرالدین الٹی کر رہا ہے' اس کی سانس رک

رہی ہے۔ ڈاکٹر کو بلاؤ اسے اسپتال لے چلو۔"

ایک نے کہا۔ "ڈاکٹر اندر کیسے جائے گا۔ باہر تالا لگا ہے۔"

ایک بزرگ نے کہا۔ "باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ کسی طرح بچے کو باہر لاؤ۔"

آمنہ دوڑتی ہوئی کمرے میں گئی' وہاں سے کرسی اٹھا کر لائی اسے گیٹ کے پاس دیوار سے لگایا پھر دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی قمرالدین کو چادر میں لپیٹ کر اسے اٹھا کر باہر آئی۔ پھر کرسی پر چڑھ کر دوسری طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ "اسے لو۔ میرے بیٹے کو بچا لو خدا کے لئے جلدی سے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔"

باہر کھڑے ہوئے لوگ بچے کو ہاتھوں ہاتھ لینے لگے "ساتھ ہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آمنہ کو بھی دیکھنے لگے۔ جب سے وہ دلہن بن کر آئی تھی تب سے پانچ برس گزر گئے پانچ برس بعد وہ پہلی بار نظر آ رہی تھی اور جو پہلی بار نظر آتی ہے اس کے ہر جلوے میں پہلی بار کی تازگی دکھائی دیتی ہے۔ وہ جو ایک حسین راز کی طرح جانو کی مٹھی میں بند تھی اب کھل کر سامنے آ گئی تھی۔

ہو سکتا ہے کہ وہ حسینہ عالم ہو۔ ہو سکتا ہے اس کے جلووں کی تابانی سے کوہ طور سینہ جلتا ہو لیکن وہ اجڑنے والی ممتا کا ماتم کرنے والی ماں بن کر آئی تھی۔ اسے اپنا ہوش نہیں تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے محلے والوں کے چہرے نہیں تھے صرف ان کے ہاتھ تھے اور وہ ہاتھوں ہاتھ اپنے بچے کو کسی مسیحا کے پاس جاتے دیکھ رہی تھی اور دیکھنے والے کچھ اور دیکھ رہے تھے۔ یہ دیکھنے والوں کی عادت ہے' وہ مریم کو بھی زلیخا سمجھ کر دیکھنے آئے ہیں۔

وہ رو رہی تھی۔ روتے روتے کرسی سے نیچے اتر گئی۔ محلے کے جوانوں اور بوڑھوں کے سامنے حسن کا سورج دیوار کے پیچھے غروب ہو گیا۔ اس کے بعد بھی وہ اُدھر دیکھتے رہے۔ امید تھی کہ وہ پھر طلوع ہو گی۔ پھر ایک نے دیوار کے پاس آ کر کہا۔ "آمنہ! فکر نہ کرو۔ ابھی تمہارا بیٹا ہنستا بولتا آئے گا' میں اسے لے کر آتا ہوں۔"

دوسرے نے کہا۔ "ابھی قمرالدین کو کیسے لاؤ گے۔ تم کوئی ڈاکٹر تو ہو نہیں۔ ڈاکٹر اچھی طرح معائنہ کرے گا۔ علاج میں دیر ہو کوئی بات نہیں۔ آمنہ! تم نہ گھبرانا۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔"

وہاں اور بھی جو لوگ تھے' وہ اپنے طور پر آمنہ سے قربت اور لگاؤ ظاہر کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ جواباً کچھ کہنے کے لئے پھر نگاہوں کے سامنے آئے گی لیکن دور ننھے امیرالدین کے رونے کی آواز نے سمجھا دیا کہ ماں اپنے دوسرے بچے کے پاس کمرے

میں چلی گئی ہے۔

اب اسے دوبارہ دیکھنے کی ایک صورت تھی۔ قمرالدین کو ڈاکٹر کے کلینک سے واپس لایا جاتا تو وہ بیٹے کو لینے پھر دیوار کے پاس نظر آتی۔ وہ سب ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔ "قمرالدین کو کون لے گیا ہے اور کس ڈاکٹر کے پاس لے گیا ہے؟"

وہاں کسی کو پتا ہی نہیں تھا کہ کون اس بچے کو لے گیا ہے؟ وہاں تو سب کی نظریں ماں پر لگی ہوئی تھیں۔ بچے کو وہ چند نوجوان لے گئے تھے جو ماں کو صرف ماں سمجھتے تھے۔ کئی لوگ اس علاقے کے مختلف ڈاکٹروں کے پاس گئے۔ ایک کمپوڈر نے بتایا۔ "تین نوجوان ایک بچے کو لائے تھے۔ بچے کی حالت تشویشناک تھی۔ اسے فوری طبی امداد پہنچائی گئی پھر وہ ڈاکٹر کے مشورے پر اسے گنگارام ہسپتال لے گئے ہیں۔"

اسپتال بہت دور تھا۔ بس کے ذریعے وہاں پہنچنے میں کم از کم ایک گھنٹا صرف ہوتا۔ ہو سکتا تھا وہ ایک گھنٹے میں اُدھر پہنچتے تو وہ تینوں جوان اس بچے کو اِدھر لے آتے۔ اسے ماں کے حوالے کر دیتے۔ پھر آمنہ دیوار کے پاس نظر نہ آتی۔ اس لئے وہ مقفل گیٹ کے پاس آ کر بچے کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

ان تینوں میں سے دو نوجوان قمرالدین کو گنگارام اسپتال لے گئے تھے۔ ایک جوان پولیس ہیڈکوارٹر جا کر جانو کو لے آیا تھا۔ اسپتال کے ایک ڈاکٹر نے جانو کو بلا کر کہا۔ "جانتے ہو تمہارا بچہ مرنے والا تھا۔ خدا کو اس کی زندگی منظور تھی اس لئے ہماری کوششوں سے بچ گیا ہے۔"

وہ بولا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ کی بڑی مہربانی ہے۔"

"مہربانی تو تم اپنے بچوں اور بیوی پر کرو۔ ان نوجوانوں نے بتایا ہے کہ بچے کو اسپتال پہنچانے میں کیوں دیر ہوئی؟ تمہاری تنگ نظری اور چھوٹے خیال کی وجہ سے ہوئی۔ تم گیٹ کو تالا لگا کر جاتے ہو ایسے میں کوئی تمہاری بیوی اور بچوں کی مدد کے لئے کیسے وقت پر پہنچ سکتا ہے؟"

ڈاکٹر اسے باتیں سنا رہا تھا اور وہ سر جھکائے سن رہا تھا۔ جب وہ قمرالدین کو اسپتال سے گھر لایا تو گلی میں مردوں اور عورتوں کی بھیڑ لگ گئی۔ سب ہی لوگ اسے ملامت کر رہے تھے۔ ملامت کرنے والے ایک دو ہوتے تو وہ ان سے لڑ پڑتا لیکن اس کے چاروں طرف سے آوازیں آ رہی تھیں اور ہر آواز پتھر کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا تھا کہ وہ ڈاکٹر اس کے بچے کی سلامتی کے لئے کتنی محنت کرتے رہے تھے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ باہر کا دروازہ مقفل رکھنے سے گھر والوں پر کیسی قیامت

ٹوٹ سکتی ہے۔

آج اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ گیٹ کا تالا کھول کر قمرالدین کو آمنہ کے پاس لے گیا۔ اسے اس کی گود میں دے کر آنگن میں آ گیا۔ منجی پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ کیا کرے؟ اگر وہ آئندہ تالا لگا کر نہ جاتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ آج تک غلطی کرتا آ رہا تھا۔ اکثر لوگ اپنی غلطیوں کو سمجھتے ہیں لیکن غلط کار کہلانا پسند نہیں کرتے۔ وہ بھی ایسا کرنے میں اپنی توہین سمجھ رہا تھا۔

سب سے زیادہ اندیشہ یہ تھا کہ گیٹ کھلا رہا اور محلے کی عورتوں کا آنا جانا لگا رہا تو وہ آمنہ کو بیوی کے زیادہ سے زیادہ حقوق مانگنے پر اکساتی رہیں گی۔ وہ پانچ برسوں سے ایک ٹوٹے ہوئے سستے سے آئینے میں منہ دیکھتی اور کنگھی کرتی تھی۔ آئینے کا پارا کہیں کہیں سے اکھڑ گیا تھا۔ پوری طرح صورت نظر نہیں آتی تھی۔ جانو کا خیال تھا کہ وہ آئینہ دیکھتے دیکھتے آمنہ اپنے حسن اور چہرے کی دلکشی بھول گئی ہے۔ محلے والیاں گھر میں آتیں تو کم از کم ایک اچھا سا آئینہ لا کر اسے ضرور دیتیں۔ جانو جاہل تھا' خودی کے فلسفے کو نہیں سمجھتا تھا کہ انسان جب خود کو شخصیت کے آئینے میں دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے تو اس میں خودی کو بلند کرنے کا جذبہ بھڑکتا ہے۔ جانو اتنی گہرائی سے نہیں سمجھتا تھا۔ بس یہ سوچتا تھا کہ صحیح آئینے میں اپنا صحیح حسن دیکھ کر وہ مغرور ہوتی رہے گی اور اس کالے کو کمتر سمجھتی رہے گی۔ عورت دوسرے مردوں کی آنکھوں سے بھی اپنی قدر و قیمت معلوم کر لیتی ہے۔ اس لئے بھی گیٹ پر تالا لگانا ضروری ہو جاتا تھا۔

اس رات قمرالدین دواؤں کے اثر سے کبھی سوتا رہا کبھی تکلیف سے جاگتا رہا۔ ماں ساری رات اس کی تیمارداری کرتی رہی۔ صبح جانو ڈیوٹی پر جانے کے لئے تالا چابی اٹھا کر گیٹ پر آیا تو آمنہ بھی آ گئی۔ وہ بولا۔ "اندر جاؤ۔"

"جاتی ہوں۔ یہ تالا مجھے دے دو۔ میں اسے اندر سے لگا کر چابی اپنے پاس رکھا کروں گی۔"

"تالے کی چابی مرد کے پاس رہتی ہے۔"

"رہتی ہے نہیں' رہتی تھی اور اس لئے رہتی تھی کہ میں صرف تمہاری بیوی تھی مگر اب اپنے بچوں کی ماں ہوں۔ میرے بچوں کو مسجد' مدرسہ' اسکول اور اسپتال تک پہنچانے کے لئے یہ گیٹ ہمیشہ کھلا رہے گا۔"

"بکواس مت کرو۔ ایک بار قمرالدین کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی' بار بار ایسا نہیں ہو گا اندر جاؤ۔"

"نہیں جاؤں گی۔" وہ ایسی جگہ تن کر کھڑی ہو گئی کہ جانو اسے ہٹائے بغیر گیٹ بند نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے دھکا دے کر کہا۔ "سویرے سویرے دماغ مت خراب کرو۔ نہیں تو ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دوں گا۔"

وہ دھکا کھا کر ذرا پیچھے گئی پھر آگے بڑھ کر بولی۔ "مجھے جان سے مار دو مگر میں اپنے بچوں کو مرنے نہیں دوں گی۔"

گلی کے دروازے اور کھڑکیاں کھل گئی تھیں۔ عورتیں جھانک رہی تھیں اور اپنے مردوں کے ساتھ پانچ سالہ تاریخی گیٹ کی طرف آ رہی تھیں۔ جانو نے اسے ایک ہاتھ مار کر کہا۔ "لوگ دیکھ رہے ہیں۔ اندر آ جاؤ۔"

وہ جانو کے ہاتھ سے تالا چھیننے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔ "تم تماشا کرو گے تو لوگ ضرور دیکھیں گے۔ آج میں رہوں گی یا یہ تالا رہے گا۔"

جانو نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر بڑا سا تالا اس کے سر پر دے مارا۔ وہ ایک دم سے چکرا گئی۔ آنکھوں کے سامنے روشنیاں جلنے بجھنے لگیں۔ اس کی پیشانی سے لہو بہہ رہا تھا۔ ایک بوڑھی نے کہا۔ "ارے جانو! تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔ بے چاری کو لہولہان کر دیا ہے۔"

کچھ عورتیں آمنہ کو سہارا دینے کے لئے آ رہی تھیں۔ وہ گرج کر بولا۔ "ہمارے معاملے میں کوئی نہ بولے۔ آج اس کی اتنی ہمت ہو گئی کہ یہ سب کے سامنے میرے سے لڑائی کر رہی ہے۔ میں ڈیوٹی سے آ کر اس کی خبر لوں گا۔"

اس نے آمنہ کو دھکا دے کر اندر صحن کے فرش پر اسے گرایا پھر باہر آ کر گیٹ کو بند کیا اس پر تالا لگایا اور محلے والوں کو گھورتا ہوا جانے لگا۔

آمنہ فرش پر گر کر سر کی تکلیف کو برداشت کرنے اور کمزوری پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہاں سے اٹھ کر پھر گیٹ پر آنا چاہتی تھی۔ پھر گیٹ پر تالا لگانے کی آواز سن کر چونک گئی۔ کمزوری کو بھول کر فرش سے اٹھ گئی۔ گیٹ پر ہاتھ مار مار کر چیخنے لگی۔ "اسے کھول دو۔ تم باپ نہیں قصائی ہو۔ تمہیں بچوں سے بھی محبت نہیں ہے۔ لیکن اب میں کسی بچے پر مصیبت نہیں آنے دوں گی۔ یہ دروازہ کھول دو۔"

اسے جواب نہیں ملا تو وہ دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی' وہاں سے کرسی اٹھا کر پھر گیٹ کے پاس آ کر اسے دیوار سے لگا دیا۔ ایک طرف کدال پڑی ہوئی تھی اسے اٹھا کر کرسی پر کھڑی ہو گئی۔ دیوار کے دوسری طرف گلی میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ چیخ کر بولی۔ "جانو! واپس آؤ اور تالا کھول دو ورنہ میرے ہاتھ میں کدال ہے۔ میں یہ دیوار توڑ دوں گی۔"

جانو جاتے جاتے رک گیا۔ پلٹ کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ پہلی بار اپنی گائے جیسی بیوی کے ایسے تیور دیکھ رہا تھا۔ اس کا حسین چہرہ پیشانی سے ٹھوڑی تک لہو میں بھیگ رہا تھا۔ بکھرے ہوئے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے کدال کو پکڑے ہوئے تھی۔ اس کے غضبناک تیور بتا رہے تھے کہ تالا نہ کھلا تو وہ احاطے کی دیوار توڑ دے گی۔

جنھوں نے کل آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس حسینہ کو دیکھا تھا آج وہ آنکھیں چرا کر اس زخمی شیرنی کو دیکھ رہے تھے۔ شاید شیرنی بھی ایسی غضبناک نہیں ہوتی ہو گی جیسی وہ زخمی ماں دکھائی دے رہی تھی۔

جانو آہستہ آہستہ چلتا ہوا گیٹ کے پاس آیا۔ تالے کو کھول کر اسے اندر صحن میں پھینکا پھر چابی اپنی جیب میں رکھتے ہوئے ڈیوٹی پر جانے لگا۔ آمنہ کرسی سے اتر کر صحن میں آگئی تھی۔ گلی میں کھڑے ہوئے لوگ خوشی سے تالیاں بجا رہے تھے۔ آمنہ اپنی وکٹ پر جمی ہوئی تھی۔ جانو کلین بولڈ ہو کر جا رہا تھا۔

وہ سیدھا ڈیوٹی پر نہیں گیا۔ بس اسٹاپ کے ایک ہوٹل میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ گھر کی چار دیواری میں خاموشی سے لات جوتے کھانے والی عورت اسے پورے محلے کے سامنے بری طرح شکست دے گی اور وہ شکست تسلیم کرتے ہوئے تالا کھول دے گا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو وہ جنون میں دیوار توڑ دیتی۔ یہی بات حیران کن تھی کہ وہ اس قدر جنونی کیسے ہو گئی؟ یہ ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ بیوی گائے ہوتی ہے اور ماں شیرنی۔

اس نے ایک دودھ پتی کی چائے کا آرڈر دیا۔ پتا نہیں اس کے ذہن میں یہ سوچ کیسے آئی کہ آمنہ دودھ پتی ہے۔ پتی میرے لئے' دودھ بچوں کے لئے۔ میرے کو صبر کرنا چاہئے۔ آخر وہ میرے بچوں ہی کے لئے لڑ پڑی تھی۔

وہ ڈیوٹی پر جانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ خیال ستا رہا تھا کہ گیٹ کھلا ہوا ہے۔ عورتیں آ رہی ہوں گی۔ آمنہ کی پیٹھ ٹھونک کر شاباشی دے رہی ہوں گی اور آئندہ بھی بغاوت کے لئے مزید گُر بتا رہی ہوں گی۔ بیچارہ دن کو کانٹوں پر چلتا تھا اور رات کو انگاروں کے بستر پر لوٹتا رہتا تھا۔ آدمی کو اپنی اوقعات سے زیادہ مل جائے تو اس کا یہی حال ہوتا ہے آمنہ کا حسن اس کی اوقعات سے زیادہ اور برداشت سے باہر تھا۔ وہ اپنے مرد کے لئے عذاب بن گئی تھی۔

☆========☆=========☆

پندرہ برس گزر گئے۔ اس دوران محلے میں بڑی تبدیلیاں آئیں۔ گلی کی کتنی ہی لڑکیاں دلہن بن کر دوسرے محلوں اور شہروں میں چلی گئیں اور دوسرے علاقوں سے کتنی ہی لڑکیاں بہوئیں بن کر محلے میں آئیں۔ ایسا ہر علاقے ہر بستی میں ہوتا ہے۔ لڑکے اپنی جگہ رہتے ہیں صرف لڑکیوں کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ یوں ہماری دنیا میں خوشگوار تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔

پڑوسن خالہ اپنا مکان فروخت کر کے چلی گئی تھیں۔ اس مکان میں ایک کشمیری خاندان آکر آباد ہو گیا تھا۔ کشمیریوں کا حسن قابلِ دید ہوتا ہے۔ سر سے پاؤں تک ایسے گورے چٹے ہوتے ہیں جیسے صبح و شام دودھ سے نہاتے ہوں۔ ان کے چہروں سے سیب اور انار کی سرخی جھلکتی ہے۔ جانو نے انہیں دیکھ کر آمنہ سے کہا۔ ”مبارک ہو۔ تمہاری قوم کے لوگ پڑوس میں آگئے ہیں۔“

وہ بولی۔ ”میں کشمیری نہیں بہاری ہوں۔“

”بہاری تو میں بھی ہوں مگر کالا ہوں۔“

”کشمیریوں میں بھی سب گورے نہیں ہوتے۔ ہر قوم میں مختلف رنگ اور مختلف مزاج کے لوگ ہوتے ہیں۔“

”یہی تو بولتا ہوں' کالے کا مزاج کالے سے ملتا ہے۔ تمہارا مزاج کشمیریوں سے ملے گا۔ وہ جوان کا جوان بیٹا فاروق بٹ ہے' وہ میرے سے پوچھ رہا تھا کیا میں تمہارے کو کشمیر سے لایا ہوں؟“

”تم نے کیا جواب دیا؟“

”جواب کی ایسی کی تیسی۔ وہ تمہارے سے کیوں دلچسپی لے رہا ہے؟“

”تم یہ بات حکیم لقمان سے پوچھتے تو وہ بھی جواب نہ دے پاتا۔ کیونکہ شک کا علاج وہ بھی نہیں جانتا تھا۔ کچھ تو سوچو' میں چار بیٹوں کی ماں ہوں۔ قمرالدین چودہ برس کا ہو گیا۔ میں چھتیس برس کی ہوں۔ فاروق بٹ مجھ سے دس بارہ سال چھوٹا ہو گا۔ وہ میرے قمرالدین جیسا ہے۔ میں اس کی ماں نہ سہی بڑی بہن کے برابر ہوں۔“

"کہاں کی بڑی ہو۔ دیکھنے میں اس سے بہت چھوٹی لگتی ہو۔ اُس روز دینو کی ماں کہہ رہی تھی کہ تم قمرالدین کی ماں نہیں بڑی بہن لگتی ہو اور تم یہ سن کر مسکرا رہی تھیں۔"

"دنیا کی کسی بھی عورت کو کم عمر کہو تو وہ خوش ہو گی لیکن خوشی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اندر سے اپنی اصل عمر کو بھول جاتی ہے۔"

"میں تمہارے سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ تمہارے کو پہلے سمجھا دیتا ہوں۔ نئے پڑوسی کے ہاں نہیں جانا۔ ان کی عورتوں سے دور کی علیک سلیک رکھو۔"

"میں یہاں کے دس گھروں میں جاتی ہوں۔ اگر اپنے ہی پڑوس میں نہیں جاؤں گی تو لوگ باتیں بنائیں گے۔"

"میں لوگوں سے نہیں ڈرتا ہوں۔ شادی کے بعد کئی برس تک تمہارے پر کاٹ کر رکھا تھا تب ٹھیک تھا۔ میں آج بھی پر کاٹ سکتا ہوں۔ تم کسی خوش قدمی میں نہ رہنا۔"

"خوش قدمی نہیں، خوش فہمی کہا جاتا ہے۔"

"کہتے ہوں گے۔ جب غلط بولنے سے صحیح سمجھ میں آجاتا ہے تو پھر استانی بن کر میرے کو اردو مت پڑھاؤ۔ میں ماں کے پیٹ سے جو پڑھ کے آیا ہوں، وہی بولتا رہوں گا اور وہی کرتا رہوں گا۔"

"اور میں بھی وہی کرتی رہوں گی جو محلے پڑوس میں رہ کر کرنا چاہئے۔"

اس نے ایک طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا۔ "میرے سے زبان لڑاتی ہے؟"

پھر اس نے دوسرا طمانچہ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا، قمرالدین نے پیچھے سے آکر ہاتھ پکڑلیا۔ اس نے سر گھما کر بیٹے کو دیکھا۔ پہلے حیران ہوا پھر غصے سے بولا۔ "ابے چھوڑ میرا ہاتھ۔"

"میری اماں کو مت مارو۔"

"ماروں گا، تُو کیا کرلے گا۔؟"

"میں گیراج کا کام چھوڑ دوں گا۔"

"ابے کیا بولتا ہے۔ ہفتے میں تین سو روپے گیراج سے ملتے ہیں اور تُو کام چھوڑنے کی دھمکی دیتا ہے۔"

"میں کام نہیں چھوڑوں گا۔ اماں کو مت مارو۔"

جانو نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا پھر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ بیٹا قد میں اس کے کاندھے تک پہنچ گیا تھا۔ آمنہ چاہتی تھی بچے اسکول جایا کریں لیکن جانو نے قمرالدین کو دس برس کی عمر سے گیراج میں گاڑیوں کا کام سیکھنے پر لگا دیا تھا۔ دوسرے بیٹے

امیرالدین کو ایک بجلی مستری کا شاگرد بنا دیا تھا۔ اب قمرالدین ہر ماہ بارہ سو روپے اور امیرالدین پانچ سو روپے لایا کرتا تھا۔ باقی دو بیٹے چھ برس اور چار برس کے تھے۔ آمنہ انہیں پڑھانا چاہتی تھی۔ جانو انہیں اسکول نہیں جانے دیتا تھا۔ گھر میں ماں کے پاس پڑھنا چاہتے تو وہ کتابیں اٹھا کر پھینک دیا کرتا تھا۔

قمرالدین کے بچپن سے یہ جھگڑا چلتا آرہا تھا۔ آج جانو فخر سے کہتا تھا۔ "دیکھ میری عقل سے بیٹے سترہ سو روپے لا رہے ہیں۔ اگر یہ آمدنی نہ ہوتی تو بڑھتی ہوئی مہنگائی میں بھوکے مرجاتے۔"

آمنہ نے کہا۔ "ہنر اچھی چیز ہے لیکن علم بھی ضروری ہے۔ انہیں اتنا پڑھ لینے دو کہ یہ کم از کم اپنا اور اپنے ماں باپ کا نام اردو انگریزی میں لکھ سکیں۔"

جانو نے انہیں گھر میں ماں کے پاس پڑھنے کی اجازت دے دی تھی لیکن اب قمرالدین کو اپنے کاندھے کے برابر دیکھ کر یہ اندیشہ ہوا کہ بیٹے نے کام چھوڑ دیا یا گھر سے بھاگ کر کہیں چلا گیا تو خود کما کر پیٹ بھرلے گا لیکن گھر آنے والی خاصی رقم ڈوب جائے گی۔ اس لئے وہ اس کی ماں پر ہاتھ اٹھانے سے باز آگیا اور یہ سوچ لیا کہ آئندہ بڑا بیٹا گھر میں نہیں ہوا کرے گا تب آمنہ کی پٹائی کیا کرے گا۔ ایک ہفتے بعد وہ ڈیوٹی سے آرہا تھا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی اس نے آمنہ کو دیکھا۔ وہ پڑوسی فاروق بٹ کے گھر سے نکل کر اپنے گھر جا رہی تھی۔ اس کی کھوپڑی میں یہ بات آئی کہ وہ روز پڑوسی کے ہاں جاتی ہے اور اس کے ڈیوٹی سے آنے سے پہلے گھر آجاتی ہے۔ آج اسے دیر ہو گئی تو چوری پکڑی گئی ہے۔

وہ گلی سے ہی پاؤں پٹختا ہوا گھر میں آیا۔ پھر دہاڑتے ہوئے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے بولا۔ "ذلیل عورت! تُو کہاں گئی تھی؟"

اس کا ارادہ تھا کہ یہ سوال کرتے ہی پٹائی شروع کر دے گا لیکن قمرالدین کو دیکھتے ہی گڑبڑا گیا۔ بیٹا بستر پر لیٹا تھا۔ آمنہ اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے بولی۔ "آتے ہی لال پیلے کیوں ہو رہے ہو۔ پڑوس میں یہ وِکس لینے گئی تھی۔ قمرالدین کو زکام ہو گیا ہے۔"

"میں نے منع کیا تھا کہ فاروق بٹ کے گھر نہ جانا۔"

وہ بولی۔ "اس گھر میں ایک فاروق بٹ نہیں رہتا ہے، اس کی تین بہنیں اور ماں باپ بھی ہیں۔ گھر کا مالک فاروق کا باپ ہے۔ تم خواہ مخواہ فاروق کا نام کیوں لیتے ہو۔"

"میرے سے بحث مت کرو۔ وہاں جاؤ گی تو میں ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

قمرالدین نے کہا۔ ”ابا! فاروق بھائی کے گھر والے بہت اچھے ہیں۔ بڑی محبت سے ہمیں اپنے گھر بلاتے ہیں۔ تم منع کیوں کرتے ہو؟“

”ابے تو بیچ میں مت بول۔ ابھی تو نہ ہوتا تو اس کی ہڈیاں توڑ دیتا۔“

”اچھا میں نہ رہوں تو تم اماں کو مارو گے؟ کیا مجھے بعد میں معلوم نہیں ہو گا؟“

”معلوم ہو گا تو کیا میرے سے لڑائی کرے گا۔ اور خبردار! کام چھوڑنے کی دھمکی نہ دینا۔ میں تیرے سے ڈر کے نہیں رہوں گا! تو میرا باپ نہیں ہے میں تیرا باپ ہوں۔“

”ابا! میں بچپن سے تمہارا غصہ دیکھتا آیا ہوں۔ اب تو ذرا بدل جاؤ۔ غصہ کم کرو۔ پڑوسی بہت اچھے ہیں۔ کیا تمہیں اس لئے غصہ آرہا ہے کہ اماں میرے لئے زکام کی دوا لائی ہیں؟“

”ابے کیوں الٹی بات کرتا ہے۔ میں سوبات کی ایک بات بولتا ہوں۔ تیری اماں فاروق بٹ کے گھر نہیں جائے گی۔“

آمنہ نے کہا۔ ”مرغے کی وہی ایک ٹانگ۔ وہ گھر محمود بٹ کا ہے اور فاروق بٹ دو دن ہو گئے پنڈی گیا ہے۔“

اس نے کھسیا کر ایک بار بیٹے کو پھر ایک بار آمنہ کو دیکھا۔ اب کہنے یا اعتراض کرنے کے لئے کوئی بات نہیں رہی تھی۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

آمنہ کو ایک بیٹے کا سہارا مل گیا تھا۔ وہ جانو کے ظلم وستم سے قدرے محفوظ ہو گئی تھی۔ چند برسوں میں دوسرا بیٹا بھی اس کا دوسرا بازو بننے والا تھا۔ جانو اب تک خواہ مخواہ بیوی کے کردار پر شبہ کرتا آیا تھا۔ فاروق کے سلسلے میں وہ بے تکی باتیں کر رہا تھا لیکن آمنہ محسوس کر رہی تھی کہ جانو نے کچھ زیادہ ہی فاروق کو اس کے حواس پر سوار کر دیا ہے۔ وہ اکثر تصور میں اس خوبرو جوان کو دیکھنے لگتی تھی پھر چونک کر سوچتی تھی‘ وہ خیالوں میں کیوں آنے لگا ہے؟

وہ شعوری طور پر یقین سے کہہ سکتی تھی کہ اس کے دل میں چور نہیں ہے۔ ہر دل میں تھوڑا بہت رومانس کا شوق ہوتا ہے۔ کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو ہوتی ہے لیکن جانو نے اس کی زندگی میں آکر تمام آرزوؤں کی دھجیاں اُڑا دی تھیں۔ جانو سے اسے محبت تھی مگر عشق نہیں تھا۔ یہ عشق کیا ہوتا ہے‘ وہ بھول چکی تھی۔ وہ پھر ماں بننے والی تھی۔ چار بیٹے ہو گئے تھے اب ایک بیٹی کی آرزو تھی۔ وہ دن رات ایک خوبصورت سی گڑیا جیسی بیٹی کو جبراً اپنے تصور میں لاتی تھی۔ مگر عجیب بات تھی کہ تصور میں چپ چاپ فاروق چلا آتا تھا۔ زچگی سے کچھ روز پہلے اس نے خواب میں بھی اسے دیکھا اور ایسے

دیکھا کہ فاروق سمٹ کر نوزائیدہ بچہ بن گیا تھا اور وہ اسے گود میں لئے آنچل میں چھپا کر دودھ پلا رہی تھی۔

کچھ روز بعد اس نے اپنی خواہش کے مطابق ایک بیٹی کو جنم دیا۔ بیٹی بہت خوب صورت تھی۔ چاند کا ٹکڑا تھی۔ گورے گورے مکھڑے پر سیب اور انار دانوں کی سرخی جھلک رہی تھی۔ زچہ اور بچہ کے پاس محلے کی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک بوڑھی نے آواز دی۔ ”ارے جانو! باہر کیا کھڑا ہے۔ ذرا آکے دیکھا۔ آج تیرے گھر میں رونق آئی ہے۔“

جانو اپنے چھوٹے بیٹے فخرالدین کو گود میں لئے کمرے میں آیا۔ آمنہ منجی پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ منجی کے پاس بیٹھ گیا۔ بوڑھی چاچی نے بچی کو اٹھا کر اس کے ہاتھوں میں دیا۔ اس نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر چوم لیا۔ اسی وقت ننھے فخرالدین نے پوچھا۔ ”یہ ہماری منی ہے؟“

وہ بولا۔ ”ہاں بیٹے! یہ ہماری منی ہے۔“

وہ معصومیت سے بولا۔ ”مگر یہ تو فاروق بھائی کے جیسی ہے۔ ہمارے جیسی نہیں ہے۔“

جانو کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ اس نے فوراً ہی بچی کو آمنہ کے پہلو میں ڈال دیا۔ کچھ عورتیں چونک کر بچی کو یوں دیکھنے لگیں جیسے پہلے غور سے نہ دیکھا ہو۔ کچھ عورتیں ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ فخرالدین نے منی کا صرف اجلا رنگ دیکھ کر معصومیت سے ایک بات کہہ دی تھی۔ معصوم بچہ فرشتہ ہوتا ہے یہی بات دل کو لگ رہی تھی کہ فرشتہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

آمنہ پریشان ہو گئی تھی۔ ایک بچے نے اسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ بگڑی ہوئی بات بنانے کے لئے بولی۔ ”فخرالدین! میرے پاس آؤ بیٹے۔“

وہ ماں کے قریب آیا۔ اماں نے پوچھا۔ ”بیٹے! میں منی کی طرح گوری ہوں نا؟“

وہ سرہلا کر بولا۔ ”ہاں مگر ہم ابا کی طرح کالے ہیں۔“

وہ سمجھاتے ہوئے بولی۔ ”جیسے تم ابا کی طرح ہو ویسے ہی منی میری طرح ہے۔ کچھ بچے باپ کی طرح ہوتے ہیں کچھ ماں کے جیسے ہو جاتے ہیں۔“

وہ قائل کرنے والی باتیں کہہ رہی تھی مگر جانو وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ اس کی کھوپڑی میں شیطان چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ”آج تک آمنہ کی بے حیائی کا کوئی ثبوت نہیں تھا‘ آج قدرت نے وہ ثبوت مہیا کر دیا ہے۔“

وہ دوسرے کمرے میں آکر اپنا منہ کھول کر لمبی لمبی سانسیں چھوڑنے لگا۔ جیسے اندر آگ لگی ہو........... اور وہ دھواں باہر نکال رہا ہو لیکن دھواں نہیں نکل رہا تھا۔ اس کے اندر چکرا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا۔ "اب کیا کرنا ہو گا؟ کچھ تو کرنا ہی ہو گا گناہ کی یہ فصل میرے گھر میں نہیں پکے گی۔ آمنہ میرے کو الو بنا رہی تھی۔ میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔"

وہ مٹھیاں بھینچ رہا تھا اور غصے سے لرز رہا تھا۔ پھر وہ قمرالدین کی آواز سن کر پلٹا۔ دروازے پر قمرالدین اور امیرالدین کھڑے ہوئے تھے۔ قمرالدین پوچھ رہا تھا۔ "ابا! تم غصے میں ہو' بات کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "اپنی ماں کے پاس جا کر دیکھو' کشمیری بٹی پیدا کی ہے۔"

امیرالدین نے پوچھا۔ "کشمیری بٹی کیا ہوتی ہے؟"

"گوری گوری' لال لال انار دانے جیسی ہوتی ہے۔ جیسا وہ پڑوسی فاروق بٹ ہے۔"

قمرالدین نے کہا۔ "اگر ہماری منی بہن اتنی خوبصورت ہے تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ تم غصہ کیوں کر رہے ہو؟"

وہ حقارت سے ہاتھ ہلا کر بولا۔ "وہ میری بٹی نہیں ہے' میں اس کا باپ نہیں ہوں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو ابا؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں' تم چاروں بیٹے میرے ہو........... اور وہ فاروق جیسی ہے۔"

دونوں بیٹوں نے سوچتی ہوئی نظروں سے باپ کو دیکھا پھر پلٹ کر ماں کے پاس آئے۔ وہاں عورتوں کی بھیڑ کم ہو گئی تھی۔ دو عورتیں تھیں وہ آمنہ کے دونوں بیٹوں کو دیکھ کر جانے کے لئے اٹھ گئیں۔ وہاں سے جانے والیوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس گھر میں ایک طوفان اٹھنے والا ہے۔

ویسے طوفان باہر اٹھ رہا تھا۔ عورتوں کے پیٹ میں ننھے فخرالدین کی بات اٹکی ہوئی تھی۔ وہ اسے باہر نکالے بغیر رات کا کھانا نہیں کھا سکتی تھیں۔ وہ گھر جا رہی تھیں اور اپنے پیٹ سے نکلی ہوئی سرگوشیاں دوسرے کانوں میں پھونک رہی تھیں۔ محلے کی فضا ان کی سرگوشیوں سے دہک رہی تھی۔ صبح تک کوئی گھر ایسا نہ رہا جہاں آمنہ کی بیٹی اور فاروق بٹ کا تذکرہ نہ ہوا ہو۔ ماں نے دونوں بیٹوں کو سمجھا دیا تھا کہ وہ بے غیرتی سے ماں کے متعلق کوئی بات نہ سوچیں۔ اگر باپ سوچتا ہے تو وہ تمہاری ماں کو گالی دیتا ہے۔ اسے سمجھاؤ۔

شاید اسے عقل آجائے۔

بیٹوں نے آکر باپ سے کہا۔ "ابا! غصہ تھوک دو۔ ہماری ماں کی بے عزتی نہ کرو۔ وہ بدنام ہو گی تو ہم محلے میں سر اٹھا کر نہیں چل سکیں گے۔"

"تم سب میرے بیٹے ہو۔ میرے جیسے ہو۔ مگر وہ جو پیدا ہوئی ہے ہم میں سے نہیں ہے۔"

امیرالدین نے کہا۔ "اماں جیسی تو ہے۔"

"ابے تو کیوں نہ ہوا اماں جیسا؟ اور تیرے تینوں بھائی کیوں نہ ہوئے اماں جیسے؟ بڑا آیا اماں کا حمایتی۔ تیری عمر کیا ہوئی ہے کہ تو دور کی بات سمجھے گا؟"

قمرالدین نے کہا۔ "ہمیں دور کی بات نہ سمجھاؤ۔ اماں کی ایک بات تمہاری سو باتوں کا جواب ہے اور وہ یہ کہ تم سوچے سمجھے بغیر الٹی بات کرو گے تو ہمارے لئے ماں کی گالی ہو گی اور یہ گالی ہم اپنے باپ کی زبان سے بھی نہیں سنیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ امیرالدین کے ساتھ چلا گیا۔ جانو تھوڑی دیر تک خالی دروازے کو تکتا رہا۔ یہ اور غصہ دلانے والی بات تھی کہ وہ باپ کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ ماں کی حمایت کر رہے تھے۔

اس نے خود کو سمجھایا۔ ابھی بیٹوں کی عمر ہی کیا ہے۔ وہ ماں کی محبت میں اسے پارسا سمجھ رہے ہیں۔ جب یہ عمر کے ساتھ ساتھ غیرت مند ہو جائیں گے تو ماں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

اس نے سوچا۔ "وہ جب غیرت مند ہوں گے تب ہوں گے۔ ابھی تو میری غیرت اسے زندہ نہیں چھوڑنا چاہتی ہے لیکن اسے بے حیائی کی سزا کیسے دوں؟ میرے سامنے بیٹے دیوار بن گئے ہیں۔ وہ آمنہ کو گھر سے نکالنے بھی نہیں دیں گے۔ میں جبر کروں گا تو وہ اس کے ساتھ چلے جائیں گے۔"

ایک ہی بات سمجھ میں آرہی تھی کہ پہلے بیٹوں کو ماں کی بے حیائی کا یقین دلانا چاہئے۔ محلے کے دو چار بزرگ ان کمبختوں کو سمجھائیں گے تو شاید ان کی سمجھ میں بات آجائے۔

وہ سامنے والی چاچی کے دروازے پر آیا۔ دستک کی آواز سن کر چاچا نے دروازہ کھولا۔ اسے اندر آکر بیٹھنے کو کہا۔ چاچی نے پوچھا۔ "خیریت تو ہے۔ زچہ بچہ ٹھیک ہے نا؟"

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہی ہوں گے۔ تمہارے سامنے ایک بار ماں

بیٹی کو دیکھا تھا پھر اس کے کمرے میں نہیں گیا۔ پتا نہیں میرے اندر کیا ہو رہا ہے۔"

چاچی سمجھ گئی۔ اس سے بولی۔ "کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ زیادہ نہ سوچ۔ آرام سے بیٹھ' میں چائے لاتی ہوں۔"

وہ بہو کو چائے کے لئے کہہ کر پچھلے آنگن میں گئی پھر منجی پر چڑھ کر اپنی پڑوسن کو راز داری سے مخاطب کیا۔ آہستگی سے بولی۔ "جانو آیا ہے۔ سامنے صحن میں بیٹھا ہے۔ اندر کی بات بولنا چاہتا ہے مگر بول نہیں پا رہا ہے۔ میں اسے تسلی دینے جا رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ منجی سے اتر گئی۔ دوسری طرف کے پڑوس میں جھانکنے کے لئے ایک لکڑی کی چوکی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے چوکی پر چڑھ کر دوسری پڑوسن کو بھی راز داری سے بتایا کہ جانو آیا ہے اندر سے ٹوٹا ہوا ہے اور وہ اسے تسلی دینے جا رہی ہے۔

اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے اتنی تیزی سے خبریں نشر نہیں ہوتیں جتنی تیزی سے پڑوسنیں ایک دوسری تک سنسنی خیز خبریں پہنچا دیتی ہیں۔ بہو کے چائے تیار کرنے تک چاچی کے دائیں بائیں پڑوسنوں کے ہاں کئی پڑوسنیں پہنچ گئی تھیں اور دیوار سے کان لگا کر جانو اور چاچی کی باتیں سن رہی تھیں۔

چاچی کہہ رہی تھی۔ "ابھی چائے نہ پینا۔ پہلے یہ مٹھائی اور نمک پارے کھا لے۔ پتا نہیں صبح سے کچھ کھایا ہے یا نہیں۔"

وہ بولا۔ "میرے حلق سے کچھ نہیں اتر رہا ہے۔ میں نہیں کھاؤں گا۔"

"ارے ایسی کیا قیامت آ گئی ہے۔ کچھ نہیں کھانے کا مطلب ہے تجھے فکر کھا رہی ہے۔ میں تیری اماں کی جگہ ہوں۔ مجھے بتا' فکر کی بات کیا ہے؟"

"میرے سے پوچھتی ہو چاچی؟ کیا تم نے فخرالدین کی بات نہیں سنی تھی؟"

"ارے وہ تو نادان بچہ ہے۔"

"تم تو نادان نہیں ہو چاچی؟"

"اتنی رات کو میری زبان سے کیا سننے آیا ہے؟"

"میرے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔ قمرالدین اور امیرالدین کو سناؤ جو سچ ہے۔ وہ کمبخت میرا خون ہیں مگر ماں کے خلاف میری زبان سے بھی کچھ سننے کو تیار نہیں ہیں۔"

"جب تیری نہیں سنتے تو میری کیا سنیں گے؟ میری ایک بات مان لو۔ جو ہو گیا' اس پر مٹی ڈال دو۔ پندرہ برس کے بعد بیٹی ہوئی ہے اس قبول کر لے۔"

"واہ چاچی! ماں بھی بنتی ہو اور میرے کو بے غیرت بن جانے کو بھی کہتی ہو۔"

"تجھے بیٹا سمجھ کے تیری بھلائی کے لئے کہتی ہوں۔ قمرالدین تیرے برابر اونچا ہو گیا

ہے۔ امیرالدین بھی جوان ہو رہا ہے اور جوان بیٹے پکے ثبوت کے بغیر ماں کے خلاف کچھ نہیں سنیں گے۔ جو سنائے گا اس سے لڑ پڑیں گے۔ اسے قتل کر دیں گے۔ تُو کیا چاہتا ہے میں سچ بول کر ان کے ہاتھوں قتل ہو جاؤں!"

"چاچی' اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا کہ وہ میرے اور میرے بیٹوں جیسی نہیں ہے۔ کیا تم بھی یہی کہو گی کہ وہ ماں جیسی ہے؟"

"میں کیا دنیا کہے گی اور دنیا کو اندر کی بات معلوم نہیں ہوتی۔ گناہ اسے کہتے ہیں' جو ظاہر ہو جائے اور جو ظاہر نہ ہو وہ چالاکی ہوتی ہے۔ تُو دیواروں سے سر ٹکراتا رہ جائے گا لیکن چالاکی کا پول نہیں کھول سکے گا۔"

"تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے۔ مگر میں بیٹی کو کیسے برداشت کروں۔؟"

"اب میں تجھے کیسے سمجھاؤں۔ تُو ایسے سمجھ لے کہ ہم سب اپنے اپنے گھر میں صفائی اور پاکیزگی رکھتے ہیں مگر سب کے گھر میں ایک چھوٹی سی چار دیواری اور دروازہ ہوتا ہے۔ اس چار دیواری میں ہم اپنی غلاظت پھینکتے ہیں اور صاف ستھرے گھر میں اس غلیظ چار دیواری کو برداشت کرتے ہیں۔ اسی طرح غلیظ رشتے کو برداشت کر لے۔"

جانو ناگواری سے کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔ چاچی نے پلیٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "عقل سے کام لینے کے لئے کھانا ضروری ہے۔ یہ لے' انکار نہ کر۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں سے جانے لگا۔ چاچا نے کہا۔ "جانو! میں اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا اور تُو میری کچھ سنے بغیر جا رہا ہے۔"

وہ دروازے کے پاس رک کر بولا۔ "چاچا! تم بھی بولو۔ سن لیتا ہوں۔"

"تُو اپنی چاچی کو دنیا کی سب سے عقلمند عورت سمجھ کر آ رہا ہے۔ اس عقل سے خالی عورت کے ساتھ میں نے آدھی صدی گزاری ہے۔"

چاچی نے اپنے میاں کی طرف تنبیہہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہا۔ "اے جی! خبردار' اپنی زہریلی زبان سے میرے بارے میں الٹی سیدھی بات نہ کرنا۔"

"میں سیدھی بات کہہ رہا ہوں۔ تم جانو سے کہہ سکتی تھیں کہ آمنہ ایک پارسا اور وفادار بیوی ہے۔ ثبوت کے بغیر کسی کی پارسائی پر کیچڑ نہیں اچھالنا چاہئے۔ تم ایک طرف یہ کہتی ہو کہ گناہ اسے کہتے ہیں جو ظاہر ہو جائے۔ دوسری طرف ڈھکے چھپے الفاظ میں آمنہ کو گناہگار کہہ رہی ہو۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟ کیوں اس نیک بخت کو الزام دے رہی ہو؟ کیا گناہ ظاہر ہو گیا ہے؟"

"میں تو جانو کو یہی سمجھا رہی ہوں کہ وہ بیٹی کو قبول کر لے۔"

چاچا نے کہا۔ "سمجھانے کے لئے گھر کے ٹائلٹ کی مثال دے رہی ہو کہ جانو ایک غلیظ رشتے کو برداشت کرلے۔"

"دیکھو جی! میں سچی اور کھری بات بولتی ہوں۔ آمنہ عورت ہے اور میں عورت ہو کر اس کا گھر برباد نہیں کروں گی۔ مگر ٹائلٹ کو ٹائلٹ ہی کہوں گی۔ اگر جانو ٹائلٹ کو خواب گاہ سمجھ کر وہاں سونا چاہتا ہے تو شوق سے سوئے۔ میں اسے روکنے ٹوکنے تو نہیں جا رہی ہوں۔"

چاچی بڑی چالاکی سے یہ کہہ گئی کہ جانو ایک غلیظ عورت کے ساتھ سونا چاہتا ہے تو شوق سے سو جائے اور یہ دعوئی بھی کیا کہ ایک عورت دوسری عورت کا گھر برباد نہیں کرتی ہے۔ چاچا نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا' جانو نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "آپ میرے لئے آپس میں جھگڑا نہ کریں۔ میرے کو خود ہی اپنی بدقسمتی سے لڑنا ہو گا۔ میں جا رہا ہوں' سلام علیکم۔"

وہ وہاں سے نکل کر اپنے گھر کے صحن میں آیا۔ امیرالدین نے اس کے لئے ایک منجی پر بستر بچھاتے ہوئے پوچھا۔ "روٹی لاؤں؟"

"زہر لے آؤ۔"

"بات کرو تو تم کاٹنے کو دوڑتے ہو۔"

"ابے کیا میں کاٹ رہا ہوں۔ تُو میرے کو کتا بول رہا ہے؟"

"ابا! ہم نے کبھی تم سے بدتمیزی نہیں کی۔ بات کو سمجھا کرو۔ صرف کتا نہیں کاٹتا ہے۔ غصہ بھی کاٹتا ہے اور کتے سے زیادہ کاٹتا ہے۔"

"کتے کے بچے! کتا کتا بولتا بھی جا رہا ہے پھر کہتا ہے کتا نہیں بول رہا ہوں۔ میرا دماغ گرم ہے۔ میں کسی کا خون کر دوں گا۔ چل بھاگ یہاں سے۔"

امیرالدین ماں کے کمرے میں چلا گیا۔ جانو بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کی بھوک مرگئی تھی' نیند بھی اُڑ گئی تھی۔ وہ صبح کی اذان تک کروٹیں بدلتا رہا اور کبھی اٹھ کر ٹہلتا رہا۔ پھر مسجد کے پاس آکر چبوترے پر بیٹھ گیا۔ نماز کے بعد مولوی صاحب باہر آئے تو اس نے سلام کیا پھر ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "میرے کو ایک مسئلہ پوچھنا ہے۔"

"کیا مسئلہ ہے؟"

"بیوی گناہ گار ہو تو خاوند کو کیا کرنا چاہئے؟"

"کوئی گمراہ ہو تو اسے راہِ راست پر لانے کی پوری کوشش کرنا چاہئے۔ پھر بھی گمراہی سے باز نہ آئے تو اس سے تعلق ختم کر دینا چاہئے۔"

"لیکن یہ کیسے معلوم ہو گا کہ عورت پہلی بار گمراہ ہوئی ہے یا بہت پہلے سے دھوکا دیتی آ رہی ہے۔"

"یہ معلوم کرنا ضروری ہے۔ تصدیق کئے بغیر کسی کو الزام دینا خلافِ عقل ہے۔ کیا یہ تمہاری گھر والی کا مسئلہ ہے؟"

"ہاں جی۔ میرے کو اس کی بے حیائی کا سو فیصد یقین ہے کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

"ثبوت کے بغیر سو فیصد یقین کیسے ہو گیا؟ یہ تم پولیس والوں کی عادت ہے۔ کسی پر چور ہونے کا یقین کر کے پکڑ لیتے ہو پھر ثبوت حاصل کرنے کے لئے اسے ڈنڈے مارتے ہو۔ میرا نیک مشورہ ہے کہ اپنے گھر کے اندر پولیس والے نہ بنو۔ ورنہ ایک بے گناہ عورت مفت میں بدنام ہو گی۔ اس کی بدنامی سے تمہاری تمام اولاد بھی دوسروں کی نظروں میں مشکوک ہو جائے گی۔ ذرا سوچو اور سمجھو' تم صرف بیوی کو نہیں اپنی اولاد کو بھی گالیاں دے رہے ہو۔"

مولوی صاحب کی اس بات نے اثر کیا۔ پہلے اس نے اس پہلو سے نہیں سوچا تھا کہ آمنہ کو بدچلن کہے گا تو وہ چاروں بیٹے بھی بدچلنی کا نتیجہ کہلائیں گے۔ اس نے گھر آکر غسل کیا۔ دماغ کچھ ہلکا سا ہوا۔ پہلے جیسا بوجھ نہیں رہا۔ نیند بھی آنے لگی۔ وہ دوسرے کمرے میں آکر ایک چادر اوڑھ کر سو گیا۔

نیند اس لیے آگئی کہ وہ چاروں بیٹوں کو بدنامی سے بچانے کا فیصلہ کر چکا تھا اور انہیں بدنامی سے بچانے کے لئے لازمی تھا کہ وہ اپنی زبان سے آمنہ کو بے حیائی کا الزام نہ دیتا۔

اس کا آدھا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ باقی آدھا مسئلہ یہ تھا کہ آمنہ کو الزام نہ دینے کے باوجود وہ اس کی نظروں میں بے حیا تھی۔ صبح قمرالدین گیراج کی طرف جا رہا تھا۔ ایک بڑے میاں اپنے مکان کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے' انہوں نے کہا۔ "قمرالدین! بہن کی خوشی میں مٹھائی نہیں کھلائے گا۔"

"کھلاؤں گا خالو! ضرور کھلاؤں گا۔"

"بیٹے! سنا ہے تیری بہن بالکل کشمیری لگتی ہے۔"

قمرالدین کو ایسا لگا جیسے بڑے میاں طعنہ دے رہے ہوں۔ اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "کشمیری کا مطلب کیا ہوا؟"

"کشمیری کا مطلب ہے گوری گوری لال لال رخساروں والی بچی۔"

"تو ایسے بولو نا کہ وہ گوری ہے' اسے کشمیری کیوں کہتے ہو؟"

"بیٹا! ایک میں ہی تو نہیں کہہ رہا ہوں۔ محلے میں سب ہی کہہ رہے کہ تمہارے ہاں کشمیرن پیدا ہوئی ہے۔ اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ گوری چٹی لڑکیوں کو مثال کے طور پر کشمیرن کہا جاتا ہے۔"

بڑے میاں نے قمرالدین کو لاجواب کر دیا۔ کشمیری حسن کی مثال سارا زمانہ دیتا ہے اور جب نوزائیدہ بہن اس مثال کے مطابق تھی تو وہ کہنے والوں پر اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔ "خالو! میری بہن کا نام صنم آراء رکھا ہے۔ آپ اسے مثالی نام سے نہ پکاریں۔"

یہ کہتے ہی وہ کوئی جواب سنے بغیر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ یہ بات اس کے دماغ میں پتھر کی طرح لگ رہی تھی کہ فاروق بٹ کشمیری ہے اور محلے والے نوزائیدہ بہن کو کشمیرن کہتے ہیں۔

جیسے جیسے دن گزرنے لگے' ان باپ بیٹوں کے اندر لاوا پکنے لگا۔ محلے کی عورتیں اور مرد ان کے سامنے بچی کو صنم آراء کہتے تھے اور پیٹھ پیچھے اسے کشمیرن کہہ کر اپنے ضمیر کو سمجھاتے تھے کہ غلط نہیں کہہ رہے ہیں' جو سچ ہے وہی زبان پر آتا ہے۔

یہ بات فاروق بٹ کو بھی معلوم تھی کہ وہ مفت میں بدنام ہو رہا ہے۔ بدنام کرنے والا کوئی ایک ہوتا تو وہ اس سے لڑ پڑتا۔ لوگ منہ پر نہیں بولتے تھے اور جو بولتے تھے وہ نظر نہیں آتے تھے۔ کیچڑ اچھالنے کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ بات کچھ ہوتی تھی اور اس بات کے پیچھے مطلب کچھ اور ہوتا تھا۔

دو برس گزر گئے' وہ گھر سے باہر آ کر گلی میں کھیلنے لگی تھی۔ فاروق بٹ نے پہلی بار اس ننھی سی گڑیا کو دیکھا تو اس پر بڑا پیار آیا لیکن وہ معصوم بچی کو مخاطب کر کے بدنامی کو اور ہوا نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس سے منہ پھیر کر چلا گیا۔ جب سے وہ پیدا ہوئی تھی' پڑوس والوں سے تعلقات ختم ہو گئے تھے۔ آمنہ فاروق سے پردہ کرتی تھی۔ اس کے گھر نہیں جاتی تھی اور نہ فاروق کے گھر والے آتے تھے۔ بعض اوقات آپس میں کوئی دشمنی نہیں ہوتی اس کے باوجود سلام کلام سماجی اور مذہبی رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔

صنم آراء دس برس کی ہوئی تو بلدیاتی انتخابات ہو رہے تھے۔ فاروق بٹ آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑ رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں کئی امیدوار تھے۔ فاروق بٹ کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔ اس کے بعد دوسرے امیدوار چوہدری امانت علی کے جیتنے کا چانس تھا۔ چوہدری کامیاب ہونے کے لئے ایڑھی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ اس کے حواری نے کہا۔ "جناب! اگر میں فاروق کی پوزیشن ایک دم نیچے گرا دوں تو کیا انعام

دو گے؟"

"تُو جو مانگے گا وہی دوں گا۔"

"مجھے پچیس ہزار روپے کی سخت ضرورت ہے۔"

"مل جائیں گے۔ پہلے کام دکھا۔"

"کل ہی دیکھ لو جناب! میرے پاس ترپ چال ہے۔"

دوسرے دن علاقے کے لوگوں نے دیکھا' جہاں جہاں دیواروں پر فاروق کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس نام کے نیچے یا اوپر لکھا ہوا تھا۔ "صنم آراء کا کنوارا باپ۔"

فاروق بٹ کی تصویر والے پوسٹروں پر راتوں رات مارکر قلم سے "کنوارا باپ" لکھ دیا گیا تھا۔

فاروق بٹ کو معلوم ہوا تو اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ بدنامی جو محلے کی ایک دو گلیوں تک تھی' اب وہ پوسٹروں اور نوشتۂ دیوار کے ذریعے پورے علاقے میں پھیل گئی تھی۔ فاروق کے حمایتی چوہدری کے حواریوں کی پٹائی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس نے حمایتیوں کو ایسا کرنے سے باز رکھا۔ انہیں سمجھایا۔ "ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے کہ انہوں نے مجھے کنوارا باپ لکھا ہے۔ خواہ مخواہ پولیس کے چکر میں پڑو گے۔ ذرا صبر کرو۔"

قمرالدین چوبیس برس کا اور امیرالدین تئیس برس کا ہو گیا تھا۔ دوسرے بھائی جوان ہو رہے تھے۔ جب انہوں نے پوسٹروں اور دیواروں پر اپنی بہن کا نام پڑھا تو غصے سے پاگل ہو گئے۔ لاٹھیاں لے کر گھر سے نکل پڑے۔ وہ فاروق بٹ کے پوسٹروں کو نوچ رہے تھے اور دیواروں پر سے بہن کا نام مٹاتے ہوئے للکار رہے تھے۔ "کس حرامزادے نے ایسی حرکت کی ہے؟ اگر لکھنے والے نے ماں کا دودھ پیا ہے تو سامنے آئے۔"

کسی کو سامنے آنا ہوتا تو وہ چھپ کر ایسا نہ کرتا۔ ایسا کرنے والوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ دیواروں اور پوسٹروں سے صنم آراء کا نام مٹا دیا جائے گا۔ اس لئے انہوں نے چھوٹے چھوٹے پمفلٹ شائع کرائے تھے۔ انہیں ایک ہی رات میں بند دکانوں کے دروازوں پر اور اس حلقے کے تمام گھروں میں ڈالتے گئے تھے۔ دوسری صبح پھر صنم آراء کی ماں اور فاروق بٹ پورے علاقے میں گفتگو کا مرکز بن گئے۔ جانو اور اس کے چاروں بیٹے جہاں جاتے تھے' وہاں آمنہ کی بے حیائی کی گونج سنتے تھے۔

جانو نے بیٹوں سے کہا۔ "گناہ کتنا ہی چھپ کر کیا جائے وہ ایک دن اندھیرے سے نکل کر روشنی میں بولتا ہے۔"

چھوٹے بیٹے فخرالدین نے کہا۔ "ابا! ایسی بات نہ کرو۔"

"اے یہ کیوں نہ کروں؟ تیرے یہ بڑے بھائی بھی ماں کی حمایت میں بولتے تھے۔ اب نتیجہ دیکھ۔ لوگ ہمارے منہ پر تھوک رہے ہیں۔"

قمرالدین نے کہا۔ "وہ بزدل اور بے غیرت ہیں۔ پیٹھ پیچھے تھوکتے ہیں' منہ پر آکر بولیں تو میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

امیرالدین نے آمنہ سے پوچھا۔ "اماں! تُو اتنی گوری گوری کیوں ہے؟ ہمارے جیسی کیوں نہیں ہے؟ صنم آراء کو ہمارے جیسی پیدا کیوں نہ کیا؟"

تیسرے بیٹے ضمیرالدین نے صنم آراء کی پیٹھ پر ایک ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "یہ پیدا نہ ہوتی تو کوئی سالا ہمیں بدنام نہ کرتا۔ اب یہ پیدا ہونے کے بعد مر بھی جائے گی تو بدنامی زندہ ہی رہے گی۔"

بڑے بھائی نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "بہن پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

"شرم تو گھر سے نکلتے ہوئے آتی ہے۔ جہاں جاؤ اسی کا چرچا سنائی دیتا ہے۔ لوگوں کی نظریں ہمارے بدن پر چبھتی ہوئی سی لگ رہی ہیں۔"

صنم آراء اپنی ماں سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ ماں کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ وہ بولی۔ "غلطی تمہارے باپ کی ہے۔ جب یہ میرا گورا رنگ برداشت نہیں کر سکتا تھا تو شادی کیوں کی؟ اگر یہ عورت کو بے حیا اور بدچلن سمجھتا ہے تو پھر عورت کو بیاہ کر لانے کی کیا ضرورت تھی۔"

جانو نے کہا۔ "اے' میرے کو الزام دیتی ہے؟"

"یہ الزام نہیں سچائی ہے۔ اگر صنم آراء کی پیدائش پر تم شبہ نہ کرتے اور میرے سامنے ڈھال بن کر رہتے تو دوسروں کو ہم پر کیچڑ اچھالنے کی جرأت نہ ہوتی۔ تم نے دوسروں کو بولنے کا موقع دیا ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ میں کسی کے گھر میں جاکر نہیں بولتا تھا کہ وہ تم پر آکر تھوکے۔"

"کیا تم نے مسجد کے پیش امام صاحب سے یہ نہیں کہا تھا کہ میں بدچلن ہوں؟ انکار کرو گے تو ابھی پیش امام صاحب کو بلاؤں گی۔ وہ خدا سے ڈرتے ہیں۔ جھوٹ نہیں بولیں گے۔ تمہارے منہ پر بھی سچ کہیں گے۔"

وہ ہاتھ نچا کر بولا۔ "ہاں ہاں' میں مولوی صاحب کو بولا تھا۔ تُو میرا کیا بگاڑ لے گی؟"

"میں کیا بگاڑوں گی' تم نے خود ہی اس گھر کو بگاڑ دیا ہے۔ آج تمہارے بیٹے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ کل صنم آراء جوان ہو گی تو لوگ اسے حرام کا سمجھ کر دیکھیں گے کیونکہ اپنے ہی باپ نے اسے جائز تسلیم نہیں کیا ہے۔"

وہ صنم آراء کی طرف سے منہ پھیر کر بولا۔ "میں تسلیم کرتا ہوں زیادہ بولے گی' تو تسلیم نہیں کروں گا۔"

"بس کرو ابا! تم نے کبھی اوپری دل سے بھی اسے بیٹی نہیں کہا۔ یہ بچی تھی تب اسے ایک بار بھی گود میں نہیں لیا۔"

دوسرے بیٹے نے باپ سے کہا۔ "جب یہ پیدا ہوئی تھی تو تم اس رات سامنے والی چاچی کے ہاں گئے تھے۔ وہاں تم نے ہماری ماں کے خلاف باتیں کیں۔ چاچا نے تمہیں سمجھایا تو تم مایوس ہو کر آ گئے۔ اڑوس پڑوس کی کتنی عورتوں نے تمہاری باتیں سنی تھیں۔"

جانو پاؤں پٹختا ہوا دروازے پر گیا پھر بولا۔ "تم سب ماں کے چمچے ہو۔ میری اولاد نہیں ہو۔ کمبختو! باپ کو برا سمجھتے ہو؟ اس باپ کو جو تمہارے لئے دن رات محنت کرتا رہا۔ تمہارے کو بچے سے جوان کیا۔ تمہارے لئے یہ گھر آباد کیا۔"

قمرالدین نے کہا۔ "اسے آباد کرنا کہتے ہیں؟ تم نے اس گھر میں ہٹلر بن کر سب کو تباہ کر دیا ہے۔ ہماری ماں نے اور ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے لیکن تمہاری حرکتوں کی وجہ سے ہم گناہ گاروں کی طرح منہ چھپا رہے ہیں۔"

جانو نے پوچھا۔ "اے' تم لوگوں کا کیا ارادہ ہے؟ کیا میرے سے جھگڑا کرو گے؟ کیا میرے کو پھانسی پہ چڑھاؤ گے؟"

"ہم ایسا نہیں کریں گے لیکن آج سے اس گھر میں تمہارا کوئی حکم نہیں چلے گا۔"

"کیسے نہیں چلے گا۔ یہ میرا گھر ہے۔"

"تمہارا گھر ہے تو پھر اکیلے رہو گے۔ ہم ماں اور بہن کو لے کر یہاں سے چلیں جائیں گے۔"

"ارے جاؤ۔ دھمکی کیا دیتے ہو۔ میں شادی سے پہلے بھی اکیلا تھا۔ آج بھی اکیلا رہ سکتا ہوں۔"

آمنہ نے کہا۔ "یہ دھمکی نہیں ہے۔ میں نے بیٹوں کو سمجھایا ہے کہ ہمیں یہ محلّہ چھوڑ دینا چاہئے۔ بیٹے جوان ہیں۔ خون میں گرمی ہے۔ غصہ برداشت نہیں کرتے ہیں۔ لاٹھیاں لے کر گھر سے نکل پڑتے ہیں۔ اگر ہمیں بدنام کرنے والا کوئی نظروں میں آگیا تو یہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ایک ایک بیٹا قاتل بن کر سزائے موت کو پہنچے گا تو میرے پاس کیا رہ جائے گا؟"

جانو دروازے پر اکڑوں بیٹھ گیا' سوچنے لگا۔ "میری عورت بہت دور تک سوچتی

ہے۔ میرے بیٹوں کی بھلائی کے لئے انہیں یہاں سے لے جانا چاہتی ہے۔ مگر سالی دشمن ہے۔ تمام بیٹوں کو اپنی طرف کرلیا ہے۔ یہ میرے سے دور جا کر ماں کے بہکانے میں آتے رہیں گے۔ میرے کو اور برا سمجھتے رہیں گے۔ یہاں میرے سامنے کم سے کم میرا لحاظ تو کرتے ہیں۔ کبھی اکڑتے ہیں تو کبھی فرمانبردار بھی بن جاتے ہیں۔"

وہ انکار میں ہاتھ ہلا کر بولا۔ "نہیں تم لوگ کہیں نہیں جاؤ گے۔ پورا محلہ ہمارا دشمن نہیں ہے۔ کوئی چھپ کر بدمعاشی کرتا ہے اور ہمارے کو بدنام کرتا ہے تو ہم اس کا پتا چلائیں گے۔ اس سے لڑائی جھگڑا نہیں کریں گے۔ میں پولیس والا ہوں۔ بدمعاشوں کا پتا چلتے ہی ان لوگوں کو کسی دوسرے کیس میں پھنسا دوں گا۔ ان کی ضمانت بھی نہیں ہونے دوں گا۔ مگر تم یہاں رہو گے۔"

امیرالدین نے کہا۔ "ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے۔ ہم وہی کریں گے' جو اماں کہتی ہیں۔"

وہ غصے سے بولا۔ "ارے تمہاری اماں کیا لاٹ گورنر ہے؟"

پھر اسے خیال آیا کہ گھر میں اس کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ گرمی دکھانے سے کام نہیں چلے گا۔ وہ آمنہ کو دیکھ کر نرمی سے بولا۔ "اری نیک بخت! کیوں میرے بیٹوں کو بہکاتی ہے۔ میری بات مان لے۔ میں پولیس والا ہوں' یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ چور اور گناہ گار منہ چھپا کر بھاگتے ہیں۔ جب تم گناہ گار نہیں ہو تو کیوں جاتی ہو۔ دنیا والے بولیں گے' قصور وار تھی اس لئے بچوں کے ساتھ کہیں منہ چھپانے چلی گئی اور جو منہ چھپانے والے دشمن ہیں میرے جوانمرد بیٹوں کو بزدل سمجھیں گے۔"

پہلی بار باپ کی یہ بات بیٹوں کے دل کو لگی۔ آمنہ نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "تمہاری ان باتوں میں وزن ہے۔ واقعی گناہ گار منہ چھپاتے ہیں۔ یہ دنیا والے الٹا ہی سمجھتے ہیں۔ میں بیٹوں کی بھلائی اور سلامتی کے لئے جانا چاہتی ہوں.......... لوگ کہیں گے' میں نے یہاں سے بھاگ کر گناہ گار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔"

قمرالدین نے کہا۔ "اماں! تم ابا کی بات مانتی ہو تو پھر ہم نہیں جائیں گے۔"

"میں تم لوگوں کی سلامتی کے لئے یہاں سے جا کر گناہ گار کہلانے کے لئے تیار ہوں۔ ہاں اگر تم سب میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ کسی سے لڑائی نہیں کرو گے' امن اور سلامتی سے رہو گے تو پھر ہم یہیں رہیں گے اور ایک نئے حوصلے سے حالات کا مقابلہ کریں گے۔"

جانو خوشی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک ایک بیٹے کو آمنہ کی طرف دھکا دیتے ہوئے

بولا۔ "ارے منہ کیا دیکھتے ہو۔ ماں کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ۔ میرے ساتھ رہو گے۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ آج سے میں ہٹلر نہیں بنوں گا۔ تمہارے کو اور تمہاری ماں کو کچھ نہیں بولوں گا اور.......... اور یہ صنم آراء میری بیٹی ہے۔"

اس نے پہلی بار بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ روتی ہوئی باپ سے لپٹ گئی۔ یہ منظر دیکھ کر بھائیوں کی آنکھیں بھی بھیگنے لگیں۔ انہوں نے ماں کے سر پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کیا کہ وہ امن اور سلامتی سے رہیں گے اور حالات کا مقابلہ کریں گے۔

☆=========☆=========☆

فاروق بٹ اپنے مخالف امیدوار امانت علی سے ملاقات کرنے آیا۔ چوہدری نے بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ "آؤ آؤ۔ ست بسم اللہ' بٹ صاحب' آپ میرے غریب خانے میں تشریف لائے۔ حکم کیا ہوتا' بندہ خود حاضر ہو جاتا۔"

فاروق بٹ نے اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "صاحب! پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے۔ اس لئے خود چل کر آیا ہوں۔"

"حکم کرو بٹ صاحب! ویسے بات کیا ہے؟"

"میں آپ کے حق میں بیٹھنا چاہتا ہوں۔ میں الیکشن نہیں لڑوں گا۔"

چوہدری نے اسے بے یقینی سے دیکھا پھر کہا۔ "آپ کی پوزیشن مجھ سے زیادہ مضبوط ہے۔ پھر آپ میرے حق میں بیٹھیں گے۔ اوبٹ صاحب' مخول نہ کریں۔"

"میں آپ کے پاس مذاق کرنے نہیں آیا ہوں۔ آج سے آپ جہاں جلسہ کریں گے میں وہاں اسٹیج پر آکر سب کے سامنے اعلان کروں گا کہ آپ عوام کے ووٹوں کے صحیح حقدار ہیں اس لئے میں آپ کے حق میں بیٹھ رہا ہوں۔"

"آپ میرے حق میں ہیں۔ میں بہت خوش ہوں لیکن آپ نے اچانک ہی ارادہ کیوں بدل دیا ہے؟ کیا وہ جو آپ کی بدنامی ہو رہی ہے اس لئے؟"

"بدنامی تو آپ کی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ دیکھئے۔"

فاروق بٹ نے ایک تصویر جیب سے نکال کر دی۔ اس تصویر میں چوہدری ایک جوان عورت کے ساتھ ایسی حالت میں تھا کہ اسے دیکھتے ہی وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ فاروق بٹ کو گھور کر بولا۔ "یہ.......... یہ کیا ہے؟"

"آرام سے بیٹھ جاؤ۔ یہ اس عورت کی تصویر ہے جس کا کروڑ پتی بھائی تمہیں الیکشن لڑنے کے لئے بھاری رقم دے رہا ہے۔ تم اتنے کمینے ہو کہ بھائی سے رقم لے رہے ہو اور درپردہ اس کی غیرت سے کھیل رہے ہو۔"

"تم .... تم کیسے جانتے ہو؟ اور یہ تصویر تمہیں کہاں سے ملی؟"

"جس فوٹوگرافر کو تم نے نیگیٹو رول ڈیولیپ کرنے اور پرنٹ کرنے کے لئے دیا تھا' وہ فوٹو گرافر میرے اسکول کے زمانے کا دوست ہے۔ دوسرے زاویوں سے بھی اتاری ہوئی تصویریں میرے پاس ہیں۔"

وہ پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔ "کہاں ہیں وہ تصویریں؟"

"میں ایسا اناڑی تو نہیں ہوں کہ تمام تصویریں لے آتا۔ وہ جہاں بھی ہیں' محفوظ ہیں۔ ان میں سے ایک بھی تصویر اس کروڑ پتی بھائی کے پاس پہنچ گئی تو اس کے حواری تمہیں گولی مار دیں گے اور میں نے ایک بھی تصویر کا پوسٹر چھاپ کر گلی کوچوں میں لگوا دیا تو الیکشن میں تمہاری امیدواری کا جنازہ نکل جائے گا۔"

وہ سرہلا کر بولا۔ "ہاں تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔"

"لیکن ابھی تک کچھ نہیں کیا ہے اور تم نے مجھ بے گناہ کو اور ایک فرشتہ صفت عورت کو بری طرح بدنام کیا ہے۔"

"مم.......... میں نے بدنام نہیں کیا ہے۔"

"جھوٹ بولو گے تو میں انتقام لینے پر آمادہ ہو جاؤں گا۔"

"نہیں بٹ صاحب! میری عزت رکھ لو۔ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ آپ جیسا کہیں گے' میں ویسے ہی اس غلطی کی تلافی کروں گا۔"

"چوہدری! میں نے بہت سوچا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گا تو زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ کروڑ پتی بھائی بدنامی پر پردہ ڈالنے کے لئے بہن کی شادی تم سے کر دے۔ پھر تو تمہاری لاٹری نکل آئے گی۔ یا وہ بھائی انتقام لینے کے لئے تم سے اپنے لاکھوں روپے وصول کرے۔ تمہیں طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے کنگال کر دے۔"

"ہاں' اس کی پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ وہ میرے خلاف کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"لیکن میں نے جو سوچا ہے وہ تمہارے جیسا کمینہ آدمی کبھی نہیں سوچ سکتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ آمنہ اور معصوم صنم آراء کس بری طرح بدنام ہو رہی ہیں۔ اس طرح ایک رئیس بھائی کی بہن بھی بدنام ہو جائے گی۔ ہمارے ملک میں ایسی گندی سیاست رواج پا رہی ہے کہ ہم اقتدار کی اونچی کرسی تک پہنچنے کے لیے ماؤں اور بہنوں کو ننگی گالیاں بنا رہے ہیں۔ میں اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر یہ الیکشن جیت سکتا ہوں لیکن میرے جیتنے سے اور اونچا منصب حاصل کرنے سے آمنہ اور صنم آراء کے دامن کا داغ نہیں دھلے گا۔ انسان بنو انسان اور انسانیت سے سوچو کہ ماں بیٹی پر جو کیچڑ اچھالی گئی ہے' وہ کیچڑ کیسے صاف کر سکتے ہو؟"

"بٹ صاحب! اللہ جانتا ہے۔ ابھی میرا دماغ کام کر رہا ہے۔ آپ جو حکم کریں گے'

میں وہی کروں گا۔"

"میری عقل کہتی ہے اگر میں الیکشن لڑوں گا اور تم میرے اسٹیج پر آکر اعلان کرو گے کہ میرے حق میں بیٹھ رہے ہو اور میں صنم آراء کا کنوارا باپ نہیں ہوں تو لوگ میرے سامنے ہارنے والے امیدوار کی باتوں کو دل سے تسلیم نہیں کریں گے۔ اگر تم الیکشن جیتنے کی پوزیشن میں آکر یہی بات کرو گے اور بعد میں چیئرمین بن کر بھی میری اور ماں بیٹی کی پارسائی کی قسم کھاتے رہو گے تو سب ہی ایک بڑے آدمی کی ہاں میں ہاں ملائیں گے۔"

"جی بٹ صاحب! آپ کی بات سمجھ میں آرہی ہے۔ میں اپنے تمام جلسوں میں کلام پاک ہاتھوں پر رکھ کر لوگوں کو آپ کی اور ماں بیٹی کی پارسائی کا یقین دلاؤں گا۔"

"چوہدری! ہم نے کلام پاک کے تقدس کو برقرار نہیں رکھا ہے۔ کتنے لوگ عدالت کے کٹہروں میں مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر سچ بولنے کا وعدہ کرتے ہیں اور جھوٹی گواہیاں دے کر چلے آتے ہیں۔ کلام پاک اس دنیا کی آخری آسمانی کتاب ہے۔ اسے مذاق نہ بنائیں۔ میں تمہارے جیسے دوغلے شخص کو عوام کے سامنے کلام پاک اٹھانے نہیں دوں گا۔"

"پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"تمہارا جو بیٹا آٹھویں جماعت میں ہے اس کی عمر کیا ہے؟"

"اٹھارہ برس۔"

"صنم آراء ابھی دس برس کی ہے۔ سات برس بعد شادی کی عمر ہو جائے گی۔ تم آج ہی شام کو اپنی بیوی کے ساتھ اس کے گھر جاؤ اور اپنے بیٹے کا رشتہ مانگو۔ اس معصوم لڑکی کے ماں باپ اور بھائیوں کو سمجھاؤ کہ وہ تمہاری بہو بنے گی تو یکلخت تمام بدنامیوں کے داغ دھل جائیں گے۔"

چوہدری منہ کھولے یوں بیٹھا تھا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن کہنے کے تمام حقوق سے محروم ہو چکا ہو۔ اب وہ صرف سن سکتا تھا اور سن کر عمل کر سکتا تھا۔ کسی بات پر انکار کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "میں آج ہی جاؤں گا لیکن انہوں نے بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کیا تو؟"

"تو میں تمہارا دشمن بن جاؤں گا۔ تمہاری نیک نامی اور الیکشن میں کامیابی کی ضمانت صرف ہونے والی بہو صنم آراء ہے۔"

اس نے سر جھکا لیا' فاروق بٹ نے کہا۔ "تم اپنے تمام جلسوں میں آمنہ اور صنم

آراء کی شرافت اور پاکیزگی کا دعویٰ کرتے ہوئے اعلان کرو گے کہ وہ عزت دار گھرانا ہے۔ اس لئے تم صنم آراء کو اپنی بہو بنانے والے ہو اور الیکشن سے پہلے اپنے بیٹے اور صنم آراء کی منگنی دھوم دھام سے کرو گے۔"

"ٹھیک ہے' میں ہر جلسے میں یہ اعلان کروں گا۔"

"ہو سکتا ہے کہ تم اسی طرح سیاست کے میدان میں دوڑتے دوڑتے کبھی اسمبلی میں پہنچ جاؤ۔ اونچی سے اونچی کرسی حاصل کرتے رہو' مگر یہ کبھی نہ بھولنا کہ تمہاری کمزوریاں ایک بینک کے لاکر میں رہیں گی۔ وہ لاکر میری موت کے بعد بھی کھل سکتا ہے۔ اور تمہاری عزت اور سیاسی وقار کی دھجیاں اُڑا سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ چوہدری نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "بیٹھیں بٹ صاحب! کچھ ٹھنڈا گرم پی کر جائیں۔"

"تم نے مجھے گرم کیا تھا' میں نے تمہیں ٹھنڈا کر دیا۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ باقی میں منگنی کا اعلان سننے کا منتظر رہوں گا۔"

وہ چوہدری کو بدنامی اور نیک نامی کے درمیان الجھا کر چلا گیا۔

☆=========☆=========☆

شام کے وقت محلے میں شور اٹھا کہ چوہدری امانت علی آرہے ہیں۔ لوگوں نے سوچا' ووٹ مانگنے آرہے ہیں۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ آیا تھا۔ جب اس نے جانو کے دروازے پر دستک دی تو لوگ حیران ہو کر سوالیہ نظروں سے ادھر دیکھنے لگے۔ گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عورتوں کو شام کی تازہ خبریں پہنچنے لگیں اور یہ کوئی معمولی اور چھوٹی خبر نہیں تھی کہ اس علاقے کا بہت بڑا آدمی جانو کے گھر آیا ہے۔

جانو نے گیٹ کھول کر چوہدری کو دیکھا تو حیرت سے گم صم رہ گیا۔ چوہدری نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "السلام علیکم جان محمد صاحب!"

اس نے چونک کر سوال کا جواب دیا پھر مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "آپ میرے جیسے غریب کے دروازے پر آئے ہیں۔ آپ نہ آتے تب بھی ہمارے گھر کے تمام ووٹ آپ کے لئے ہیں۔"

"جان محمد صاحب! میں ووٹ نہیں کچھ اور مانگنے آیا ہوں۔ کیا آپ مجھے بیٹھنے کے لئے نہیں کہیں گے؟"

"ہاں جی ہاں' تشریف رکھئے۔" امیرالدین نے چوہدری کے لئے منجی بچھائی۔ فخرالدین چوہدری کی بیوی اور بیٹی کو اپنی ماں کے پاس لے آیا۔ آمنہ اور صنم آراء نے

انہیں سلام کیا۔ چوہدرائن نے بچی کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”یہ تمہاری بیٹی صنم آراء ہے؟“

”جی ہاں۔ یہی وہ بدنصیب ہے جس کا نام اس علاقے کی ہر دیوار اور پوسٹر پر نظر آتا ہے۔“

چوہدرائن بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”بدنصیب ہیں وہ دشمن جو عزت داروں پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔ شاہد کے ابا بدمعاشوں کو تلاش کر رہے ہیں۔ ذرا وہ مل تو جائیں۔ انہیں دو چار سال کے لئے اندر کرا دیں گے۔“

آمنہ نے پوچھا۔ ”یہ شاہد کے ابا کون ہیں؟“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”اے بہن! میں اپنے چوہدری صاحب کی بات کر رہی ہوں۔ میرے بیٹے کا نام شاہد ہے۔ آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ تم صنم آراء کو پڑھا رہی ہو؟“

”گھر میں پڑھاتی ہوں۔ جب تک قدم قدم پر کانٹے بچھے ہیں تب تک میں اسے اسکول نہیں جانے دوں گی۔“

”میں تمہاری بیٹی کے راستے کے تمام کانٹے چنتی ہوئی آئی ہوں۔ آج کے بعد کوئی اسے میلی نظر سے نہیں دیکھ سکے گا‘ نہ تم لوگوں کی عزت پر کیچڑ اچھال سکے گا۔“

”آپ کی مہربانی ہے کہ آپ ہمیں عزت کے قابل سمجھتی ہیں۔“

”بہن! عزت بنانے سے عزت بنتی ہے۔ تم صنم آراء کو ہمارے گھر کی عزت بنا دو۔“

آمنہ نے حیرانی سے پوچھا۔ ”میں سمجھی نہیں؟“

”میں تمہاری بیٹی کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں۔“

آمنہ کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ پہلی حیرانی کی بات یہ تھی کہ بہت اونچے خاندان سے اور اونچی حیثیت والوں کے گھر سے رشتہ آیا تھا۔ دوسری حیرانی کی بات یہ تھی کہ ایک بدنام گھرانے کی بیٹی کا رشتہ مانگا جا رہا تھا۔ یہ تو ناقابلِ یقین بات تھی۔ یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ چوہدرائن ماں بیٹی کا مذاق اڑانے آئی ہے۔

چوہدرائن نے پوچھا۔ ”کیا سوچتی ہو؟“

وہ خیالات سے چونک کر بولی۔ ”کیا آپ ہمارا مذاق اڑانے آئی ہیں؟“

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیا میں مذاق اڑانے تمہارے گھر کے اندر آؤں گی۔ میں اپنے خاوند اور جوان بیٹی کے ساتھ آئی ہوں۔ دیکھو بہن! تمہارے آس پاس اتنے دشمن ہو گئے ہیں کہ اپنا بن کر آنے والوں پر بھی شک کرنے لگی ہو۔ تمہاری جگہ میں ہوتی تو مجھے بھی فوراً یقین نہ آتا۔ اب تم جس طرح چاہو یقین دلانے کی کوشش کروں گی۔“

”لیکن میری بیٹی ابھی دس برس کی ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ منگنی تو ہو سکتی ہے۔“

”بیگم صاحبہ! میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے‘ آخر ہم میں ایسی کیا بات ہے کہ آپ میری بیٹی کا رشتہ مانگنے آئی ہیں۔“

”رشتے عزت دار گھرانوں میں آتے ہیں۔ کیا تم عزت دار نہیں ہو؟ کیا صنم آراء خوب صورت نہیں ہے۔ تم میں یا تمہارے گھر میں کیا خرابی ہے کہ میں رشتہ نہ مانگنے آتی؟“

”ٹھہریئے‘ میں صنم آراء کے ابا سے بات کرتی ہوں۔“

وہ دروازے کے پاس آئی۔ باہر چوہدری بیٹھا ہوا تھا۔ اس لئے وہ دروازے کی آڑ سے بولی۔ ”قمرالدین‘ اپنے ابا کے ساتھ یہاں آؤ۔“

جانو نے آ کر کہا۔ ”چوہدری صاحب تو فرشتہ ہیں۔ کہتے ہیں ہم لوگ عزت دار ہیں۔ ہمارے کو بدنام کرنے والوں کو وہ تلاش کر رہے ہیں۔ ہمارے دشمنوں کو سزا دلائیں گے۔“

آمنہ نے کہا۔ ”یہ ہماری صنم آراء کا رشتہ مانگ رہی ہیں۔“

قمرالدین نے کہا۔ ”چوہدری صاحب بھی ہم سے یہی کہہ رہے ہیں۔“

ماں نے پوچھا۔ ”بیٹے! تم کیا کہتے ہو؟“

”اماں! یہ تو بہت بڑی بات ہے۔ ہمیں بدنام کرنے والوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی لیکن ہماری گڑیا جیسی بہن کا معاملہ ہے۔ ہم فوراً جواب نہیں دے سکتے۔ ان سے کہا جائے کہ ہم اپنے رشتے داروں سے مشورہ کرنے کے بعد جواب دیں گے۔“

آمنہ نے کہا۔ ”بیٹی کی ساری زندگی کا معاملہ ہے۔ قمرالدین ٹھیک کہتا ہے‘ اچھی طرح سوچ سمجھ کر رشتہ دیں گے۔“

امیرالدین نے آ کر کہا۔ ”ابا! یہ بڑے اور سیاسی لوگ ہیں۔ ہمیں سمجھنا چاہئے کہ اچانک رشتہ مانگنے کیوں آئے ہیں؟“

جانو نے پوچھا۔ ”میں چوہدری صاحب کو کیا جواب دوں؟“

”یہی کہ ہم اپنے خاندان کے دوسرے بزرگوں سے مشورہ کرنے کے بعد جواب دیں گے۔“

باپ بیٹے چوہدری کے پاس گئے۔ آمنہ نے چوہدرائن کے پاس آ کر کہا۔ "آپ ہم سے رشتہ داری کر کے ہمارا مان بڑھا رہی ہیں۔ ہم اپنے خاندان کے بزرگوں سے مشورہ کر کے انشاء اللہ جلد ہی جواب دیں گے۔"

ادھر چوہدری نے جانو سے کہا۔ "میرے بھائی! یہ تو معقول بات ہے۔ اپنے بزرگوں سے ضرور مشورہ کرنا چاہئے لیکن مہربانی کر کے کل صبح تک ہاں میں جواب دے دیں۔ ہمیں مایوس نہ کریں۔"

قمرالدین نے پوچھا۔ "آپ جلدی کیوں کر رہے ہیں؟ بہتر ہے الیکشن سے فارغ ہو جائیں۔ پھر رشتے داری بھی ہو جائے گی۔"

وہ بولا۔ "بیٹے! دشمن تم لوگوں کو خوامخواہ بدنام کر رہے ہیں۔ اگر میں آج سے ہر جلسے میں لوگوں سے یہ کہہ دوں کہ جانو بھائی خاندانی عزت دار ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں اس عزت دار گھرانے کی بیٹی صنم آراء کو اپنی بہو بنا رہا ہوں تو بدنام کرنے والے اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں گے۔"

باپ بیٹے قائل ہو کر سر ہلانے لگے۔ چوہدری نے کہا۔ "میں نے فاروق بٹ سے بھی بات کی ہے۔ وہ سمجھدار بندہ ہے۔ وہ بے چارہ بھی خوامخواہ بدنام ہو رہا ہے۔ اس نے خود کو اور آپ لوگوں کو بدنامی سے بچانے کے لئے فیصلہ کیا ہے کہ میرے حق میں بیٹھ جائے گا اور الیکشن نہیں لڑے گا۔"

قمرالدین نے کہا۔ "بٹ صاحب ایک اچھے انسان ہیں، ہم صرف بدنامی کے باعث ان سے سلام دعا نہیں رکھتے ہیں۔"

"آپ لوگ عقل سے کام لیں۔ اس وقت سے فائدہ اٹھائیں۔ الیکشن ہونے تک لوگ ہزاروں کی تعداد میں میرے سامنے ہوتے ہیں۔ وہ میری زبان سے ہماری تمہاری رشتہ داری کی باتیں سنیں گے۔ الیکشن کے بعد نہ لوگوں کا مجمع ہو گا نہ اس بات کی شہرت ہو گی کہ میں نے عزت دار ہو کر آپ جیسے عزت داروں کو پہچانا ہے اور آپ لوگوں کو گلے لگا کر آپ کے دشمنوں کو منہ توڑ جواب دیا ہے۔"

"بے شک، آپ کی ایک ایک بات میں وزن ہے۔ پھر بھی آپ ہمیں سوچنے کا وقت دیں۔"

چوہدری اندر سے سہما ہوا تھا کہ لڑکی والوں کی رضامندی لئے بغیر وہاں سے .... اٹھے گا تو باہر فاروق بٹ محاسبے کے لئے کھڑا ہو گا۔ اس نے تاکید کی تھی کہ ہر حال میں رشتہ طے کر کے آنا اور چوہدری بھی ٹھوس منصوبہ بنا کر آیا تھا۔ اب ایک ترپ چال چلنے

کا وقت آ گیا تھا اور ترپ چال تھی اس کی اپنی بیٹی سیما۔

وہ یہ سوچ کر سیما کو ساتھ لایا تھا کہ جب رشتہ کرنا ہی تو ہے جانو کے بڑے بیٹے سے سیما کو منسوب کرائے گا۔ اس طرح جانو اور اس کے بیٹوں کو یہ اندیشہ نہیں رہے گا کہ ان کی صنم آراء سسرال میں کمتر سمجھی جائے گی۔ جو شخص بیٹی لینے سے پہلے اپنی بیٹی دے رہا ہو، اس کی نیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ سارا کھیل سیاست کا تھا۔ بعض لیڈروں کو اقتدار کی کرسی اس وقت ملتی ہے جب وہ بیٹے اور بیٹی کو داؤ پر لگاتے ہیں۔ فاروق بٹ نے اسے ایسے شکنجے میں پھنسایا تھا کہ وہ اپنے بیٹے شاہد کو ایک بدنام گھر کا داماد بنا رہا تھا۔ ویسے بیٹے کے لئے کسی کی بھی بیٹی لائی جا سکتی ہے۔ کبھی حالات سازگار ہوئے تو اس لڑکی کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینکا جا سکتا تھا لیکن اپنی بیٹی کسی ایسے ویسے گھر میں نہیں دی جاتی۔ سیما چوہدری کی اپنی بیٹی نہیں تھی۔

چوہدری کی بہن نے مرنے سے پہلے اپنی بیٹی بھائی کی گود میں دی تھی، اس وقت سیما چھ ماہ کی تھی۔ چوہدرائن نے اسے اس لئے گود میں لے لیا تھا کہ سیما کو اس کی ماں کے چھوڑے ہوئے لاکھوں روپے مل رہے تھے۔ انہوں نے سیما کو دولت کی ہوا نہیں لگنے دی۔ بعد میں چوہدرائن کے دو بیٹے ہوئے۔ دوسرے بیٹے شاہد کے بعد لیڈی ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ کسی اندرونی خرابی کے باعث چوہدرائن آئندہ ماں نہیں بن سکے گی۔ گھر میں ایک بیٹی کی کمی تھی۔ سیما نے وہ کمی پوری کر دی۔ چوہدرائن نے بھی اسے بیٹی مان لیا۔ وہ صادق آباد سے لاہور میں رہائش اختیار کرنے آئے، یہاں دوست احباب میں یہی ظاہر کیا گیا سیما ان کی اپنی بیٹی ہے۔

یہ سیما کی مختصر سی ہسٹری تھی۔ اگر وہ چوہدری کی اپنی بیٹی ہوتی تو پتا نہیں وہ اسے جانو کی بہو بنانے کا فیصلہ کرتا یا نہیں؟ ابھی تو وہ یہی فیصلہ کر کے آیا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ جانو کے بیٹے اور آمنہ سوچنے کا وقت مانگ رہے ہیں۔ تو وہ انہیں وقت دے کر خود پر برا وقت لانا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے کہا۔ "جانو بھائی! تمام بیٹیوں کے والدین سوچنے سمجھنے کے لئے تھوڑا وقت لیتے ہیں۔ دراصل وہ سوچتے نہیں ہیں بلکہ وہ اندیشوں میں مبتلا رہتے ہیں کہ پتا نہیں بڑے گھر میں بیٹی سہاگن بن کر جائے گی تو اس کے ساتھ کیسا سلوک ہو گا؟ آپ ایمان سے بتائیں یہ اندیشہ ہے یا نہیں؟"

جانو اعتراف کرتے ہوئے ہچکچانے لگا۔ قمرالدین نے کہا۔ "آپ درست فرماتے

ہیں۔ بہت اونچائی پر پہنچ کر نیچے دیکھو تو گرنے کا ڈر لگتا ہے۔ ہماری بہن بھی خدا نہ کرے بہت اوپر سے .... گرے گی تو ہم سے دیکھا نہ جائے گا۔"

"اگر میں صنم آراء کو بہو بنانے سے پہلے تمہیں داماد بنا لوں۔ اپنی بیٹی اس گھر میں دے دوں تو کیا پھر کوئی اندیشہ رہے گا؟"

سب کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ قمرالدین کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سیما کو کئی بار چور نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اگر اس حسین لڑکی کا تعلق معمولی گھرانے سے ہوتا تو وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو جاتا لیکن وہ ایک موٹر مکینک تھا۔ فلمی ہیرو کی طرح غریب ہو کر بادشاہ زادی سے محبت نہیں کر سکتا تھا۔ ایسی مہنگی حسیناؤں کو دور سے دیکھ کر انہیں پالینے کی آرزوؤں کو سینے میں دفن کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

چوہدری نے کہا۔ "جانو بھائی! میری بیٹی تمہارے گھر میں ہے۔ اسے اچھی طرح دیکھ لو۔ اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ یہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ یوں سمجھیں' میں آپ کو اپنا کلیجہ نکال کر دے رہا ہوں۔"

صنم آراء اور فخرالدین مہمانوں کے سامنے ناشتہ اور چائے لا کر رکھ رہے تھے۔ آمنہ سیما کو ہونے والی بہو کی حیثیت سے دیکھ کر باغ باغ ہو رہی تھی۔ اس نے پھر دروازے پر آ کر جانو اور بیٹے کو بلایا پھر کہا۔ "قمرو کے ابا' چوہدری بھائی نے اور چوہدرائن بہن نے تو ہمیں زمین سے آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ کیا میرے بیٹے کو سیما پسند ہے؟"

قمرالدین نے شرما کر مسکراتے ہوئے سر کو جھکا لیا۔ جانو نے اس کے سر پر ایک چپت مارتے ہوئے کہا۔ "ابے! مرد ہو کر شرماتا ہے؟"

آمنہ نے دھیرے سے کہا۔ "یہ کیا حرکت ہے؟ ہونے والے سسر کے سامنے قمرو کو ابے کہہ رہے ہو۔ بیٹے کے لئے ایسی زبان استعمال کرو گے تو سسرال میں اس کی کیا عزت رہے گی۔"

جانو نے جھینپ کر کہا۔ "خوشی میں بھول گیا تھا۔ یہ بتاؤ' میں رشتے کے لئے ہاں کہہ دوں؟"

"کہہ دو اور پوچھ لو منگنی کب ہو گی۔ پہلے میں بہو لاؤں گی۔"

چوہدری نے صحن سے اونچی آواز میں کہا۔ "بہن! قمرالدین اور سیما کی شادی پہلے ہو گی۔ پہلے تم بہو لے آؤ۔ ہم اپنی بہو سات برس کے بعد لے جائیں گے۔ تب تک ہمارا شاہد یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہو جائے گا۔"

یہ آواز باہر تک گئی۔ باہر ایک بارہ برس کی لڑکی اور ایک بڑھیا دیوار سے لگی کھڑی تھیں۔ ان کے اندر بجلی دوڑ گئی۔ لڑکی دوڑتی ہوئی اپنے گھر گئی۔ بڑھیا ہانپتی کانپتی ایک گھر سے دوسرے گھر آج کی تازہ خبر نشر کرتی چلی گئی۔ یہ خبر سن کر کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا اور محلے کی عورتیں تصدیق کئے بغیر کسی کل قرار نہیں پا سکتی تھیں۔ ایک عورت نے ایک پلیٹ میں کھیر ڈالی۔ کھیر پر پستہ بادام کے ٹکڑے چھڑک دیئے پھر اسے دوسری پلیٹ سے ڈھانپ کر جانو کے گھر پہنچ گئی۔ اندر پہنچتے ہی اس نے چوہدری صاحب کو اور چوہدرائن کو سلام کیا پھر بولی۔ "آمنہ بہن! میں نے منت مانی تھی کہ میری شبو کا رشتہ آئے گا تو محلے والوں کو کھیر کھلاؤں گی' یہ لو۔"

آمنہ نے کھیر کی پلیٹ لے کر اسے بیٹی کے رشتے کی مبارک باد دی پھر کہا۔ "آج بڑی خوشی کا دن ہے۔ چوہدری صاحب اور چوہدرائن بہن میری صنم آراء کو بہو بنانا چاہتے ہیں اور یہ ان کی بیٹی سیما ہے' میری ہونے والی بہو۔"

کھیر والی نے بڑی حیرانی سے سنا پھر آمنہ کو دو دو رشتوں کی مبارک باد دینے لگی۔ اسی وقت دوسری عورت ایک پلیٹ میں لڈو لے کر آئی۔ آمنہ سے بولی۔ "میرا بیٹا بورڈ کے امتحان میں پاس ہو گیا ہے۔ اس خوشی میں منہ میٹھا کر لو۔ ویسے تمہارے ہاں بھی بڑی رونق لگی ہے۔"

اسے بھی رونق کا سبب بتایا گیا۔ پھر تیسری آ گئی۔ اس کے بعد چوتھی پہنچ گئی۔ آنے والیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سب ہی کسی نہ کسی بہانے سے آئی تھیں اور آمنہ کے گھر کا بھید لے رہی تھیں۔ جو خبر سنی تھی' اس کی تصدیق ہو رہی تھی اور مبارک باد دے کر واپس جا رہی تھیں۔

بڑی مشکل ہے۔ عورتوں کی بے چینیاں اور بڑھ گئی تھیں۔ آخر یہ معجزہ کیسے ہو گیا۔ ایک بڑے گھر سے ایک بدنام عورت کی بیٹی کا رشتہ کیسے آ گیا۔ صرف اتنا ہی نہیں' اس محلے میں قمرالدین ایک بڑے گھر کی بیٹی بیاہ کر لانے والا تھا۔

سب ہی دعا مانگ رہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے ہی سب کے دن پھیرے مگر وہ پھیر میں پڑ گئی تھیں کہ جو بات ناممکن تھی وہ ممکن کیسے ہو گئی؟ یہ سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ الیکشن لڑنے والے چوہدری کا دماغ چل گیا ہے۔ اتنے بڑے خاندانی شخص نے کچھ سمجھ کر ہی جانو سے رشتہ داری کی ہے۔

ایک بوڑھی نے چار عورتوں میں بیٹھ کر کہا۔ "اب ہم آمنہ کے برابر کے نہیں رہے۔ وہ اتنی اونچی ہو گئی ہے کہ منہ اٹھا کر تھوکنے سے وہ تھوک ہمارے ہی اوپر آئے

گا۔"

یہ موٹی سی عقل میں سمانے والی سچائی ہے کہ نیچے منہ کر کے تھوکا جاتا ہے یا سامنے منہ کر کے اوپر منہ اٹھانے سے اپنی غلاظت اپنی ہی طرف واپس آتی ہے۔

ایک کمتر اپنے برابر والے کو حسد اور جلاپے سے اور کمتر بنا سکتا ہے لیکن اپنے سے اوپر والے سے حسد نہیں کر سکتا یا حسد کر کے اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ مساوات کا درس دینے والے کہتے ہیں' تمام انسانوں کو برابر ہونا چاہئے۔ نہ کوئی برتر ہو نہ کوئی کمتر۔ جبکہ کمتروں میں آمنہ جیسی عورتوں کا جینا دشوار ہو جاتا ہے اور برتر لوگوں میں پہلے چوہدری نے فاروق بٹ کو بدنام کر کے اپنے مقابلے میں گرانا چاہا تھا۔ اب فاروق بٹ اسے جوتی بنا کر پہن رہا تھا۔ آدمی اونچے طبقے میں ہو یا نچلے طبقے میں' اس کی کم ظرفی نہیں جاتی۔ یہ الگ بات ہے کہ کم ظرف کے منہ میں میٹھی زبان ہوتی ہے۔ چوہدری نے اسی میٹھی زبان سے اپنے ہر جلسے میں اعلانیہ کہا۔ "جانو بھائی کی بیٹی صنم آراء کو بدنام کرنے والے چند بدمعاش ہیں جو منہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔ میں جانو بھائی کے عزت دار گھرانے کو اچھی طرح جانتا ہوں اور ان کی بیٹی صنم آراء کو اپنی بہو بنانے والا ہوں۔ اس سے پہلے صنم آراء کے بھائی قمرالدین کو اپنا داماد بنا رہا ہوں۔"

اس نے خالص لیڈر کی زبان سے کہا۔ "میرے بزرگو! میرے بھائیو! ہم سب کو خدا سے ڈرنا چاہئے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے اپنے محلے اور پڑوس میں کسی خاندان کو بدنام نہ کریں۔ اگر کوئی بدنام کرتا ہے تو آپ میری طرح اس کا توڑ کریں۔ آپ بھی کسی بے گناہ بدنام ہونے والے گھرانے میں رشتے داری کریں گے تو خوامخواہ کیچڑ اچھالنے والے شرمندگی سے منہ چھپائیں گے۔ ہم اپنے گھر کی صفائی کرتے ہیں' مسجد کی صفائی کرتے ہیں پھر دوسرے انسان پر لگی ہوئی کیچڑ کو کیوں نہیں صاف کرتے؟ اگر نہیں کر سکتے ہیں تو ہم سب کو انسان کہلانے کا اور مجھے الیکشن میں حصہ لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

اس کی زبردست تقریر سن کر لوگ تالیاں بجاتے تھے۔ فاروق بٹ نے اعلان کر دیا تھا کہ چوہدری کے حق میں بیٹھ رہا ہے۔ کسی گرنے والے کو جھک کر اٹھانے والا شخص سادھو' مہاتما یا فرشتہ کہلاتا ہے۔ عوام نے اس فرشتے کو ووٹ دے کر کامیاب بنا دیا۔

چوہدری نے علاقے کا چیئرمین بننے کے بعد فاروق بٹ سے ملاقات کی اور کہا۔ "بٹ صاحب! آپ نے مجھے عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ آپ کو خدا کا واسطہ' میری وہ تمام تصویریں مجھے واپس کر دیں۔"

"وہ تصویریں آپ کو نقصان نہیں پہنچا رہی ہیں۔"

"بات یہ ہے کہ زندگی اور موت کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ آج میں مر سکتا ہوں۔ کل آپ کی باری آئے گی۔ آپ کے بعد وہ تصویریں کسی کے بھی ہاتھ لگ سکتی ہیں۔ جس کے بھی ہاتھ لگیں گی وہ مجھے بلیک میل کرے گا۔"

"کوئی بلیک میل نہیں کرے گا۔ میں نے اپنی ایک عزیز ہستی کو تاکید کی ہے کہ میرے بینک کے لاکر سے نیلے رنگ کا جو لفافہ ملے اسے وہ اپنے لاکر میں رکھ لے۔ اگر چوہدری امانت علی' صنم آراء یا اس کے گھر والوں سے کبھی زیادتی کرے تو وہ چوہدری کو یعنی تمہیں پہلے دھمکی دے۔ تم باز نہ آؤ تو پھر وہ تمہاری عزت کی دھجیاں اُڑا دے۔"

"بات تو وہی ہو گئی۔ آپ کے بعد کوئی دوسرا مجھ پر مسلط رہے گا۔"

"جب آپ شرافت سے رہیں گے تو آپ پر کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔"

وہ فاروق بٹ کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کے پاؤں پکڑتا ہوں۔ ان تصویروں کا سودا کر لیں۔ میں پورے دس لاکھ دینے کو تیار ہوں۔"

"آپ اتنی بڑی رقم کیوں ضائع کرنا چاہتے ہیں؟"

"آپ سمجھ دار ہیں۔ یہ دیکھ رہے ہیں کہ مجھے بہت بڑی کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ بلدیاتی الیکشن کی کامیابی اسمبلی کی پہلی سیڑھی ہے۔ ایک بہت ہی ماہر نجومی نے بتایا ہے کہ مجھے اور زیادہ عروج حاصل ہونے والا ہے۔ شرط یہ ہے کہ میں اپنے راستے کے کانٹے ہٹاتا چلوں۔"

"یہ پیش گوئی سب کے لئے کی جا سکتی ہے۔ جو بھی راستے کے کانٹے ہٹاتا چلے گا اس کی منزل آسان ہو جائے گی۔ کامیابی قدم چومتی رہے گی۔ کسی نجومی نے یہ کہہ کر کوئی نئی بات نہیں کی ہے۔"

"نجومی کو ماریں گولی۔ آپ تصویروں کے عوض نذرانہ لے لیں۔"

"چوہدری صاحب! یہ ضروری ہے کہ انسان خدا سے ڈرے۔ جو خدا سے نہ ڈرے' وہ حاکمِ وقت سے خوف زدہ رہے یا ماں باپ' استاد یا کسی بھی ایک طاقت کے دباؤ میں رہے' ورنہ وہ فرعون کی طرح بے لگام ہو جاتا ہے۔ آپ خدا سے نہیں ڈرتے' قانون سے نہیں ڈرتے لہٰذا وہ تصویریں آپ کو لگام دیں گی اور انسانیت کی حدود میں رکھیں گی۔"

وہ انکار پر ڈٹا رہا.......... چوہدری زیر لب اسے گالیاں دینے لگا۔ گالیاں انسان کی بے بسی کے اندر سے نکلتی ہیں۔ جب وہ اپنی دولت سے خرید نہیں سکتا اور طاقت سے

چھین نہیں سکتا تو اگلے کو گالیاں دے کر اور کھوکھلی دھمکیاں دے کر اپنی تسلیاں کرتا ہے۔ ابھی وہ دھمکیاں بھی نہیں دے سکتا تھا۔ سیاست کے میدان میں آگے بڑھتے رہنے کے لئے فاروق بٹ کو خوش رکھنا لازمی ہو گیا تھا۔

اس نے قمرالدین کا سسر کہلانے کا کڑوا گھونٹ حلق سے اتار لیا۔ سیما دلہن بن کر جانو کے گھر آ گئی۔ محلے والے آمنہ اور صنم آراء کے لئے خوش اخلاق ہو گئے تھے۔ جانو کے چاروں بیٹے جہاں سے گزرتے تھے' لوگ عزت سے پیش آتے تھے۔ یہ دنیا ان کے لئے بے حد خوبصورت ہو گئی تھی۔ شہد کی مکھیاں کاٹنے کو دوڑ رہی ہوں تو بچاؤ کے لئے اپنے اوپر کمبل ڈالتے ہیں' چوہدری کمبل کی طرح ان پر چھا گیا تھا۔ اب بدنامی کی مکھیاں انہیں کاٹ نہیں سکتی تھیں۔

چوہدرائن نے سیما کو کچھ ضروری ہدایات دی تھیں۔ اس نے دوسرے ہی دن سے ان پر عمل شروع کر دیا۔ اس نے قمرالدین سے پوچھا۔ "کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ دنیا والے اچانک تمہاری عزت کیوں کر رہے ہیں؟"

"ہاں سمجھ رہا ہوں۔ میں بہت اونچے اور نیک نام گھرانے سے دلہن لایا ہوں۔"

"قمرو! تم مرد ہو۔ عورت کے ذریعے جتنی عزت مل گئی' اس پر تکیہ نہ کرو کوئی ایسا کام کرو' ایسی ترقی کرو کہ عزت تمہارے عمل اور تمہاری صلاحیتوں سے بڑھتی رہے۔ میں فخر سے کہہ سکوں کہ میرے مرد نے اپنی عزت آپ بنائی ہے۔"

یہ بات قمرالدین کے دل کو لگ گئی' وہ بولا۔ "تم بڑے پتے کی بات کرتی ہو۔ مجھے سچ مچ ترقی کرنے والا اور بڑا آدمی بننے والا کام کرنا چاہئے۔ یہ دنیا بڑے لوگوں کے عیب کو نظر انداز کر کے انہیں سلام کرتی ہے۔"

وہ بولی۔ "بڑے آدمی کی پہلی پہچان یہ ہے کہ اس کا لباس دور سے ہی اجلا اور صاف ستھرا نظر آتا ہے لیکن تم مکینک ہو' گاڑیوں کی مرمت کر کے گیراج سے نکلتے ہو تو تمہارے کپڑے داغ دھبوں سے میلے اور گندے ہو جاتے ہیں۔ تم اندر سے کتنے ہی اجلے رہو' لوگ باہر کی گندگی کو دیکھتے ہیں۔ تمہیں بظاہر سلام کرتے ہوں گے مگر منہ پھیر کر ناک سکیڑتے ہوں گے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن مجھے تو یہی ایک کام آتا ہے۔"

"یہ کام اچھا ہے اگر تم خود نہ کرو۔ ملازموں سے کراؤ اور اپنا ایک گیراج کھول لو۔"

"اپنے گیراج کے لئے بڑی رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"میں ابا سے کہوں گی تو........"

وہ بات کاٹ کر بولا "نہیں۔ تمہارے ابا سے رقم لینا اچھا نہیں لگتا۔ اماں بھی اجازت نہیں دیں گی۔"

"ترقی کرنے کے لئے جن راستوں پر چلنا پڑتا ہے' وہ راستے میں جانتی ہوں۔ کیونکہ میں نے بڑے گھرانے میں پرورش پائی ہے۔ تمہاری اماں چھوٹے سے گھر میں غریبی اور محتاجی دیکھتی آئی ہیں۔ وہ بڑا آدمی بنانے کے ہتھکنڈے نہیں جانتیں ہیں۔ اماں کی باتوں پر چلو گے تو تمام عمر گیراج سے کپڑے کالے کر کے گھر آتے رہو گے۔"

"تمہاری باتیں دل کو لگتی ہیں مگر........"

"اگر مگر نہ کرو۔ یہ سوچو' اگر ابا اس دنیا میں نہ رہے تو ان کے دم سے جو عزت تمہارے گھرانے کو مل رہی ہے' وہ ختم ہو جائے گی۔ لوگ پھر کیچڑ اچھالنے لگیں گے۔ اگر تم بڑے آدمی بن جاؤ گے تو لوگ تمہارے دباؤ میں رہا کریں گے۔ یہ میں اپنے لئے نہیں' تمہاری بہن اور بھائیوں کی بہتری کے لئے سمجھا رہی ہوں۔"

وہ پہلے ہی دن قائل نہیں ہو سکتا تھا لیکن بیوی کی دانائی کا قائل ہو گیا تھا۔ اس دن سے آہستہ آہستہ کھوپڑی گھومنے لگی۔ شادی کے ایک ماہ بعد ہی اس نے ماں کو خوشخبری سنائی "اماں! میں اپنا گیراج کھول رہا ہوں۔ اب نوکری نہیں کروں گا۔"

آمنہ نے کہا۔ "بیٹے! تم تو کہا کرتے تھے' اپنا گیراج کھولنے کے لئے ہزاروں روپے لگتے ہیں۔"

"روپے کا انتظام ہو گیا ہے۔ میں نے جناز گاہ کے قریب ایک بڑی سی دکان کرائے پر لے لی ہے۔ اس کا بیعانہ دے چکا ہوں۔"

جانو نے کہا۔ "جناز گاہ یہاں سے بیس میل دور ہے۔ تُو دوپہر کو اتنی دور سے کھانا کھانے کیسے آئے گا۔ بسوں اور ویگنوں میں آتے جاتے کئی گھنٹے برباد ہوں گے۔ میرے سے مشورہ تو لینا چاہئے تھا۔"

"ابا! تم نے ساری عمر نوکری کی ہے۔ کاروبار کو نہیں سمجھتے ہو۔ جناز گاہ میں بڑی گاڑیاں آتی جاتی ہیں۔ میرے چوہدری سسر کے تمام گاڑیوں والے دوست اپنی گاڑیاں میرے پاس مرمت کے لئے اور ڈینٹنگ پینٹنگ کے لئے لایا کریں گے۔"

"کیا تُو نے سسر سے رقم ادھار لی ہے؟"

وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔ "رقم کہیں سے بھی لی ہے' اسے قسطوں میں واپس کر دوں گا۔"

آمنہ نے بہو سے کہا۔ "سیما! اس نے تمہارے باپ سے رقم لی۔ یہ تمہیں معلوم تھا، تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

سیما نے کہا۔ "میرے ابا سے رقم لینا کوئی جرم تو نہیں ہے۔"

"جرم نہیں ہے لیکن سسرال والوں کا احسان نہیں لینا چاہئے۔"

"اماں! آپ نے میرے ابا کا احسان لیا ہے۔ تب ہی میں یہاں بہو بن کر آئی ہوں۔ آپ لوگوں کی عزت جو بالکل ہی ڈوب چکی تھی اسے دوبارہ بحال کرنے میں میرے ماں باپ کا احسان ہے۔ کیا آپ اتنے بڑے احسان کا بدلہ دے سکتی ہیں؟"

آمنہ کو چپ سی لگ گئی۔ اس نے جانو کو اور اپنے بیٹوں کو دیکھا۔ ان میں سے کوئی سیما کے سامنے سر اٹھا کر قمرالدین کی سسرال والوں کے سامنے ناک اونچی نہیں کر سکتا تھا۔

پھر آمنہ نے کہا۔ "ٹھیک کہتی ہو۔ میں تمہارے باپ کے احسان کو تھوڑی دیر کے لئے بھول گئی تھی۔ صرف بیٹے کی ماں بن کر سوچ رہی تھی۔"

سیما نے کہا۔ "آپ کے یہ بیٹے صاحب میرے بھی کچھ لگتے ہیں۔ مجھے بھی ان کی بہتری اور ترقی کے لئے کچھ سوچنے دیں۔"

"تم نے کیا سوچا ہے۔ قمرالدین دوپہر کو ہوٹلوں میں کھائے گا یا گھر سے روٹی لے جایا گا؟"

سیما نے قمرالدین کو کن انکھیوں سے دیکھا پھر کہا۔ "اماں! نیا نیا کاروبار ہے۔ انہیں اپنی ساکھ بنانے کے لئے رات کو بھی دیر تک کام کرنا ہو گا۔ یہ رات کو بھی اتنی دور نہیں آسکیں گے۔ گیراج کے پاس میری خالہ کا گھر ہے، انہوں نے مکان کا ایک حصہ ہمیں دیا ہے۔ میں وہاں رہ کر آپ کے بیٹے کے کھانے کا خیال رکھوں گی۔ انہیں بیس میل آنے اور بیس میل جانے کی پریشانی نہیں رہے گی۔"

آمنہ نے بے یقینی سے بڑے بیٹے کو دیکھا۔ وہ منہ پھیر کر جانے لگا۔ وہ بولی۔ "ٹھہر جا قمرالدین! ابھی شادی کو ایک مہینہ ہوا ہے اور تُو بیوی کو لے کر الگ ہو رہا ہے؟"

"میں الگ نہیں ہو رہا ہوں۔ یہ کاروباری مجبوری ہے۔ کاروبار اچھی طرح جم جائے گا، میں سسر کی رقم واپس کردوں گا پھر ایک گاڑی خرید لوں گا تو سیما کو لے کر تمہارے پاس آجاؤں گا۔ اسی گھر میں رہا کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔ آمنہ رو پڑی۔ بیٹا نظریں چرا کر کہہ رہا تھا کہ ایک دن ماں کے پاس واپس آجائے گا اور آمنہ نے آج تک ایسا بیٹا نہیں دیکھا تھا جو بہو کے ساتھ الگ گھر بسا کر ماں کے پاس پلٹ آیا ہو۔ وہ چارپائی پر گر پڑی۔ آنچل میں منہ چھپا کر رونے

لگی۔ بہو اس کے اندر سے کلیجا نکال کر لے جا رہی تھی اور وہ دنیا کے کسی تھانے میں بیٹے کے اغوا ہونے کی رپورٹ نہیں لکھوا سکتی تھی۔

بے چاری کو یہ دن بھی دیکھنے تھے، سو دیکھ لئے۔ سینے پر پتھر کی سِل رکھ لی۔ محلے میں پھر سرگوشیاں ابھرنے لگیں۔ عورتوں نے پہلے سوچا سیما میکے گئی ہے۔ پھر کئی دنوں تک قمرالدین بھی نظر نہیں آیا۔ مردوں نے جانو سے اور عورتوں نے آمنہ سے پوچھا "آج کل بڑا بیٹا نظر نہیں آرہا ہے؟"

جانو نے کہا۔ "اس نے اپنا گیراج کیا ہے۔ نیا کام ہے۔ وہاں دن رات مصروف رہتا ہے۔"

عورتوں نے پوچھا۔ "کیا بہو میکے میں رہے گی؟"

آمنہ نے کہا۔ "وہ اپنے میاں کے ساتھ ہے۔ گیراج کے پاس ہی ایک مکان کرائے پر لیا ہے۔"

"تو یوں کہو نا، وہ تمہارے بیٹے کو لے کر الگ ہو گئی ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ کاروبار چل پڑے گا تو وہ بہو کو لے کر آجائے گا۔"

ایک عورت نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "اللہ کرے واپس آجائے۔"

ایک بوڑھی نے کہا۔ "میں نے بہو کی کمان سے نکلے ہوئے تیر کو کبھی واپس آتے نہیں دیکھا۔"

تیسری نے کہا۔ "ہو سکتا ہے بہو ایسے نہ آئے لیکن صنم آراء کو اپنے بھائی کی دلہن بنا کر لے جانے کے لئے ضرور آئے گی۔"

چاچی نے کہا۔ "یہ بڑے گھر کی لڑکیاں بڑی تیز ہوتی ہے۔ سسرال میں قدم رکھ کے مہینہ بھی نہیں لگایا اور میاں کو یہاں سے لے اُڑی۔ میری مانو آمنہ! تعویذ کرو۔ پہاڑ جیسا بیٹا گیا ہے۔ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"

عورتیں بولتی رہیں۔ آمنہ خاموشی سے سنتی رہی۔ اسے بچپن سے سنتے رہنے کی عادت ہو گئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا، بدبختی کے دن پھر آرہے ہیں۔ سیما نہیں رہے گی تو چوہدری بھی ادھر نہیں آئے گا۔ دشمنوں کی لمبی زبانیں پھر کھل جائیں گی۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ بڑے بیٹے کو چھین لینے کے بعد چوہدری صنم آراء کو بہو بنائے۔ وہ منگنی توڑ بھی سکتا تھا۔ اس کے ساتھ عزت کا تاج محل ٹوٹنے والا تھا۔ آمنہ کا گھر گویا ایک سرائے تھا جہاں عزت اور نیک نامی مسافروں کی طرح آئی تھیں اور اب سرائے کو چھوڑ کر جانے والی تھیں ویسے بدنامی پلٹ کر نہیں آئی۔ کیونکہ ابھی چوہدری کے گھرانے سے جانو اور

آمنہ کی رشتے داری تھی۔ بہو اور بیٹے کے چلے جانے سے تھوڑی سی ٹوٹ پھوٹ ہوئی لیکن نیک نامی بحال رہی۔ قمرالدین ہفتے میں ایک بار سیما کو لے کر ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ملنے آتا تھا۔ تمام دن رہتا تھا پھر رات کو چلا جاتا تھا۔ اس طرح محلے والوں کو پتا چلتا تھا کہ ابھی اس گھر پر چوہدری نے کمبل ڈالا ہوا ہے۔

ایک سال کے بعد آمنہ دادی بن گئی۔ سیما نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ آمنہ کی خوشیوں کا ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ روز صبح بیس میل کا فاصلہ طے کرکے پوتے کو گود میں کھلانے جاتی تھی۔ شام کو پھر بیس میل کا فاصلہ طے کرکے گھر آتی تھی۔ بہو نے کبھی جھوٹے منہ نہیں کہا کہ اماں، آج رات رک جاؤ۔ روز چالیس میل کا سفر کرتی ہو۔ یہ بڑھاپا ایسا ہوتا ہے کہ بسوں میں بیٹھ کر بھی سفر کرو تو ہڈیوں کا جوڑ جوڑ دکھنے لگتا ہے۔

قمرالدین نے بیوی سے کہا۔ ”کبھی تو اماں کو ایک رات کے لئے روک لیا کرو۔ یا سمجھا دو کہ روز اتنی دور سے نہ آیا کریں۔ اس عمر میں اماں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ کل آنے دو۔ میں انہیں خود ہی سمجھاؤں گا۔“

”اے جی خبردار! انہیں یہاں آنے سے نہ روکنا۔ وہ آتی ہیں تو گھر کا کتنا ہی کام ہوجاتا ہے۔ ساجد کو صبح و شام مالش کرتی ہیں۔ شام تک اسے سنبھالتی بھی ہیں اور رات کا کھانا پکا کر جاتی ہیں۔ مجھ سے اتنا کام نہیں ہوتا اور ملازمہ رکھنے کی تمہاری اوقات نہیں ہے۔“

اپنی حیثیت کی بات آتی تو قمرالدین تلملا جاتا تھا۔ اپنے گیراج اور اپنی کاروباری محنت کے باوجود اس کی یہ پوزیشن تھی کہ وہ بیوی کا احسان مند تھا۔ وہ میکے سے رقم نہ لاتی تو دوسروں کے گیراج میں دوسروں کا نوکر رہتا۔ اب وہ کسی کا نوکر نہیں تھا، بیوی کا محکوم تھا۔ اوقعات یہی تھی کہ چوہدری کے رحم و کرم پر تھا۔ اگر وہ صنم آراء کو بہو بنانے کے وعدے سے پھر جاتے تو بہن اور ماں کی بدنامی پہلے سے زیادہ ہونے لگتی۔

دنیا یہی کہتی کہ انہیں گلے لگانے والے چوہدری نے آمنہ کا اصل گناہ گار چہرہ دیکھ لیا ہے۔ ایک چوہدری کے ٹھکرا دینے سے صنم آراء کے ناجائز ہونے کی تصدیق ہوجاتی۔ اور قمرالدین انتقاماً کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ گیراج اور کاروبار سیما کے نام سے تھا۔ وہ بہن کا انتقام لینے کے لئے بیوی کو چھوڑ دیتا تو کنگال ہوجاتا اور کنگال ہونے کے بعد چوہدری کے حواریوں سے لات جوتے کھاتا رہتا۔ یہی کچھ سوچ کر وہ ماں باپ کی حمایت میں کچھ نہیں بولتا تھا۔ سیما سے کسی معاملے میں الجھتا نہیں تھا۔ بیوی کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے سے دو فائدے حاصل ہو رہے تھے۔ ایک تو یہ کہ ماں اور بہن کی نیک نامی بحال تھی۔

دوسرے یہ کہ ماہانہ پانچ ہزار سے دس ہزار روپے کی آمدنی ہو رہی تھی۔ بیوی خودغرض سہی مگر اسے بڑا آدمی بنا رہی تھی۔

آمنہ ایک بہو کی کمی پوری کرنے کے لئے دوسری بہو لے آئی۔ اگلے دو برسوں میں امیرالدین نے بھی ماں کو دادی بنا دیا۔ وہ بہت خوش تھی، خاندان پھل پھول رہا تھا۔ نئے پیدا ہونے والے نئے رشتوں کی محبتیں لا رہے تھے۔ اتنی ساری مسرتوں کے باوجود آمنہ اندر سے ذرا ٹوٹی ہوئی تھی۔ اسے اپنے چاروں بیٹوں سے بڑی محبت تھی لیکن بڑے بیٹے قمرالدین سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ تھا۔ شاید اس لئے بھی زیادہ لگاؤ تھا کہ بچھڑنے والے بہت یاد آتے ہیں، بہت ستاتے ہیں اور دل میں گھس کر پھر نہیں نکلتے، خواہ گھر سے نکل جائیں۔

صنم آراء رفتہ رفتہ جوانی کی دہلیز پر آرہی تھی۔ حسن و جمال کی چکاچوند بڑھتی جارہی تھی۔ جو دل پھینک جوان تھے اور راستہ چلتی لڑکیوں کو دیکھ کر چھیڑتے تھے، وہ صنم آراء کو دیکھ کر راستہ بدل دیتے تھے یا دور سے چھپ کر اسے دیکھتے تھے اور سرد آہ بھر کر رہ جاتے تھے کیونکہ وہ چوہدری امانت علی کی ہونے والی بہو تھی۔ پچھلے چھ برسوں میں چوہدری بہت ہی بااثر اور وسیع ذرائع کا مالک ہوگیا تھا۔ اس علاقے کے تھانے والے سرکار سے محدود تنخواہ پاتے تھے اور چوہدری سے لامحدود۔ اس لئے وہاں چوہدری کا سکہ چلتا تھا۔

ملک بھر میں انتخابات ہونے والے تھے۔ ایک سیاسی پارٹی اسے قومی اسمبلی کی سیٹ حاصل کرنے کے لئے ٹکٹ دے رہی تھی لیکن وہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے میدان میں آگیا۔ ایسے وقت جو دھوم دھڑکا اور شور و ہنگامہ ہوتا ہے شروع ہوچکا تھا۔ پہلے دن سے یہ اندازہ ہونے لگا تھا کہ چوہدری امانت علی، اپنے حریفوں کے مقابلے میں شاندار کامیابی حاصل کرے گا۔ وہ کامیابی کے لئے تمام جائز اور ناجائز طریقے اختیار کر رہا تھا۔ جانو اور اس کے چاروں بیٹے صبح سے رات گئے تک چوہدری کی حمایت میں نعرے لگاتے رہتے تھے۔ دیواروں پر اس کے پوسٹر لگاتے تھے۔ اس کے جلسوں کو کامیاب بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

چوہدری ان کی وفاداری کو مانتا تھا لیکن ان کی رشتے داری بری طرح کھٹک رہی تھی۔ وہ قومی اسمبلی میں پہنچ کر کسی شعبے کا وزیر بن سکتا تھا۔ وزیروں اور سرمایہ داروں کے ماحول میں رہنے والا جانو حوالدار کے ماحول میں سانس نہیں لے سکتا تھا۔ اس پر مصیبت یہ تھی کہ اس کی بیٹی کو بہو بنا کر لانے سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔ فاروق بھلا اسے

پھنسا کر مطمئن ہو گیا تھا۔ ادھر وہ اندر ہی اندر اس کے شکنجے سے نکلنے کی کوشش کرتا آرہا تھا۔ جس بینک میں فاروق بٹ کا اکاؤنٹ تھا' وہاں کے ایک ملازم کو بھاری رشوت دے کر خرید لیا تھا۔ اس نے بتایا کہ فاروق کے لاکر کا نمبر چھ ہے۔ پھر چوہدری نے دوسرے بینک کے ایک ملازم کو خریدا۔ اس نے بتایا کہ فاروق بٹ کی بیوی سعیدہ کے لاکر کا نمبر گیارہ ہے۔ اب ان دو میں سے کسی ایک لاکر میں تصویروں کا وہ لفافہ ہو سکتا تھا۔ فاروق نے ایک بار کہا تھا کہ اگر وہ اس دنیا سے اٹھ جائے گا تو وہ اہم لفافہ اس کی ایک عزیز ہستی کے پاس رہے گا۔

اور وہ عزیز ہستی اس کی بیوی سعیدہ ہی ہو سکتی تھی' ہو سکتا ہے اس نے اپنی موت سے پہلے ہی وہ لفافہ سعیدہ کے لاکر میں رکھوا دیا ہو۔ سیاست ایک علم ہے جسے حاصل کرنے کے لئے بدمعاشی' غنڈا گردی' قتل اور بے رحمی کا کورس مکمل کرنا پڑتا ہے۔

چوہدری اپنے علاقے کے تھانے داروں کے ذریعے ان علاقوں کے تھانے داروں سے رابطہ بڑھا رہا تھا جہاں وہ دونوں بینک تھے۔ معاملات طے ہو رہے تھے کہ ایک ہی دن ایک ہی وقت دونوں بینکوں میں ڈکیتی ہو گی۔ جو رقم ہاتھ لگے گی اس کا آدھا تھانے داروں کو ملے گا۔ اگر ڈکیتی ناکام رہی تو چوہدری اپنے اکاؤنٹ سے پچیس پچیس ہزار روپے دے گا۔ تھانے داروں کو مایوس نہیں کرے گا۔

یہ معاملات تقریباً طے ہو چکے تھے۔ چوہدری کے تیز و طرار اور چھٹے ہوئے بدمعاش جدید ہتھیاروں سے لیس تھے لیکن ڈاکا ڈالنے کے لئے حالات سازگار نہ رہے۔ انتخابی مہم کے لئے بے شمار امیدواروں کے بے شمار بندے' جلوس کی صورت میں بینکوں کے آس پاس سے گزرتے رہتے تھے۔ ان کے جلوسوں اور نعروں کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ ایسے میں ڈاکا ڈالنے والوں کو فرار کا راستہ آسانی سے نہ ملتا۔ وہ لوگوں کی بھیڑ میں پکڑے جاتے۔ پولیس نہ پکڑتی' لوگ انہیں بے نقاب کر دیتے۔

چوہدری مجبوراً صبر کر رہا تھا اور الیکشن لڑ رہا تھا۔ دو بڑی سیاسی پارٹیوں کو اس کی جیت کا یقین ہو چکا تھا۔ الیکشن کا نتیجہ دیکھنے سے پہلے ہی دونوں پارٹیاں اسے اپنی اپنی طرف مائل کر رہی تھیں۔ وہ دونوں کو اپنی حمایت کا یقین دلا رہا تھا اور یہ کہتا جا رہا تھا کہ پہلے وہ اپنی چند شرائط منوائے گا پھر حمایت کا اعلان کرے گا۔

کامیابی اسی کے مقدر میں تھی کیونکہ اس نے مقدر بنانے کا فن سیکھ لیا تھا۔ انتخابی نتائج کا اعلان ہوا۔ اس نے اپنے حلقے کے تمام امیدواروں کے مقابلے میں چالیس ہزار ووٹ زیادہ حاصل کئے۔ قومی اسمبلی کی ایک سیٹ اسے مل گئی تھی۔

آگے بڑھتے رہنے والا پیچھے گھوم کر نہیں دیکھتا۔ جبکہ دیکھنا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ پہلی کامیابی کیسے حاصل ہوئی؟

پہلی کامیابی بلدیاتی الیکشن سے ایسے ہوئی تھی کہ اس نے فاروق کو کنوارا باپ مشہور کر کے آمنہ اور صنم آراء کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ لوگ نہیں جانتے تھے کہ یہ اسی کی کمینگی تھی۔ لوگوں نے تو یہ دیکھا کہ ذلت کی پستیوں میں گرنے والی صنم آراء کو چوہدری نے بہو بنانے کا اعلان کیا۔ اس خاندان کو عزت دار ثابت کرنے کے لئے اپنی بیٹی اس گھر میں بیاہ دی۔ یہ ایسا زبردست ڈراما تھا کہ اسے علاقے کے تمام لوگوں کی حمایت حاصل ہو گئی۔ عوام بلدیاتی الیکشن سے لے کر قومی اسمبلی کے الیکشن تک اسے فرشتہ سمجھ کر ووٹ دیتے رہے۔ سیاست میں کامیاب ہونے کے لئے عوام کا دل جیت لینا ضروری ہوتا ہے اور دل جیتنے کے لئے عوام سے فرشتہ بننے کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا پڑتا ہے اور یہ سرٹیفکیٹ اسے آمنہ کے گھر سے حاصل ہوا تھا۔

گندی سیاست سے ملک سپر پاور کے قدموں میں پڑا رہتا ہے۔ اقتصادی اور معاشی مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ مہنگائی اور جرائم میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن مجرمانہ سیاست سے غریبوں کی چار دیواریوں کے اندر جو تباہی آتی ہے اسے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ یہ کوئی نادانی سی نادانی ہے کہ لوگ اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو دیکھتے ہیں اور توڑنے پھوڑنے والوں کو ملک بچانے کے لئے اسمبلیوں میں پہنچا دیتے ہیں۔

انتخابات کے نتیجے میں دو سیاسی پارٹیاں سرِفہرست تھیں۔ ان میں سے جو زیادہ سیٹیں حاصل کرتی وہ اپنی حکومت بنا لیتی۔ حکومت بنانے کے لئے دونوں پارٹیاں آزاد امیدواروں آمنہ کو عزت [illegible] لگیں۔ دونوں طرف سے چوہدری امانت علی کو بھی بولی دی جا رہی تھی۔ مانگو وہ خوشگوار ان[illegible] جن بھی وہ خواہش پوری نہیں کرتا جو سیاسی خرید[illegible]نا۔ چھوٹی بڑی غلطیاں [illegible] نے اس سیاسی پارٹی کے لیڈر سے رابطہ کیا جو پولیس کے اعلیٰ اف[illegible]ڈی سے بھی ہو گئی۔ وہ [illegible] تھا۔ اس نے لیڈر سے کہا۔ "میں دو بینکوں کے لاکر کھلوانا چاہتا ہوں۔ ان میں سے جو بھی لفافے برآمد ہوں گے۔ انہیں اپنے قبضے میں لینا چاہتا ہوں۔ میرا یہ کام کر دو۔ میں اسمبلی کے اندر تمہاری لابی میں آجاؤں گا۔"

اس لیڈر نے ایک افسر کو یہ معاملہ بتایا اور کہا۔ "یہ کام کر دو تو میں حکومت بناتے ہی تمہیں انٹیلی جنس کا چیف بنا دوں گا' فی الحال تمہیں پچاس ہزار ملیں گے۔"

افسر نے کہا۔ "لاکر کی ایک چابی بینک میں ہوتی ہے۔ دوسری چابی فاروق بٹ کے

پاس ہو گی۔ لاکر دونوں سے کھلے گا۔ میاں بیوی کے لاکروں کو جبراً کھلوایا نہیں جا سکتا ہے۔ بینک منیجر ایسا غیر قانونی کام نہیں کرے گا۔"

لیڈر نے کہا۔ "کچھ بھی کرو۔ یہ کام ہونا چاہئے۔"

افسر نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔ "فاروق بٹ کو گرفتار کر کے ملک دشمن عناصر کے ریکارڈ میں اس کی انٹری کرو اور اسے ٹارچر سیل میں پہنچا دو۔"

حکم کی تعمیل کی گئی۔ فاروق کو ٹارچر سیل میں پہنچا دیا گیا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ "یہ کیا ظلم ہے؟ مجھے کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے؟"

"افسر اسے چند کاغذات دکھاتے ہوئے کہا۔" یہ کاغذات تمہارے گھر کے بیڈ روم سے برآمد ہوئے ہیں۔ ان کاغذات سے ثابت ہوتا ہے' تم انڈر گراؤنڈ تخریب کاروں کے لیڈر ہو اور ملک میں سیاسی تبدیلیاں لانے کے لئے تخریب کاری کے ذریعے حکومتِ وقت کو مجبور کرتے ہو۔"

"یہ غلط ہے۔ مجھ پر جھوٹا الزام ہے۔ میں پاکستان سے محبت کرتا ہوں۔ اس پیارے وطن کو وجود میں لانے کے لئے میرے دادا دادی نے امرتسر میں اپنی جانوں کا نذرانہ دیا تھا۔ میرے والدین اپنا سب کچھ لٹا کر صرف ایک پھٹے ہوئے لباس میں پاکستان آئے تھے۔"

وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا اور اس پر ڈنڈے برس رہے تھے۔ سر چکرانے لگا تھا۔ حلق سے نکلنے والی آواز بیٹھ گئی تھی۔ اس سے پوچھا جاتا۔ "بولو' تم کس دشمن ملک کے ایجنٹ ہو۔ تمہیں جدید اسلحہ اور دہشت گردی کے لئے کس ملک سے رقم ملتی ہے؟"

اسے دن رات ننگا رکھا گیا۔ کئی بار بجلی کے جھٹکے پہنچائے گئے۔ وہ تڑ... دن سے اس... نہیں تھا۔ ایسے تھا... مجھے چھوڑ دو۔ میں ایک پُر امن شہری ہوں۔ تمہیر... یں ڈاکا ڈالنے والوں... زیر... پکڑے جاتے۔ پولیس نہ پکڑتی'... ں' سچے پاکستانیوں کو زندہ رہنے دو۔ ایسی اذیتیں نہ دو کہ بن... برداشت... در مر جاؤں۔"

"زندہ رہنا چاہتے ہو تو بتاؤ۔ تم نے ملک دشمنی سے تعلق رکھنے والی دستاویزات کہاں چھپائی ہیں۔"

"میرے پاس کوئی دستاویز نہیں ہے۔"

افسر نے ایک کاغذ اور قلم اسے دے کر کہا۔ "بینک منیجر کو لکھو کہ تم محب وطن ہو۔ انٹیلی جنس والوں کو اپنی حب الوطنی کا یقین دلانے کے لئے اپنے لاکر کی تلاشی لینے کی اجازت دے رہے ہو اور اس تحریر کے ساتھ لاکر کی دوسری چابی بھیج رہے ہو۔"

فاروق بٹ نے فوراً ان کی مرضی کے مطابق وہ تحریر لکھ دی۔ وہ اپنی بے گناہی کو خوب سمجھتا تھا۔ لاکر کے اندر سے کوئی قابلِ اعتراض دستاویز برآمد نہ ہوئی۔ افسر نے وہ تحریر لے کر کہا۔ "تم بہت چالاک ہو۔ تم نے ان خفیہ دستاویزات کو اپنی بیوی سعیدہ کے لاکر میں رکھا ہو گا۔"

"میری بیوی کے لاکر سے آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ وہاں صرف سونے کے زیورات اور زمین کے کاغذات ہیں۔"

افسر نے دوسرا کاغذ اور قلم دے کر کہا۔ "اپنی بیوی کو لکھو کہ وہ اپنے لاکر کی چابی دے تاکہ ہم تلاشی لے سکیں۔"

"جناب! میری بیوی کے لاکر میں آپ کے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے۔ آپ اسے نہ کھلوائیں۔"

"ہم اسے نہ کھلوائیں۔ اس کا مطلب ہے' خفیہ دستاویزات وہاں رکھی ہیں۔"

"خدا جانتا ہے' خفیہ دستاویزات نہیں ہیں۔ کچھ ایسی چیزیں ہیں جنہیں ہم دونوں میاں بیوی دیکھ سکتے ہیں وہ کسی اور کو نہیں دکھائی جا سکتیں۔"

"ہم ضرور دیکھیں گے۔ وہ زیادہ سے زیادہ تم میاں بیوی کی سہاگ رات کی تصویریں ہوں گی۔ چلو اس کاغذ پر لکھو کہ وہ ہمیں لاکر کی چابی دے دے۔"

فاروق بٹ سادے کاغذ کو گھور کر دیکھنے لگا۔ بیوی کے لاکر میں ایک لفافہ تھا۔ لفافے میں چوہدری اور ایک امیرزادی کی قابلِ اعتراض حالت میں تصویریں تھیں۔ اسے ایسی تصویریں رکھنے کا شوق نہیں تھا۔ بلکہ یہ اہم مقصد تھا کہ چوہدری اپنی عزت رکھنے کے لئے آمنہ کو عزت دے۔ دوسرا نیک مقصد یہ تھا کہ جس امیرزادی کی وہ تصویریں تھیں' اب وہ خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی تھی۔ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ چھوٹی بڑی غلطیاں ہر مرد اور عورت سے ہوتی ہیں۔ ایک بڑی غلطی اس امیرزادی سے بھی ہو گئی۔ وہ تصویریں پولیس والوں کے ہاتھ لگتیں تو امیرزادی کی موجودہ شرافت اور نیک نامی پر حرف آتا۔ اس کا شوہر اسے طلاق دے دیتا اور دو بچے دربدر ہو جاتے۔"

ایک گناہ کا اثر بہت دور اولاد تک پڑتا ہے۔ فاروق بٹ نے ایسے گناہ کو لاکر میں چھپا دیا تھا۔ اس کی بیوی سعیدہ نے کہا تھا۔ "بہتر ہے' ان تصویروں کو جلا ڈالیں۔ انہیں چھپا کر رکھنا بھی ایک گناہ ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں لیکن یہ تصویریں جل کر راکھ ہو جائیں گی اور چوہدری کبھی فرعون بنے گا تو میں اسے آمنہ اور صنم آراء کے ساتھ نیکی کرنے پر مجبور نہیں کر سکوں گا۔ ہم

اسے کلام پاک کی آیتیں سنا کر صراط مستقیم پر چلا نہیں سکتے۔ شیطان کو ہتھیار سے ہی مارا جا سکتا ہے۔ جب تک یہ تصویریں رہیں گی وہ آمنہ کے گھر والوں کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کرتا رہے گا۔"

وہ خیالات سے چونک گیا۔ افسر نے گرج کر پوچھ رہا تھا۔ "کیا سوچ رہے ہو۔ اس کاغذ پر لکھو۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "نہیں۔ مجھ سے جبراً نہ لکھواؤ۔ میں نہیں لکھوں گا۔"

انکار کرنے پر پھر اس کی پٹائی ہونے لگی۔ اس کے جسم کے ایسے ایسے حصوں پر ڈنڈے مارے جاتے تھے کہ وہ تکلیف کی شدت سے حلق پھاڑ کر چیختا تھا۔ حلق پھاڑتے وقت منہ کے اندر ڈنڈا زور سے گھسایا جاتا تھا۔ حلق لہولہان ہوتا تھا۔ کئی دانت ٹوٹ گئے تھے۔ ایسی ظالمانہ ضربیں لگائی جاتی تھیں کہ گھٹنوں اور کہنیوں کی ہڈیاں ٹوٹتی ہوئی سی لگتی تھیں۔ دونوں ہاتھ پاؤں یوں ڈھیلے پڑ کر جھول گئے تھے جیسے ان میں ہڈیاں نہ رہی ہوں۔

وہ برداشت کی آخری حد تک یہی کہتا رہا۔ "عورتوں کی شرم رکھو۔ خدا کہتا ہے، ہم تمہیں قیامت کے دن ماؤں کے نام سے پکاریں گے۔ اس کا مطلب ہے، خداوند کریم اولاد کے ساتھ ان کی ماؤں کی بھی شرم رکھے گا۔ جب وہ پردہ رکھتا ہے تو تم بھی رکھو۔ اس لاکر کے کھلنے سے تین عورتوں کی زندگیاں برباد ہو جائیں گی۔ میں مر جاؤں گا لیکن اپنی بیوی کو یہ نہیں لکھوں گا کہ وہ چابی تمہارے حوالے کر دے۔"

آخر وہ بے ہوش ہو گیا۔ افسر نے ماتحت سے کہا۔ "اس کی گھر والی کے پاس جاؤ اور کہو تمہارا شوہر تم سے ملنا چاہتا ہے اور تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس عورت کے ساتھ کسی اور رشتے دار کو نہ لاؤ۔"

ماتحت دو سپاہیوں کے ساتھ چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد اس کی بیوی سعیدہ کو ساتھ لے آیا۔ سعیدہ نے اپنے شوہر کو دیکھا تو پہلی نظر میں پہچان نہ سکی۔ مار کھاتے کھاتے اس کا جسم اور چہرہ سوج گیا تھا۔ وہ پسینے میں اور لہو میں ڈوبا ہوا تھا۔ کھلے ہوئے منہ میں کئی دانت نظر نہیں آ رہے تھے، چہرہ کچھ ٹیڑھا ہو گیا تھا۔

پھر سعیدہ نے اسے پہچانتے ہی چیخ ماری۔ دوڑتی ہوئی جا کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ ننگے فرش پر ننگا پڑا تھا۔ افسر نے کہا۔ "یہ ابھی زندہ ہے۔ بے ہوش ہو گیا ہے۔"

وہ روتی ہوئی بولی۔ "میرے فاروق پر کیوں ظلم کر رہے ہو۔ اس کا جرم کیا ہے؟"

"یہ کسی دشمن ملک سے بھاری رقم لے کر شہروں میں دہشت پھیلاتا ہے، تخریب کاری کے ذریعے حکومت وقت کو بدنام کرتا ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔"

"اگر جھوٹ ہے تو اپنے لاکر کی چابی دو۔ ہمیں شبہ ہے کہ اس نے تمہارے لاکر میں خفیہ دستاویزات کو چھپایا ہے۔"

"میرے لاکر میں ایسی کوئی دستاویز نہیں ہے۔"

"تمہارے شوہر کے خلاف کوئی مواد نہیں ملے گا تو ہم اسے رہا کر دیں گے۔"

وہ بولی۔ "بینک ابھی بند ہے۔ صبح میرے ساتھ چلو۔ میں وہ لاکر کھول کر تمہیں دکھاؤں گی۔"

"تم یہاں سے جا کر کسی سے ٹارچر سیل کا ذکر نہیں کرو گی۔ یہ یہاں جس طرح لایا گیا تھا اسی طرح خاموشی سے تمہارے حوالے کر دیں گے۔ اگر ہمیں قانون کی زد میں لانے کی حماقت کرو گی تو تمہیں اس کی لاش ملے گی۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "میں کسی سے ذکر نہیں کروں گی۔ تمہیں خدا کا واسطہ دیتی ہوں اس پر اور ظلم نہ کرو۔"

سعیدہ نے اپنی زبان بند رکھی۔ دوسری صبح اس افسر کے ساتھ بینک گئی۔ منیجر سے دوسری چابی لے کر لاکر کھولا۔ افسر نے لاکر کی تلاشی لی۔ وہ ایک لفافہ ہی اس کے کام کا تھا۔ اس میں چوہدری کی مطلوبہ تصویریں تھیں۔

سعیدہ نے ان تصویروں کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ افسر نے پوچھا۔ "ان کے علاوہ کتنی تصویریں ہیں؟"

وہ بولی۔ "صرف اتنی ہی تصویریں ہیں۔"

"میں یہ لفافہ لے جا رہا ہوں۔"

"پلیز اسے نہ لے جائیں۔ یہ جس عورت کی تصویریں ہیں وہ شریفانہ زندگی گزار رہی ہے۔"

"وہ عورت بدنام نہیں ہو گی۔ اس لفافے کے بدلے ہی تمہارے شوہر کو رہائی مل سکتی ہے۔ بولو یہ لفافہ چاہتی ہو یا فاروق بٹ کی رہائی؟"

وہ بولی۔ "لعنت ہے ایسی تصویروں پر۔ میرے فاروق کو رہا کر دیں۔"

"تم گھر جاؤ۔ وہ آج شام تک گھر پہنچ جائے گا۔"

سعیدہ لاکر کو لاک کر کے چلی گئی۔ افسر لفافہ لے کر بینک کے باہر آیا۔ باہر ایک قیمتی کار کی پچھلی سیٹ پر چوہدری امانت علی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے افسر سے لفافہ لے کر تصویریں دیکھیں پھر مطمئن ہو کر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ اب فاروق بٹ کا لاکر چیک کرو۔"

افسر نے دوسرے بینک میں منیجر کو فاورق بٹ کا اجازت نامہ اور دوسری چابی دکھائی۔ منیجر نے وہ لاکر کھول دیا۔ اس کی تلاشی لینے پر کوئی تصویر نہیں ملی۔ افسر نے باہر آکر کہا۔ ”وہاں کچھ نہیں ہے۔“

چوہدری نے خوش ہو کر افسر کو ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا۔ ”اس میں پچاس ہزار ہیں۔ تم چند ہفتوں میں ترقی پا کر چیف بننے والے ہو۔ پیشگی مبارک باد قبول ہو۔“

قانون اور غنڈا سیاست ایک دوسرے کو مصافحہ کرنے لگے۔

☆=========☆=========☆

آمنہ بہت خوش تھی۔ بیٹی کو دلہن بنایا گیا تھا۔ بارات آرہی تھی۔ پورے گھر کو رنگ برنگے قمقموں سے سجایا گیا تھا۔ فلمی سہاگ گیتوں کی آواز دور دور تک گونج رہی تھی۔ محلے کے مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے سب ہی شادی میں شریک تھے اور ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ ”واہ صنم آراء نے کیا قسمت پائی ہے! بڑے گھر میں راج کرے گی راج۔“

دوسرے نے کہا۔ ”سسر کو راج مل رہا ہے تو بہو کیوں نہ راج کرے گی۔“

ایک اور نے کہا۔ ”اسی محلے والوں نے آمنہ پر کتنی کیچڑ اچھالی تھی۔ بے چاری کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔“

”یہ سچ ہے، خدا جسے نیک نامی دیتا ہے، اسے کوئی بدنام نہیں کر سکتا۔“

بارات بینڈ باجے کے ساتھ آتش بازیوں کا مظاہرہ کرتی ہوئی آئی۔ جانو اور اس کے بیٹے باراتیوں کا استقبال کرنے لگے۔ چوہدری امانت علی نے سیکڑوں افراد کے سامنے جانو کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے عوام کے سامنے وعدہ کیا تھا کہ اس گھر سے بہو لے کر جاؤں گا۔ آج وہ وعدہ پورا کرنے آگیا ہوں۔ قاضی صاحب، نکاح پڑھائیں۔“

تمام لوگ چوہدری امانت علی زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ شادی کی تقریب سیاسی جلسہ لگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد نکاح پڑھا دیا گیا۔ نکاح کے بعد کھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسی وقت چوہدری کے سیکریٹری نے آکر کہا۔ ”جناب! اسلام آباد سے کال آئی ہے۔ آپ کو اسی وقت بلایا گیا ہے۔“

چوہدری نے جانو سے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے، ابھی مجھے جانا ہو گا۔“

پھر اس نے لوگوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میں ملک اور قوم کی خدمت کے لیے سیاست میں آیا ہوں۔ یہ خدمت کا جذبہ ہے کہ میں بیٹے کی خوشیاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جانو بھائی! میرے جانے کے بعد جتنی جلدی ہو سکے بیٹی کو رخصت کر دیں۔ میں کل شام

تک واپس آؤں گا۔“

وہ جانو سے مصافحہ کر کے لوگوں کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ کوئی باپ اپنے بیٹے کی شادی چھوڑ کر جاتا تو طرح طرح کی باتیں بنائی جاتیں لیکن وہ ملک اور قوم کی خدمت کرنے گیا تھا اس لئے سب ہی تعریفیں کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ ”ہم نے صحیح حقدار کو ووٹ دیئے ہیں۔“

رات کے گیارہ بجے آمنہ نے روتے ہوئے اور آنسو پونچھتے ہوئے صنم آراء کو داماد کے ساتھ رخصت کر دیا۔ محلے کے لوگ بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ شادی والے گھر میں خاموشی چھا گئی۔ یہ خاموشی زیادہ دیر تک نہیں رہی۔ پھر آدھے گھنٹے کے بعد ہی کچھ باراتی گاڑی میں بیٹھ کر واپس آئے پھر باہر والے گیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ”جانو بھائی! باہر آؤ، یہ کیا مذاق ہے۔ تمہاری بیٹی اپنے یار کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔“

یہ آوازیں دور تک گئیں۔ مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھلنے لگے۔ جانو کے جوان بیٹوں نے باہر آکر پوچھا۔ ”یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ تم لوگ تو وہی ہو جو بارات ساتھ لائے تھے۔“

ایک نے کہا۔ ”ہاں، ہم چوہدری صاحب کے خاص بندے ہیں ابھی راستے میں بہت سے مسلح افراد نے ہمیں روک لیا تھا۔ انہوں نے تمہارے بہنوئی شاہد کو گاڑی سے نکال کر مارا۔ ایک نوجوان نے تمہاری بہن کو گاڑی سے نکال کر کہا۔ ”صنم آراء ان سے کہہ دو کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو، یہ ہمارا پیچھا نہ کریں۔ ورنہ ایک ایک کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔“

دوسرے باراتی نے کہا۔ ”صنم آراء نے ہمارے سامنے گھونگھٹ اٹھا کر کہا کہ وہ جوان اس کا عاشق ہے اور وہ اپنی خوشی سے اس کے ساتھ جا رہی ہے۔“

فخرالدین نے کہا۔ ”یہ جھوٹ ہے، ہماری بہن ایسی نہیں ہے۔“

تیسرے باراتی نے کہا۔ ”ہم جھوٹ بولتے ہیں تو اسپتال چل کر اپنے بہنوئی کو دیکھو۔ کیا تمہارے بہنوئی کی زبان اور اس کے زخم بھی جھوٹ بولیں گے۔“

جانو اور قمرالدین ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر اسپتال کی طرف چلے گئے۔ محلے کی عورتیں آکر پوچھنے لگیں۔ ”یہ صنم آراء نے کیا نادانی کی ہے؟ اچھا خاندان چھوڑ کر کس کے ساتھ گئی ہے؟“

آمنہ نے چیخ کر کہا۔ ”میری بیٹی ایسی نہیں ہے۔ ایک ماں سے زیادہ اس کی اولاد کو

کوئی نہیں جانتا۔ میری بیٹی کسی سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتی تھی' اسے الزام دیا جارہا ہے۔"

ایک عورت نے کہا۔ "الزام کون دے رہا ہے؟ کیا چوہدری صاحب کے باراتی؟ کیا تمہارا داماد جو اسے عزت و آبرو سے لے گیا اور اپنے گھر پہنچنے سے پہلے اسپتال پہنچ گیا؟ چوہدری تم لوگوں کو پستی سے اٹھا کر بلندی پر لے جا رہا تھا کیا اسے الزام دے رہی ہو؟"

ساری عورتیں کچھ نہ کچھ کہنے لگیں۔ اسے باتیں سنا کر جانے لگیں۔ مرد حضرات بھی آمنہ کے بیٹوں سے کہہ رہے تھے۔ "جو ہوا برا ہوا۔ تمہارا باپ اور بھائی اسپتال سے واپس آئیں گے تو حقیقت سامنے آجائے گی۔"

محلے والوں کی نیندیں اُڑ گئی تھیں۔ وہ جانو اور قمرالدین کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ان باپ بیٹے نے اسپتال پہنچ کر دیکھا۔ چوہدری کا دلہا بیٹا شاہد بستر پر پڑا ہوا تھا۔ سر پر' ہاتھوں اور پیروں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ چوہدرائن نے جانو کو دیکھتے ہی کہا۔ "آگئے جان کے دشمن! تمہارے جیسے ذلیل کمینوں کو گلے لگانے کا نتیجہ ہمیں مل رہا ہے۔"

قمرالدین نے کہا۔ "آنٹی! آپ ابھی غصے میں ہیں۔ مگر........."

وہ بولی۔ "میرے سامنے اگر مگر نہ کرو۔ میں یہ لحاظ نہیں کروں گی کہ تم میرے داماد ہو۔ میرے بیٹے کو کچھ ہو گیا تو میں گن گن کر بدلے لوں گی۔ ابھی جاتی ہوں۔ اس کے ابا کو فون کرتی ہوں۔ وہ اسلام آباد سے آکر تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

وہ روتی ہوئی اپنے رشتے داروں سے بولی۔ "میں فون کر کے آتی ہوں۔ میرے بیٹے کا خیال رکھو اور ان کیڑے مکوڑوں کو یہاں سے نکال دو۔"

وہ آنسو پونچھتی ہوئی اسپتال سے باہر آئی۔ ڈرائیور سے کہا۔ "گھر چلو۔"

چوہدری کے ایک حواری نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ جھک کر اندر بیٹھنے آئی پھر پچھلی سیٹ پر چوہدری کو دیکھ کر چونک گئی۔ چوہدری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ "خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔ بیٹے کے لئے شور مت مچاؤ۔"

وہ بیٹھ گئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ کار وہاں سے چل پڑی۔ پھر وہ بولی۔ "آپ اسلام آباد نہیں گئے؟ میں تو آپ کو فون کرنے جا رہی تھی۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "اسلام آباد سے کوئی کال نہیں آئی تھی۔ دراصل میں واپسی پر بارات کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ ہمارے بیٹے کو دشمنوں نے نہیں' میرے ہی آدمیوں نے میرے حکم سے زخمی کر کے اسپتال پہنچایا ہے۔"

چوہدرائن بے یقینی سے دیدے پھاڑ کر اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ "یہ سیاست

ہے' تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

"میں لعنت بھیجتی ہوں ایسی سیاست پر۔ آپ نے باپ ہو کر بیٹے کی پٹائی کرائی ہے اور آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"مجھے اطمینان ہے کہ بیٹے کے زخم جلد ہی بھر جائیں گے۔ ہمارا بیٹا گبھرو جوان ہے۔ تھوڑا سا خون بہہ گیا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جوانی میں یوں بھی بچے خون خرابہ کرتے رہتے ہیں۔"

"لیکن ایسا کرنے کی ضرورت کیا تھی؟"

"میں نے بلدیاتی الیکشن میں عوام کے سامنے وعدہ کیا تھا کہ صنم آراء کو بہو بناؤں گا۔ اب قومی اسمبلی میں پہنچ کر وعدے سے پھر جاتا تو عوام کی نظروں میں گر جاتا۔ خود کو گرنے سے بچانے کے لئے صنم آراء کو لوگوں کی نظروں سے گرانا ضروری تھا۔ صبح ہونے سے پہلے جانو کا پورا خاندان پہلے کی طرح بدنامی کی دلدل میں پہنچ جائے گا۔ میری نیک نامی برقرار رہے گی۔"

"یہ اچھا ہوا دلدل کے کیڑے دلدل میں گئے۔ وہ دو کوڑی کی لڑکی میری بہو بن کر دروازے تک نہیں آئی۔ میرے دل کی مراد پوری ہو گئی لیکن آپ نے میرے بیٹے کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔"

"بکواس نہ کرو۔ تمہارا بیٹا صنم آراء کا دیوانہ تھا۔ میں نے ایک بار اس کی ڈائری میں صنم آراء سے محبت کا اظہار پڑھا تھا۔ اس نے صنم آراء پر الٹے سیدھے اشعار بھی لکھے تھے۔ اگر میں اسے اپنا راز دار بنانا چاہتا اور اسے یہ بتا دیتا کہ صنم آراء کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے تو وہ مجنوں کی اولاد کبھی میرا ساتھ نہ دیتا۔"

"میں مانتی ہوں' ایک بار میں نے صنم آراء کے خلاف کچھ کہا تھا تو وہ ناراض ہو گیا تھا۔ یہ اچھا ہوا صنم آراء نے جاتے جاتے کہہ دیا کہ وہ خوشی سے جا رہی ہے اور چوہدری کے خاندان پر لعنت بھیجتی ہے۔"

چوہدری نے کہا۔ "یہ صنم آراء نے نہیں کہا تھا۔ اسے اغوا کر کے جس گاڑی میں بٹھایا گیا تھا اس میں ایک دوسری عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دلہن کی طرف سے یہ الفاظ کہے تھے۔ دلہن کا تو منہ بند رکھا گیا تھا۔ دراصل تمہارے بیٹے کو یقین دلانا تھا کہ صنم آراء بے حیا' آوارہ تھی' کسی آوارہ کے ساتھ چلی گئی۔ اب ہمارے صاحب زادے کا دماغ ٹھکانے آجائے گا۔"

وہ اپنی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ چوہدری نے کہا۔ "تم اسپتال واپس جاؤ اور یہ ظاہر کرو

کہ تم نے مجھے فون پر اطلاع دے دی ہے۔ میں اسلام آباد سے واپس آرہا ہوں۔"

وہ کار سے اتر کر کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ چوہدرائن کی کار اسپتال کی طرف گھوم گئی۔

آمنہ کے تینوں بیٹے بہن کی تلاش میں نکلے لیکن کہاں تلاش کرتے؟ اغوا کرنے والے اسے کہاں لے گئے تھے یہ معلوم کرنا آسان نہ تھا۔ انہوں نے تھانے میں رپورٹ درج کرانے کا ارادہ کیا۔ تھانے پہنچے' وہاں تمام روداد سنائی۔ ایس آئی نے کہا۔ "قومی اسمبلی کے رکن چوہدری امانت علی کی بہو کا معاملہ ہے۔ انہیں لے آؤ۔ رپورٹ درج ہو جائے گی۔"

دوسری صبح چوہدری محلے میں آیا تو سیکڑوں لوگ جمع ہو گئے۔ وہ چیخ چیخ کر بولا "میرے بزرگو اور بھائیو! تم سب گواہ ہو۔ میں نے جانو اور اس کے گھر والوں کو عزت دار سمجھ کر رشتہ کیا' یہ بھول گیا کہ غلاظت کے کیڑے غلاظت میں ہی رہتے ہیں۔ انہیں خوشبو میں رکھا جائے تو وہ مر جاتے ہیں۔ یا ہمارے دامن کو بھی داغ دار کر کے غلاظت میں واپس چلے جاتے ہیں۔ صنم آراء کے ماں باپ نے ہم سے یہ بات چھپائی کہ وہ بے حیا لڑکی کسی اور سے عشق کرتی تھی۔ اس لڑکی کا اور اس کے ماں باپ کا کچھ نہیں بگڑا۔ میرا بیٹا زخموں سے چُور اسپتال میں پڑا ہے۔ یہ ذلیل کمینے شکر کریں کہ میرا بیٹا زندہ ہے اس لئے یہ سب زندہ نظر آرہے ہیں۔ اسے کچھ ہو جاتا تو میں ایک ایک کو کتے کی موت مار ڈالتا۔"

چوہدری جانو کے گھر کی طرف تھوک کر چلا گیا۔ دوسرے بھی تھو تھو کرنے لگے۔ آمنہ اور ساجد اکیلے تھے۔ شوہر اور بیٹے صنم آراء کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ اسی طرح محلے والوں سے فی الحال منہ چھپانے کا بھی موقع مل گیا تھا۔

قمرالدین اپنے گھر آیا تو سیمانے کہا۔ "میں ایسی ذلت برداشت نہیں کر سکتی تھی اس لئے آگئی۔ وہ کمبخت ساجد دادی کو نہیں چھوڑ رہا تھا۔ میں اسے چھوڑ کر آگئی ہوں۔"

"تمہیں اماں کو ایسے وقت میں چھوڑ کر نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"ایک میں ہی نہیں امیرالدین کی دلہن کو بھی اس کے میکے والے لے گئے ہیں۔ محلے والوں کی چھی چھی تھو تھو کون برداشت کرے گا۔"

وہ بولا۔ "سچ پوچھو تو میں بھی منہ چھپا کر آیا ہوں لیکن ایک بار ہمیں جانا ہو گا۔ میں اماں ابا سے صاف کہہ دوں گا کہ ہم کبھی اس گھر میں تو کیا' اس علاقے میں قدم نہیں رکھیں گے۔"

جانو بھی دوسرے دن گھر نہیں آیا۔ وہ بھی منہ چھپا رہا تھا۔ دنیا والوں کی لعن طعن سننے کے لئے آمنہ وہاں اکیلی رہ گئی تھی۔ شام کو محلے میں شور اٹھا کہ فاروق بٹ آرہا ہے۔ وہ اپنی بیوی کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا گلی میں آیا تو مرد عورتیں سب ہی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ہر نظر پوچھ رہی تھی۔ "کیا یہ فاروق بٹ ہے؟"

اس کا حلیہ بگڑ چکا تھا۔ وہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ چہرے اور ہاتھ پاؤں پر جگہ جگہ پٹیاں چپکی ہوئی تھیں۔ چہرہ سوج گیا تھا اور ڈاڑھ کی طرف سے ذرا ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ ہونٹ موٹے ہو گئے تھے۔ آنکھیں بند ہو گئیں تھی۔ کان سے بہرا ہو گیا تھا۔ دماغ سن ہو گیا تھا' کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کا وجود' اس کا حلیہ پاکستان کا سیاسی جغرافیہ پیش کر رہا تھا۔

لوگ پوچھ رہے تھے۔ اسے کیا ہو گیا ہے؟ تم اسے کہاں سے لا رہی ہو؟

سعیدہ کے چہرے پر موت کا سناٹا تھا۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ وہ بول رہی تھی۔ اس کی آواز جیسے کسی اندھے کنوئیں سے آرہی تھی۔ "میں نہیں جانتی میرے مرد کو کیا ہو گیا ہے؟ کچھ ہو گیا ہے تو اس کا علاج ہمارے پاس نہیں ہے۔"

اس نے اپنے دروازے پر پہنچ کر فاروق بٹ کو زمین پر بٹھا دیا پھر چابی نکال کر تالا کھولنے لگی۔ ایک عورت نے پوچھا۔ "یہ بولتا کیوں نہیں ہے؟"

اس نے شوہر کو سہارا دے کر زمین سے اٹھایا پھر اندر جاتے ہوئے بولی۔ "اس کے دماغ پر چوٹ لگی ہے۔ یہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔" رفتہ رفتہ بھیڑ چھٹ گئی۔

آمنہ اپنے گیٹ پر کھڑی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ فاروق بٹ کا بگڑا ہوا حلیہ دیکھ کر دل دکھ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس شخص نے ماں بیٹی کی نیک نامی کے لیے کتنی بڑی قربانی دی ہے اور ایک پہاڑ سے ٹکرانے کے بعد اس انجام کو پہنچا ہے۔

دل پر بیٹی کے اغوا کا بوجھ تھا' جو سب سے بھاری تھا۔ دنیا کہہ رہی تھی کہ جوان بیٹی بھاگ گئی ہے۔ پہلے صرف ماں فاروق بٹ کے حوالے سے بدنام تھی۔ آج بیٹی کی بدنامی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ پہلے سے زیادہ ذلتوں کا سامنا تھا۔ اسی لئے شوہر اور بیٹے کسی کا سامنا نہیں کر رہے تھے۔

ایک ہی بات ان کے حق میں تھی اور وہ یہ کہ چاندنی رات نہیں تھیں۔ ہر سُو اندھیرا تھا۔ سردی کے باعث مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ کسی مکان کی بھی روشنی گلی میں نہیں آرہی تھی۔ اس تاریکی میں جانو منہ پر چادر لپیٹے تیزی سے چلتا ہوا اپنے گیٹ پر آیا۔ آہستگی سے دستک دی۔ آمنہ نے آکر پوچھا۔ "کون ہے؟"

”میں ہوں دروازہ کھولو۔“

اس نے دروازہ کھولتے ہی پوچھا۔ ”میری صنم آراء مل گئی؟؟“

جانو صنم آراء کو گالیاں دیتا ہوا اندر آیا۔ ”گیٹ بند نہ کرو۔ ہمارے دونوں بیٹے آرہے ہیں۔ جیسے میں چادر میں منہ چھپا کر آیا ہوں‘ ویسے وہ بھی آئیں گے۔“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”یہ ہمیں کس گناہ کی سزا مل رہی ہے؟؟“

”تیرے گناہ کی سزا ہمارے کو مل رہی ہے۔ میں پہلے ہی دن بول رہا تھا‘ وہ میری بیٹی نہیں ہے۔ گندہ خون ہے۔ آج اس سؤر کی بچی نے اپنے خون کی اصلیت دکھا دی۔“

آمنہ نے آنسو پونچھ لئے پھرتن کر بولی۔ ”ہاں گندہ خون تھا۔ تم میرا کیا کرلو گے۔ آؤ کرو۔“

جانو اس کا منہ تکنے لگا۔ اس نے سوچا نہیں تھا کہ بیوی بے حیا ہے تو اسے کیا سزا دے۔ وہ ذلتوں اور رسوائیوں کی حد سے اس قدر آگے نکل گئی تھی کہ اب سزا بھی اسے تکلیف نہیں پہنچا سکتی تھی۔ درد کا حد سے گزر جانا دوا ہوتا ہے۔

وہ بولی۔ ”دنیا والوں سے منہ چھپانے والا کیا سزا دے گا۔ میں ابھی ایک آواز لگاؤں گی تو دنیا چلی آئے گی اور تم یہاں سے بھاگ جاؤ گے۔ بھگوڑے اور بزدل شوہر! اگر تم پہلے دن سے اپنی عورت کی پارسائی کی خاطر لڑتے تو دنیا والے تمہیں مرد سمجھتے اور میں نے دیکھا ہے‘ جس گھر میں مرد ہوتے ہیں اس گھر کی کسی عورت پر باہر والے انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کرتے ہیں۔“

وہ پہلی بار اتنی سخت باتیں سن کر خاموش تھا۔ واقعی ڈر رہا تھا کہ بات بڑھانے سے بھیڑ لگ جائے گی۔ اسی وقت بڑا بیٹا قمرالدین سیما کے ساتھ آگیا۔ پانچ منٹ کے بعد امیرالدین بیوی بچوں کے ساتھ پہنچ گیا۔

سیما نے کہا۔ ”میں یہاں رہنے نہیں اپنے ساجد کو لینے آئی ہوں۔“

دوسری بہو نے کہا۔ ”سیدھی سی بات ہے۔ میں اپنے بچوں کو لے کر اس علاقے میں نہیں رہوں گی۔ یہ آج بچے ہیں کل بڑے ہوں گے۔ سب ان پر تھوکیں گے اور یہ ہماری طرح منہ چھپاتے پھریں گے۔“

باقی دو بیٹے ضمیرالدین اور فخرالدین بھی منہ چھپا کر آگئے۔

آمنہ نے کہا۔ ”تم دونوں کا بھی یہی فیصلہ ہو گا۔ یہاں نہیں رہو گے۔“

ضمیرالدین نے کہا۔ ”میں ایک کرائے کا مکان شاہدرہ میں دیکھ آیا ہوں۔ سامان باندھو‘ ہم صبح ہونے سے پہلے یہاں سے چلے جائیں گے۔“

آمنہ نے پوچھا۔ ”کوئی ایسا عمل کیوں نہیں کرتے کہ صبح تک تم سب کی عزت اور نیک نامی واپس مل جائے۔“

سب نے چونک کر اسے دیکھا۔ جانو سے پوچھا۔ ”کیا ایسا ہو سکتا ہے؟؟“

قمرالدین نے کہا۔ ”اماں ہمیشہ عقل کی بات کرتی ہیں۔ بولو اماں‘ ہمیں عزت کیسے واپس مل سکتی ہے؟؟“

وہ بولی۔ ”تمام مصیبتیں میری وجہ سے آرہی ہیں۔ شروع سے اب تک صرف میں بے حیا اور بدکار کہلا رہی ہوں جس کے نتیجے میں تم سب بدنام ہو رہے ہو۔ اگر تم سب مل کر ابھی مجھے اونچی آواز میں گالیاں دو‘ مجھے دھکے دے کر باہر نکال دو اور گلی میں مجھے مارتے ہوئے محلے سے باہر کر دو تو سب کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔“

قمرالدین نے کہا۔ ”اماں! عقل کی بات نہیں ہے۔ تم جانتی ہو ہم کبھی ایسا نہیں کریں گے۔“

”ہاں سمجھ کر نہیں کرو گے تو میری بدنامی تمہاری اولاد تک جائے گی۔ ذرا سوچو‘ صنم آراء اب واپس نہیں آئے گی۔ تم لوگ مجھے بھی سب کے سامنے مار پیٹ کر گھر سے نکال دو گے تو پھر لوگوں کے پاس آئندہ بدنام کرنے کے لئے کیا رہ جائے گا؟ کچھ نہیں رہے گا۔ تم سب غیرت مند کہلاؤ گے۔ جو بھی گھر کی گندگی باہر پھینکتا ہے وہ صفائی پسند کہلاتا ہے۔ تم سب میرے وجود کو نکال پھینکو۔ میں اپنے پوتے اور پوتیوں کا واسطہ دے کر کہتی ہوں‘ پتھر کے بن جاؤ اور مجھے پتھر مارتے ہوئے یہاں سے نکال دو۔ یہ ایک تماشا اور کرلو۔ محلے والوں کو آرام مل جائے گا۔“

کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہل رہا تھا۔ شوہر اپنی بیوی کو اور بیٹے اپنی ماں کو پتھر مار کر وہاں سے نکال نہیں سکتے تھے۔ بہویں خاموش تھیں۔ بچے سو گئے تھے۔ گھر کے اندر سناٹا چھا گیا تھا۔ وہ سب ایک کمرے میں اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے تھے۔

بیٹھے رہنے سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد آمنہ اپنی جگہ سے اٹھ کر چلی گئی۔ کمرے سے باہر جانے لگی۔ سب نے سمجھا‘ کسی ضرورت سے جا رہی ہے۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آئی پھر دروازے کو بند کر کے اس نے باہر سے کنڈی لگا دی۔ اندر والوں کو پتا نہ چلا کہ وہ قید ہو گئے ہیں۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی باورچی خانے میں آئی۔ وہاں سے دیا سلائی کی ڈبیا اور مٹی کا تیل سے بھرا ہوا کین اٹھا کر صحن میں آگئی۔ کین کو کھول کر اپنے اوپر تیل ڈالنے لگی۔ مٹی کے تیل کی مہک کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر گئی تو ایک بیٹے نے جھانک کر صحن میں دیکھا

پھر چیخ کر بولا۔ ”اماں یہ کیا کر رہی ہو؟ ابا! قمرو بھائی‘ اماں اپنے اوپر مٹی کا تیل ڈال رہی ہیں۔“

سب دوڑتے ہوئے کھڑکی کے پاس آئے۔ پھر ماں کو مٹی کے تیل میں بھیگتے دیکھ کر دروازے پر آئے۔ جانو نے کہا۔ ”یہ باہر سے بند ہے۔“

وہ دروازہ پیٹنے لگے‘ دھکے مار مار کر اسے توڑنے لگے۔ دروازہ کمزور تھا‘ ٹوٹنے لگا۔ آمنہ ماچس کی تیلی جلا چکی تھی۔ جانو کھڑکی سے کہہ رہا تھا۔ ”رک جاؤ آمنہ! تیلی پھینک دو۔“

اس نے جلتی ہوئی تیلی اپنے اوپر ڈالی۔ آگ لگی پھر شعلے بھڑکنے لگے۔ اسے پتا تھا کہ آگ جلاتی ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ کیسی غضب کی جلن ہوتی ہے۔ وہ بے اختیار چیخنے لگی۔

اس نے سوچا تھا کہ آگ لگاتے ہی گیٹ کھول کر باہر جائے گی گلی سے دوڑتی ہوئی گزرے گی اور چیختی جائے گی کہ وہ بدنامی کو آگ لگا کر محلے سے جا رہی ہے۔ مجھے گناہگار سمجھنے والو! میرے بچوں کو میری سزا نہ دو۔ انہیں اس معاشرے میں قبول کر لو۔

لیکن وہ شعلوں میں گھر کر بدحواس ہو گئی تھی۔ اسے باہر جانے کے لئے گیٹ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ ٹوٹ گیا تھا۔ کمرے سے رشتے دار اور باہر محلے دار چلے آئے تھے۔ اس پر کمبل ڈال کر آگ بجھا دی گئی تھی۔ ایمبولینس کے آتے آتے اس کی زندگی بجھ گئی۔

کمبل سے آگ بجھتی ہے۔ دوسری صبح کے اخبارات میں چوہدری امانت علی کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ اس تصویر میں وہ غریبوں اور محتاجوں کو کمبل تقسیم کر رہا تھا۔

=================

شوہر بیتی

یہ بڑی تلخ حقیقت ہے اور اسے کوئی کوئی حقیقت پسند تسلیم کرتا ہے کہ ہر شخص اپنی ذات کے اندر درزی ہوتا ہے‘ اس کے فیتے میں عورت کا وہی پہلا ناپ نہ رہے تو وہ عورت بدل دیتا ہے مگر ہوس کا فیتہ نہیں بدلتا۔

اپنے ہر عمل کو سود و زیاں کے ترازو میں تولنے والے‘ رشتوں کی نزاکت اور تقدس کو خاطر میں نہ لانے والے‘ مطلب برآوری کے لئے ہر رنگ‘ ہر وضع کا لبادہ اوڑھنے والے مردوں کی کہانی۔

نظریں حسن کو ناپ سکتی ہیں' تول نہیں سکتیں۔ درزی حسین عورت کو فیتے سے ناپتا ہے۔ عاشق اسے نظروں سے بھانپتا ہے۔ ناپتے وقت درزی کے سامنے کپڑے کا حساب ہوتا ہے۔ بھانپتے وقت عاشق بے حساب ہوتا ہے۔

عبدالمجید بیک وقت درزی بھی تھا اور عاشق بھی۔ دس برس پہلے وہ بے بی شائلہ کی شلوار قمیض کا ناپ لینے گیا تھا۔ پھر ایک ہی برس بعد ناپ لینے گیا تھا تو فیتے نے بتایا' وہ بے بی نہیں رہی ہے۔

بے چاری شائلہ دونوں پیروں سے معذور تھی۔ پیدائشی طور پر گھٹنوں سے نیچے ایڑی پنجے تک دونوں پیر بے حس تھے' حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ بالکل پتلے ہڈی جیسے تھے اور گھٹنوں سے اوپر وہ بلا کی صحت مند تھی۔ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک برس بعد فیتے نے چغلی کھائی تو عبدالمجید کا دل اس کی معذوری پر بھر آیا۔ کیا خوب ناک نقشہ تھا گورا بدن تھا۔ اس کے سلائی کئے ہوئے کپڑے پہن کر بنتی سنورتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے اس نے محنت سے تیار کیا ہوا لباس نہیں پہنا ہے بلکہ عبدالمجید نے لباس کی صورت میں اپنی محنت سے اسے پہن لیا ہے۔

جب جوانی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ جب تک لڑکپن تھا' وہ فرش پر دونوں گھٹنے ٹیک کر سیدھی ہو کر چلتی تھی۔ اپنے قد کی پوری اونچائی تک نہیں اٹھ سکتی تھی۔ کئی بار ماں اور رشتے کی بہنوں نے دونوں بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھایا تھا اور آئینے میں اس کا پورا قد اسے دکھایا تھا۔ وہ بہت خوش ہوتی تھی۔ پھر ماں بہنیں اسے فرش پر ڈال دیتی تھیں۔

اب ہمیشہ تو کوئی اسے آئینہ نہیں دکھا سکتا تھا اور نہ ہی ہمیشہ اس کا بوجھ اٹھا سکتا تھا۔ عبدالمجید نے یہ سوچا ہی نہیں کہ ایسی دل میں بیٹھ جانے والی لڑکی بوجھ ہو سکتی ہے۔ اب مجید کی ہی بات نہیں ہے۔ ابتدا میں کسی کو یہ سوچنے کی فرصت نہیں ملتی کہ محبت کا وزن ہوتا ہے۔ شادی سے پہلے اسے پھول پیش کرو' وہ نہایت ہلکا ہوتا ہے۔ شادی کے بعد گلدستہ پیش کرو' وہ ذرا بھاری ہوتا ہے۔ اس کے بعد بیوی ہر سال دو سال بعد ایک

گلدستہ پیش کرتی جاتی ہے۔ وزن بڑھتا جاتا ہے۔ اس کے بعد قوتِ برداشت کا امتحان ہوتا ہے۔ ہندو دھرم کے مطابق ہماری پوری دنیا کو ایک بیل نے اپنے سینگوں پر اٹھا رکھا ہے۔ مرد کیا بیل سے کیا گزرا ہے؟ وہ بھی پوری دنیا کا بوجھ دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیتا ہے لیکن آہ! بیوی پرانی ہوتی جائے تو اس کی قوتِ برداشت جواب دے جاتی ہے۔

دنیا کی تمام بیویاں ابھی' اسی لمحے میں بیٹھ کر ذرا غور کریں۔ پہلی بہاروں میں اپنے بازوؤں پر انہیں اٹھا کر سیج پر لانے والا شوہر کیا بچوں کی بہاروں کے بعد انہیں بازوؤں میں اٹھا کر لاتا ہے۔ وہ تو آتے ہی بستر پر گر جاتا ہے اور حکم دیتا ہے۔ "بھئی میں تھک گیا ہوں۔ خود ہی چلی آؤ۔"

عبدالمجید نے ناولوں میں پڑھا' فلموں میں دیکھا کہ ہیرو اپنی ہیروئن کو دونوں بازوؤں میں اٹھائے افق کے پار جا رہا ہے۔ جبکہ ہیروئن دونوں پیروں سے چل سکتی تھی۔ بازوؤں میں اٹھائے جانے کی حق دار معذور شائلہ تھی اور وہ خیالوں ہی خیالوں میں یہ حق ادا کرتا تھا۔ ایک معذور کو اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا کر ثواب بھی کماتا تھا اور اپنا کلیجہ بھی ٹھنڈا کرتا تھا۔

بظاہر وہ ایسی مجبور بھی نہیں تھی۔ ایک وسیع و عریض کوٹھی میں رہتی تھی۔ والدین کی ایک ہی بیٹی تھی۔ باقی چار بھائی اس کی حالت کے پیشِ نظر اسے بڑی محبت دیتے تھے۔ وہ وھیل چیئر پر بیٹھ کر کسی کی مدد کے بغیر کوٹھی کے اندر اور باہر گھومتی پھرتی تھی۔ اسی پہیوں والی کرسی پر کھانے کی میز تک چلی جاتی تھی اور اسی کرسی کے ذریعے خودکار زینے سے کوٹھی کے اوپری حصوں میں پہنچ جاتی تھی۔ ایک مخصوص گاڑی تھی جس کے پچھلے حصے میں وھیل چیئر سمیت آ جاتی تھی اور کھڑکی سے باہر کے نظارے دیکھتی جاتی تھی۔

دولت کے ذریعے جتنی سہولتیں حاصل ہو سکتی تھیں' وہ حاصل ہو چکی تھیں لیکن اس کے بعد بھی بہت کچھ رہ گیا تھا۔ وہ وھیل چیئر سے خود اتر کر اپنے بستر پر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ایسا کرنے کے لئے دونوں پنجوں کو زمین پر رکھنا لازمی تھا جبکہ گھٹنوں سے نیچے دونوں پیر بے حس تھے' بیکار تھے۔ جب تک جوان نہیں ہوئی تھی اسے بھائی اٹھا کر بستر پر لٹاتے تھے۔ پھر ماں نے دو صحت مند عورتوں کو انہی خدمات کے لئے رکھا۔ وہ اسے اٹھا کر بستر تک اور باتھ روم تک پہنچاتی تھیں اس کے بعد ماں ان عورتوں کو باہر کر کے بیٹی کو غسل کراتی تھی۔

وہ کچھ زیادہ ہی شرمیلی تھی۔ ماں کے سوا رشتے کی کسی عورت کے سامنے غسل نہیں کرتی تھی۔ یوں ماں باپ کو سوچنے پر مجبور کرتی تھی کہ آگے کیا ہوگا؟ ماں آج ہے'

کل نہیں بھی ہو سکتی ہے۔ زندگی اچانک مختصر ہو سکتی ہے۔ پھر شمائلہ کا کیا بنے گا؟

چنانچہ ایک داماد کی فکر لاحق ہو گئی۔ خاندان میں لڑکے بہت تھے لیکن اس بات کی ضمانت نہیں تھی کہ وہ ڈیوٹی کے مطابق شمائلہ کو اٹھا کر بستر اور غسل خانے تک پہنچاتے رہیں گے۔ کبھی وہیل چیئر میں کوئی خرابی پیدا ہو جاتی تھی ایسے میں کوٹھی کی نچلی منزل سے پہلی منزل پر اسے پہنچانے کے لئے پہلوان شوہر کی ضرورت تھی۔

خاندان میں ٹیڈی لڑکے زیادہ تھے۔ ایسے دھان پان سے تھے کہ انہیں اوور کوٹ پہنایا جاتا تو ان کے لئے اوور ہو جاتا۔ اندیشہ تھا زمین میں دھنس جائیں گے۔ باقی اپنے اپنے کاروبار سے لگے ہوئے جوان تھے' خوب کماتے تھے' خوب عیش کرتے تھے' انہیں دو پیروں والی سرو قد حسینائیں مل سکتی تھیں پھر وہ آدھی کو کیوں قبول کرتے۔

عبدالمجید کے فیتے نے دس برس پہلے دریافت کیا تھا کہ وہ جوان ہو رہی ہے' ان دس برسوں میں وہ باغ و بہار ہو گئی تھی۔ ان دس برسوں میں بدن ایسا انقلابی ہو چکا تھا کہ ناپ لیتے لیتے عبدالمجید کے اندر شراب بھر جاتی تھی۔ وہ راتوں کو کروٹیں بدلتا تھا پھر اندر کا غبار اسے بٹھا کر اٹھا دیتا تھا۔ وہ اپنے خالی بستر پر دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پرستوں کو مخاطب کرتا تھا۔ بالکل ہی آپے سے باہر ہو کر کہتا تھا۔ "ارے کچھ تو خیال کرو۔ وہ فیتے سے اوپر نکلی جا رہی ہے۔"

وہ مہنگے علاقے کا معروف ٹیلر ماسٹر تھا۔ بڑی بڑی بیگمات اور رئیس زادیوں کے لباس تیار کرتا تھا۔ ایک بار جس کا ناپ لیتا تھا اسے کبھی نہیں بھولتا تھا۔ صرف آرڈر لکھتا تھا اور لباس تیار کر دیتا تھا۔ اس نے شمائلہ کو بھی ایک ایک انچ یاد رکھا تھا۔ اس کے باوجود فیتہ لے کر پہنچ جاتا تھا۔ ایک بار شمائلہ نے کہا۔ "تم نے پچھلے ماہ دو لباس تیار کئے۔ ان کا ناپ تو لکھا ہوا ہو گا۔"

بات معقول تھی لیکن قریب ہونے کا موقع ہاتھ سے نکل رہا تھا' اس نے بات بنائی "قمیض کا ناپ ضرور ہے۔ کوٹی کا نہیں۔ میں چاہتا ہوں........."

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "میں لیٹی ہوئی ہوں۔ اب اٹھنا نہیں چاہتی قمیض اور کوٹی کے ناپ میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ پھر تم تو ماسٹر ہو' انیس بیس کے فرق کو سنبھال لو گے۔"

وہ مایوس ہو کر جانے لگا' وہ بولی۔ "لباس کب تک تیار ہو جائے گا؟"

"میں آج شام کو ہی لا سکتا ہوں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "معلوم ہوتا ہے تم صرف میرے ہی کپڑے سیتے ہو۔"

وہ نظر بھر کر دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ سچ ہے۔ صرف تمہارے کپڑے سیتا ہوں۔ باقی بیگمات کے کپڑے میرے ملازم تیار کرتے ہیں۔"

وہ نظریں پھیر کر دوسری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں شام کو انتظار کروں گی۔"

شمائلہ کا یہ انداز بہت کچھ کہہ گیا۔ نظریں پھیرنے کا مطلب تھا' ناگواری اور شام کو انتظار کرنے کا مطلب تھا کہ وہ گوارا ہے اور جب گوارا ہے تو اس نے نظریں پھیر کر نہیں' نظریں چرا کر انتظار کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ کچھ باتیں زبان سے کہو تو سمجھ میں نہیں آتیں' وہی باتیں ادائیں سمجھا دیتی ہیں۔

وہ بیڈ روم سے باہر بالکونی میں آیا۔ پھر زینے سے اترنے لگا۔ نیچے ڈرائنگ روم میں شمائلہ کے والد برکت علی اپنی بیگم اور ایک بیٹے کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ عبدالمجید انہیں سلام کر کے جانا چاہتا تھا۔ برکت علی نے کہا۔ "ارے مجید میاں' کبھی ہمارے پاس بھی بیٹھا کرو۔ تم تو بس ہماری بیٹی اور بیگم کے لئے ہی آتے ہو۔"

بیگم نے کہا۔ "میں تو دو چار مہینوں میں ایک آدھ جوڑا سلواتی ہوں۔ یہ ہماری شمائلہ ہی مجید میاں کو صبح شام دوڑاتی رہتی ہے۔ ارے میاں کھڑے کیوں ہو' بیٹھو!"

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "بی بی جی نے آج ہی لباس تیار کرنے کو کہا ہے۔ انشاء اللہ شام تک لے آؤں گا۔"

بیگم نے کہا۔ "ایسی بھی جلدی کیا ہے۔ وہ نچاتی ہے' تم ناچتے ہو......... شادی ہو گئی ہے تمہاری؟"

ناچنے اور نچانے کی بات کے ساتھ شادی کا ذکر کچھ معنی خیز سا لگا۔ اس نے سر جھکا کر کہا۔ "جی نہیں۔"

"خاصی عمر ہو گئی ہے پھر شادی کیوں نہیں کی؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "میرا مزاج دوسروں سے مختلف ہے۔ دوسرے اس لئے شادی کرتے ہیں کہ بیوی آ کر ان کی خدمت کرے۔ بیوی ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں بیوی کی ضرورت بننا چاہتا ہوں۔ اس کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

بیگم اور برکت علی نے ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھا۔ ان کے بیٹے حشمت نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میں پہلی بار سن رہا ہوں کہ شوہر بھی بیوی کی خدمت کرتے ہیں۔"

عبدالمجید نے کہا۔ "دنیا ایسے شوہروں کو زن مرید کہتی ہے۔ یہ نہیں سوچتی کہ بیوی اپنا میکہ اپنے تمام رشتہ دار چھوڑ کر آتی ہے۔ اگر اس کی ہر ضرورت شوہر پوری نہیں

کرے گا' اس کا ہر کام شوہر نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا۔"

بیگم نے کہا۔ "ماشاء اللہ! بڑے نیک خیالات ہیں۔"

برکت علی نے پوچھا۔ "تمہاری دکان لبرٹی مارکیٹ میں ہے' خوب چلتی ہو گی؟"

"جی ہاں' آپ کی دعاؤں سے شادمان کالونی میں ذاتی کوٹھی ہے۔ اللہ نے سوسائٹی میں عزت دی ہے۔ کوئی مجھے درزی نہیں کہتا' سب ماسٹر صاحب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔"

"بے شک' ہم بھی تمہاری بہت عزت کرتے ہیں۔"

بیگم نے کہا۔ "یوں سمجھو اپنے ہی گھر کا فرد سمجھتے ہیں۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں یہاں فیملی ممبر سمجھا جاتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے قدموں میں پڑا رہوں لیکن پڑا رہا تو شام تک لباس تیار نہیں ہو گا اور بی بی جی ناراض ہو جائیں گی؟"

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ وہ اجازت لے کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی برکت علی نے کہا۔ "باتوں ہی باتوں میں اشارے دے گیا ہے۔"

بیگم نے کہا۔ "میں تو پہلے ہی کہتی تھی۔ یہ ہماری شائلہ کے لئے بھاگا بھاگا آتا ہے۔"

"بیگم! اپنی سطح سے نیچے آتے ہوئے دکھ ہوتا ہے۔ ہم خاندانی لوگ ہیں۔ برادری کہے گی ہمیں روپیٹ کر آخر درزی داماد ملا ہے۔"

"شائلہ پچیس برس کی ہو گئی ہے۔ برادری کے ایک گھر سے بھی آج تک رشتہ نہیں آیا۔ باہر کے خاندانوں میں بھی دیکھ لیا کہ کوئی غریب یا بے روزگار ہو تو اسے داماد بنا کر کوئی کاروبار کرا دیں لیکن آپ کا دل نہیں مانتا۔ آپ کہتے ہیں جو کاروبار اور رقم کے لالچ میں شادی کرے گا اسے ہماری بیٹی سے محبت اور ہمدردی نہیں ہو گی۔ آپ کی بات بھی درست ہے۔ لے دے کر یہی ایک عبدالمجید معقول نظر آ رہا ہے۔"

حشمت نے کہا۔ "ڈیڈی! شائلہ معذور نہ ہوتی تو اور پانچ برس کسی رشتے کا انتظار کر لیتے لیکن اس معذور کے لئے کوئی نہیں آئے گا۔ کسی اور کے انتظار میں عبدالمجید بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔"

برکت علی سر جھکا کر سوچنے لگے۔ یوں تو وہ بیٹی کی پیدائش سے سوچتے آ رہے تھے۔ فکر مندی کے لئے بیٹی کا پیدا ہونا ہی بہت ہوتا ہے۔ اگر وہ معذور ہو تو والدین پہلے ہی دن سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ جوان ہوتی ہے تو ہر اچھے لڑکے پر نظر جاتی ہے۔ برکت علی نے

پورے خاندان میں پھیلے ہوئے رشتے داروں کو ٹٹول لیا۔ اچھا تو کیا برا لڑکا بھی نہ ملا۔ تب وہ اونچی سطح سے نیچے اتر کر عبدالمجید کو دیکھنے لگے تھے۔ یہ بات بیگم نے ہی ان کے کان میں پھونکی تھی کہ ٹیلر ماسٹر کے مزاج میں عاجزی ہے۔ پھر آج وہ اشاروں میں کہہ گیا تھا کہ شائلہ کا خدمت گزار بن کر رہے گا۔

بھائیوں کو اپنی اپنی شادی کی جلدی تھی۔ وہ ماں باپ کے پیچھے پڑ گئے تھے کہ اللہ کا نام لے کر شائلہ کو درزی کی جھولی میں ڈال دیں اور شائلہ بھی سمجھ رہی تھی کہ وہ بوجھ بن گئی ہے۔ آئینہ اس سے کہتا تھا کہ اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔ صرف ایک معذوری کے باعث کوئی اس کی طرف نہیں آتا تھا۔ بہت قریب آنے والا صرف عبدالمجید تھا۔ وہ جب بے بی تھی' تب سے عبدالمجید کو دیکھتی آ رہی تھی۔ اب پچیس سال کی ہو گئی تھی۔ اپنی سلور جوبلی تک اس نے ٹیلر ماسٹر کو اچھی طرح پرکھ لیا تھا۔

وہ شرمیلا تھا۔ بڑی عاجزی اور انکسار سے بولتا تھا۔ اس کی ہر بات پر ہاں جی ہاں جی' کہتا تھا۔ خاندان کے چند دل پھینک جوانوں نے شائلہ میں دلچسپی لی تھی۔ اس کے حسن و شباب کی تعریفیں کی تھیں لیکن شادی کے نام پر بھاگ گئے تھے۔ عبدالمجید نے کبھی زبان سے کچھ نہیں کہا اور جو باتیں وہ زبان سے نہیں کہتا تھا' انہیں وہ سن لیتی تھی۔ بدن کا ناپ لیتے وقت ماسٹر کے لرزتے ہوئے ہاتھ جیسے سرگوشی کرتے تھے۔ اس کی آنکھیں بھیک مانگتی ہوئی سی لگتی تھیں۔ وہ مقابل رہتا تھا لیکن کسی شرارت کے قابل نہیں رہتا تھا۔ اس بزدلی نے شائلہ کو سمجھا دیا تھا کہ یہ زندگی بھر ساتھ دینے والا بندہ ہے۔

وہ زبان کا دھنی تھا۔ وعدے کے مطابق شام کو لباس لے آیا۔ اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے آپ کی ممی سے کہا تھا' یہاں آ کر لباس کی فٹنگ دیکھ لیں لیکن وہ کچن میں مصروف ہیں۔"

"وہ نہیں آئیں گی۔ کیا تم نے نہیں دیکھا' پچھلے کئی مہینوں سے میرے کمرے میں کوئی نہیں آتا ہے؟"

"کیوں نہیں آتا ہے؟"

"باہر جا کر سوچو اور دروازے کے پاس ہی رہو۔ میں لباس پہن کر بلاؤں گی۔"

اس نے باہر آ کر دروازے کو بند کیا پھر سوچنے لگا۔ ایسی کیا بات ہو گئی کہ کوئی اس کے کمرے میں نہیں آتا ہے؟ ماں تو ضرور آتی ہو گی۔ کچھ ایسی ضرورتیں ہیں جو ماں سے ہی پوری ہوتی ہوں گی۔ باپ بھی بیٹی سے بے انتہا پیار کرتا ہے۔ ایسا ہو نہیں سکتا کہ وہ دن رات بستر پر پڑی رہتی ہو اور کوئی اسے سہارا دینے نہ آتا ہو۔

وہ سر کھجاتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”شمائلہ سچی اور کھری باتیں کرتی ہے۔ یہ جھوٹ نہیں بولے گی۔ یہ بھی سچی ہے اور گھر والے بھی اس کی محبت میں سچے ہیں۔ مگر بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ میں کئی مہینوں سے دیکھ رہا ہوں جب بھی کمرے میں آتا ہوں شمائلہ تنہا ملتی ہے۔“

کچھ دیر بعد اندر سے آواز آئی ”آجاؤ“ وہ دروازہ کھول کر اندر آیا۔ شمائلہ نیا لباس اور کوٹی پہنے بستر پر بیٹھی تھی۔ وہ ہمیشہ نیا لباس پہن کر اسے دکھاتی تھی اور وہ دیکھتا تھا۔ چوں کہ وہ پیروں پر کھڑی ہو کر گھوم نہیں سکتی تھی اس لئے وہ اس کا طواف کرتا تھا۔ آگے سے پیچھے، دائیں سے بائیں سلائی کی خامی تلاش کرتا تھا اور اپنی خامی کو سنبھالتا جاتا تھا۔ لباس کی تراش عمدہ ہو اور وہ بدن پر عمدہ فقرے کی طرح چست ہو جائے تو پھر وہ لباس نہیں رہتا، جسم پر منڈھی کھال لگتا ہے۔ اندر کا مضمون لفافے سے ہی پڑھ لیا جاتا ہے۔ شمائلہ نے کہا۔ ”تم دیکھنے میں دیر لگاتے ہو۔ بتاؤ تو سہی لباس کیسا لگ رہا ہے؟“

بستر کے سامنے کچھ فاصلے پر قدِ آدم آئینہ تھا۔ وہ آئینے میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں کچھ کہوں گا تو اپنے منہ میاں مٹھو کہلاؤں گا۔ آپ فرمائیں، کیا میری محنت میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟“

وہ آئینے میں خود کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ بولی۔ ”میں جانتی ہوں، تم بہت بڑے فن کار ہو۔ یہ کوٹی کیسی لگ رہی ہے؟“

”کیا عرض کروں۔ دوسری لڑکیاں طرح طرح کے لباس سے اپنے حسن میں اضافہ کرتی ہیں لیکن آپ کے بدن پر آ کر لباس کا حسن بڑھ جاتا ہے۔“

”میں نئے لباس کی تعریف سننا چاہتی تھی، تم نے میرے بدن کی تعریف کر دی۔ کیا تم کچھ اوور نہیں ہو گئے؟“

وہ گڑبڑا گیا۔ جلدی سے بولا۔ ”شرمندہ ہوں۔ بے اختیار کچھ سے کچھ کہہ گیا۔“

”اگر یہاں ممی ہوتیں یا کوئی اور ہوتا تو تم بے اختیار ہو سکتے تھے؟“

”نہیں، میں محتاط رہ کر بولتا۔“

”یعنی تنہائی نے احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیا اور تمہارے اندر چھپی ہوئی بے اختیاری باہر آ گئی۔“

”ہاں جی، ہاں جی۔ یہ غلطی ہو گئی۔“

”یہ غلطی نہیں ہوئی بلکہ تم سے غلطی کرائی گئی ہے۔ اتنی دیر سے دروازے کے باہر کھڑے سوچ رہے تھے پھر بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم یہاں آتے ہو تو گھر

کوئی فرد ادھر نہیں آتا۔ یہ بزرگ جانتے ہیں کہ تنہائی میں لڑکے لڑکی کچھ بے باک ہو جاتے ہیں۔ جو باتیں اوروں کے سامنے نہیں ہوتیں وہ تنہائی میں بے اختیار ہوتی چلی جاتی ہیں۔“

عبدالمجید کے دیدے حیرت سے پھیل گئے۔ کھوپڑی روشن ہو گئی۔ بات اب سمجھ میں آئی۔ وہ بولا۔ ”معافی چاہتا ہوں، پہلے میں سمجھ نہیں پایا تھا یا شاید سمجھ رہا تھا مگر حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔“

”اب حوصلہ کرو جو باتیں دل میں ہیں، انہیں زبان پر لاؤ۔“

”ہاں جی ضرور، کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟“

وہ جل کر بولی۔ ”بہتر ہے اپنی ماں سے پوچھ کر آؤ۔ میری ماں کو تو اعتراض نہیں ہے۔ تم عجیب آدمی ہو، یہاں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے اور تم پاس بیٹھنے کی اجازت طلب کر رہے ہو۔“

وہ دھپ سے بستر کے سرے پر اس کے قریب بیٹھ گیا پھر بولا۔ ”میں بیان نہیں کر سکتا، مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ میں شاعر نہیں ہوں، اپنی خوشی بیان نہیں کر سکوں گا مگر یوں لگ رہا ہے کہ ورلڈ کپ جیت کر لے آیا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”شاعر ہونا ضروری نہیں ہے۔ آدمی اپنے اندر سے بولے تو بے اختیار سچائی نکلتی ہے۔ میں ایک چاندی کا کپ ہوں جسے ٹرالی اور وہیل چیئر پر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا جاتا ہے یا پھر اسے جیتنے والا اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھائے چلتا ہے۔ کپ اس کے ساتھ نہیں چل سکتا۔“

”آپ اس پہلو سے باتیں کرتی ہیں، جس سے دل دُکھتا ہے۔ آپ اس پہلو سے کیوں نہیں سوچتیں کہ چاندی کے کپ کی طرح ایک جگہ رکھی ہوئی ہیں۔ ایک چیلنج بنی ہوئی ہیں کہ اتنی بڑی دنیا میں ہے کوئی مرد جو آپ کی چمک دمک کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا لے۔ ورلڈ کپ شہرت دیتا ہے۔ آپ محبت دیتی ہیں۔ وہ گھر آ کر شوکیس میں رکھا جاتا ہے۔ محبت گھر میں آ کر ہمیں ذہین نسل دیتی ہے۔ یہ ہماری دنیا کبھی ایک انچ آگے نہ بڑھتی اگر عورت اولاد نہ دیتی۔ ہاتھوں پیروں سے معذور رہنے والی عورتوں نے ثابت و سالم اور بے عیب انسانوں کو جنم دیا ہے۔ پھر آپ مثبت انداز میں کیوں نہیں سوچتیں؟ اگر سوچنے کے لئے سہارے کی ضرورت ہو تو یہ ناچیز حاضر ہے۔ میں صرف سوچتا سمجھتا ہی نہیں ہوں، ذرا شہ ملے تو عمل بھی کرتا ہوں۔“

وہ حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی، پھر بولی۔ ”ماسٹر تم بولتے بھی ہو؟ میں تو تمہیں

گونگا ہی سمجھتی آرہی تھی۔"

عبدالمجید نے سر گھما کر بند دروازے کو دیکھا پھر کہا۔ "میں شاید آج بھی نہ بولتا اور شاید نہیں بول رہا ہوں۔ یہ بند دروازہ بول رہا ہے۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ میں بزدل ہوں۔"

"اب بزدل نہیں رہے۔ بولتے جاؤ۔"

"آج صبح آپ کے والدین سے کچھ ایسی باتیں ہوئیں جیسے وہ مجھے اپنے خاندان میں کوئی جگہ دینا چاہتے ہوں۔ پھر اس کمرے میں دوسروں کی عدم موجودگی بھی بہت کچھ سمجھا رہی ہے۔ کیا میں بات آگے بڑھاؤں؟"

شمائلہ نے نظریں جھکا لیں' وہ بولا۔ "میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں شریکِ حیات بنانا چاہتا ہوں۔"

وہ دھیمی سی آواز میں بولی۔ "آ.......... آپ مجھ سے ہی کیوں شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

وہ باتوں کی دھن میں ایک انسانی کمزوری پر دھیان نہ دے سکے۔ عبدالمجید شادی کی پیش کش کرتے ہی آپ سے تم پر آگیا اور شمائلہ نے نیم رضامندی کی صورت میں تم سے آپ کا درجہ دے دیا تھا۔ یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے' مرد کو جیسے ہی جیت کا یقین ہوتا ہے وہ عورت کو آپ کے مقام سے گرا دیتا ہے اور عورت ہارنے کی خوشی میں اسے آپ جناب بناتی چلی جاتی ہے۔

عبدالمجید نے کہا۔ "یہ عجیب سوال ہے کہ میں تم سے شادی کیوں کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم نے منفی انداز میں سوچ لیا ہے کہ تم سے کوئی شادی نہیں کرے گا۔ تم حسین ہو' بے حد حسین' تم جوان ہو' بے حد جوان' تم لباس کی کترن نہیں ہو' مکمل لباس ہو' ایسی بھرپور ہو کہ تمہیں دیکھ کر درزی شاعر بن جاتا ہے۔"

"درزی اور شاعر کبھی بوجھ نہیں اٹھاتے۔ ایک سوئی پکڑتا ہے اور دوسرا قلم اور میرا موجودہ وزن ایک من پندرہ سیر ہے۔ مجھے وہیل چیئر سے اٹھا کر بستر پر لانا ہوتا ہے۔ بستر سے ہر صبح باتھ روم میں پہنچانا پڑتا ہے۔ وہیل چیئر میں خرابی پیدا ہو تو مجھے نچلی منزل سے اوپری منزل پر لایا جاتا ہے۔ کوئی بہت ضروری تقریب ہو اور میری موجودگی پر اصرار کیا گیا ہو تو ہر جگہ وہیل چیئر کام نہیں آتی۔ بھری محفل میں مجھے اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بٹھانا پڑتا ہے۔ ٹرین اور ہوائی جہاز کے سفر میں بھی یہی ہوتا ہے۔"

درزی ناپتا ہے' تولتا نہیں ہے۔ شمائلہ نے اسے تول کا حساب بتایا لیکن طلب کی شدت ہو تو کوئی پہاڑ کے وزن کو بھی سمجھنا نہیں چاہتا' عبدالمجید نے سینہ ٹھونک کر کہا۔

"تم نچلی سے منزل سے اوپر منزل تک لے جانے کی بات کرتی ہو' میں تو تمہیں دونوں بازوؤں میں اٹھا کر پل صراط سے بھی گزر جاؤں گا۔"

شمائلہ نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ وہ جیسا چاہتی تھی ویسا ہی جیون ساتھی مل رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "تمہاری باتوں سے مجھے ایک نئی زندگی مل رہی ہے لیکن زبانی باتوں پر کہاں تک بھروسا کیا جا سکتا ہے۔"

"میں پکے کاغذ پر لکھ کر دوں گا کہ میری ذات سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ جب تک محنت کرنے اور کمانے کے قابل ہوں تمہاری ہر ضرورت پوری کرتا رہوں گا۔ تمہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھا کر لے جاؤں گا۔ تم کبھی کسی کی محتاج نہیں رہو گی۔"

وہ بستر پر بیٹھے ہی بیٹھے کھسکتی ہوئی تکئے کے پاس آئی' اسے ایک ہاتھ سے اٹھایا۔ نیچے دو اسٹامپ پیپر رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک پکے کاغذ پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ دوسرا کاغذ سادہ تھا۔ وہ سادا کاغذ اٹھا کر اسے دیتے ہوئے بولی۔ "مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ اچھی بھلی لڑکیاں سسرال جا کر دو کوڑی کی ہو جاتی ہیں۔ مجھ جیسی معذور کی زندگی ان سے زیادہ عبرت ناک ہو سکتی ہے۔ تم اچھے ہو یا برے' رحم دل ہو یا سنگ دل' میں تو ہر حال میں بھگت لوں گی۔ یہ اسٹامپ پیپر میں اپنے لئے نہیں' اپنے والدین کی تسلی کے لئے لکھوا رہی ہوں۔ تم انہیں میرے تحفظ کی جو بھی ضمانت دے سکتے ہو' وہ لکھ دو۔"

وہ شمائلہ سے کاغذ لے کر ایک میز کے پاس آیا۔ وہاں سے کلپ بورڈ اور قلم اٹھا کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا پھر پکے کاغذ پر لکھنے لگا۔ "میں مسمی عبدالمجید ولد عبدالحمید ساکن شادمان کالونی بقائمی ہوش و حواس مندرجہ ذیل حقائق قلم بند کر رہا ہوں۔

"میں شمائلہ بانو بنت برکت علی کے ساتھ شادی خانہ آبادی چاہتا ہوں۔ شمائلہ بانو کے بزرگوں کی رضامندی سے ہمارا نکاح پڑھایا گیا تو میں شمائلہ بانو کا صرف مجازی خدا ہی نہیں' محافظ بھی بن کر رہوں گا۔ جب تک محنت کرنے اور کمانے کے قابل ہوں اپنی ہونے والی شریکِ حیات شمائلہ بانو کی ہر ضرورت پوری کرتا رہوں گا۔ وہ میری زندگی میں کسی کے سہارے کی محتاج نہیں رہے گی۔ میں جیون ساتھی کی حیثیت سے ساری عمر ساتھ نباہتا رہوں گا۔ کبھی اسے بے یارو مددگار نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی معذوری کے پیشِ نظر جب بھی اور جہاں بھی اسے اٹھا کر لے جانا پڑا' میں لے جاؤں گا اور ایسے ٹھوس انتظامات کروں گا کہ معذوری اس کی پریشانیوں کا سبب نہ بنے۔

"میں صرف شمائلہ بانو کو شریکِ حیات بنانا چاہتا ہوں' اس کی دولت اور جائیداد کو

نہیں۔ لہٰذا میں، کوئی جہیز قبول نہیں کروں گا۔ شمائلہ کے والدین اور بھائیوں سے کار، کوٹھی، پلاٹ یا نقد رقم کبھی طلب نہیں کروں گا۔ خدا نے مجھے بہت دیا ہے۔ اپنی شمائلہ کے لئے کچھ مانگنا ہوا تو صرف خدا سے مانگوں گا۔"

وہ صوفے سے اٹھ کر پھر شمائلہ کے پاس آیا اور تحریر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اسے پڑھ لو، اس کے علاوہ جو لکھنے کو کہو گی لکھ دوں گا۔"

وہ پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے اچانک اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، اس نے سر اٹھا کر پوچھا۔ "آپ جہیز نہیں لیں گے؟ کار کوٹھی، رقم کچھ نہیں لیں گے؟ کیا میں یہی پڑھ رہی ہوں؟ کیا آپ نے یہی لکھا ہے؟"

"ہاں، یہی لکھا ہے۔ بار بار پڑھ کر دیکھ لو۔"

"میں نے دوبار پڑھا ہے۔ آپ کچھ نہیں چاہتے، صرف مجھے چاہتے ہیں پھر آپ کیا حاصل کریں گے۔ خالی ڈبہ اور خالی بوتل بھی پچیس پچاس میں بک جاتی ہے۔ جہیز میں دولت اور جائیداد کے بغیر میں پچیس پیسے کی بھی نہیں ہوں۔"

"محبت وہی ہوتی ہے جو ایک پیسے کی بھی نہیں ہوتی، اس کا کوئی مول ہی نہیں ہوتا۔"

"لیکن میں نے ہوش سنبھالتے ہی سنا ہے کہ مجھے کوئی بھاری جہیز کے بغیر قبول نہیں کرے گا۔ میرے پیدا ہوتے ہی والدین نے گلبرگ میں ایک پلاٹ اور لاکھوں روپے کے سیونگ سرٹیفکیٹ خرید لئے تھے۔ آپ جہیز نہ لیں تب بھی یہ سب کچھ میرا ہی رہے گا۔ اور جو کچھ میرا ہے، وہ آپ کا ہی ہو گا۔"

"وہ میرا کبھی نہیں ہو گا۔ مجھے اپنی دولت اور جائیداد کا حساب نہ بتاؤ، میں تمہیں صرف تمہیں دلہن بنا کر لے جانا چاہتا ہوں۔"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مجھے کسی لالچ یا غرض کے بغیر کوئی چاہنے والا ملے گا۔ آج پہلی بار میں خود کو خوش نصیب سمجھ رہی ہوں۔"

اس نے اسٹامپ پیپر پر تحریر کئے ہوئے معاہدے کے نیچے دستخط کر دیئے، شمائلہ نے کہا۔ "میں پچھلے کئی برسوں سے یہ سوچ رہی ہوں کہ مجھے جو بھی دلہن بنا کر لے جائے گا، وہ رفتہ رفتہ مجھ سے بے زار ہو جائے گا۔ اس کی خواہش ہو گی کہ اس کے شانہ بشانہ دو پاؤں والی شریکِ حیات محفلوں اور تقریبات میں رہا کرے۔ میں اپنے شوہر کو اس خواہش کی تکمیل سے روک نہیں سکوں گی۔"

"شمائلہ! یہ خیال دل سے نکال دو۔ میں اس کاغذ پر لکھ دیتا ہوں بلکہ ایک نئے

اسٹامپ پیپر پر لکھ دیتا ہوں کہ دوسری شادی نہیں کروں گا۔ تم پر کبھی سوکن نہیں لاؤں گا۔"

"نہیں۔ آپ نے میری توقع سے اور میری حیثیت سے بہت زیادہ لکھ دیا ہے، اور کچھ نہ لکھیں۔ البتہ میں نے بھی کچھ لکھا ہے۔ اسے آپ پڑھ لیں۔"

اس نے تکئے کے نیچے سے دوسرا اسٹامپ پیپر نکال کر عبدالمجید کو دیا اس نے اسے لے کر پڑھا۔ شمائلہ نے لکھا تھا۔

"میں شمائلہ بانو بنت برکت علی یہ تحریر پورے ہوش و حواس میں رہ کر لکھ رہی ہوں۔ مستقبل کا حال کوئی نہیں جانتا۔ میں بھی نہیں جانتی کہ ایک شریکِ حیات کی حیثیت سے اپنے شوہر پر کس حد تک بوجھ بن کر رہوں گی۔ میں اپنے ہونے والے جیون ساتھی کو مختلف شرائط میں جکڑ کر اسے اپنا پابند نہیں بنانا چاہتی۔ کوئی ہوا کو مٹھی میں نہیں پکڑ سکتا اور کوئی ہوس کے گھوڑے کو لگام نہیں دے سکتا۔ یہ دونوں چیزیں گرفت میں نہیں رہتیں۔ اس لئے میں اپنے ہونے والے جیون ساتھی کو ہوس کے بے لگام گھوڑے پر جانے سے نہیں روکوں گی۔ اسے میری طرف سے دوسری شادی کی اجازت ہو گی۔ میری معذوری نے مجھے عقل دی ہے کہ مجھے اپنے مرد سے اندھی محبت کرنا چاہئے مگر اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ کبھی اس خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہئے کہ معذور سے کی جانے والی محبت خالص ہوتی ہے اور اس میں دوسری عورت کی ملاوٹ نہیں ہوتی۔ لہٰذا میں اپنے ہونے والے خاوند کی زوجیت اسی وقت قبول کروں گی جب وہ میری ازدواجی زندگی کے کسی بھی مرحلے پر دوسری شادی کرنے کا وعدہ کرے گا اور مجھے خوش فہمی کی جنت سے نکالے گا۔

"میں نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ اپنے ہونے والے خاوند کے لئے دوسری شادی کرنے کا یہ اجازت نامہ لکھ دیا ہے۔"

عبدالمجید نے پڑھنے کے بعد حیرانی سے پوچھا۔ "یہ کیا حماقت ہے؟ جب میں یہ بھی لکھ کر دینے کو تیار ہوں کہ تم پر کبھی سوکن نہیں لاؤں گا تو تم یہ اجازت نامہ مجھے کیوں دے رہی ہو؟"

"جب آپ کو پورا یقین ہے کہ مجھے اپنانے کے بعد دوسری شادی نہیں کریں گے تو میرا اجازت نامہ آپ کے پاس اور بہت سی فضولیات کی طرح پڑا رہے گا۔ میں نے سنا ہے کہ کھوٹا سکہ بھی کبھی کبھی کام آجاتا ہے۔"

"لیکن تمہاری یہ تحریر میرے مزاج کے خلاف ہے۔"

"میاں بیوی ایک دوسرے کے مزاج کے خلاف بہت کچھ برداشت کرتے ہیں' تب ہی ازدواجی اور گھریلو زندگی اچھی گزرتی ہے۔"

"لیکن شائلہ ...."

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "مجھ سے بحث نہ کریں۔ میں لکھ چکی ہوں کہ اسی کو جیون ساتھی قبول کروں گی جو بہ وقت ضرورت دوسری شادی کرے گا۔ میں آپ کو دوسری شادی کے لئے مجبور نہیں کروں گی لیکن یہ اجازت نامہ قبل از وقت اس لئے لکھ دیا ہے کہ سند رہے کہ آپ نے مجھ پر سوکن لا کر میری توہین نہیں کی ہے بلکہ میں نے مرد کو پہچاننے میں وقت سے پہلے دانائی کا ثبوت دیا ہے۔"

وہ پس و پیش میں رہا۔ ابھی پہلی شادی نہیں ہوئی تھی۔ پہلی بیوی نہیں آئی تھی ایسے میں دوسری شادی کا اجازت نامہ اپنے پاس رکھتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ ایک پہلو سے دیکھا جائے تو وہ ایک سیدھے سادے شریف آدمی کو دوسری شادی کے لئے بھڑکا رہی تھی۔ دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو وہ اجازت نامہ ایک چیلنج تھا۔ اسے ثابت کرنا تھا کہ وہ زبان کا سچا ہے۔ کبھی سوکن نہیں لائے گا۔ گھر میں اجازت نامہ پڑا رہے گا تو کیا فرق پڑے گا۔ گھر میں بھرا ہوا ریوالور بھی ہوتا ہے' کوئی ہوش مند اس سے خودکشی تو نہیں کر لیتا۔

بات طے ہو گئی۔ ان کا فیصلہ بزرگوں تک پہنچ گیا۔ انہوں نے تنہائی میں جو تحریری معاہدے کئے تھے انہیں دوسروں کے سامنے پیش کرنا ضروری نہیں تھا۔ یہ ان دونوں کی آپس کی بات تھی' ویسے یہ سب کو معلوم ہو گیا کہ وہ جہیز میں ایک پیسے کی بھی چیز نہیں لے گا اور نہ ہی کوئی مطالبہ کرے گا۔ صرف شائلہ کو قبول کرنے کے باعث اس کی عزت بڑھ گئی تھی۔

آخر شادی ہو گئی۔ اس کے ہونے میں کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا اس لئے ایک ماہ بعد ہی نکاح پڑھا دیا گیا۔ شائلہ کی رخصتی سے پہلے کچھ رسومات ادا کی گئیں پھر ایک رسم کے مطابق خواتین نے کہا۔ "دلہا اپنی دلہن کو اٹھائے اور باہر کار میں لے جا کر بٹھا دے۔"

کچھ مردوں نے کہا۔ "یہ فرسودہ رسم ہے' اب دلہنیں اپنے پیروں سے چل کر ڈولی یا کار تک جاتی ہیں۔ شائلہ چل نہیں سکتی کوئی بات نہیں' اسے وہیل چیئر میں بٹھا کر کار کی پچھلی سیٹ تک پہنچایا جا سکتا ہے۔"

لیکن ایسے وقت عورتیں نہیں مانتیں۔ شادی کی بیشتر رسمیں دلچسپ تماشا ہوتی ہیں اور ہر رسم کے پیچھے کوئی مقصد یا کوئی آرزو چھپی رہتی ہے۔ جب دلہا اپنی دلہن کو بازوؤں

میں اٹھا کر لے جاتا ہے تو عورتیں منہ پر ہاتھ رکھ کر یا آنچل کی آڑ لے کر مسکراتی ہیں۔ وہاں یہ رسم دیکھنے والی بیاہتا عورتوں کو اپنے شوہروں کے انداز یاد آتے ہیں اور کنواری لڑکیاں خیالی بازوؤں میں خود کو دیکھ دیکھ کر شرماتی ہیں۔ دلہن کے پہنچنے سے پہلے ہر عورت کی آنکھ اس کے سہاگ کے بستر پر پہنچ چکی ہوتی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ عورتیں کسی تفریح یا کسی تقریب میں شریک ہو کر نہیں تھکتیں لیکن شادیوں کی تقریب سے گھر آ کر بری طرح تھک جاتی ہیں۔

بہرحال عبدالمجید نے رخصتی کے وقت پہلی بار شائلہ کو دونوں بازوؤں میں اٹھایا تو لڑکھڑانے سے پہلے فوراً سنبھل گیا۔ وہ خاصی صحت مند تھی۔ اگر وہ مزدور ہوتا تو بھاری سامان کی طرح سر پر یا پیٹھ پر لاد کر تیزی سے چلتا ہوا اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پٹخ دیتا۔ لیکن وہ دلہا تھا' اسے اٹھائے لڑکیوں کے درمیان چل رہا تھا۔ لڑکیاں گیت گا رہی تھیں' اسے حصار میں لے کر اوپری منزل سے سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔ گیت کے بول کہہ رہے تھے کہ چڑیاں دا چنبہ ہے اور دوسری لڑکیوں کی طرح شائلہ کو بھی اُڑ جانا ہے۔

اور اُڑ جانے کا راستہ بڑا لمبا ہے۔ شائلہ کے بیڈ روم سے بالکونی پھر بالکونی سے ایک طویل زینہ۔ زینے کے بعد وسیع و عریض ڈرائنگ روم' وہاں سے ایک چھوٹا کوریڈور پھر باہر کا دروازہ' دروازے کے باہر پھر ایک برآمدہ' اس کے بعد پورچ میں کھڑی ہوئی کار تک پہنچتے پہنچتے کوئی ایک گھنٹہ لگ گیا۔ کیونکہ میکے کے تمام عزیز و اقارب یکے بعد دیگرے سامنے آ کر راستہ روکتے تھے۔ مرد رشتے دار دعائیں دیتے تھے' عورتیں اور لڑکیاں شائلہ سے لپٹ کر روتی تھیں۔ بس یہی موقع تھا جب عبدالمجید بھی آنسوؤں سے رونے لگا۔ میکے والوں نے سمجھا داماد اپنی خوشی بھول کر ان کے غم میں شریک ہے۔ باراتیوں نے سمجھا کہ خوشی کے آنسو ہیں۔ بہرحال دلہا کا بھرم رہ گیا۔

وہ خدا خدا کر کے دلہن کے ساتھ پچھلی سیٹ تک پہنچ گیا۔ دیر تک ہانپتا رہا۔ چلتے وقت ساس سسر کو بلند آواز سے سلام کرنا چاہتا تھا مگر سانس لے کر رہ گیا تھا۔ ہانپنے کے باعث آواز نہیں نکل رہی تھی۔ راستے میں اس نے ایک آدھ بار دلہن کو دیکھا۔ وہ گھونگھٹ میں دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن اس کا وزن دہلا رہا تھا۔ اپنی کوٹھی میں پہنچ کر پھر اسے اٹھانے کا مسئلہ پیش آیا۔ اس نے کار سے نکل کر اپنے رشتے داروں سے کہا "یہاں سے دلہن کے کمرے تک کوئی رسم نہیں ہوگی۔ جو بھی رسومات ہیں وہ کمرے میں پہنچنے کے بعد کی جائیں۔"

یہ تاکید کر کے اس نے شائلہ کو پچھلی سیٹ سے اٹھایا پھر تیزی سے چلتا ہوا کوٹھی

کے اندر آیا اور دلہن کے کمرے میں پہنچ کر اسے پھولوں کی سیج پر بٹھا دیا۔ عورتیں پیچھے پیچھے چلی آئیں۔ وہ باہر آکر خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ اب بوجھ اٹھانے کا کوئی مرحلہ نہیں رہا جب کہ مرحلہ تو ابھی شروع ہوا تھا۔

عورتیں بڑی دیر تک رُونمائی کی رسمیں ادا کرتی رہیں۔ انہوں نے رات کے دو بجے دلہا اور دلہن کا پیچھا چھوڑا۔ عبدالمجید نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ شمائلہ کے پاس بیٹھ کر محبت بھرے مکالمے ادا کرتے ہوئے اس نے گھونگٹ اٹھایا۔ وہ بلا کی حسین لگ رہی تھی۔ دلہن بن کر غضب ڈھا رہی تھی۔ مزدور کو معاوضہ ملتا رہے تو وہ بوجھ اٹھانے کی تکالیف کو بھول جاتا ہے۔ اس میں دوسرے دن مزدوری کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس رات شمائلہ سے اسے اتنی محبت اور اتنی اپنائیت ملی کہ وہ آج کی بار برداری کو بھول گیا۔ یوں بھی جی جان سے محبت کرو تو اس کا پھل ملتا ہے۔ وہ صبح تک پھل کھاتا رہا۔ صبح اذان کے بعد وہ بولی۔ ”پلیز، مجھے غسل خانے میں پہنچا دیں۔“

وہ بڑی چاہت سے اسے اٹھا کر باتھ روم میں لے گیا۔ وہاں وہ گھٹنوں کے بل نصف استادہ ہو کر بولی۔ ”آپ جائیں، ضرورت ہوگی تو آواز دے دوں گی۔“

”بھئی اب کیا پردہ رہا ہے؟ پہلے بات اور تھی جب میں دروازے کے باہر تمہارے لباس بدلنے کا انتظار کیا کرتا تھا۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”آپ بڑے بے شرم ہیں۔ شادی سے پہلے تو بالکل ہی بھولے بھالے سیدھے سادے لگتے تھے۔ چلیں اب یہاں سے جائیں۔“

وہ مسکراتا ہوا باہر آگیا۔ اس بستر پر آکر گر پڑا جس پر شمائلہ کے وجود کی حرارت کا احساس ہو رہا تھا۔ زندگی بدل گئی تھی۔ کمرے کی ہر چیز نئی نئی سی لگ رہی تھی۔ ابھی وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ شمائلہ اچھی کیوں لگتی ہے۔ کتنی ہی لڑکیاں اس سے زیادہ حسین تھیں۔ دونوں پاؤں سے چل کر اس کی ٹیلرنگ شاپ میں ناپ دینے آتی تھیں۔ کچھ ایسی تھیں جو دلکش انداز میں مسکرا کر باتیں کرتی تھیں۔ ان کی اپنائیت سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اپنی ہو سکتی ہیں۔ بڑے حسین مواقع چھوڑ کر وہ ایک معذور کو اپنا کر لے آیا تھا۔

ہر گھر کے چولھے پر ہانڈی چڑھتی ہے لیکن ایک آدھ ہانڈی ایسی ہوتی ہے جو دور سے خوشبو دیتی ہے اور اشتہا انگیز مہک سے اپنے لذیذ ہونے کا یقین دلاتی ہے۔ بس کچھ ایسی ہی بات تھی۔ لباس کا ناپ دیتے وقت جو آنچ شمائلہ سے آتی تھی، کسی اور سے نہیں آتی تھی۔ پھر یہ کہ وہ اپنے سینے میں نہایت ہی درد مند دل رکھتا تھا اسے اس کی معذوری پر ترس آتا تھا۔ اگر وہ لڑکا ہوتی تو وہ دور ہی سے ہمدردی کا اظہار کرتا اور اس کی کچھ مالی

امداد کر دیتا۔ چونکہ وہ لڑکی تھی اس لئے درد منداسے دل سے لگا کر گھر لے آیا تھا۔ اس کا جذبہ کہہ رہا تھا کہ وہ تمام عمر اسے محبت اور توجہ دیتا رہے گا۔

شمائلہ نے بڑی دیر بعد آواز دی۔ وہ بستر سے اٹھ کر باتھ روم میں آیا، اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

اس نے شبنم میں نہائے ہوئے گلاب کو فرش پر سے اٹھا لیا۔ وہاں سے چلتا ہوا کمرے میں آیا۔ بڑی عجیب سی بات تھی کہ وہ بوجھ نہیں لگ رہی تھی، پھول کی طرح ہلکی تھی۔

کچھ بھی ہو، اچھی ہو یا بری، ہلکی ہو یا بھاری، پیچیدہ ہو یا سلجھی ہوئی، یہ سارے مسائل ہمیشہ تو نہیں رہتے اور رہتے بھی ہیں تو محسوس نہیں ہوتے کیونکہ ازدواجی زندگی مسرتوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ شمائلہ اور عبدالمجید شروع دن سے ہی ایک دوسرے کے مزاج میں ڈھلنے لگے تھے۔ ایک دوسرے کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھنے لگے تھے۔ اس طرح شادی ناکام نہیں ہوتی۔ میاں بیوی مثالی بن جاتے ہیں۔

وہ بے مثال بنتے گئے۔ دو برس بعد ایک بیٹے کے والدین بن گئے۔ پانچویں برس ایک بیٹی آگئی۔ اتنی ساری مسرتیں اور کامیابیاں عبدالمجید کے دم سے تھیں۔ شوہر محبت کرنے والا ہو اور معذور بیوی کی خدمت کرنے والا ہو تو گھریلو زندگی خوش گوار رہتی ہے۔ شمائلہ نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس قدر وفادار اور خدمت گزار ثابت ہوگا۔ اگر یہ پہلے معلوم ہوتا تو وہ اسے دوسری شادی کا اجازت نامہ لکھ کر نہ دیتی۔ ویسے اجازت دینے سے ابھی تک کوئی اندیشہ پیدا نہیں ہوا تھا اور نہ ہی آئندہ اس کا امکان تھا لیکن شمائلہ کبھی کبھی سوچتی تھی کہ شاید اس نے دوسری شادی کی بات کہہ کر ایک شریف اور تابعدار خاوند کی توہین کی ہے۔

وہ تابعدار اب ذرا تھک رہا تھا کیونکہ صرف بیوی کو ہی نہیں بچوں کو بھی گود میں اٹھانا پڑتا تھا۔ ادھر بیوی کو اٹھا کر وہیل چیئر پر بٹھاتا تھا۔ ادھر روتے ہوئے بچے کو اٹھا کر بہلاتا تھا۔ باپ کی موجودگی میں بچے آیا کے پاس نہیں جاتے تھے۔ جب وہ تمام دن ٹیلرنگ شاپ میں رہتا تو شمائلہ کو دو ملازمائیں ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ منتقل کرتی تھیں لیکن شوہر کے گھر آتے ہی خدمت کرنے والیاں چلی جاتی تھیں۔ کیونکہ چوبیس گھنٹے کی ملازمت نہیں تھی۔ ان کے جانے کے بعد عبدالمجید کی ڈیوٹی شروع ہو جاتی تھی۔

شادی یا سالگرہ وغیرہ کی تقریبات میں بچوں کو سنبھالنے کے لئے ایک آیا ہوتی تھی لیکن شمائلہ کو عبدالمجید سنبھالتا تھا۔ وہیل چیئر سے اٹھا کر ڈرائنگ روم میں یا کسی دلہن کے

کمرے میں پہنچاتا تھا۔ اس نے ایک بار شمائلہ سے کہا تھا۔ ”ایسی جگہ ملازم عورتوں کو لے چلو۔ وہ تمہیں اٹھا کر عورتوں میں پہنچا دیا کریں گی پھر وہاں سے باہر وہیل چیئر پر لے جایا کریں گی۔“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”اگر آپ تھک جاتے ہیں تو کوئی بات نہیں آپ صرف چیئر سے فرش پر اتار دیا کریں‘ میں گھٹنوں سے چلتی ہوئی عورتوں میں خود چلی جاؤں گی۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو۔ قیمتی لباس پہن کر شادی کی تقریب میں آئی ہوئی خواتین کے درمیان گھٹنوں کے بل چلو گی؟“

”تو کیا ہوا؟“

”میں نہیں چاہتا کہ دنیا تمہیں تماشا سمجھ کر دیکھے۔“

وہ بولی۔ ”جب سے ہماری شادی ہوئی ہے‘ تب سے ہر تقریب میں لوگوں نے مجھے آپ کے بازوؤں پر آتے جاتے دیکھا ہے۔ عورتیں تو رائی کا پہاڑ بناتی ہیں۔ ان کی مجموعی سوچ یہی ہوگی کہ آپ مجھ سے بے زار ہو گئے ہیں اور مجھے ملازماؤں کے حوالے کر دیا ہے۔“

”عورتیں سوچے سمجھے بغیر بکواس کرتی ہیں۔ تم دل پر ہاتھ رکھ کر کہو کیا میں تم سے بے زار ہوں؟“

”بالکل نہیں۔ میں آپ پر فخر کرتی ہوں لیکن عورت کی عزت عورتیں ہی بناتی ہیں اور عورتیں ہی خاک میں ملاتی ہیں۔ میری کتنی عزت ہے‘ یہ دیکھنے کے لئے میں مردوں میں نہیں جاسکتی۔ عورتوں کی ہی بھلی بری باتوں سے زخمی ہوتی رہوں گی۔ پانچ برس سے ہر تقریب میں عورتیں مجھے آپ کے بازوؤں میں دیکھتی آ رہی ہیں اور مجھے خوش نصیب کہتی آ رہی ہیں۔ ایسے میں انہوں نے مجھے ملازماؤں کے رحم و کرم پر دیکھا تو میں آپ کی دی ہوئی محبت اور عزت کے آسمان سے ذلت کی پستیوں میں پہنچ جاؤں گی۔“

بعض حالات میں بات کچھ بھی نہیں ہوتی لیکن وہی بات بنا کر کسی کو عزت دے دی جاتی ہے اور کسی کو ذلت‘ عبدالمجید برسوں سے بھری محفلوں میں شمائلہ کو اٹھا کر عزت دیتا رہا تھا۔ اگر وہ کسی مجبوری کے تحت اسے ملازماؤں کے حوالے کر دیتا تو دنیا والے اور خصوصاً عورتیں مجبوری کو نہ سمجھتیں۔ شمائلہ کے بے وقعت ہونے کا حساب کرتیں۔ کوئی اور سمجھے یا نہ سمجھے ایک معذور بیوی اپنی توہین کو شدت سے محسوس کر سکتی ہے۔

توہین یک طرفہ نہیں تھی۔ عبدالمجید شروع دن سے بیوی کا بار بردار جانور کہلانے کی توہین برداشت کرتا آ رہا تھا۔ لوگ اس کے منہ پر نہیں کہتے تھے‘ پیٹھ پیچھے کہی جانے والی

باتیں دوسرے ذرائع سے کانوں تک پہنچتی تھیں۔ اکثر شادیوں میں جب وہ شمائلہ کو اٹھا کر لوگوں کے سامنے سے گزرتا ہوا اسے کہیں پہنچاتا تھا تو لوگ مزہ لینے کی خاطر اس شادی کے دلہا سے کہتے تھے۔ ”عبرت حاصل کرو۔ بیویاں اسی طرح ساری عمر سوار رہتی ہیں۔ کچھ بازوؤں میں‘ کچھ سر پر اور باقی تمام اعصاب پر..........“

عبدالمجید نے یہ باتیں شمائلہ کو بتاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے پچھلے پانچ سال سے یہ توہین صرف تمہاری محبت میں برداشت کی ہے۔“

وہ بولی۔ ”یہی آپ سے غلطی ہوئی۔ آپ پہلے ہی دن سے مجھے ملازماؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے تو نہ آپ کا مذاق اڑایا جاتا اور نہ ہی اب میں مذاق بنائی جاتی۔ کسی عورت کو یہ کہنے کا موقع نہ ملتا کہ پہلے کبھی شوہر اٹھا کر لایا کرتا تھا اور اب اس نے فالتو بوجھ سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔“

شمائلہ اب بھی بوجھ نہیں تھی مگر احساسات پر بوجھ بن گئی تھی۔ بدلتے ہوئے حالات نے اس کا وزن ناقابلِ برداشت بنا دیا تھا۔ اسی لئے دانا کہتے ہیں‘ محبت میں صرف آج کو نہ دیکھو‘ کل کی بھی سوچو کیوں کہ آنے والا کل توقع کے خلاف محبت کے سامنے ناقابلِ حل مسائل لے آتا ہے۔

شمائلہ نے دانش مندی کی بات کہی تھی۔ اگر وہ پہلے ہی دن سے تنخواہ دار خادمائیں رکھ لیتا تو وہ دونوں تماشہ نہ بنتے اور نہ ہی دنیا باتیں بناتی لیکن پہلے رومانی انداز میں اٹھا کر کلیجے سے لگاتے ہوئے زبردست لطف حاصل ہوتا تھا۔ کوئی اپنی شریکِ حیات کو دوسروں کے سامنے آغوش میں نہیں لیتا۔ جب کہ وہ بھری محفلوں میں حسن و شباب کے خزانے کو آغوش میں سمیٹ کر ایک فاتح کی شان سے چلتا تھا۔ اس کی معذوری سے یہ سنہری مواقع اس کا مقدر بن گئے تھے اور وہ بھول گیا تھا کہ مقدر بگڑتا بھی ہے۔

اگر کوئی ماہرِ نفسیات عبدالمجید سے یہ کہتا کہ میاں! کوئی شوہر اپنے بچوں کی ماں کو تنہائی میں بھی بازوؤں پر نہیں اٹھاتا ہے جب کہ تم محفلوں میں اٹھاتے ہو۔ اس حقیقت کو مان لو کہ رفتہ رفتہ میاں بیوی کے درمیان فاصلہ بڑھ جاتا ہے۔ آپس کی کشش میں انجانی سی کمی پیدا ہو جاتی ہے۔ میاں عبدالمجید! یہ مان لو کہ درزی کے فیتے کو بدن کا وہ ناپ نہیں مل رہا ہے‘ جس سے تن بدن میں شراب بھر جایا کرتی تھی۔ تم‘ ہاں تم اس بے چاری سے کچھ بے زار ہو چلے ہو۔ وہ ایسی حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا کیوں کہ شمائلہ سے محبت اور وفاداری بدستور تھی۔ صرف اسے اپنے بازوؤں سے ہٹانے کی بات کی تھی۔ پہلے اسے لگانے کا اب الگ کرنے کا معاملہ تھا۔ یہ کون تسلیم کرتا کہ ہانڈی کو چولہے

سے اترے ہوئے پانچ برس ہو گئے ہیں۔ اب وہ گرمی کھو چکی ہے۔ دور سے پکنے والی ہانڈی سے جو لذت آمیز مہک آتی ہے وہ مہک بھی نہیں رہی۔ اب وہ دوسری حسیناؤں کا ناپ لیتا ہے تو شائلہ کی بھولی بھٹکی ہوئی آنچ ادھر سے آنے لگتی ہے۔

یہ بڑی تلخ حقیقت ہے۔ اسے کوئی کوئی حقیقت پسند تسلیم کرتا ہے کہ ہر شخص درزی ہوتا ہے' اس کے فیتے میں عورت کا وہی پہلا ناپ نہ رہے تو وہ عورت بدل دیتا ہے مگر ہوس کا فیتہ نہیں بدلتا۔

جو سچائی تسلیم نہیں کی جاتی وہی سچائی خود کو دوسری طرح منوا لیتی ہے۔

عبدالمجید یہ ماننے لگا تھا کہ اب محفلوں میں بار بردار بننے سے توہین ہوتی ہے۔ اسے مرد حضرات کی پروا نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ زنانہ ملبوسات کا درزی تھا۔ بڑی بڑی' تقریبات میں وہ حسینائیں بھی آتی تھیں جو اس سے کپڑے سلوایا کرتی تھیں۔ ان حسین عورتوں اور جوان لڑکیوں کی نظروں میں ٹیلر ماسٹر کی ایک شان تھی۔ وہ پورے گلبرگ کا نمبرون درزی تھا۔ لاہور کے دوسرے مہنگے علاقوں سے بھی کار والیاں اس کے پاس آتی تھیں۔ اسے ایک دولت مند ٹیلر ماسٹر سمجھتی تھیں۔ ان کی نظروں میں اس کی ایک اونچی سماجی حیثیت تھی۔ ان کی موجودگی میں شائلہ کو اٹھا کر لے جاتے وقت وہ زمین میں گڑنے لگتا تھا۔ خود کو ماسٹر نہیں ایسا بھنگی محسوس کرتا تھا جو کچرے کا ڈرم اٹھا کر لے جا رہا ہو۔

مگر اسے شائلہ سے محبت تھی۔ اس نے کبھی اسے کچرے کا ڈرم نہیں سمجھا۔ ایسا اس کے احساسات کہتے تھے اور یہ ایک موٹی سی' سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ پہلے آدمی نہیں بدلتا' پہلے احساسات بدلتے ہیں اور احساسات سے پہلے سوچ بدلتی ہے اور سوچ سے پہلے مرد کی نیت بدل چکی ہوتی ہے۔

نئے سال کا نیا دن تھا اور وہ عورت بھی نئی تھی جو ٹیلرنگ شاپ میں آئی تھی۔ نئی اس لئے تھی کہ پہلی بار کپڑے سلوانے آئی تھی۔ پہلی بار عبدالمجید نے اسے دیکھا۔ وہ دکان میں آنے والیوں کو ایک نظر دیکھتا تھا اس کے بعد فیتے کی آنکھ دیکھتی جاتی تھی اور وہ ناپ لکھتا جاتا تھا۔ ایک مدت کے بعد پہلی بار اس نے اس عورت کو بار بار دیکھا۔ نظریں ملا کر بھی دیکھا اور نظریں چرا کر بھی۔ وہ بین الاقوامی حسن کے مقابلے میں جانے والی حسیناؤں کے ناپ پر پوری اترتی تھی۔ اسے مقابلہ حسن میں جانا چاہئے تھا لیکن وہ عبدالمجید ٹیلرنگ شاپ میں آگئی تھی۔

وہ کاؤنٹر پر کپڑوں کا پیکٹ رکھتی ہوئی بولی۔ "مجھے جلدی چاہئے۔"

اس نے پوچھا۔ "کتنی جلدی؟"

"ایسے پوچھ رہے ہو جیسے آج کہوں گی تو آج ہی تیار کر دو گے۔"

"تم آج کی بات کرتی ہو' میں ابھی تیار کرتا ہوں۔ آرام سے بیٹھو اور میرا کمال دیکھو۔"

اس نے پیکٹ سے کپڑا نکال کر میز پر بچھایا پھر اسے کاٹنے لگا' وہ بولی۔ "ناپ لیا نہیں اور کاٹنا شروع کر دیا۔ تم کیسے ٹیلر ماسٹر ہو؟ کیا میرا قیمتی کپڑا ضائع کرو گے؟"

"یہ کپڑا بازار میں بہت ہے لیکن یہ ٹیلر ماسٹر پورے پاکستان میں ایک ہی ہے۔ کپڑا ضائع ہوا تو میں خرید دوں گا اور اپنی ناکامی کا جرمانہ تمہیں پانچ ہزار روپے بھی ادا کروں گا۔ اور اگر سلائی کامیاب رہی تو تم کیا کرو گی؟"

"میں نہ تو دولت مند ہوں' نہ ہی حاتم طائی کی بیٹی ہوں کہ فراخ دلی سے پانچ ہزار کا وعدہ کر لوں۔"

"میں انعام میں رقم نہیں لوں گا۔ صرف ایک پیشکش قبول کرنے کو کہوں گا۔"

"کیسی پیشکش؟"

"یہی کہ تم میرا پیشہ قبول کرو گی۔ اسی میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ میں تمہیں اپنا ہنر سکھاؤں گا۔"

"میں یہاں کار میں نہیں آئی ہوں اس لیے مجھے غریب اور ضرورت مند سمجھ کر یہ آفر دے رہے ہو؟"

"نہیں' میں ٹیلر ماسٹر ہوں۔ دکان میں آنے والیوں کو کار سے نہیں کپڑوں سے پہچانتا ہوں۔ تم نے جو لباس پہنا ہے اسے کسی معمولی اور سستے درزی نے تیار کیا ہے اور تمہارے بدن کا کپڑا بیس روپے میٹر ہے۔ تمہارا یہ جو کپڑا تراش رہا ہوں یہ پچیس روپے میٹر ہے۔ تم پہلی گاہک ہو جو اتنا سستا کپڑا لا کر کہتی ہو کہ تمہارا قیمتی کپڑا ضائع کر دوں گا۔ جب کہ میرے پاس سو روپے سے سات آٹھ سو اور ہزار روپے میٹر کے کپڑے سلائی کے لئے آتے ہیں۔"

"ماسٹر! تم میری توہین کر رہے ہو۔"

"میں تمہاری قدر کر رہا ہوں۔ تمہارے کپڑے کو اس جگہ رکھ کر تراش رہاں ہوں' ںاں کروڑ پتی اور ارب پتی بیگمات کے کپڑے رکھے جاتے اور تراشے جاتے ہیں۔ اگر ان بگمات کے مقابلے میں تمہیں دکان سے واپس کر دیتا تو تمہاری توہین ہوتی۔ یہ مان لو کہ ں تمہاری عزت کر رہاں ہوں۔"

بات معقول تھی مگر وہ آسانی سے نہیں مان سکتی تھی۔ کوئی جواب نہ بن پڑا تو بولی

"تم بہت زیادہ بولتے ہو۔ ارے یہ کیا! باتوں ہی باتوں میں سارا کپڑا کاٹ کر رکھ دیا اور اپنے ملازموں کو سلائی کے لئے دیتے جا رہے ہو۔ آخر یہ کس کے ناپ کا تیار کرا رہے ہو؟"

"تمہارا ہی ناپ ہے۔ چھتیس، بتیس، چھتیس۔"

وہ دنگ رہ گئی۔ آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی پھر بولی۔ "ہاں یہی ناپ ہے، تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں درزی نہیں ہوں۔ درزی وہ ہے جو ابھی تمہارے کپڑے لے جا کر سلائی کر رہے ہیں۔ میں ماسٹر ہوں، فنکار ہوں، نگاہوں سے بھانپ لیتا ہوں۔"

"میں ابھی پہن کر دیکھ لوں گی کہ تم کتنے بڑے فنکار ہو لیکن تم نے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ میں کس ڈیزائن کی قمیض چاہتی ہوں؟"

"جو ڈیزائن تم نے پہن رکھا ہے اس سے ہزار درجہ بہتر قمیض ملے گی۔ عورت کا بدن مجھے خود ہی ڈیزائن بتا دیتا ہے۔ تمہارا رنگ دودھ میں بہتے ہوئے گلاب جیسا ہے۔ اس لئے کھلا گریبان ہونا چاہئے۔"

وہ نظریں چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ "تمہارے گلے میں دل کے ڈیزائن والا لاکٹ ہے۔ اس لئے قمیض کا وی گلا ہونا چاہئے۔ تمہاری دونوں کلائیوں میں سب رنگ کی چوڑیاں ہیں۔ آستین کوارٹر ہونا چاہئے تاکہ چوڑیاں آسانی سے تھرکتی رہیں اور کھنکتی رہیں لیکن میں نے ہاف آستین رکھی ہے۔"

"ہاف آستین میں کیا بات ہے؟"

"تمہارے بازو بھرے بھرے ہیں۔ آستین بھی بھری بھری نظر آئے گی۔ دیکھنے والوں کی نگاہیں مالا مال ہوتی رہیں گی۔"

"تم کچھ زیادہ ہی فری ہو رہے ہو؟"

"ایسی بات نہیں ہے۔ تم پہلی بار ایک مہنگے علاقے کی مہنگی دکان میں آئی ہو۔ یہاں ستر فیصد خواتین ایسی آتی ہیں جو یورپ اور امریکا کا فیشن اور وہاں کی بے باکی اور بے حجابی اپنے ساتھ لاتی ہیں۔ میں پانچ برس پہلے ایسا نہیں تھا۔ احمق اور کم گو کہلاتا تھا۔ بیرونی ملکوں سے آنے والی بیبیوں نے سمجھا دیا ہے کہ درزی اور قصائی کی دکان میں ایک ہی فرق ہے وہاں جانوروں کے گوشت اور ہڈیاں تولی جاتی ہیں، یہاں خواتین کے گوشت پوست کا حساب ہوتا ہے۔"

ایسی ہی باتیں سن کر اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ لال پری لگ رہی تھی۔ عبدالمجید

نے اپنی بات کو سنبھالا۔ "تم ان خواتین میں سے نہیں ہو۔ تمہارا انداز بتا رہا ہے کہ حیا والی ہو۔ میری دکان میں آنے والیاں اپنی ذات میں بے حیا نہیں ہوتیں۔ ملبوسات کے بدلتے ہوئے فیشن کے مطابق لباس کی حد تک ذرا بے حجاب ہو جاتی ہیں۔ گلبرگ میں دوپٹے کے بغیر پھرنے والی لڑکیوں کو چھیڑو تو وہ تھپڑ مار دیں گی اور ثابت کر دیں گی کہ بدن کی چغلیاں کھانے والا لباس پہن کر لڑکیاں صرف بے حجاب ہوتی ہیں، بے حیا نہیں ہوتیں۔ مردوں کے صبر کو آزماتی پھرتی ہیں۔ جو بے صبرا ہو گا، وہ تھپڑ اور جوتے ضرور کھائے گا۔"

وہ ہنس پڑی۔ غصہ کرنے والی عورت کے سامنے تھپڑ کھانے والے مرد کا تصور پیش کرو تو وہ خوش ہو جاتی ہے۔

ایک ماتحت درزی قمیض تیار کر کے لے آیا۔ عبدالمجید نے کہا۔ "کیبن میں چلی جاؤ۔ اسے پہن کر آواز دو، میں آ کر دیکھوں گا۔"

وہ قمیض اٹھا کر جانے لگی۔ وہ بولا۔ "رسید بک پر نام کیا لکھوں؟"

وہ کیبن کا دروازہ کھول کر بولی "سلمیٰ" پھر اندر جا کر دروازے کو بند کر لیا۔

دوسرے ماتحت نے شلوار سلائی کر کے ماسٹر کے سامنے رکھ دی۔ تھوڑی دیر بعد سلمیٰ نے آواز دی۔ اسے اپنی کٹنگ اور مہارت پر اعتماد تھا۔ اطمینان سے چلتا ہوا دروازہ کھول کر کیبن میں آیا۔ وہ نئی قمیض پہنے آئینے کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ کہہ رہی تھی "واقعی تم فنکار ہو۔ میں کیا بتاؤں کہ یہ قمیض کتنی اچھی لگ رہی ہے؟ اسے پہن کر سوچ رہی ہوں، کیا یہ میں ہوں؟"

"تم جس انداز میں تعریف کر رہی ہو، اس سے میری محنت وصول ہو گئی ہے۔ میں باہر جا رہا ہوں، یہ شلوار بھی پہن کر دیکھ لو۔"

وہ باہر آ گیا۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔ اس بار ماسٹر سحرزدہ ہو گیا تھا۔ اس کے بدن سے وہی آنچ آئی تھی جو شمائلہ سے گزرتے ہوئے وقت نے چھین لی تھی۔ خرابی یہیں سے پیدا ہوتی ہے کہ اسی گزرتے ہوئے وقت نے عبدالمجید کی حرارت برقرار رکھی تھی۔

آنچ کے حوالے سے شمائلہ یاد آئی جیسے گزرے ہوئے لوگ یاد آتے ہیں پھر اسے یوں شرم آئی جیسے گناہ کے وقت آتی ہے۔ اس کے بعد آدمی ڈھیٹ بنتا چلا جاتا ہے۔ عبدالمجید نے دانش مندی سے سوچا، دکان میں بیٹھ کر گھر والی کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ دکان والی کیبن کا دروازہ کھول کر سامنے آئی۔ اپنا اتارا ہوا لباس دیتے ہوئے بولی۔ "پلیز اسے شاپنگ بیگ میں رکھوا دیں۔"

ماسٹر نے اس کی اترن کو دونوں ہاتھوں میں لے کر ماتحت سے شاپنگ بیگ لانے کو کہا۔ ان ہی لمحات میں اس کی اترن سے عجیب پکارتی ہوئی سی پسینے کی مہک آتی رہی۔ پسینے کی بُو کسی کو بھی اچھی نہیں لگتی اور کسی کو بھی اچھی لگ سکتی ہے اور جسے اچھی لگ جاتی ہے اس کی سانسوں میں سما جاتی ہے۔ ماسٹر اس لباس کو شاپنگ بیگ میں رکھنے تک گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ ایک اژدھے کی طرح اس پسینے والی کو اپنے اندر کھینچتا رہا۔

وہ اس کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ لے کر بولی۔ ”لباس کی سلائی کیا لیتے ہو؟“

اس نے کاؤنٹر کے پیچھے آکر رسید بک کھولی پھر بولا۔ ”پورا نام اور پتا لکھاؤ۔“

”نام لکھو، سلمٰی زبیر۔ پتا لکھنا ضروری نہیں ہے۔“

وہ نام لکھتے ہوئے بولا۔ ”ضروری ہے۔“

”کیا دوسری ملاقات کا ارادہ ہے؟“

”جو ایک بار یہاں آتی ہے، وہ بار بار سلائی کے لئے آتی ہی رہتی ہے۔ مجھے کسی کے پتے پر جانا نہیں پڑتا۔“

”یہ تو میں مان گئی۔ اب ہمیشہ یہیں کپڑے لایا کروں گی، اب تو پتا ضروری نہیں رہا؟“

”ضروری ہے، کوئی سات برس پہلے پولیس کو ایک لاش ملی تھی، لاش کے بدن پر میرا سلائی کیا ہوا لباس تھا۔ پولیس نے میرے تعاون سے اس مقتول عورت کا پتا ٹھکانا معلوم کرلیا۔“

وہ اچھرے اور رحمان پورہ کی ایک درمیانی گلی میں رہتی تھی۔ اس نے اپنا مکمل پتا لکھوا دیا۔ ماسٹر کا اندازہ درست نکلا۔ وہ کسی مہنگے علاقے کی رئیس زادی نہیں تھی۔ جانے کیسے گلبرگ کی اس مہنگی دکان میں آگئی تھی۔ اس نے رسید بک سے ایک ورق نکال کر اسے تھما دیا۔ اس نے سلائی کے بل پر ایک نظر ڈالی پھر حیرانی سے بولی۔ ”یہ مذاق ہے؟ شلوار اور قمیض کی سلائی کا معاوضہ صرف ایک روپیہ؟“

”ہاں ایک روپے کا ایسا نوٹ جس پر تمہارے دستخط ہوں۔“

”کیا تم یہاں آنے والیوں سے اسی طرح لفٹ لیتے اور دوستی بڑھاتے ہو؟“

”میں یہاں کاروبار اور رزقِ حلال کی جگہ بیٹھ کر بخدا کہتا ہوں، میں نے آج تک اپنی کسی کسٹمر سے دوستی نہیں کی ہے۔ پتا نہیں تمہیں دیکھ کر کیا ہو گیا ہے؟ کیا انسان کو نہیں بولنا چاہئے؟“

”سچ ضرور بولنا چاہئے مگر ایسا سچ نہیں کہ کسٹمر بھاگ جائے۔“

”چلو میں نہیں بولتا۔ تم سچ بولو۔ اپنے حالات نہ چھپاؤ۔ کیا تم ضرورت مند نہیں ہو؟ دیکھو یہ نہیں کہتا کہ تم غریب ہو، محتاج ہو یا دوسروں سے کم تر ہو۔ میں نے تمہارے اطوار سے اندازہ لگایا ہے کہ تم ہر ضرورت اپنی مرضی کے مطابق پوری نہیں کر سکتی ہو۔“

”تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟“

”تمہاری خواہش ہے کہ تم گلبرگ جیسے علاقے میں رہو، قیمتی لباس پہنو اور وہ لباس اونچی اور مہنگی دکان سے تیار کراؤ۔ تم خوابوں میں چلتی ہوئی میری دکان میں آئی ہو۔“

”شاید تمہاری بات درست ہو۔ میں اکثر اپنے آپ کو سمجھ نہیں پاتی ہوں، اور شاید تمہارا تجزیہ غلط بھی ہو کیونکہ تم میرے حالات کے تمام پہلوؤں سے واقف نہیں ہو۔ پلیز سلائی کا معاوضہ بتاؤ۔“

”میں نے رسید لکھ دی ہے۔ صرف ایک روپیہ لوں گا۔“

”کیا مجھے ایک روپیہ ادا کرتے ہوئے شرم نہیں آئے گی۔“

”اس چھوٹے سے نوٹ پر تمہارا آٹوگراف ہو گا تو وہ معاوضہ نہیں رہے گا۔ پہلی ملاقات کی یادگار بن جائے گا۔“

”پھر تو ایسے آٹوگراف کے متعلق مجھے سوچنا ہو گا۔“

”سوچو، گھر جا کر سوچو۔ جب تک سوچتی رہو گی، میں انتظار کرتا رہوں گا۔ جانے سے پہلے یہ یقین کرلو، میری دوستی تمہیں کبھی نقصان نہیں پہنچائے گی بلکہ فائدہ ہی پہنچاتی رہے گی۔“

وہ سوچ میں ڈوبی نظروں سے کاؤنٹر پر رکھی ہوئی قینچی دیکھنے لگی۔ چند ایسے پیشے ہیں، چند ایسے اوزار ہیں جن کی حیثیت بین الاقوامی ہوتی ہے۔ وہ قینچی بھی بین الاقوامی تھی۔ ایک درزی دنیا کے جس ملک اور جس آبادی میں جائے گا وہاں تن ڈھانپنے والے مہذب انسان ہوں گے، اور جہاں لباس میں اپنی شرم چھپانے والے ہوں گے، وہاں درزی کو تحفظِ حیا کی قیمت ادا کی جائے گی۔ یہ درزی کی عظمت ہے کہ خدا انسان کو ننگا بھیجتا ہے اور درزی اسے ننگا نہیں رہنے دیتا۔

سلمٰی نے نظریں اٹھا کر سلمٰی ستارہ جیسی آنکھوں سے ماسٹر کو دیکھا پھر شاپنگ بیگ گویا بھول کر چلی گئی۔ ماسٹر کو یاد نہیں آرہا تھا کہ ایسی دل میں اتر جانے والی پہلے کبھی دکان میں آئی ہو اور چور ارادوں کو گرما گئی ہو۔ زندگی میں آنے والی پہلی عورت سے کوئی

چوری نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ معاملہ صاف ہوتا ہے کہ وہ بیوی بنے گی پھر ہمارے بچوں کی ماں بنے گی۔ دوسری عورت کے ساتھ چور ارادے ہوتے ہیں کیونکہ مذہب' قانون اور سماج کے مطابق تو بیوی موجود ہے۔ بچے بھی ہیں۔ گھر آباد ہے۔ بیوی بدستور ازدواجی وظیفہ ادا کر رہی ہے۔ ایسے میں دوسری عورت سے تعلقات کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ قانون دوسری شادی کی اجازت نہیں دیتا۔ تب ان حالات میں ارادے چور اور بدمعاش بن جاتے ہیں۔

وہ رات کو دکان سے گھر آیا۔ شمائلہ اس کے انتظار میں یا اس کے استقبال کے لئے دروازے تک نہیں آسکتی تھی۔ پانچ برس کی گھریلو زندگی میں اس نے بیوی کا یہ فرض ادا نہیں کیا تھا۔ یوں وہ سو فیصد بیوی نہیں تھی۔ اس رات شمائلہ کے سو میں سے پانچ نمبر کٹ گئے۔

اس نے معمول کے مطابق بستر پر بیٹھے ہی بیٹھے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ بیٹا دوڑتا ہوا گود میں آگیا۔ ننھی بچی ماں کی گود میں تھی۔ عبدالمجید نے بیٹے کو چوم کر چاکلیٹ کا پیکٹ دیا۔ پھر اسے گود سے اتار کر شمائلہ کے پاس آیا' بیٹی کو اس کی گود سے لے کر چومتے ہوئے بولا۔ "بھئی شمائلہ! اس بیٹی نے تو میری بیوی پر قبضہ جما لیا ہے۔ قبضہ چھڑانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ بیٹی میری گود میں ہو اور میں اپنی جان کی گود میں پہنچ جاؤں گا۔"

وہ بچی سمیت بستر پر گر کر شمائلہ کے پاس پہنچا اور اپنا سر اس کے زانو پر رکھ دیا۔ اپنے مرد کی ایسی محبت پا کر وہ خوشی سے کھل جاتی تھی۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے بولی۔ "آپ تھکے ہوئے آتے ہیں اور بچوں کو اپنے اوپر لاد لیتے ہیں۔ چلیں' منہ ہاتھ دھو کر آئیں' میں کھانا گرم کرنے کو کہتی ہوں۔"

ایک قباحت یہ بھی تھی کہ وہ وہیل چیئر پر بیٹھ کر کچن میں کھانا تیار نہیں کر سکتی تھی۔ اسے کبھی بیوی کے ہاتھ کا کھانا نصیب نہیں ہوا۔ شمائلہ کے پانچ نمبر اور کٹ گئے۔ وہ نوے فیصد رہ گئی۔ بیوی نوے فیصد بھی ہو تو بہت ہوتی ہے۔ اسی لئے سر ابھی تک اس کے زانو پر تھا۔

سر سجدے میں ہو تو ضروری نہیں ہے کہ وہ عبادت گزار ہے۔ سر عورت کے زانو پر ہو تو لازمی نہیں کہ وہ محبت گزار ہے۔ سر میں اپنا ایک سودا سمایا ہوتا ہے جو سجدے میں دغا بازی اور زانو پر قلابازی کھا کر اسے دوسری عورت کے زانو تک پہنچاتا ہے۔

☆==========☆==========☆

زبیر احمد بہت اچھا لکھتا تھا لیکن اپنے اندر سے کوئی بات نہیں نکالتا تھا۔ انگریزی رسالوں اور کتابوں سے کہانیاں پڑھ کر انہیں اردو زبان میں منتقل کر دیتا تھا۔ انگریز کرداروں کو مشرف بہ اردو کر دیتا تھا۔ اس طرح وہ کہانیاں ترجمہ نہیں طبع زاد سمجھی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ شاعری بھی فرماتا تھا اور زبیرؔ ہی تخلص کرتا تھا۔

چونکہ زبان اچھی لکھتا تھا' لفظوں کا زبردست کھلاڑی تھا اس لئے اس کی کہانیاں خوب پڑھی جاتی تھیں۔ سلمٰی بھی خوب پڑھتی تھی۔ اس کی تحریریں بارہ برس کی عمر سے پڑھتے پڑھتے جوان ہو گئی تھی۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ عمر کے حساب سے جوان ہوئی تھی یا جذباتی تحریروں نے اسے جوان بنا دیا تھا۔ ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ ان کے زمانے میں لڑکیاں بیس پچیس برس کی عمر میں بھی جوان نہیں لگتی تھیں۔ ان میں ایک قدرتی معصومیت رہتی تھی۔ آج دس برس کی لڑکیاں فلمیں دیکھ کر اور جذباتی تحریریں پڑھ کر بالغ ہو جاتی ہیں۔ شاید سلمٰی بھی ان میں سے ایک تھی۔

اس نے ایک رسالے میں زبیر کی کہانی پڑھی۔ وہ کہانی زبیر کی آپ بیتی تھی۔ اس نے ایک غریب اور ایک دولت مند لڑکی کے فرق کو بیان کیا تھا۔ رئیس زادی فیشن کی دلدادہ تھی۔ زبیر اپنی قیمتی کار میں ایک نائٹ کلب کے پاس سے گزر رہا تھا وہاں رئیس زادی نشے میں نظر آتی ہے۔ کلب کے دروازے پر لڑکھڑاتے ہوئے باہر گرتی ہے۔ دو عیاش نوجوان اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ لڑکی کو اپنا ہوش نہیں ہے۔ ہوش اس وقت آتا ہے جب وہ اسے ایک خالی مکان میں لے آتے ہیں۔ اس کی عزت سے کھیلنا چاہتے ہیں۔ زبیر عین وقت پر پہنچ جاتا ہے اس کی عزت بچاتا ہے۔ دونوں جوانوں کی پٹائی کرتا ہے رئیس زادی کو اس کے رئیس ماں باپ کے پاس لاتا ہے۔ ان کے سامنے ایک طویل تقریر کرتا ہے مذہب اور اخلاق کی باتیں یوں سمجھاتا ہے جیسے پہلی بار انہیں مذہب سے روشناس کرا رہا ہو۔ رئیس زادی اس سے متاثر ہوتی ہے۔ والدین اسے داماد بنانا چاہتے ہیں لیکن وہ کہتا ہے میرے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ میں کسی رئیس زادی نہیں کسی غریب کی بیٹی سے شادی کروں گا۔

پھر وہ کہانی آگے بڑھتی ہے۔ زبیر اپنی قیمتی کار ڈرائیو کرتا ہوا غریبوں کی بستی میں آتا ہے۔ وہاں ایک لڑکی کی شادی ہو رہی ہے۔ دلہا کا باپ جہیز مانگتا ہے۔ ورنہ بارات واپس لے جانے کی دھمکی دیتا ہے۔ زبیر وہاں بھی ایک طویل تقریر فرماتا ہے اور جہیز پر لعنت بھیج کر ایک غریب لڑکی کو دلہن بنا کر لے جانے کی نصیحت کرتا ہے دلہا کا باپ کہتا ہے' جہیز کے بغیر لڑکی منظور نہیں ہے۔ اگر لڑکی سے اتنی ہمدردی ہے تو تم جہیز کی رقم ادا کر دو۔ صرف پچاس ہزار روپے۔ تب زبیر ڈرامائی انداز میں کہتا ہے۔ میں ابھی رقم لاتا ہوں۔ انتظار کرو۔ وہ تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا بینک کے سامنے آتا ہے لیکن بینک بند ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ ایک مل اونر کے پاس آتا ہے۔ اسے کہتا ہے' تم جانتے ہو میں کتنا دولت مند ہوں لیکن بینک بند ہو چکا ہے۔ مجھے پچاس ہزار دے دو۔ یہ رقم تمہیں کل واپس مل جائے گی۔

مل اونر ہنستے ہوئے کہتا ہے۔ "زبیر صاحب! میرے ساتھ بھی آپ جیسا معاملہ ہے۔ اتنی بڑی رقم جیب میں یا دفتر میں نہیں رکھی جاتی اور آپ خود کہہ رہے ہیں کہ بینک بند ہو چکا ہے۔"

مل اونر کی بات درست تھی۔ بینک بند ہونے کے بعد اسے کسی دولت مند دوست سے پچاس ہزار روپے نہیں مل سکتے تھے۔ وہ کار لے کر ایک کار ڈیلر کے پاس آتا ہے پھر اپنی پانچ لاکھ کی کار پچاس ہزار میں فروخت کر کے وہ رقم لے کر دوڑتا ہوا غریبوں کی بستی میں آتا ہے۔ بارات واپس جانے والی ہوتی ہے۔ وہ پچاس ہزار کی گڈیاں دیکھ کر رک جاتی ہے۔ لڑکے کا باپ لڑکی کو بہو بنا کر لے جانے پر راضی ہو جاتا ہے۔ شادی ہو جاتی ہے۔ کہانی کا اختتام بڑا ہی تاثر انگیز تھا۔ ایک طرف غریب لڑکی دلہن بن کر پھولوں سے سجی ہوئی کار میں جاتی ہے اور زبیر خالی سڑک پر پیدل چلتا جاتا ہے۔"

بالکل فلمی طرز کی کہانی تھی۔ کہانی کے ہیرو زبیر نے جذباتی انداز میں پانچ لاکھ کی کار کو صرف پچاس ہزار میں فروخت کیا جبکہ فوری طور پر لاکھ دو لاکھ مل سکتے تھے۔ پھر اس نے رئیس زادی کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ وہ کسی غریب لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ جب ایک غریب لڑکی کی بارات واپس جا رہی تھی تو اسے جہیز کی لعنت ختم کرنے کے لئے اس لڑکی سے شادی کرنا چاہئے تھی لیکن اس نے کار فروخت کر کے جہیز کی رقم دی اور خود غریب لڑکی کو قبول نہیں کیا۔ آخر میں دل کو لگنے والا یہ منظر لکھا کہ اس کی قربانی کے باعث ایک غریب لڑکی پھولوں سے سجی ہوئی کار میں جا رہی ہے اور امیر و کبیر زبیر پیدل گھر جا رہا ہے۔

جب انسان کے اندر کھوٹ ہو سکتا ہے تو کہانیوں کے اندر کھوٹ کیوں نہ ہو گا۔

اناڑی پڑھنے والے اور خصوصاً جوان لڑکیاں اندر کی خامیوں کو دیکھ نہیں پاتیں۔ سلمیٰ نے اس سے پہلے زبیر کی بہت سی کہانیاں پڑھی تھیں۔ اس کی زبردست فین تھی لیکن اس کہانی نے تو اس کے دل میں ہلچل مچا دی تھی۔

کہانی کے عنوان کے ساتھ لکھا ہوا تھا کہ وہ زبیر کی سچی آپ بیتی ہے اور یہ متاثر کرنے والی بات تھی کہ زبیر کا کردار کس قدر بلند تھا۔ وہ شراب پینے والی رئیس زادی کو ٹھکرا دیتا ہے اور کسی اجنبی غریب لڑکی کو سہاگن بنانے کے لئے لاکھوں کی کار کوڑیوں کے مول بیچ دیتا ہے۔

وہ رات دیر تک جاگتی رہی۔ کبھی کروٹیں بدلتی رہی' کبھی اٹھ کر چارپائی کے پاس ٹہلتی رہی۔ جب یقین ہو گیا کہ اپنے اندر کا غبار نکالے بغیر نیند نہیں آئے گی تو وہ کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔ لکھنے لگی۔ "زبیر صاحب! میں نے آپ کی آپ بیتی پڑھی۔ آپ کے قلم میں جادو ہے۔ آپ سحر زدہ کر دیتے ہیں۔ میں نے کئی بار آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کیا ہے لیکن آپ کا پوسٹل ایڈریس معلوم نہیں تھا۔ مجبوراً رسالے کے پتے پر لکھ رہی ہوں' آپ میرے خط کا جواب دیں گے اور اپنے ذاتی پتے پر خط و کتابت جاری رکھیں گے؟ جس دن آپ کا خط مجھے ملے گا اس دن میرے لئے عید ہو جائے گی۔ اس سے زیادہ اور کیا لکھوں۔

فقط آپ کی فین سلمیٰ......."

اس نے دوسرے دن رسالے کے پتے پر خط پوسٹ کر دیا اور یوں انتظار کرنے لگی جیسے آج ہی جواب موصول ہو جائے گا۔ رات کو کروٹیں بدلتے ہوئے سوچنے لگی۔ "ملک کے بہت بڑے مصنف ہیں۔ پتا نہیں کتنے قارئین کے خطوط آتے ہوں گے اور خطوط لکھنے والوں میں پتا نہیں کتنی لڑکیاں ہوں گی' انہیں باری باری جواب دینے کے بعد پتا نہیں میری باری کب آئے گی؟"

اسے خیال نہیں رہا کہ وہ سوچنے کے دوران بڑبڑا رہی ہے دھیرے دھیرے بول رہی ہے۔ پتا نہیں وہ کیسے ہوں گے؟ پتا نہیں ایک کار پانی کے بھاؤ بیچ کر دوسری خریدی ہے یا نہیں؟ پتا نہیں پیدل چل رہے یا........"

پاس والی چارپائی سے بڑی بہن نے کہا۔ "پتا نہیں تجھے عقل کب آئے گی اور عقل نہ آئی تو پتا نہیں نیند کب آئے گی۔ یہ تو نے پتا نہیں پتا نہیں کی کیا رٹ لگا رکھی ہے۔"

وہ باجی کی آواز پر چونک کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی باجی بڑی سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا ضروری ہے کہ کسی مرد سے دھوکا کھاؤ تو عقل آئے۔ کیا تو میری اور آپا

کی زندگی سے کچھ سیکھ نہیں سکتی؟"

اس کی بڑی آپا سعیدہ بانو چھ برس پہلے ایک شخص کی دلہن بن کر مسقط گئی تھیں۔ اس کے بعد پتا نہیں کہاں پہنچا دی گئی تھیں۔ شادی کے ایک برس بعد ہی ایسے افراد کے نام اور تصویریں شائع ہوئی تھیں جو حسین لڑکیوں کو اسمگل کرتے تھے۔ ان میں اس کے بہنوئی کا نام اور فوٹو بھی تھا جو اس کی آپا کو دلہن بنا کر لے گیا تھا۔

بوڑھے باپ اور جوان بھائی نے اخبارات کے دفتروں میں جا کر معلومات حاصل کیں۔ معلوم ہوا اونچے پیمانے پر سفارت خانوں کے ذریعے سعیدہ بانو کا سراغ لگانا ہوگا۔ سلمیٰ کا باپ بھائی اونچے نہیں تھے' اونچے ذرائع تک پہنچ نہیں تھی۔ سعیدہ بانو کے لئے بھاگتے بھاگتے چھ برس گزر گئے۔ ان چھ برسوں میں رفتہ رفتہ اندازہ ہو گیا کہ وہ مر چکی ہے یا کسی حرم سرا میں مردہ عورت کی طرح زندگی گزار رہی ہے۔

اس کے بعد سائرہ باجی کا قصہ سامنے آیا۔ وہ ایک گارمنٹس فیکٹری میں کپڑوں اور دھاگوں کی انچارج تھی اور ریڈی میڈ ملبوسات کا حساب رکھتی تھی۔ ایک بار اس کا بھائی قیصر کسی ضرورت سے فیکٹری میں ملنے آیا۔ معلوم ہوا بہن مالک کے آفس میں ہے۔ وہ آفس کے دروازے پر پہنچا تو وہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دستک دی۔ اندر سے مالک کی غراتی ہوئی آواز آئی۔ "کون ہے؟ جاؤ ابھی میں مصروف ہوں۔"

اس نے دروازے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میں قیصر ہوں سائرہ کا بھائی۔ دروازہ کھولو۔"

بھائی کے ذکر پر اندر سناٹا چھا گیا۔ قیصر کو ایک دم سے توہین کا احساس ہوا۔ اگر سائرہ اندر ہے تو دروازہ کیوں بند ہے؟ پُراسرار خاموشی کیوں چھا گئی ہے؟ غرا کر بولنے والا مالک خاموش کیوں ہے؟

اس نے پھر دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ فیکٹری کے مینجر نے اپنے دفتر سے نکل کر کہا "مسٹر! یہ دستک دینے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ تمہاری بہن آج جلدی چھٹی لے کر جا چکی ہے۔ صاحب اندر مصروف ہیں' انہیں ڈسٹرب نہ کرو۔"

قیصر سر جھکا کر سوچتے ہوئے واپس جانے لگا۔ پھر دو قدم چل کر رک گیا۔ پلٹ کر بولا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا' میں کسی کا بھائی ہوں اور بہن سے ملنے آیا ہوں۔"

مینجر سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ پھر جلدی سے بولا۔ "بھئی تم سائرہ کے بھائی ہو۔ پہلے بھی تم اس سے ملنے آئے تھے۔"

"میں اس فیکٹری میں پہلی بار آیا ہوں۔"

وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "بحث نہ کرو' ابھی تم دروازہ پیٹ کر سائرہ کو آوازیں دے رہے تھے۔"

"اول تو میں نے آوازیں نہیں دیں۔ صرف ایک بار کہا تھا کہ سائرہ کا بھائی ہوں دروازہ کھولو۔ دوم آپ کا دفتر ادھر ہے۔ آپ نے میری آواز اتنی دور سے کیسے سن لی؟"

اس سے پھر جواب نہ بن پڑا۔ وہ بولا۔ "اے بھائی! کیوں میری نوکری کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ صاحب نے مجھے انٹرکام پر بتایا تھا کہ سائرہ کا بھائی ہے اس سے کہہ دو کہ وہ چھٹی لے کر چلی گئی ہے۔ خدا کے لئے تم بھی جاؤ۔"

وہ سر جھکا کر جانے لگا۔ اس کی غیرت نے سوال کیا۔ اگر وہ دروازہ کھل جاتا تو کیا وہ بہن سے اور بہن اس سے نظریں ملا سکتی تھی؟ فیکٹری کے وسیع حصے میں سلائی مشینوں کی قطاریں تھیں۔ ہر عمر کی لڑکیاں وہاں بیٹھ کر سلائی کر رہی تھیں۔ وہ قطاروں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ بے شمار مشینوں کی آوازیں اس کی سماعت میں ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر دوڑتا ہوا فیکٹری سے باہر آ گیا۔

فیکٹری کے سامنے کشادہ سڑک تھی۔ سڑک کے دوسری طرف کچھ دکانیں تھیں۔ ان سے پرے کافی اونچائی پر ریلوے لائن تھی۔ وہ ریل کی پٹڑی پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہاں سے فیکٹری کا بڑا پھاٹک صاف نظر آتا تھا۔

دو گھنٹے بعد چھٹی کا وقت ہو گیا۔ بڑے پھاٹک کا ایک چھوٹا سا دروازہ کھل گیا۔ اس دروازے سے ایک ایک دو عورتیں باہر آنے لگیں۔ قیصر کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ ٹوٹ ٹوٹ کر سمجھ رہا تھا کہ فیکٹری میں اس سے جھوٹ بولا گیا ہے۔ وہ چاہتا تو بند دروازے کو کھلوانے کے لئے اَڑ جاتا لیکن غیرت نے گوارا نہیں کیا۔ نظریں بہن کی نظروں سے نہیں مل سکتی تھیں۔

پھر رہے سہے شبہے کی تصدیق ہو گئی۔ سائرہ چھوٹے دروازے سے نکل کر فیکٹری سے باہر آئی تھی اور بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔ ریلوے کا انجن تیزی سے سیٹی بجاتا ہوا جا رہا تھا۔ پیچھے والی پٹڑی پر ٹرین تیزی سے گزر رہی تھی۔ وہ دوسری پٹڑی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرے انجن کی سیٹی بھی چیختی ہوئی آ رہی تھی۔ ادھر دو ٹرینوں کی کراسنگ تھی۔ کراس کرنے والا انجن اسے دور تک اچھالتا ہوا' اس کے چیتھڑے اُڑاتا ہوا گزر گیا۔

سائرہ فیکٹری سے گھر تک سہمی رہی اور سوچتی رہی کہ بھائی سے کیسے سامنا کرے گی؟ گھر میں رات ہو گئی۔ رات کے کھانے کا وقت گزر گیا۔ پھر صبح ہو گئی۔ وہ نہیں آیا۔ دوسرے دن اخبار میں کسی کے ریلوے لائن پر کٹ مرنے کی خبر شائع ہوئی۔ لاش ناقابلِ

شناخت تھی۔ کٹے پھٹے لباس سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہوئی جس سے قیصر کا پتا ٹھکانا معلوم ہوتا۔ سائرہ، سلمیٰ اور ان کے باپ کو کبھی کبھی اخبار پڑھنا نصیب ہوتا تھا۔ اس روز کا اخبار نصیب نہیں ہوا۔

وہ دوسرے اور تیسرے دن بھی گھر نہیں آیا تو تشویش بڑھتی گئی۔ اس کے دوستوں کے ہاں پوچھا گیا۔ سب نے کہا کہ انہوں نے دو چار دنوں سے اسے دیکھا نہیں ہے۔ محلے والوں کے مشورے پر قریبی تھانے میں گم شدگی کی رپورٹ لکھوائی گئی۔ بوڑھا باپ رپورٹ لکھوانے کے دوسرے دن پھر تھانے پہنچا۔ ایک سپاہی نے کہا۔ "تمہارا بیٹا کسی حادثے کا شکار ہو سکتا ہے۔ نہر والی ریلوے لائن کے پاس جو تھانہ ہے، وہاں ایک لاش کے ٹکڑے لائے گئے تھے۔ ٹرین کے نیچے آ کر مرنے والے کا کوئی وارث سامنے نہیں آیا، تم وہاں جا کر معلوم کرو۔"

وہاں جانے کے بعد معلوم ہوا۔ لاش ناقابلِ شناخت ہو گئی تھی۔ دو دنوں تک اس کے وارثوں کا انتظار کیا گیا۔ لاش کی بدبو ناقابلِ برداشت تھی لہٰذا بھنگیوں کو بلا کر اسے قریبی قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ البتہ اس کے پھٹے ہوئے کپڑے تھانے میں تھے۔ جنہیں دیکھتے ہی بوڑھا باپ چکرا کر گر پڑا۔ اپنے قدموں سے چل کر گھر تک نہ آ سکا۔ اسے اسپتال پہنچایا گیا۔ اسپتال میں امراض کا علاج ہوتا ہے، کوئی معالج بیٹے کی ناگہانی موت کا صدمہ نہیں دھو سکتا۔ وہ تین بیٹیوں میں اس کا کلوتا بیٹا تھا۔ اس کے مرتے ہی باپ نے ہمیشہ کے لئے بستر پکڑ لیا۔

سائرہ نے سمجھ لیا کہ بھائی کو غیرت نے مار ڈالا ہے۔ وہ کئی دنوں تک دل اور دماغ پر بوجھ لئے پھرتی رہی۔ باپ کو اصل بات بتاتی تو وہ نیم مُردہ رہنے والا بھی مر جاتا۔ اس نے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ایک رات سلمیٰ سے کہا۔ "میں نہیں بولوں گی تو مر جاؤں گی۔ میں ایک ناقابلِ برداشت بوجھ اٹھائے پھر رہی ہوں۔"

"کیسا بوجھ؟"

وہ فیکٹری کا واقعہ بتانے لگی۔ سلمیٰ گم صم ہو کر سنتی رہی۔ سب کچھ سننے کے بعد زبان سے کچھ نہ بولی۔ خلا میں تکتی رہی۔ سائرہ نے کہا۔ "چپ کیوں ہو؟ کچھ بولو۔ مجھے گالیاں دو۔ میرے منہ پر تھوک دو۔ میں کئی بار خودکشی کے لئے سوچ کر رہ گئی۔ آپا چلی گئیں۔ بھائی چلا گیا۔ میں بھی جان دے دوں گی تو ابا کا کیا بنے گا؟ تیری تعلیم اور شادی کا کیا ہو گا؟ میں اکیلی کمانے والی ہوں۔ تیری تعلیم کے اخراجات پورے کرنے والی ایک میں ہی ہوں۔ ابا پہلے ہی کمانے کے قابل نہیں تھے اب تو بستر سے اٹھ بھی نہیں سکتے۔ میں تم

لوگوں کو دال روٹیاں کھلاتی ہوں، حلال کی نہ سہی، حرام کی سہی۔ مگر تم لوگوں کی زندگی حرام نہیں ہونے دیتی۔ سوچتی تھی قیصر تعلیم مکمل کر لے، گھر کا بوجھ اٹھانے لگے تو پھر کسی کو اپنی بوٹیاں نوچنے نہیں دوں گی۔ اسے غیرت میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس غیرت مند نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ مجھ جیسی چار جماعتیں پڑھنے والی کو ماہانہ چار ہزار روپے کیوں ملتے ہیں؟ کس محنت کے صلے میں ملتے ہیں؟"

وہ بولتی رہی اور روتی رہی۔ سلمیٰ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے لیکن وہ بدستور خاموش تھی۔ تکئے پر سر رکھے ستاروں بھرے کالے آسمان کو تک رہی تھی۔ آنگن کو تک رہی تھی۔ آنگن میں رات کی رانی مہک رہی تھی اور یہ خیال خنجر کی طرح دل میں اتر رہا تھا کہ بھائی کو رات کی رانی کی خوشبو بہت پسند تھی۔

سائرہ دو خواب آور گولیاں پانی سے نگل رہی تھی، اب گولیوں کے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی۔ وہ گھڑے پر خالی گلاس اوندھا کر کے اپنی چارپائی پر آ گئی۔ پھر تکئے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ آدمی کیا کرے؟ جینا ہی پڑتا ہے۔ اپنے لئے نہ سہی، دوسروں کے لئے جینا پڑتا ہے۔ پیدا ہونے کے بعد کوئی اپنی مرضی سے مر بھی نہیں سکتا۔ اگر کوئی اپنی مرضی سے خودکشی کرتا ہے تو شاید یہ خودکشی بھی اس کی اپنی مرضی کی نہ ہو۔ مرضی مقدر کی ہو۔

بڑی دیر بعد نیند آنے لگی۔ آنکھیں بند ہونے لگیں تب سلمیٰ کی آواز سنائی دی۔ "باجی جو ہوا، وہ صدمہ سہنا ہی پڑے گا مگر آپ کے ساتھ جو ہو رہا ہے، وہ مناسب نہیں ہے آپ اپنے صاحب سے شادی کر لیں۔"

"شادی؟" سائرہ آنکھیں بند کرتے کرتے چونک گئی۔ جیسے پتھر آ کر لگا ہو۔ جو مال مفت میں ملتا ہو اسے کون احمق قیمت دے کر خریدے گا۔

اور شادی تو صرف مہنگا سودا ہی نہیں پیروں کی زنجیر بھی ہوتی ہے اور آج تک کسی نے ہوشمندی میں زنجیر نہیں پہنی۔

سلمیٰ نے پھر آواز دی۔ "باجی! ہمارے لئے اپنی زندگی حرام نہ کریں، شادی کر لیں۔"

تب وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "صاحب دوسری شادی نہیں کریں گے۔"

"دوسری شادی؟" سلمیٰ نے سر گھما کر بہن کو دیکھا۔

"ہاں، ان کی ایک بیوی اور سات بچے ہیں۔ بیوی وہ گارمنٹس فیکٹری اپنے جہیز میں لائی تھی۔ صاحب مجھے بہت چاہتے ہیں لیکن دوسری شادی کریں گے تو اس فیکٹری سے محروم ہو جائیں گے۔ وہ فیکٹری بہت منافع بخش ہے۔ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ دوسری

شادی نہ سہی، دوسری عورت ہی سہی۔ وہ اس ماہ سے مجھے چھ ہزار دیا کریں گے۔"

سائرہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ بند آنکھوں کے اندر نیند آنے والی تھی، اس سے پہلے آنسو باہر آرہے تھے۔

یہ اُن دنوں کی بات تھی جب سلمٰی نے ساتویں کا امتحان پاس کیا تھا۔ اب تو وہ دسویں جماعت میں کامیاب ہو کر کالج میں پہنچ گئی تھی۔ جتنی کورس کی کتابیں پڑھتی تھی، اتنی ہی زبیر احمد زبیر کی کہانیاں ڈھونڈ کر پڑھتی تھی۔ بک اسٹال والے اسے پہچان گئے تھے۔ جب بھی کسی رسالے میں زبیر کی کہانی شائع ہوتی، وہ سلمٰی کو آواز دے کر بلاتے تھے۔ "بی بی! تمہارے رائیٹر کی کہانی آگئی ہے۔"

گھر میں سائرہ نے بھی دیکھا تھا کہ وہ اپنے پسندیدہ رائیٹر کی کہانیاں پڑھ کر باؤلی ہو جاتی تھی اور کہانیوں کی خاص خاص باتیں سائرہ کو بھی پڑھ کر سناتی تھی۔ وہ سنتی پھر کہتی تھی۔ "سلمٰی! خود کو قابو میں رکھا کر۔ کیا تُو اس کے لئے زیادہ پاگل نہیں ہو رہی ہے؟"

"اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے؟"

"تُو نے خود ہی مجھے بتایا ہے کہ بک اسٹال والے تجھے زبیر کے حوالے سے پہچانتے ہیں۔ کالج کی لڑکیاں اس کے نام سے تجھے چھیڑتی ہیں۔ گھر کی چار دیواری میں تُو نے اتنی نمازیں نہیں پڑھیں، جتنا زبیر کو پڑھ ڈالا ہے۔"

وہ اپنی سائرہ باجی سے بحث نہیں کرتی تھی کیونکہ کھانا پینا، اچھا پہننا اور کالج میں تعلیم حاصل کرنا، سب ہی باجی کے دم سے تھا۔ وہ آئندہ کے لئے محتاط ہو گئی کہ اس کے سامنے زبیر کا کوئی ذکر نہیں کرے گی لیکن جس روز اس نے پہلی بار زبیر کو خط لکھا۔ اس رات کچھ زیادہ ہی بے چین ہو گئی تھی۔ اس کا خیال تھا، باجی خواب آور گولیاں کھا کر سو رہی ہیں۔ لہٰذا وہ کروٹ کروٹ زبیر کے متعلق سوچ رہی تھی کہ پتا نہیں اس رائیٹر کے پاس کتنی لڑکیوں کے خطوط آتے ہوں گے؟ وہ سب کو باری باری جواب لکھ کر بھیجتا ہوگا۔ پتا نہیں میری باری کب آئے گی؟

ایسے ہی وقت وہ سائرہ باجی کی آواز پر چونک گئی۔ وہ کہہ تھیں۔ "پتا نہیں تجھے کب عقل آئے گی۔ کیا عقل آنے کے لئے ٹھوکریں کھانا ضروری ہے۔ کیا تو آپا کی اور میری زندگی سے کچھ سیکھ نہیں سکتی؟"

وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ باجی کی طرف منہ کر کے بولی۔ "میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ جو آپ کے اور آپا کے ساتھ ہوا وہ میرے ساتھ نہیں ہوگا۔ میں ایسے شخص سے شادی کروں گی جس کے پاس دولت، عزت اور شہرت ہو۔ میں نے ابھی تک زبیر

اس کی تحریروں کے حوالے سے پسند کیا ہے۔ یہ پڑھا بھی ہے اور سنا بھی ہے کہ اس کے پاس دولت، عزت اور شہرت ہے۔ آئندہ میں خط و کتابت کے ذریعے اسے سمجھوں گی۔ ملاقات کا موقع ملا تو اسے دیکھنے کے بعد سوچ سمجھ کر فیصلہ کروں گی۔"

"اگر وہ شادی شدہ ہوا تو؟"

"تو میں اس کا سایہ بھی خود پر نہیں پڑنے دوں گی۔"

"تو جس طرح بول رہی ہے، خدا کرے اتنی ہی دانشمندی سے عمل بھی کرے۔"

زبان کی اور عمل کی دانشمندی میں بڑا تضاد ہوتا ہے۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ گفتار کا غازی، عمل کی راہ پر شہید ہو۔ وقت آنے پر ہی زبان اور عمل کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔

پانچویں دن لوکل ڈاک سے زبیر کا خط آگیا۔ لفافے کے ایک گوشے میں اس کا نام دیکھ کر سلمٰی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے جلدی سے لفافہ کھول۔ اندر سے تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور پھر اسے کھول کر تیزی سے پڑھنے لگی۔ ایک بار پڑھنے کے بعد خیال آیا، جلدی میں پڑھ گئی ہے۔ ذرا ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا چاہئے۔ دوسری بار آہستہ پڑھنے میں خواب کچھ گہرے ہو گئے۔ پھر بھی تسلی نہ ہوئی۔ اس نے تیسری بار ایک ایک لفظ کو خوب غور سے پڑھا تو وہ خط کسی حد تک ہضم ہوا۔ اس نے خط کو تہہ کر کے گریبان کے سائے میں غروب کر دیا۔ اب وہ رات کو جواب لکھنے سے پہلے اسے کئی بار پڑھنے والی تھی۔

زبیر نے اس کی فرمائش کے مطابق اپنا ذاتی پتا لکھا تھا جس سے پتا چلا وہ علامہ اقبال ٹاؤن میں رہتا ہے اور یہ اچھرے میں تھی۔ وہ آئیڈیل رائیٹر بہت زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور اس خط میں یہی سب سے خوشی کی بات تھی۔

اس نے لکھا تھا۔ "سلمٰی! چونکہ تم نے اپنے نام کے آگے مس یا مسز نہیں لکھا ہے اس لئے میں بھی سلمٰی ہی کہہ کر مخاطب کر رہا ہوں۔ میں ایک ہفتہ کے لئے لندن گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو تمہارا خط اپنی میز پر پایا۔ یوں تو میز پر بے شمار خطوط تھے لیکن تمہاری نوش خطی نے سب سے پہلے متوجہ کیا۔ پھر لفافہ کھول کر خط پڑھا تو اس میں کچھ عجیب سی بنائیت محسوس ہوئی۔ میں کسی کو اپنا ذاتی پتا نہیں بتاتا۔ ملاقات کرنے والوں کی بھیڑ لگ اتی ہے۔ تمہاری فرمائش پر پتا لکھ رہا ہوں۔ پلیز، یہ کسی اور کو نہ بتانا۔ اچھا اب اجازت اہوں گا۔ تمہارا جواب آئے گا تو ضرور جواباً بہت کچھ لکھوں گا۔ ابتدائی ملاقات اکثر مختصر تی ہے۔ فقط تمہارا قلم کار زبیر احمد زبیر۔"

وہ رات دیر تک جاگتی رہی۔ خط کے ایک ایک فقرے اور ایک ایک لفظ پر غور کرتی رہی۔ اس میں تو شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ دولتمند ہے اور لندن تک چلا جاتا ہے۔ اس کی خوش خطی نے زبیر کو متوجہ کیا تھا۔ گویا اس نے خوش خطی نہیں' پردہ نشیں کا ایک ناخن دیکھا تھا اور اسے اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔ ابھی تو پردہ نشیں کو روبرو دیکھنا رہ گیا تھا۔ دیکھ لے گا تو پتا نہیں اپنائیت کا کیا عالم ہو گا۔

پھر یہ کہ اس نے اپنا ذاتی پتا صرف سلمٰی کو دیا تھا اور یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دوسری لڑکیوں سے کتراتا تھا۔ سلمٰی اپنے طور پر تجزیہ کر رہی تھی کہ وہ اپنائیت محسوس کرنے کے باعث اسے دوسروں پر ترجیح دے رہا ہے۔ ابھی سوچنے سمجھنے کا یہ پہلو ذہن میں نہیں آیا کہ وہ اسے دیکھے بغیر دوسروں پر کیوں ترجیح دے رہا ہے؟

دونوں بہنیں آنگن میں سوتی تھیں۔ سلمٰی کروٹیں بدل بدل کر انتظار کر رہی تھی کہ سائرہ باجی سوئیں گی تو وہ کمرے میں جا کر خط لکھے گی لیکن سائرہ باجی بھی کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "باجی! آپ نے نیند کی گولیاں نہیں لیں؟"

وہ بولی۔ "نہیں' جب بدترین حالات سے سمجھوتا ہو جائے تو نیند آنے لگتی ہے۔ پچھلے عرصے سے میں نے گولیاں کھانا چھوڑ دی تھیں۔ نیند آرام سے آ جاتی تھی۔"

"آج کیوں جاگ رہی ہیں؟"

"کل سے میری جگہ اور میرا صاحب بدل رہا ہے۔ میں فیکٹری چھوڑ رہی ہوں۔ ایک بہت بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنی میں ٹیلی فون آپریٹر کا کام کروں گی۔"

"آپ فیکٹری کیوں چھوڑ رہی ہیں' کیا دوسری جگہ آپ کو ماہانہ چھ ہزار ملیں گے؟"

"آٹھ ہزار ملیں گے .... دراصل ایڈورٹائزنگ کمپنی کے مالک نے کئی بار مجھے فیکٹری میں دیکھا تھا۔ وہ کہتا ہے میں اس کی آئیڈیل محبوبہ لگتی ہوں۔ فیکٹری کے صاحب کو وہ لڑکی آئیڈیل لگتی ہے جو ایڈورٹائزنگ میں کام کر رہی ہے۔ یوں دونوں نے اپنے آئیڈیل کا تبادلہ کر لیا ہے۔ ہمیں راضی کرنے کے لئے تنخواہ بڑھا دی ہے۔"

سلمٰی تڑپ کر بولی۔ "یہ کیا ذلالت ہے؟"

"ذلالت نہیں' ذہانت ہے۔ اگر صاحب مجھ سے دوسری شادی کر لیتا تو میں بیوی ہوتی۔ یہ لوگ کتنے ہی بے غیرت ہوں' آپس میں بیویوں کا تبادلہ نہیں کرتے ہیں۔ صاحب مجھے بیوی بنا کر غیرت مند بن جاتا۔ دراصل مرد کے لئے دوسری شادی ضروری نہیں ہے' دوسری عورت ضروری ہے۔"

وہ دوسری طرف منہ کر کے شاید سلمٰی سے منہ چھپانے لگی لیکن بہن کا لرزتا ہوا بدن بتا رہا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔ اس نے سوچا اٹھ کر پاس جائے اور اس سے لپٹ کر اس کے آنسو پونچھے' اسے دلاسا دے۔ پھر خیال آیا ایک کے بعد دوسرا تازہ صدمہ پہنچے تو رونے والوں کو کھل کر رونے کا موقع دینا چاہئے۔ دل کا بوجھ ہلکا ہونے کے بعد ہی تسلیاں اور دلاسے کام آتے ہیں۔

اس رات اسے خط لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ باجی نے اپنے سر پر پہاڑ اٹھا رکھا ہے۔ اگر میری شادی ہو جائے اور شادی کے بعد میں شوہر کے پاس رہ کر تعلیم مکمل کروں تو باجی پر صرف ابا کا بوجھ رہ جائے گا۔ میرا شوہر اچھا ثابت ہوا تو میں ابا کو بھی اپنے ساتھ رکھ لوں گی۔ پھر باجی بے حیا ملازمت نہیں کریں گی۔ میں انہیں عزت سے بیاہ دوں گی۔ یعنی باجی جو قربانیاں آج ہمارے لئے دے رہی ہیں' وہی قربانیاں میں اپنے شوہر کے تعاون سے دے سکوں گی تو تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔

اس نے دوسرے دن کالج میں بیٹھ کر زبیر کو خط لکھا۔ "زبیر صاحب! میں نے اپنے نام کے آگے مس یا مسز نہیں لکھا۔ لکھ دیتی تو معلوم ہوتا کہ میں شادی شدہ ہوں یا نہیں؟ جبکہ مردوں کے نام کے آگے شادی شدہ ہونے کی پہچان نہیں ہوتی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ مس یا مسز کے ذریعے یا گود میں بچے کے ذریعے عورت پڑھ لی جاتی ہے۔ مرد کی گود میں بچہ نہیں ہوتا۔ وہ ساری عمر کنوارے کے طور پر پیش ہوتا رہتا ہے۔ اس سے خاص طور پر پوچھنا پڑتا ہے۔ بھئی زبان کھولو اور بولو کیا شادی ہو چکی ہے؟

"بہرحال میں کوئی معمہ نہیں ہوں۔ مس ہوں۔ آنسہ سلمٰی عابد۔ آپ علامہ اقبال ٹاؤن میں رہتے ہیں اور میں وہیں دبئی چوک کے پاس گرلز کالج میں پڑھتی ہوں۔ آپ کو میری خوش خطی پسند آئی یہ میرے لئے بڑی بات ہے۔ میرے خط میں آپ کو اپنائیت کا احساس ہوا۔ اس سے زیادہ آپ نے ذاتی پتا لکھ کر اپنائیت کا ثبوت دیا۔ آپ اطمینان رکھیں' یہ پتا میں کسی کو نہیں بتاؤں گی اسے میں نے سبق کی طرح ذہن میں نقش کر لیا ہے اور آپ کے خط سے مٹا دیا ہے۔ آپ کی تحریر کا ایک لفظ بھی مٹانے کو جی نہیں چاہتا لیکن وہ الفاظ آپ کو نقصان پہنچا رہے تھے اور جو آپ کو نقصان پہنچانے والا ہو' اسے مٹا دینا فرض ہے۔"

یہ آخری دو فقرے لکھنے کے بعد اس نے انہیں بار بار پڑھا' کہیں بہت زیادہ اپنائیت کا اظہار تو نہیں ہو گیا ہے؟ کئی بار سوچا ان فقروں کو مٹا دیا جائے لیکن اس نے سوچتے سوچتے خط مکمل کر لیا۔ لفافے میں بند کر دیا۔ ایڈریس لکھ کر پوسٹ کر دیا' اس کے بعد

سوچنے اور مٹانے کی گنجائش ختم ہو گئی۔

دوسری صبح وہ کالج جانے کے لئے گھر سے نکلی۔ گلیکسی سینما کے بس اسٹاپ پر آئی‘ اگرچہ دہئی چوک بہت فاصلے پر نہیں تھا تاہم دو بسیں بدلنا ضروری ہوتا تھا۔ وہ اسٹاپ پر آئی تو قریب ہی ایک کار آکر رک گئی۔ کار سے ایک ادھیڑ عمر کا شخص باہر آیا پھر بولا۔

”ہیلو مس سلمٰی! مجھے زبیر احمد کہتے ہیں۔“

سلمٰی نے چونک کر دیکھا۔ وہ جیسا تصور میں تھا‘ ویسا نہیں تھا پھر بھی ایک بہت بڑے رائیٹر کے سامنے دل دھڑکنے لگا۔ اسے گم صم دیکھ کر اس نے اپنا شناختی کارڈ دکھا کر کہا ”اس کارڈ سے یقین ہو جانا چاہئے کہ میں وہی زبیر ہوں۔“

اس نے کارڈ لے کر دیکھا۔ تصویر اس شخص کی تھی جو سامنے کھڑا ہوا تھا۔ وہ بولا۔

”مجھ سے غلطی ہو گئی۔ پاسپورٹ گھر میں چھوڑ آیا۔ اسے دیکھ کر شبے کی گنجائش نہ رہتی۔“

وہ ذرا سنبھل کر بولی۔ ”نہیں شبے کی بات نہیں ہے۔ آپ کو اچانک دیکھ کر حیران رہ گئی ہوں۔ آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟“

”میں تمہاری الجھن دور کر دوں گا لیکن سڑک کے کنارے گفتگو کرنا مناسب نہیں ہے۔ چلو کار میں بیٹھو۔“

وہ انکار کر سکتی تھی لیکن اس نے بڑے اعتماد سے بیٹھنے کو کہا تھا۔ اس کے لئے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول چکا تھا۔ بس بھی آگئی تھی مگر بہت پرانی سی اور غریب سی لگ رہی تھی۔ وہ کار کی اگلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ بس پرانے روٹ پر جانے لگی‘ کار نئے روٹ پر چل پڑی۔

سلمٰی نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ زبیر کی آنکھوں پر سیاہ عینک تھی یعنی ابھی آنکھیں چھپی ہوئی تھیں۔ باقی چہرہ ایک عام آدمی کا تھا۔ کوئی غیر معمولی کشش نہیں تھی۔ دیکھنے سے ہی عمر کچھ زیادہ لگتی تھی۔ چالیس اور پینتالیس کے درمیان ہو گی۔ اگر ایسا تھا تو وہ سلمٰی کی دوگنی عمر سے بھی زیادہ تھا۔

شاید عمر رسیدگی کے باعث اس کی شخصیت بھاری بھر کم لگ رہی تھی۔ ائرکنڈیشنڈ کار نے اس کی شخصیت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ دل سمجھا رہا تھا کہ اتنی عزت‘ شہرت اور دولت کماتے کماتے عمر گزر جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ابھی زبیر کی زیادہ عمر نہیں گزری ہے۔ دراصل محنت اور تھکن آدمی کو وقت سے پہلے عمر رسیدہ بنا دیتی ہے۔

وہ خاموش بیٹھی اسے کبھی کبھی چور نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس کا خیال تھا کہ چور

نظریں پکڑی نہیں جاتیں۔ ادھر وہ انجان بنا ہوا تھا۔ یہ چاہتا تھا کہ دیکھنے والی اچھی طرح دیکھ سمجھ لے۔ پھر وہ خود ہی بولی۔ ”کیا آپ مجھے پہلے سے جانتے ہیں؟“

”تمہارا خط پڑھنے تک تمہیں نہیں جانتا تھا۔ پڑھنے کے بعد تجسس ہوا کہ جس کی تحریر ایسی عمدہ ہے وہ کیسی ہو گی؟ دیکھنے کو دل مچل گیا۔ تم نے اپنے خط پر جو پتا لکھا تھا میں اس پتے کے مطابق شام کو تمہارے مکان کے سامنے سے گزرا۔ پہلے کار میں گیا۔ پھر ایک جگہ کار روک کر پیدل تمہارے دروازے کے سامنے سے گزرنے لگا۔ اسی وقت ایک لڑکی کہیں سے آ رہی تھی۔ بہت ہی خوبصورت اور اسمارٹ تھی۔ میرے دل نے کہا وہ تم ہو۔ کیونکہ وہ تمہارے ہی دروازے پر آئی تھی۔ جب اس نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے آواز دی۔ ”سلمٰی۔“ تو میں آگے بڑھتے بڑھتے ٹھٹک گیا۔ ایک درخت کی آڑ سے دیکھا‘ تم نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ آنے والی کون تھی؟“

”میری سائرہ باجی تھیں۔“

”میں نے تمہیں دیکھا پر پتا نہیں چلا کتنی دیر تک دیکھ پایا‘ تمہاری باجی اندر گئیں‘ تم نے دروازہ بند کر لیا۔ نظارہ گم ہو گیا پھر بھی میری آنکھوں کو تم نظر آتی رہیں۔ ایک جھلک دکھانے والے جلوے کی جادوگری عجیب ہوتی ہے۔“

وہ شرما رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا بولے؟ وہ بولنے والا اپنے لفظوں کے استعمال سے واقعی منجھا ہوا مصنف لگ رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے کچھ کمتر سی ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ سمجھنے میں وقت گزرتا جا رہا تھا کہ اس کے جواب میں نپی تلی ہوئی بات کس طرح کہی جائے؟

وہ بولا۔ ”جس دن میں نے تمہیں دیکھا اس دن سے لکھنا بھول گیا۔ جس دماغ سے کہانیاں نکل کر آیا کرتی تھیں وہاں سے صرف تم ہی آنے لگیں۔ میں جب بھی کسی کہانی کا آئیڈیا سوچتا ہوں میری نگاہوں کے سامنے تمہارے گھر کا دروازہ کھل کر بند ہو جاتا تھا۔ تم جھلک دکھا کر چھپ جاتی تھیں۔“

وہ بڑی مشکل سے بولی۔ ”اللہ! میں تو ایسی نہیں ہوں جیسی آپ تعریفیں کر رہے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”اچھا ہے کہ تم خود کو حسین نہیں سمجھتی ہو۔ اگر سمجھتیں تو مغرور ہو جاتیں۔ میری کار میں نہ بیٹھتیں۔“

وہ چونک کر ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”لاہور کے راستے بڑے لمبے ہیں کہیں ختم نہیں ہوتے جہاں اختتام کی بات ہو‘

وہاں سے مڑ جاتے ہیں۔ تم جس موڑ پر ساتھ چھوڑنا چاہو گی میں گاڑی روک دوں گا۔ ساتھ دیتی رہو گی تو گاڑی چلتی رہے گی۔"

"آپ کو چار دن پہلے میرا خط ملا ہو گا۔ اسی شام آپ نے میرا سراغ لگایا۔ پھر چار دن بعد کیوں سامنے آئے؟"

"پہلے خط میں یہ طے نہ کر سکا کہ تمہاری اپنائیت صرف میری کہانیوں کے لئے ہے یا میری ذات کے لئے بھی ہے۔ تمہارا دوسرا خط پڑھ کر حوصلہ مل گیا۔"

"دوسرا خط؟" وہ حیرانی سے بولی۔ "وہ تو میں نے کل شام کو پوسٹ کیا تھا؟ اتنی جلدی آپ کو کیسے مل گیا؟"

وہ بولا۔ "قصہ کچھ یوں ہے کہ پہلے دن میں نے تمہیں اپنی باجی کے لئے دروازہ کھولتے دیکھا تھا۔ دوسرے دن ایک کتاب اور کاپی لے کر نکلتے دیکھا۔ وہ اسکول اور کالج کا وقت تھا۔ میں نے بہت فاصلہ رکھ کر تمہارا تعاقب کیا۔ میں کار میں تھا۔ تم دو بسیں بدل کر دہئی چوک گئی تھیں۔ وہاں سے ایک گرلز کالج میں داخل ہو گئی تھیں۔ اس دن سے میں تمہیں اس کالج کے سامنے آتے جاتے دیکھتا رہا۔ کل شام کو تم نے کالج سے نکل کر ایک لفافہ لیٹر بکس میں ڈالا۔ میں نے پورے یقین سے سوچا کہ وہ میرے لئے ہے۔"

پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "بچپن میں ہم چند لڑکے شرارتیں کیا کرتے تھے۔ لیٹر بکس کا تالا توڑ کر اندر سے سارے خطوط نکال کر اِدھر اُدھر پھینکتے ہوئے بھاگ جاتے تھے۔ کل میں نے بچپن کی شرارت دہرائی۔ لیٹر بکس کے سامنے کار کھڑی کر دی کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی قیمتی کار والا کسی کا خط چرائے گا۔ میں نے کار کی آڑ سے لیٹر بکس کا تالا توڑا بے شمار چھوٹے بڑے لفافے اندر سے باہر نکل کر گرنے لگے۔ تمہارا پوسٹ کیا ہوا لفافہ آخر میں یعنی سب سے اوپر تھا اس لئے ذرا دیر سے ملا۔ اس پر اپنا نام پڑھتے ہی میں نے اسے اٹھایا۔ پھر گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے دور نکلتا چلا گیا۔"

عشق بھی کیا چیز ہے۔ عاشق نے باقاعدہ ڈاک کے ذریعے خط کا انتظار نہیں کیا۔ گویا جان پر کھیل کر وہ خط قانون کی تجوری سے چرا لایا۔ سلمٰی اس کی دلیری اور محبوبانہ بے صبری پر خوش ہو رہی تھی۔ زبیر جیسے ذمے دار شہری اور ذمے دار ادیب کی یہ غیر اخلاقی اور غیر قانونی حرکت' سراسر عاشقانہ تھی مجرمانہ نہیں۔ فلموں میں ایسے مناظر دیکھ کر تماشائی خوب تالیاں بجاتے ہیں۔ سلمٰی کے دل میں بھی پیار کی تالیاں گونج رہی تھیں۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "تمہارا دوسرا خط پڑھ کر اتنا حوصلہ ہوا کہ میں تمہارے پاس آ گیا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ تمہیں پاس دیکھ کر مجھے کتنی بڑی دولت مل رہی ہے۔ ایسا لگتا

ہے جیسے یہ ساڑھے چار لاکھ کی گاڑی ابھی اللہ میاں نے مجھے دی ہے تاکہ تم اس میں آ کر بیٹھو' اس گاڑی کی شان بڑھاؤ اور میرا مقدر چمکاؤ۔"

وہ پہلی بار ساڑھے چار لاکھ کی کار میں بیٹھی تھی۔ کار میں بیٹھنے سے ایک طرح کی شان محسوس کر رہی تھی۔ زبیر اس کے برعکس کہہ رہا تھا کہ سلمٰی کے حسین وجود سے گاڑی کی شان بڑھ گئی ہے۔ وہ ایسا چاہنے والا تھا کہ ساڑھے چار لاکھ پر تھوک رہا تھا اور محبوبہ کی اہمیت بڑھا رہا تھا۔

ایسے میں کسی بھی لڑکی کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔ وہ پرل کانٹی نینٹل میں لنچ کے لئے گئے۔ اس ہوٹل کی بھی ایک شان تھی۔ ملکی اور غیر ملکی امیر ترین لوگ نظر آ رہے تھے۔ ایسے لوگوں کے درمیان وہ احساسِ کمتری سے سمٹ گئی تھی۔ اسے خیال ہی نہ رہا کہ وہ سمٹ کر زبیر کے قریب ہو گئی ہے اور وہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر چل رہا ہے۔ اس نے ایسی میز کا انتخاب کیا' جہاں سے سوئمنگ پول نظر آ رہا تھا۔ حسین عورتیں مختصر سے باتھنگ سوٹ میں تیرتی ہوئی اور پول کے کنارے بیٹھی ہوئی مشروب پیتی نظر آ رہی تھیں۔

سلمٰی کھانے کے دوران سوئمنگ پول کی طرف سے نظریں چراتی رہی اور کبھی بھول کر دیکھتی بھی رہی۔ زبیر نے مسکرا کر پوچھا۔ "تمہیں تیرنا آتا ہے؟"

"آں؟ ہاں آتا ہے مگر مجھے یہ بے حیائی پسند نہیں ہے۔"

"مجھے بھی پسند نہیں ہے۔ میں لندن' پیرس اور فرینکفرٹ وغیرہ جاتا ہوں۔ پاکستان سے یورپ تک مجھے ایک سے ایک حسین لڑکی ملتی رہی لیکن میں نے شادی نہیں کی۔"

"وہ کیوں نہیں کی؟"

"وہ اپنے جسم کی نمائش کرتی ہیں۔ عورت کا سنگھار کرنے اور خود کو نمایاں رکھنے کی ایک حد ہوتی ہے۔ اگر وہ حد سے بڑھ جائے اور یوں سوئمنگ پول میں اپنے جسم کی نمائش کرے تو پھر میں اسے بیوی بنانے کے قابل نہیں سمجھتا۔"

"پاکستان میں بے شمار شریف زادیاں ہیں۔ آپ نے یہاں کسی سے شادی کیوں نہیں کی؟"

"کوئی شریف ملی تو وہ اَن پڑھ نکلی۔ کسی کی سیرت اچھی تھی تو صورت اچھی نہ تھی' کوئی کوئی پسند آئی تو پتا چلا اس کی نظر میری دولت پر ہے۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ آپ کی دولت پر نظر رکھتی تھی؟"

"پولیس والوں کی طرح کھل کر حساب لیتی تھی کہ میں نے کتنی جائیداد بنائی ہے۔

بینک میں کتنی رقم ہے۔ ملک سے باہر بھی کیا کچھ جمع کیا ہے؟"

سلمٰی نے کہا۔ "لڑکیاں یا اس کے ماں باپ بیٹی کے خوشگوار مستقبل کے لئے ایسی تحقیقات کرتے ہیں۔ میرے ابو اور بھائی جان مسقط سے آنے والے ایک شخص کی ظاہری شان وشوکت سے متاثر ہو گئے۔ آپا کو اس کے ساتھ بیاہ کر رخصت کر دیا۔ اس کے بعد برسوں گزر گئے۔ ہم نے آپا کی صورت نہیں دیکھی۔ اس بہنوئی کی اخبار میں تصویر دیکھی، وہ حسین لڑکیوں کا اسمگلر تھا۔"

زبیر نے کہا۔ "مجھے تمہاری آپا کے متعلق سن کر دکھ ہوا۔ بیشک لڑکیوں کے والدین کو شادی سے پہلے، ہونے والے داماد کی ہسٹری معلوم کر لینا چاہئے۔ مثلاً میں لاہور میں ہوں۔ علامہ اقبال ٹاؤن میں میری ایک کوٹھی ہے۔ ایک زمانہ جانتا ہے کہ میری کہانیوں نے مجھے لکھ پتی بنا دیا ہے۔ اسی طرح لکھتا رہا تو کروڑ پتی بن جاؤں گا۔ میری آمدنی مختلف پبلشروں سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ جب اتنے ثبوت موجود ہوں تو یہ نہیں پوچھنا چاہئے کہ میرے بینک میں کتنی رقم ہے اور کہاں کہاں جائیداد ہے۔ یہ باتیں کوئی دولت مند اپنے باپ کو بھی نہیں بتاتا۔ صرف بیوی کو کسی حد تک بتا دیتا ہے بشرطیکہ وہ پہلے بیوی بن جائے اور اپنے عمل سے یقین دلا دے کہ وہ دولت کا راز اپنے میکے والوں کو بھی نہیں بتائے گی۔"

وہ قائل ہو کر بولی۔ "آپ درست کہتے ہیں۔ دولت چھپانے کے لئے ہوتی ہے۔ چور، ڈاکو یا جان کے دشمن اپنوں ہی میں ہوتے ہیں۔ دولت کا راز صرف بیوی کو معلوم ہونا چاہئے۔"

وہ بولا۔ "بیوی بننے والی لڑکی میں ایک خوبی لازمی ہو وہ یہ کہ اپنے میکے والوں کی باتوں میں آ کر شوہر سے اختلاف نہ کرے اور نہ شوہر کی دولت مندی کا راز اپنے ماں باپ کو بتائے۔"

"بے شک، لڑکی کو صرف اپنے شوہر پر اعتماد کرنا چاہئے اور خود شوہر کا اعتماد حاصل کرتے رہنا چاہئے۔"

"تم بہت ذہین ہو۔"

وہ تعریف سن کر مسکرانے لگی۔ تعریف کہہ رہی تھی کہ وہ زبیر کے معیار کے مطابق تھی۔ اگرچہ انہوں نے ایک دوسرے سے شادی کی بات نہیں کی تھی لیکن دوسرے کے حوالوں سے ایک دوسرے کے سامنے بہت کچھ کہہ دیا تھا اور بہت کچھ مان لیا تھا۔ وہ اندھیرا ہونے تک اس کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی۔ کبھی اسے اپنے گھر کے حالات

بتاتی رہی، کبھی اس کے حالات سنتی رہی۔ رات کو آٹھ بجے واپس آنے پر مکان سے ذرا دور کار رکنے کو کہا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا میں دروازے تک پہنچا نہیں سکتا؟"

"میں اتنی قیمتی کار میں جاؤں گی تو محلے میں بدنام ہو جاؤں گی۔"

"کیا مجھے تمہاری باجی اور ابا سے نہیں ملنا چاہئے؟"

"ضرور ملنا چاہئے لیکن میں پہلے آپ کا غائبانہ تعارف کرانا چاہتی ہوں۔ ابا ہمارے کسی معاملے میں نہیں بولتے۔ زندہ ہیں مگر سماجی اور گھریلو زندگی سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔ البتہ باجی آپ سے ضرور ملنا چاہیں گی۔"

وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "وہ کب ملاقات کریں گی؟"

سلمٰی نے جلدی سے ہاتھ چھڑا کر کہا۔ "پلیز یہ ابھی مناسب نہیں ہے۔"

"تم صبح سے میرے ساتھ ہو۔ اب رات ہو گئی ہے۔ اتنی دیر میں تمہیں سمجھ لینا چاہئے کہ میں کوئی فلرٹ نہیں ہوں۔ نگاہوں کے سامنے کوئی چیز صبح سے شام تک ہو اور وہ دل کو کھینچ رہی ہو تو اسے کم از کم چھونے کو جی چاہتا ہے۔ تم مجھے ہاتھ پکڑنے کا حق دے سکتی ہو۔"

"یہ حق دینے کے لئے ہی میں باجی سے بات کروں گی۔"

"تو پھر کل ہی ملاقات کراؤ۔ تم نے میرا صبر چھین لیا ہے۔ میں تمہاری باجی سے ہمیشہ کے لئے تمہیں مانگ لوں گا۔"

وہ مسکراتی ہوئی کار سے باہر آئی۔ زبیر محبت کے چند مکالمے ادا کر کے چلا گیا۔ وہ وہاں سے گھر تک جاتے ہوئے خود کو سنبھال رہی تھی۔ اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے جسے وہ بارہ برس کے عمر سے پڑھ رہی تھی، وہی مصنف اسے سر سے پاؤں تک پڑھنے آ گیا تھا۔ اب محض قانونی اور مذہبی طور پر اجازت حاصل کرنے کی دیر تھی۔

وہ دونوں بہنیں کالج اور ملازمت کے لئے جانے سے پہلے باپ کی چارپائی کے پاس کھانے پینے کی اور دوسری ضروریات کی چیزیں رکھ دیتی تھیں تاکہ شام تک کسی پڑوسی کو آواز دے کر بلانے کی ضرورت نہ پیش آئے۔ وہ باہر سے دروازہ مقفل کر کے جاتی تھیں۔ اکثر سلمٰی ہی پہلے آیا کرتی تھی، اس روز سائرہ اپنے وقت پر شام کو آئی تو تالا کھول کر اندر جاتے ہوئے سوچا۔ "آج کیا بات ہو گئی؟ سلمٰی اپنے وقت کے مطابق کیوں نہیں آئی؟"

وہ رات کے آٹھ بجے تک بے چینی سے انتظار کرتی رہی۔ بار بار دروازہ کھول کر باہر دیکھتی رہی۔ کوئی ساتویں بار دروازہ کھولا تو وہ آتی ہوئی دکھائی دی۔ دروازے سے

اندر داخل ہونے سے پہلے بولی۔ ”میں سمجھتی ہوں آپ میرے لئے پریشان ہو رہی ہیں لیکن جو خوشخبری سناؤں گی اسے سن کر ساری پریشانیاں بھول جائیں گی۔“

باجی نے کہا۔ ”تم اپنی خوشخبری کے ساتھ اندر آؤ۔ آج تک محلے والوں نے تمہیں اتنی رات کو دروازے کے باہر نہیں دیکھا۔ کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع نہ دو۔“

وہ اندر آ گئی‘ باجی نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”تُو صبح کالج گئی تھی اور اب آئی ہے۔ جبکہ شام چار بجے سے پہلے گھر آجاتی ہے۔ تُو مجھے خوشخبری سنائے گی لیکن محلے والے تیرے بارے میں بری خبریں ایک دوسرے کو سنا رہے ہوں گے۔“

”باجی‘ آپ تو کچھ سننے سے پہلے سنانے لگتی ہیں۔ میں محلے والوں کی زبان بند کر دوں گی۔“

”کیا یہ کہہ کر زبان بند کرو گی کہ جسے پسند کرتی ہو‘ وہ تمہارا رشتہ مانگنے آئے گا اور رشتہ مانگنے سے پہلے تم اتنی رات تک اس کے پاس رہ کر آئی ہو؟“

وہ سخت لہجے میں بولی۔ ”باجی! دنیا والوں سے پہلے آپ مجھ پر کیچڑ اچھال رہی ہیں۔ آپ مجھے اتنا سستا سمجھتی ہیں کہ کوئی بھی میری کلائی پکڑ سکتا ہے اور میری عزت سے کھیل سکتا ہے؟“

سائرہ کے دماغ پر ہتھوڑا سا لگا۔ آج پہلی بار چھوٹی بہن نے اسے بے آبروئی کا طعنہ دیا تھا۔ اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ آنگن میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ حرکت کرنا بھول گئی۔ سلمیٰ تیزی سے چلتی ہوئی کمرے میں آئی۔ کتاب اور کاپیاں میز پر پھینک دیں۔ وہ اپنے طور سے سوچ رہی تھی یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ حالات سے مجبور ہو کر باجی نے خود کو صاحب کے حوالے کر دیا ہے تو میں بھی کوئی عزت بیچنے والی ہوں۔ میں لوہے کا چنا ہوں‘ چبانے والوں کے دانت توڑ سکتی ہوں۔

وہ بڑی دیر تک کمرے میں ٹہلتی رہی۔ چھت کا پنکھا گردش کر رہا تھا پھر بھی گرمی لگ رہی تھی۔ ائرکنڈیشنڈ کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ وہ تازہ ہوا کے لئے آنگن میں آئی تو ٹھٹک کر رہ گئی۔ باجی کو جہاں چھوڑ کر آئی تھی‘ وہیں کھڑی ہوئی تھیں۔ کیوں کھڑی ہوئی تھیں! کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟ اس نے آواز دی ”باجی!“

وہ بدستور گم صم کھڑی رہی۔ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں رہی تھی۔ ہوا بھی نہیں ہلا رہی تھی۔ سلمیٰ تیزی سے چلتی ہوئی قریب آئی۔ پھر بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔

”یہاں کیوں کھڑی ہوئی ہیں؟“

وہ ایک جھٹکے سے بازو چھڑا کر پیچھے ہٹی‘ پھر بولی۔ ”نہ میری بہنا! میں ناپاک ہوں‘

بازاری ہوں۔ مجھے ہاتھ نہ لگانا۔“

”آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ میں نے کوئی گالی تو نہیں دی تھی؟“

”تُو نے گالی تو نہیں دی‘ میری آنکھیں کھول دیں۔ تیرے ہونے والے مرد کو میری اصلیت معلوم ہو گی تو وہ تجھے قبول نہیں کرے گا۔ میں تجھ سے دور چلی جاؤں گی۔ وہ پوچھے تو کہہ دینا کہ یہ لڑکی کسی بازار سے بھاگ کر آئی تھی۔ تیرے گھر میں کچھ روز چھپی رہی۔ پھر آج ہی نئے گاہک کی تلاش میں اس کے گھر کو بھی چھوڑ گئی۔“

”بس کریں باجی! مجھے اتنے جوتے نہ ماریں۔ میں نے زبیر سے کہا ہے کہ آپ میری باجی ہی نہیں ماں بھی ہیں اور میرے مستقبل کا فیصلہ آپ ہی کریں گی۔“

”کس زبان سے تُو نے ماں کہا؟ کیا اسی زبان سے‘ جس سے ابھی کہہ رہی تھی کہ میں نے آسانی سے خود کو صاحب کے حوالے کر دیا۔ کیا تُو جانتی ہے کہ ایک شریف لڑکی بے حیا نہیں ہوتی‘ اس کے حالات اسے بے حیا بناتے ہیں۔ مجھے ابا کی بیماری اور ان کے علاج نے بے حیا بنایا۔ میری بے حیا زندگی نے تم سب کو عزت سے زندہ رکھا ہے۔ اگر مجھے تجھ سے محبت نہ ہوتی تو تُو بھی میرے جیسی ہوتی اور جب میرے جیسی ہوتی تو آج تیری زندگی میں کوئی زبیر نہ آتا۔“

سلمیٰ فرش پر بیٹھ کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ پھر بولی۔ ”مجھے معاف کر دیں باجی! آج پہلی بار آسمان پر اُڑتی ہوئی آئی تو آپ کی قربانیاں بھول گئی۔ یہ سچ ہے کہ دولت دیکھ کر کچھ لوگ اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔ میں بھی اپنی اوقات بھول گئی تھی۔ مجھے معاف کر دیں۔“

اس نے بہن کو اٹھا کر گلے سے لگا لیا پھر اس سے کہا۔ ”میں نے تیرے انتظار میں کھانا نہیں کھایا ہے۔ چل آ‘ میں سالن گرم کرتی ہوں۔“

”میں نے آج اس کے ساتھ گھوم پھر کر خوب کھایا ہے۔ آپ نے اس ہوٹل کا نام نا ہو گا جو ساری دنیا میں ہے۔ پرل کانٹی نینٹل اس کا نام ہے‘ وہاں میں نے لنچ کیا تھا۔ آج ی ایسی جگہ گئی جہاں دولت مند ہی جا سکتے ہیں۔“

سائرہ چولہے کے پاس بیٹھ کر کھانے لگی۔ سلمیٰ دن بھر کا رومانی فسانہ سناتی رہی۔ یہ سانہ آنگن کی چارپائی پر جا کر لیٹنے تک جاری رہا۔ سائرہ نے پوچھا۔ ”آج تو تجھے نیند نہیں ئے گی؟“

سلمیٰ نے آسمان کی طرف تکتے ہوئے کہا۔ ”میری زندگی میں آج جیسا دن پہلے نہیں یا۔ آنکھوں کے سامنے آج کی فلم ساری رات چلتی رہے گی۔ سچ مچ نیند نہیں آئے

گی۔"

سائرہ بھی ننگے آسمان کو تک رہی تھی۔ کہنے لگی۔ "میری دعا ہے کہ تیرے تمام سوتے جاگتے خواب پورے ہوتے رہیں۔ ہائے مگر خواب پورے ہونے سے پہلے تو صبح ہو جاتی ہے۔"

"باجی! آپ زبیر سے ملیں گی؟"

"ملوں گی مگر تمہیں اچھا نہیں لگے گا۔"

"کیوں اچھا نہیں لگے گا؟"

"اس لئے کہ میں تجربے کی آنکھ سے اسے دیکھوں گی اور تجربے کی زبان سے بولوں گی تو تم دونوں کو اچھا نہیں لگے گا۔"

"باجی! دیکھنے کے لئے یہی ہے کہ وہ مجھے تمام عمر خوش رکھ سکے گا یا نہیں۔ آپ ناپ تول کی زبان میں بولیں گی تو وہ ہمیں لالچی سمجھے گا۔"

"میں لالچ والی کوئی بات نہیں کروں گی۔ میں تمہارے لئے ایک نیک لڑکے کو پرکھنا چاہتی ہوں اس کی دولت کو نہیں۔"

سلمٰی مطمئن ہوگئی۔ دوسری صبح باجی کے ساتھ اسٹاپ پر آئی۔ بس سے پہلے زبیر اپنی کار لے کر آگیا۔ اس کے ساتھ باجی کو دیکھ کر ذرا بجھ سا گیا پھر فوراً ہی مسکرا کر بولا۔ "میں پہچان گیا' آپ سلمٰی کی باجی ہیں۔ میں تو آپ سے ملنے گھر آنا چاہتا تھا۔ مگر بات یہ ہے کہ............"

سائرہ نے بات کاٹ کر کہا۔ "میں بات جانتی ہوں چونکہ بات کو سوچ سمجھ کر آگے بڑھانا چاہئے اس لئے تم دونوں کے بیچ آگئی ہوں۔ زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ کام کی باتیں کر کے چلی جاؤں گی۔"

وہ کار کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ "آپ سلمٰی ہی کی نہیں' میری بھی باجی ہیں۔ تشریف لائیں۔"

سائرہ نے پہلے سلمٰی کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا۔ جب وہ بیٹھ گئی تو وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ "ہم آگے مناسب رہیں گے۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "جی .... جی ہاں۔ آپ ہم سے زیادہ مناسب اور نامناسب کو سمجھتی ہیں۔"

وہ دونوں آگے بیٹھ گئے۔ پھر گاڑی آگے بڑھ گئی۔ زبیر نے پوچھا۔ "میں آپ کے گھر چلوں یا آپ میرے ہاں چلنا پسند کریں گی۔"

"ہمارا گھر بہت چھوٹا ہے' محلے کے لوگ بھی چھوٹے دماغ کے ہیں۔ ایک قیمتی گاڑی میں دو جوان بہنوں کو دیکھ کر رائی کا پربت بنائیں گے اور جس بہن کے سلسلے میں تم سے بات کرنے آئی ہوں اسے بات طے ہونے سے پہلے تمہارے گھر لے جانا مناسب نہیں ہے۔"

"آپ درست کہتی ہیں۔ ویسے گفتگو اسی گاڑی میں جاری رہ سکتی ہے۔ آپ پیٹرول کی فکر نہ کریں۔ میں ٹنکی فل کراتا جاؤں گا۔"

"تمہارے پاس اتنی دولت ہے کہ ٹنکی خالی نہیں رہے گی۔ ویسے زبیر! ہماری نظروں میں دولت اہم نہیں ہے' ایندھن کی بچت اہم ہے۔ ہمارے ملک میں ٹی وی' ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے ایندھن بچانے کی ہدایات دی جاری ہیں۔ ہمیں ان ہدایات پر عمل کرنا چاہئے۔ مال روڈ کے کسی ایسے ریستوران میں چلو' جہاں کا بل میں ادا کر سکوں اور وہاں جانے سے تمہاری امارت کو ٹھیس نہ پہنچے۔"

وہ بولا۔ "خواتین کے ساتھ مرد ہو تو اصولاً مرد کو بل ادا کرنا چاہئے۔"

"ان خواتین میں ایک بڑی بہن ہو تو مرد کی برتری نہیں رہ جاتی۔"

وہ جواب نہ دے سکا۔ اس نے ایک ریستوران کے سامنے گاڑی روک دی۔ تینوں ائرکنڈیشنڈ ریستوران کے اندر آئے پھر ایک میز کے اطراف بیٹھ کر ٹھنڈے مشروب کا آرڈر دیا۔ سائرہ نے کہا۔ "سلمٰی بتا رہی تھی کہ پچھلے ہفتے تم لندن گئے تھے۔"

"میں تو جاتا ہی رہتا ہوں۔"

"میں صرف پچھلے ہفتے کی بات پوچھ رہی ہوں تاکہ معلوم ہو کہ آج کل وہاں کا موسم کیسا ہے؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "فنٹاسٹک موسم ہے۔ ان دنوں وہاں برائے نام سردی ہوتی ہے۔ ایک کوٹ یا سویٹر میں گزارہ ہو جاتا ہے۔"

سلمٰی نے بیزاری سے پوچھا۔ "ہمیں دوسرے ملکوں کے موسم سے کیا لینا ہے!؟"

سائرہ نے پوچھا۔ "کیا تمہیں اس ملک میں دلچسپی نہیں ہے جہاں تک تمہارے زبیر صاحب پچھلے ہفتے کوٹ یا سوئٹر میں رہ کر آئے ہیں۔ جبکہ وہاں سردی کی شدت سے بے شمار لوگ مر چکے ہیں۔"

زبیر نے کہا۔ "آپ مجھے جھوٹا کہہ رہی ہیں۔ میں ثابت کر دوں گا کہ مئی اور جون میں لندن کا موسم معتدل ہوتا ہے۔ سردی برائے نام ہوتی ہے۔"

سائرہ نے کہا۔ "بیشک یہ جون کا آخری ہفتہ ہے۔ لندن کا موسم بہت اچھا ہوتا ہے۔

لیکن زبیر! اس سال گلیشیر نہیں پگھلی ہے۔ برف کے تودے ٹوٹ کر پانی نہیں بن رہے ہیں اس لئے سردی اتنی شدید ہو گئی ہے کہ وہاں کے ٹورسٹ واپس آ رہے ہیں۔"

وہ بولا۔ "آپ پاکستانی اخبارات کی جھوٹی سچی خبریں سنا رہی ہیں؟"

"ہماری ایڈورٹائزنگ کمپنی میں لندن سے شائع ہونے والے اخبارات آتے ہیں۔ تم لندن سے آئے ہو اور میں اسی شہر کی پچھلے ہفتے کی خبریں سنا رہی ہوں۔"

زبیر کا چہرہ یوں ہو گیا جیسے بدن کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ پہلے تو اس سے جواب نہ بن پڑا پھر وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "میں نے اپنی برداشت کے مطابق کہا تھا کہ لندن میں زیادہ سردی نہیں ہے۔ میں وہاں ایک سوئٹر میں دن گزار کر آیا ہوں۔ آپ گلیشیر کی بات لے بیٹھی ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ وہاں دوسروں کی قوتِ برداشت کے مطابق سردی زیادہ ہے۔ لیکن میں تو جب بھی کہوں گا اپنی ہی بات کہوں گا۔"

سلمٰی نے کہا۔ "پلیز باجی! آپ زبیر صاحب کو غلط نہ سمجھیں۔"

زبیر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہاری باجی تو پولیس والی لگتی ہیں۔"

سائرہ نے کہا۔ "والدین بیٹی کے لئے جیون ساتھی کی تلاش کرتے اور چھان بین کرتے وقت پولیس والے ہی لگتے ہیں۔ سلمٰی کی میں ماں ہوں اور میں ہی باپ زبیر' تمہاری ایک کمزوری ہے۔ تم سوچ سمجھ کر سوال کا جواب نہیں دیتے ہو۔ کیا میں امید کروں کہ اس بار تم میرے سوال کا جواب خوب سوچ سمجھ کر دو گے؟"

"آپ اچھی بات سمجھا رہی ہیں' میں خوب سمجھ کر جواب دوں گا۔"

سائرہ نے جیسے اچانک ہی پتھر دے مارا ہو۔ اس سے پوچھا۔ "تمہاری پہلی شادی کب ہوئی تھی؟"

وہ ایک دم چونک کر کرسی پر سیدھا بیٹھ گیا۔ پہلے تو سلمٰی کو دیکھا۔ وہ بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے باجی کو دیکھا۔ وہ سوال کرنے کے بعد سر جھکائے ٹھنڈے مشروب کی چسکیاں لے رہی تھی۔ وہ سلمٰی سے کہہ چکا تھا کہ آج تک کوئی لڑکی پسند نہیں آئی اس لئے آج تک شادی نہیں کی۔ یہی بات سائرہ سے کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ وہ سچ مچ پولیس والی لگ رہی تھی۔ اس کا اطمینان بتا رہا تھا کہ وہ زبیر کے متعلق بہت کچھ جانتی ہے۔ جو لندن کی خبر لا سکتی ہے' وہ لاہور میں رہ کر لاہور والے کے متعلق پتا نہیں کیا کچھ جانتی ہو گی۔

اس نے پہلے ہی نصیحت کی تھی کہ سوال کا جواب سوچ سمجھ کر دے۔ عقل سمجھا رہی تھی کہ اگلی کو نادان نہیں سمجھنا چاہئے۔ وہ آخر کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔

"شادی دو برس پہلے ہوئی تھی۔"

سلمٰی نے تڑپ کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔ اس نے کہا۔ "لیکن طلاق ہو چکی ہے۔"

پھر سلمٰی نے یوں اطمینان کی سانس لی جیسے ڈوبتے ڈوبتے ہوئے ساحل سے آ لگی ہو' وہ بولا۔ "میں نے کل شادی کی بات نہیں بتائی۔ کیونکہ سلمٰی کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔"

سائرہ نے کہا۔ "جب طلاق دے چکے ہو تو دل کیوں دکھے گا؟ کیوں سلمٰی' تمہیں دکھ پہنچ رہا ہے؟"

"نہیں باجی! مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔"

سائرہ نے کہا۔ "تم رائیٹر ہو۔ سچ بتاؤ کہ کہانیوں میں کتنا سچ اور کتنا جھوٹ ہوتا ہے۔"

"بالکل اتنا ہی' جتنا ہماری عام زندگی میں ہوتا ہے۔"

"یعنی زندگی میں جتنا سچ ہوتا ہے اتنا ہی سچ لکھتے ہو اور جتنا جھوٹ ہوتا ہے اتنا ہی جھوٹ بول دیتے ہو۔"

"میں جھوٹ نہیں بولتا لیکن ضرورت کے مطابق لکھتا ہوں۔ کہانیوں میں کسی حد تک جھوٹ اور فراڈ ہو تو ایسی کہانیوں میں عجب طرح کی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔"

"تمہاری سچی آپ بیتی میں کتنا جھوٹ ہے؟"

"وہ میری آپ بیتی ہے۔ اس میں جھوٹ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"دیکھو! تم پھر سوچے سمجھے بغیر جواب دے رہے ہو۔"

وہ محتاط انداز میں سوچنے لگا۔ مشروب کا گلاس گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے اسے خالی کرنے تک مہلت مل رہی تھی۔ پھر وہ خالی ہو گیا گلاس میز پر رکھ کر ٹشو پیپر سے ہونٹ پونچھتے ہوئے بولا۔ "آپ کو میری آپ بیتی میں کیا جھوٹ نظر آ رہا ہے؟"

سائرہ نے کہا۔ "ایک شوق پیدا ہو گیا ہے کہ ابھی تمہاری کار میں بیٹھ کر اسی بستی جاؤں جہاں تم نے ایک غریب لڑکی کو جہیز دینے کے لئے پانچ لاکھ کی گاڑی پچاس ہزار میں فروخت کر دی تھی۔"

وہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھول رہا تھا۔ سائرہ نے تنبیہہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہا۔ "فوراً کوئی جواب نہ دینا۔ پہلے اچھی طرح سوچ لو۔"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "آپ مجھے جھوٹا اور بے ایمان سمجھ لیں مگر میں آپ کو اس بستی میں نہیں لے جاؤں گا۔ ہمارے پیغمبر کی ہدایت ہے کہ ایک ہاتھ سے کسی کو خیرات دو تو

دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ میں آپ کو وہاں لے جا کر سہاگن بن کر جانے والی کے والدین
سے نہیں ملاؤں گا۔ اپنے حاتم طائی ہونے کی پبلسٹی نہیں کروں گا۔"

"تمہاری آپ بیتی کے ذریعے پورے ملک میں پبلسٹی ہو گئی صرف دو بہنیں اسی بستی
کو دیکھ لیں گی تو کیا فرق پڑ جائے گا؟ چلو اس غریب سہاگن کے والدین سے ہمیں نہ ملانا۔
صرف گاڑی ادھر سے گزار دینا.......... یا پھر رہنے دو۔ صرف اس بستی کا پتا بتا دو۔"

"آپ پتا معلوم کر کے انکوائری کریں گی؟"

"کیا ہمیں رشتے کی بات شروع کرنے سے پہلے معلومات حاصل نہیں کرنا چاہئے؟"

"ضرور کرنا چاہئے لیکن آپ میری کہانیوں کے پیچھے نہ پڑیں۔ میرے متعلق
معلومات حاصل کریں۔"

"تمہارے متعلق تو زمین' جائیداد' دولت اور محفوظ مستقبل کے سلسلے میں باتیں ہو
سکتیں ہیں اور اس سلسلے میں تم نے کل سلمٰی سے کہہ دیا ہے کہ لالچی والدین لڑکی دینے
سے پہلے تمہاری دولت کا حساب کرتے ہیں۔ ہم لالچی نہیں کہلانا چاہتے۔ تم بتاؤ' تمہارے
متعلق اور کیا بات کی جائے؟"

"میری کوٹھی موجود ہے۔ کار میں آپ آئی ہیں۔ لاہور کے دو بینکوں اور کراچی کے
ایک بینک میں میرا اکاؤنٹ ہے۔ اپنا خاندانی شجرہ لکھ کر دے دوں گا۔"

سائرہ نے پوچھا۔ "سلمٰی کے خوشگوار مستقبل کی کیا ضمانت دو گے؟"

"لڑکی کے مستقبل کی ضمانت کے لئے مہر کی رقم ضمانت ہوتی ہے۔"

"مہر کی رقم کتنی ہو گی؟"

"شرعی مہر کی رقم بہت کم ہوتی ہے۔ صرف چند دینار کا حساب ہوتا ہے۔ مگر میں
نے سابقہ بیوی کو پچیس ہزار روپے دیئے ہیں۔"

"دو سال تک عورت کو رکھ کر پچیس ہزار میں طلاق دینا آسان ہو جاتا ہے۔"

"میں نے اسے دو برس بعد علیحدہ نہیں کیا تھا۔ وہ خود مجھے چھوڑ کر گئی ہے۔
چھوڑنے والے تو پچیس لاکھ دے کر بھی بیوی سے پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔"

"سب ہی نہیں چھڑا پاتے۔ پچیس لاکھ کی ادائیگی ہوش اڑا دیتی ہے۔ یہ عقل آ جاتی
ہے کہ طلاق دنیا کا سب سے بدترین اور خود غرضانہ عمل ہے۔ میاں بیوی دونوں ہی
سمجھوتا کر کے ایک ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔"

"آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"مہر کی زیادہ رقم تاکہ سلمٰی طلاق کی لعنت سے محفوظ رہے اور ایک معاہدہ کہ سلمٰی

جب تک ذہنی اور جسمانی طور پر ازدواجی زندگی گزارنے کے قابل رہے گی تم دوسری
شادی نہیں کرو گے' اس پر کبھی سوکن نہیں لاؤ گے۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا' سائرہ نے کہا۔ "اچھی طرح سوچ لو۔ ہم نے کوئی لالچ نہیں کیا
ہے۔ تمہاری دولت اور جائیداد کا حساب نہیں کیا ہے۔ تم سے نقد رقم طلب نہیں کی
ہے۔ اگر تم مہر کی رقم پچاس لاکھ بھی لکھ دو گے تو وہ پچاس لاکھ تمہارے ہی پاس رہیں
گے۔ نہ طلاق کی نوبت آئے گی نہ اتنی بڑی رقم کی ادائیگی کی ضرورت پیش آئے گی۔"

زبیر نے پوچھا۔ "کیا بیوی پچاس لاکھ وصول کرنے کے لئے طلاق کا کوئی راستہ نہیں
نکالے گی؟"

"طلاق کے راستے قدم قدم پر نکل آتے ہیں' بیوی کے لئے بھی اور میاں کے لئے
بھی۔ مہر کی رقم کم ہو تو میاں کے لئے آسانی اور رقم زیادہ ہو تو بیوی کی طرف سے اندیشہ
رہتا ہے۔ فی زمانہ مرد اور عورت ایک دوسرے پر اعتماد کے قابل نہیں رہے اس لئے
ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔"

زبیر نے کہا۔ "ہم ایک دوسرے پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ میں نکاح نامے میں مہر کی رقم
ایک لاکھ روپے لکھوا دوں گا۔"

سائرہ نے کہا۔ "آج ایک لاکھ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ دفتر میں میری میز کی دراز
میں پندرہ بیس لاکھ آتے جاتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا نا' تم سوچے سمجھے بغیر بول پڑتے
ہو۔ ایک تنہا عورت ایک لاکھ میں پلاٹ حاصل کر کے مکان نہیں بنوا سکتی۔ ایک معقول
فلیٹ بک کراؤ تو اس کی مجموعی ادائیگی تین لاکھ روپے سے کم نہیں ہوتی۔ ایسی صورت
میں مطلقہ عورت ایک لاکھ روپے لے کر میکے آتی ہے اور میکے والے بھی اسے نوچ کر کھا
جاتے ہیں۔ لاکھ روپے ختم ہوتے ہی اسے طعنے دینے لگتے ہیں۔ سلمٰی کو پسند کرتے ہو اور
اسے بہت چاہتے ہو۔ گھر جا کر آرام سے سوچو' جسے چاہتے ہو اسے غیر معمولی تحفظ کیسے
دے سکتے ہو؟"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی' سلمٰی نے پوچھا۔ "کیا آپ جا رہی ہیں؟"

"ہاں دفتر پہنچنا ضروری ہے۔ تم اپنے وقت پر.......... گھر آ جانا۔ مجھے امید ہے زبیر!
کل تک اپنا فیصلہ سنا دو گے۔"

وہ کاؤنٹر پر گئی پھر مشروبات کا بل ادا کر کے ریستوران سے باہر نکل گئی۔ زبیر نے
اطمینان کی گہری سانس لے کر کہا۔ "او گاڈ! تمہاری باجی دیکھنے میں جتنی خوب صورت اور
نرم و نازک ہیں' باطن میں اتنی ہی پتھر ہیں۔ ان کی ایک ایک بات پتھر کی طرح لگتی ہے' تم

ان کے ساتھ کیسے زندگی گزارتی ہو؟"

"باجی نے اتنی سی عمر میں بڑے صدمات برداشت کئے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے مجھے تعلیم دلا رہی ہیں۔ پورے گھر کا بوجھ اٹھاتی ہیں۔ ایسے میں ذرا پتھر ہو گئی ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔"

"سلمٰی! تمہیں اپنی باجی سے اندھی عقیدت ہے۔ تم نے بہن کی محبت میں یہ نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح میری توہین کر رہی تھیں۔ مجھے جھوٹا اور بے ایمان ثابت کرنے کی کوشش فرما رہی تھیں۔ پتا نہیں تم نے کیا جادو کر دیا ہے کہ میں تمہاری خاطر خاموش بیٹھ رہ گیا۔ ورنہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر چلا جاتا۔"

"باجی کی باتیں مجھے بھی گراں گزر رہی تھیں لیکن آپ بھی تو الٹی سیدھی باتیں کر رہے تھے۔ یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ لندن میں ایک سوئٹر کی سردی ہے۔"

"بھئی میرے لئے تو ایک ہی سوئٹر کی تھی۔ دوسروں کے لئے گلیشیر نہیں پگھلے او کچھ لوگ سردی کی شدت سے مر گئے تو میں کیا کروں۔ میں تو لاہور کی شدید سردی میں بھی ململ کا کرتا پہن کر رکھتا ہوں۔"

"جہنم میں گئی سردی۔ آپ ایک بار باجی کی تسلی کر دیں پھر وہ کبھی ہمارے درمیا نہیں آئیں گی۔"

وہ بولا۔ "ان کی باتوں سے صاف پتا چلتا ہے کہ وہ پچیس یا پچاس لاکھ روپے سے مہر نہیں رکھوائیں گی۔"

"آپ ایسا نہ سوچیں۔ ہم نے بہت زیادہ دولت نہیں دیکھی ہے اور نہ ہی ہما مطالبہ دولت کا ہے۔ مطالبہ محض میرے تحفظ کا ہے۔ میں نہیں جانتی آپ مجھے کتنا چا ہیں' جتنا چاہتے ہیں اتنے ہی تحفظ کا یقین دلا دیں۔"

"میں تو جان سے زیادہ تمہیں چاہتا ہوں۔ مہر کی ادائیگی میں اپنی جان لکھ سکتا ہو لیکن قانون جان دینے کی اجازت نہیں دیتا۔"

"عورت کی زندگی شوہر کے دم قدم سے ہوتی ہے۔ شوہر چھوڑ دے تو عورت مہ رقم کتنے دنوں میں کھائے گی؟ میرا بس چلے تو میں ایک پیسہ بھی نہ لکھواؤں۔ آپ باجی تسلی کے لئے کچھ لکھ دیں اور یہ جھگڑا ختم کریں۔"

"تم اپنی باجی کے دفتر کا پتا اور فون نمبر بتاؤ۔ میں ان سے معاملات طے کر لوں گا۔

سلمٰی نے پتا اور فون نمبر نوٹ کرا دیا۔ اس کے بعد زبیر سائرہ کے دفتر کے چکر کا لگا۔ ان کے درمیان کئی دنوں تک مذاکرات جاری رہے۔ ادھر سلمٰی کی بے چینی بڑ

گئی۔ وہ زبیر سے صبح و شام ملتی تھی اور روزِ اول سے زیادہ متاثر ہوتی جاتی تھی۔ ایک رات اس نے جھنجلا کر باجی سے کہہ دیا۔ "آپ میرا سودا کرنا چاہتی ہیں' شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ آپ لاکھوں روپے مہر لکھوا کر کیا کریں گی۔ کیا طلاق کے بعد مجھے سہاگن والی عزت مل جائے گی۔ پلیز' آپ یہ مذاکرات ختم کریں۔ جو میرے نصیب میں ہو گا' میں بھگت لوں گی۔"

جب لڑکی باؤلی ہو رہی تھی تو اس کی باجی کیا کرتی؟ ایک ماہ بعد ہی اسے دلہن بنا کر رخصت کر دیا۔ سلمٰی کوٹھی والی بن کر زبیر کے ساتھ اقبال ٹاؤن میں آ گئی۔ اس کوٹھی میں زبیر کے چند دوست اور دور ایک رشتے کی خاتون تھیں۔ یہ لوگ بھی دوسرے دن چلے گئے۔ اس کی اور زبیر کی محبت کے درمیان حائل ہونے کے لئے کوئی ساس نند نہیں تھی۔ وہ ایسی ہی سسرال چاہتی تھی جہاں صرف اپنا مرد ہو اور وہ سدا پیار سے اس پر حکومت کرتی رہے اور خود اس کی محکوم بن کر رہے۔ اس کی یہ آرزو پوری ہو گئی تھی۔

سائرہ باجی نے اسے شادی سے پہلے سمجھایا تھا۔ "یہ تیرا عشق نہیں ہے حماقت ہے۔ کیا تجھے نظر نہیں آتا کہ زبیر کی عمر تجھ سے دوگنی ہے۔ بلکہ دوگنی سے بھی زیادہ ہے۔ وہ کوئی ایسا ہیئر کلر استعمال کرتا ہے کہ بالوں کی سفیدی چھپ جاتی ہے۔"

سلمٰی نے باجی کو جواب دیا تھا۔ "آپ کو تو زبیر سے خدا واسطے کا بیر ہو گیا ہے۔ جو شخص ایک سوئٹر میں لندن کی سردیاں گزار دیتا ہے کیا وہ بوڑھا ہو سکتا ہے؟ عمر کچھ زیادہ ہو سکتی ہے اور یہ تو اچھی بات ہے کہ تجربات زیادہ ہوتے ہیں۔ دولت عمر والوں کے پاس ہی ہوتی ہے۔ کسی نوجوان نادان عاشق کے پاس نہیں ہوتی۔"

حجام کے پاس آ کر سر جھکاؤ تو پتا چلتا ہے سر میں کتنے بال تھے۔ سب سامنے ہی گرتے ہیں۔ ازدواجی زندگی کے پہلے ہی مرحلے میں سلمٰی کو عمر کا فرق کچھ سمجھ میں آیا' کچھ سمجھنے کے لئے باقی رہ گیا۔ دلہن گونگی ہوتی ہے وہ سوچ سکتی ہے کچھ بول نہیں سکتی لیکن جب بولنے کے دن آتے ہیں تو کفن پھاڑ کر بولنے لگتی ہے۔

رفتہ رفتہ انکشاف ہونے لگا کہ وہ زیادہ پیدل نہیں چلتا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر ہانپنے لگتا تھا۔ خواب گاہ میں ساری رات ائرکنڈیشنڈ آن رہے تو وہ کھانسنے لگتا تھا' کمبل اوڑھ کر سوتا تھا۔ سلمٰی پہلی رات گونگی رہی' دوسری رات اس نے پوچھا۔ "آپ کمبل کیوں اوڑھتے ہیں؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ مجھے سردی لگتی ہے۔ اگر اے سی بند کروں گا تو تمہیں گرمی لگے گی۔"

وہ بولی۔ ”یہ گرمی کا موسم ہے۔ ساری دنیا کو گرمی لگتی ہے آپ اے سی کی ٹھنڈک برداشت نہیں کر رہے ہیں۔ پھر ایک سوئٹر میں لندن کی سردی کیسے برداشت کر لیتے تھے؟“

”کیوں گڑے مُردے اکھاڑ رہی ہو؟ انسان کی قوتِ برداشت ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔ وقت اور حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔“

”کیا پچھلے ماہ میں آپ کی قوتِ برداشت صفر رہ گئی ہے؟ کیا اتنی جلدی آپ بوڑھے ہو گئے ہیں؟“

”تم تو شادی کے دوسرے ہی دن جھگڑنے بیٹھ گئی ہو۔ پچھلے دنوں میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ کھانسی نے زور پکڑ لیا تھا۔ ڈاکٹر نے ایکسرے دیکھ کر بتایا' دمے کا مرض ہے۔ مجھے ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔ اسی لئے میں برف کا پانی یا ٹھنڈی بوتلیں نہیں پیتا۔ یہاں اے سی میں کمبل اوڑھ کر سوتا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”اب معلوم ہوا کہ کہانیاں لکھنے والے باتیں بنانے کا فن خوب جانتے ہیں لیکن باتیں پائیدار نہیں ہوتیں' عمل پائیدار رہتا ہے۔ آپ ساری دنیا سے اپنا بڑھاپا چھپاتے آئے ہیں۔ بیوی سے نہیں چھپا پائیں گے۔ کیا اسی لئے آپ نے پہلی کو طلاق دی تھی؟ یا وہ آپ کو برداشت نہ کر سکی؟“

”سلمٰی! اپنی حدود میں رہ کر بولو۔ تم غصے میں مجھے بوڑھا کہہ رہی ہو۔“

”غصے میں؟“ سلمٰی نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا آج دوسرے دن بھی آپ کو خوش فہمی ہے کہ میں آپ کو بانکا چھیل چھبیلا گبھرو جوان سمجھ رہی ہوں۔“

وہ نظریں چراتے ہوئے اس کے سامنے سے اٹھ گیا۔ کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مول اور تول میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ آج مجھ میں کمی ہے تو بیماری کے باعث ہے اور مرد ہمیشہ بیمار نہیں رہتا۔“

وہ ذرا نرم پڑ گئی۔ زبیر بیماری کے حوالے سے معقول بات کہہ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پیچھے آئی۔ پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”آپ توجہ سے علاج کروائیں۔ میں خود آپ کو اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی۔ دمے کا مرض ابتدا میں تشویشناک نہیں ہوتا۔ میں آپ کی صحت یابی کے لئے دن رات ایک کردوں گی۔“

زبیر نے کھڑکی کے پاس سے گھوم کر اسے بازوؤں میں بھر لیا' وہ بولی۔ ”میں کیا بتاؤں آپ کو کتنا چاہتی ہوں۔ بارہ برس کی عمر سے رسالوں کے صفحات پر آپ کو ڈھونڈتی ہوئی آئی ہوں۔ باجی مجھے باؤلی کہتی ہیں' میں سچ مچ آپ کی دیوانی ہوں۔“

وہ بولا۔ ”میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو تمہارے حسن و جمال کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں نے اپنی کہانیوں میں حسن و شباب کا نقشہ طرح طرح سے کھینچا ہے۔ مجھے الفاظ پر کمانڈ حاصل ہے لیکن میں تمہارے شباب کی تعریف لفظوں میں کرنے سے قاصر ہوں۔ تمہاری تعریف صحیح معنوں میں اسی طرح کر سکتا ہوں کہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھوں اور تمہاری ہر خواہش پوری کرتا ہوں۔“

وہ غلط کہہ رہا تھا۔ انسان خود اپنی ہر خواہش پوری نہیں کر سکتا' دوسرے کی کیا پوری کرے گا۔ جوشِ محبت میں ایسے فقرے اچھے لگتے ہیں جیسے وہ ادا کر رہا تھا لیکن سلمٰی اب لفظوں کے طلسم سے نکل آئی تھی۔ اسی دن سے وہ عملی طور پر کوشش کرنے لگی کہ زبیر بیماری سے نجات پالے۔ صحت مند ہو جائے اور یہ اچھی طرح سمجھ لے کہ وہ دولت سے نہیں' صحت سے اپنی سلمٰی کو خوش رکھ سکتا ہے۔

رفتہ رفتہ ڈاکٹر بھی کہنے لگا کہ یہ عمر کا تقاضا ہے' کبھی مرض بڑھے گا کبھی کم ہوتا رہے گا۔ زبیر ایسا غبارہ ہے جس میں دواؤں سے ہوا بھری جاتی رہے گی۔ دواؤں کا اثر زائل ہو گا تو غبارے سے ہوا نکلتی رہے گی۔ ایک دوپہر کو وہ بستر پر لیٹی سوچ رہی تھی۔ یہ زندگی زبیر کے ساتھ گزرے گی۔ وہ کچھ بدمزاج اور چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے اندر دھواں سا بھر جاتا تھا۔ دھواں کہیں سے نکلتا نہیں تھا تو بات بے بات غصہ آ جاتا تھا۔ بعد میں وہ منہ چھپا کر روتی تھی اور سوچتی تھی کہ وہ ملازموں کو کیوں جھڑکتی ہے' انہیں کس بات پر غصہ دکھاتی ہے۔ کیا کوٹھی کی مالک بن کر پچھلی غربت کو بھول گئی ہے۔

کوٹھی کی مالک بننے کی بات پر وہ ہنسنے لگی۔ پھر ہنستی ہی چلی گئی۔ ہنستے ہنستے بستر سے اٹھ گئی۔ سنگھار میز کے سامنے آ گئی۔ وہاں آئینے میں اپنے عکس پر انگلی اٹھا کر ہنسنے لگی۔ اسے اپنی خبر نہیں تھی کہ کیا کر رہی ہے اور کس حال میں ہے؟ گھر کی ایک ملازمہ اور ملازم دوڑتے ہوئے آئے۔ اس وقت وہ ہنستی ہوئی غسل خانے میں جا رہی تھی۔ ملازمہ نے پوچھا ”بی بی جی! کیا ہو گیا؟ آپ .... آپ بہت دیر سے ہنس رہی ہیں۔ ایسی کیا بات ہو گئی ہے؟“

وہ جواب کیا دیتی؟ غسل خانے کے گیلے فرش پر پھسل کر گر پڑی۔ اس کے بعد اسے ہوش نہ رہا۔ ہوش آنے پر زبیر اور ڈاکٹر بستر کے پاس موجود تھے۔ ڈاکٹر اسے دوائیں کھلانے کے متعلق زبیر کو ہدایات دے رہا تھا' پھر وہ چلا گیا۔ زبیر نے ملازمہ کو بھی جانے کے لئے کہا۔ اس کے جانے کے بعد وہ بولا ”یہ بشیراں کہہ رہی تھی کہ تم پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہی تھیں! کیا ہو گیا تھا تمہیں؟“

وہ خاموشی سے چھت کو تک رہی تھی۔ زبیر نے اس کے بولنے کا انتظار کیا پھر خود ہی بولا۔ "ڈاکٹر کہہ رہا تھا تمہیں کوئی ذہنی صدمہ پہنچا ہے' کیا یہ درست ہے؟"

اسے جواب نہیں ملا' اس نے کہا۔ "میں تو ہر طرح تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نے اپنی دانست میں کوئی صدمہ نہیں پہنچایا۔ اگر پہنچایا ہے تو بتاؤ میں اس کی تلافی کردوں گا۔"

وہ رک رک کر بولتا رہا۔ اسے اپنے بے مثال عاشق ہونے کا یقین دلاتا رہا۔ اس سے کہتا رہا۔ "میرے پاس جو زمین' جائیداد اور دولت ہے اور میرا جو کچھ بھی ہے وہ سب تمہارے لئے ہے۔ میں تم سے زیادہ نہیں بولوں گا۔ ڈاکٹر نے تمہیں بھی بولنے سے منع کیا ہے اور ذہن کو پُرسکون رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ...."

وہ بڑی دیر بعد اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کرو۔ یہاں سے جاؤ۔"

یہ کہتے ہی اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ زبیر تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا' کچھ بولنے کا ارادہ کیا پھر ہونٹوں کو سختی سے بند کرتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

رات کو سائرہ باجی ملنے آئیں۔ اس کی حالت دیکھ کر بولیں۔ "تم بیمار ہو اور مجھے اطلاع تک نہیں دی جبکہ فون سرہانے رکھا ہوا ہے اور میں دفتر میں صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک رہتی ہوں۔ کیا تم شادی کے بعد مجھے اپنا سمجھنا بھول گئی ہو؟"

"ایسی بات نہیں ہے باجی! زیادہ بیمار ہوتی یا زیادہ پریشانی ہوتی تو آپ کو ضرور آواز دیتی۔"

"اور زیادہ بیماری کیا ہوتی ہے؟ چہرے سے برسوں کی بیمار لگ رہی ہو۔ سچ سچ بتاؤ' کیا یہاں خوش نہیں ہو؟"

وہ اپنے پیروں پر کلہاڑی مار کر کیسے کہہ سکتی تھی کہ تکلیف ہورہی ہے۔ جبراً مسکراتے ہوئے بولی۔ "بہت خوش ہوں۔ کوٹھی والی بن گئی ہوں۔ اسی لئے تو آپ مجھے "تم" کہہ کر مخاطب کررہی ہیں۔ جبکہ ہمیشہ تُو کہا کرتی تھیں۔"

باجی نے محبت سے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "واقعی اب خیال آرہا ہے کہ میں تجھے "تم" کہہ رہی ہوں۔ شاید میں نے غیر شعوری طور پر تجھے بہن سے زیادہ بیگم صاحب تسلیم کرلیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگیں۔ سلمٰی نے بھی اصل بات کو ٹالنے کے لئے جبراً ہنستے ہوئے باجی کا ساتھ دیا پھر باپ کی خیریت دریافت کی۔ کچھ کھانے پینے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن باجی

کو رات کا کھانا کھلانے کے لئے خود کھانا پڑا۔ رات کے گیارہ بجے زبیر کے ساتھ کار میں بیٹھ کر باجی کو چھوڑنے میکے تک گئی۔ باپ سے ملاقات کی۔ واپسی میں زبیر نے خوش ہوکر کہا۔ "چلو اچھا ہے' باجی کے آجانے سے تمہارا دل بہل گیا۔ ہمیں شہر سے باہر تفریح کا پروگرام بنانا چاہئے۔ موسم کے لحاظ سے کوئی پہاڑی علاقہ مناسب رہے گا۔"

وہ بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ "جگہ بدلنے سے میرے حالات نہیں بدلیں گے۔ مجھے ایک جگہ خاموشی سے رہنے دو اور رات کو کبھی میرے کمرے میں نہ آؤ۔"

"کیا مجھ سے نفرت کررہی ہو؟"

"میں نہیں جانتی' کیا کررہی ہوں۔ مجھ سے صرف ضروری باتیں کیا کرو۔"

"تم مجھے آپ کہہ کر مخاطب کیا کرتی تھیں اب یہ انداز کیوں بدل گیا ہے؟"

"آج باجی کا بھی انداز بدل گیا تھا۔ وہ مجھے بیگم صاحبہ سمجھ کر تو کہنا بھول گئی تھیں۔ عجیب بات ہے کہ تم مجھے صاحب نہیں لگ رہے ہو۔ پھر میں کس حوالے سے آپ کہوں؟"

اس سوال نے شوہر کا بھاؤ گرادیا۔ وہ ذرا گرج کر بولا۔ "کیا میں تمہارا شوہر نہیں ہوں؟"

"شوہر نہیں' شوہو' ایس ایچ او ڈبلیو .... شو۔"

وہ پھر گرج کو بولا۔ "تم حد سے بڑھ رہی ہو۔"

وہ بے فیض بادل تھا' گرج رہا تھا۔ وہ بے پروائی سے ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہی تھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے وہ پھر نرم پڑگیا۔ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "سمجھا کرو۔ میرا علاج ہورہا ہے۔ ٹھیک ہوجاؤں گا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

وہ باتیں بناتا ہوا بیڈ روم کے دروازے تک آیا۔ وہ رک کر بولی۔ "کس کمرے میں جاؤ گے؟"

"میری سلمٰی! غصہ تھوک دو۔"

"میں اس کمرے میں جارہی ہوں۔ تم کوئی دوسرا دیکھ لو۔"

وہ پلٹ کر تیزی سے اندر گئی پھر دروازے کو بند کرلیا' اس نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا حرکت ہے' دروازہ کھولو۔" اس نے انتظار کیا پھر دستک دی۔ غصے سے کہا۔ "یہاں آئے چار دن بھی نہیں ہوئے اور میرے گھر کا دروازہ میرے منہ پر کررہی ہو؟"

وہ بولی۔ "تمہارا گھر تمہیں مبارک ہو۔ میں صبح چلی جاؤں گی۔"

"خبردار! میکے جانے کی دھمکی نہ دینا۔ میں زن مرید نہیں ہوں۔ کاٹ کر پھینک دوں گا۔"

"بڑے آئے کاٹنے والے۔ کیا ہے تمہارے پاس؟"

"میرے پاس اتنا بڑا چاقو ہے۔"

وہ اندر سے بولی

"جذبات ہی کند ہیں تو بے کار
تلوار کی لاکھ بے نیامی۔"

وہ گڑبڑا گیا۔ لاجواب ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک بند دروازے کو گھورتا رہا پھر پاؤں پٹختا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

دوسری صبح اس نے عاجزی سے کہا۔ "رات گئی بات گئی۔ جھگڑا بھول جاؤ۔ یہ گھر صرف میرا نہیں تمہارا بھی ہے۔ میکے نہ جانا۔"

"میں اتنی نادان نہیں ہوں کہ اپنے حقوق چھوڑ کر چلی جاؤں۔ جاؤ اپنا کام کرو اور سوچو ہمارا گزارہ کیسے ہو گا؟"

"اللہ نے چاہا تو ہو جائے گا۔"

"اللہ نہیں چاہے گا۔ کیونکہ میں نے شادی سے پہلے باجی کی دانائی اور طرزِ عمل کو سمجھنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے میری نادانی کی سزا مل رہی ہے۔ مگر میں تمہارے ساتھ سزا نہیں کاٹوں گی۔"

"تم سمجھ رہی ہو کہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"خوب سمجھ رہی ہوں۔ تم سمجھنے سے کترا رہے ہو۔"

"سلمیٰ! لوگ کیا کہیں گے؟ دوست احباب مذاق اڑائیں گے کہ .... کہ دوسری بیوی بھی چھوڑ کر چلی گئی ہے۔"

"یہ تمہیں شوہر بننے سے پہلے سوچنا چاہئے تھا۔"

"تم نے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔ میں سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔"

"پہلی بیوی نے بھی جادو کیا تھا؟ بیویوں کے علاوہ اور نہ جانے کتنی حسینائیں تمہیں سحرزدہ کرتی رہی ہیں۔ تم پھول کو سونگھ نہیں سکتے تو توڑتے کیوں ہو؟"

"پلیز سلمیٰ! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے تھوڑا موقع دو۔"

وہ ناشتے کی میز سے اٹھ کر چلا گیا۔ سلمیٰ سر تھام کر سوچنے لگی۔ اب کیا ہو گا؟ علیحدگی سے صرف زبیر ہی اپنی سوسائٹی میں بدنام نہیں ہو گا' وہ بھی اپنے محلے میں کسی سے

آنکھیں نہیں ملا سکے گی۔ ساڑھے چار لاکھ کی گاڑی میں بیٹھ کر سسرال جانے والی میکے میں پیدل نظر آیا کرے گی۔

دوپہر کو ایک حسین عورت زبیر سے ملنے آئی۔ سلمیٰ نے کہا۔ "وہ موجود نہیں ہیں۔ اندر آجائیں۔ وہ ابھی آتے ہی ہوں گے۔"

وہ ڈرائنگ روم میں آکر بولی۔ "میرا نام نجمہ ناہید ہے۔ میں کبھی اس کوٹھی کی مالکن کہلاتی تھی۔ زبیر نے میرا ذکر کیا ہو گا؟"

سلمیٰ اسے دیکھتی رہی۔ نجمہ اتنی حسین تھی کہ زبیر نے اس پر بھی شاعری کی ہو گی اور اسے بھی ایک سوئٹزرلینڈ لندن جا کر آنے والی کہانیاں سنائی ہوں گی۔ یہ کہانیاں لکھنے والے لفظوں کے بازی گر ہوتے ہیں۔ نادان لڑکیوں کو خوابوں کی جنت دکھا کر اپنے بیڈ روم کا دروازہ کھولتے ہیں۔

وہ ایک صوفے پر بیٹھ کر بولی۔ "میں یہاں ہوتی تو شادی سے پہلے تم سے ضرور ملاقات کرتی۔ میں فیصل آباد میں تھی۔ دو روز پہلے معلوم ہوا کہ اس دلدل میں ایک اور آگئی ہے؟"

سلمیٰ اس کا منہ تک رہی تھی۔ اس کی باتیں سمجھ رہی تھی۔ آگے بھی بہت کچھ سننا چاہتی تھی۔ اس لئے خاموش تھی۔ نجمہ ناہید نے کہا۔ "ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا۔ شادی سے پہلے زبیر کے متعلق کچھ سنتیں تو یقین نہ کرتیں۔ یہ تمہاری خاموشی بتا رہی ہے کہ میری باتیں گراں نہیں گزر رہی ہیں۔ جو گزرنی تھی' وہ گزر چکی ہے۔"

وہ آمنے سامنے تھیں اور دونوں پر گزر چکی تھی۔ دونوں کی نادانیاں مشترک تھیں۔ نجمہ نے کہا۔ "دنیا ہمیں ناقص العقل کہتی ہے' ٹھیک ہی کہتی ہے۔ ہم مرد کو تسخیر کرنے کی خوش فہمی میں اپنا بہت کچھ گنوا بیٹھتی ہیں۔ پھر اپنی آنکھوں کے پیچھے آنسو چھپاتی رہتی ہیں تاکہ ہماری نادانی ظاہر نہ ہو اور دانائی کا بھرم قائم رہے۔"

سلمیٰ نے دل میں اعتراف کیا۔ "یہ درست ہے۔ میں بھی اپنی نادانی کا یہ نتیجہ میکے والوں پر اور محلے والوں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔"

نجمہ نے کہا۔ "ہم اپنی حماقتیں چھپا کر اور زیادہ نادانی کا ثبوت دیتے ہیں۔ میں نے شادی کے بعد یہ سوچتے سوچتے ایک سال چار ماہ گزار دیئے کہ زبیر سے طلاق لوں گی تو میری ذلت ہو گی کیونکہ میں ہی باؤلی ہو کر اس پر مرمٹی تھی۔ رشتے دار زبیر سے زیادہ مجھے تنقید کا نشانہ بنائیں گے۔" پھر اس نے سلمیٰ سے پوچھا۔ "تم کب تک خاموش رہو گی؟"

سلمیٰ نے بڑی دیر بعد کہا۔ "جو میرے دل پر گزر رہی ہے وہ ساری باتیں تمہاری

زبان سے سن رہی ہوں۔ تم نے میرے بولنے کے لئے کچھ نہیں چھوڑا ہے۔" پھر سرد آہ بھر کر وہ بولی۔ "نجمہ بہن! کوئی درد کو سمجھنے والا ہمدرد مل جائے تو آدھا دکھ دور ہو جاتا ہے۔ تمہاری آواز' تمہارا لہجہ میرے کانوں کو بھلا لگ رہا ہے۔ یہ بتاؤ تم نے طلاق لی تھی یا زبیر نے دی تھی؟"

"وہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ کہتا تھا' سوسائٹی میں بدنامی ہو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مہر کے ایک لاکھ روپے ادا نہیں کر سکتا تھا۔"

"اس کے پاس یہ پندرہ لاکھ کی کوٹھی ہے۔ ساڑھے چار لاکھ کی کار ہے۔ بینک بیلنس بھی کافی ہو گا۔ پھر کیا تمہارے ایک لاکھ نہیں دے سکتا تھا۔"

نجمہ نے کہا۔ "بارہ برس پہلے اس کے باپ نے یہ کوٹھی تین لاکھ میں بنوائی تھی آج اس کی قیمت پندرہ لاکھ ہو گئی ہے اور ساڑھے چار لاکھ کی کار تو کبھی اس کے باپ نے بھی نہیں چلائی ہے۔ زبیر کاروں کا دلال ہے۔ اس کے پاس نئی پرانی کاریں آتی جاتی رہتی ہیں۔ تم ہفتے دو ہفتے سے جو کار دیکھ رہی ہو وہ کسی گاہک کے پاس چلی جائے گی تو کوئی دوسری آ جائے گی اور اس شخص کے پاس بنک بیلنس کیا خاک ہو گا جو میری رقم ادا نہیں کر سکتا ہے۔ باپ یہ کوٹھی بنا کر نہ مرتا تو وہ کسی چھوٹے سے کرائے کے مکان میں نظر آتا۔"

"کیا تم نے مہر کی رقم وصول کرنے کے لئے قانونی کارروائی کی تھی؟"

"کرنا چاہتی تھی مگر وہ میرے باپ کے قدموں میں گر پڑا اور پکے کاغذ پر یہ لکھ کر دیا کہ جب تک ایک لاکھ ادا نہیں کرے گا اس ایک لاکھ کا سُود ادا کرتا رہے گا۔"

"سُود؟" سلمیٰ نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں' میرے ابا کا دھندا یہی ہے۔ وہ لوگوں کو سُود پر رقم دیتے ہیں۔ زبیر کے خلاف قانونی کارروائی اس لئے نہیں کر رہے ہیں کہ وہ ہر ماہ دس ہزار روپے بطور سُود ادا کرتا ہے۔ اب تک وہ ایک لاکھ سے زیادہ رقم دے چکا ہے اور اصل مہر کے ایک لاکھ روپے جوں کے توں اس پر قرض ہیں۔"

سلمیٰ نے کہا۔ "یہ تو سراسر حماقت ہے۔ وہ کوٹھی بیچ کر تمہاری رقم ادا کر سکتا ہے۔"

"کوٹھی سے تو رئیسانہ شان ہے۔ وہ اونچے لوگوں میں رہ کر نیچے نہیں گرنا چاہتا۔ وہ ایک نفسیاتی مریض ہے۔ جو نہیں ہے وہ ظاہر کرتا ہے۔ وہ بیویوں کو خوش نہیں رکھ سکتا مگر شادیاں کرتا ہے۔ اس کے اندر انتقام کی یہ آگ بھڑکتی رہتی ہے کہ جس عورت کا

کچھ بگاڑ نہیں سکے گا اسے بگاڑنے کے لئے بیوی بنائے گا۔ میں تیسری تھی' تم چوتھی ہو۔ ہم سے پہلے دو جا چکی ہیں۔ انہوں نے آسانی سے پیچھا چھوڑ دیا۔ میرے ابا اسے نہیں چھوڑیں گے۔"

"میرا خیال ہے آج تم سُود وصول کرنے آئی ہو۔"

"وصولی کے لئے میرے ابا آتے ہیں۔ آج میں اس لئے آئی ہوں کہ تم سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور رقم بھی وصول کر لوں۔"

"میں حیران ہوں کہ زبیر ہر ماہ دس ہزار روپے کیسے ادا کرتا ہے۔"

"کچھ کار ڈیلنگ سے اور کچھ کہانیوں سے آمدنی ہوتی ہے' ویسے آمدنی کہاں سے ہوتی ہے؟ کتنی ہوتی ہے؟ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرے ابا پھل کھاتے ہیں پیڑ نہیں گنتے۔"

وہ بڑی دیر تک باتیں کرتی رہیں .... پھر زبیر آ گیا۔ نجمہ ناہید کو دیکھتے ہی ٹھٹک گیا' پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "تت .... تم نے یہاں آنے کی زحمت کیوں کی۔ میں آج شام تمہارے ابا سے ملنے والا تھا۔"

نجمہ ناہید نے دیوار گیر گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "شام تو ہو چکی ہے۔"

"آں۔ ہاں' میرا مطلب یہ .... یہ ہے کہ میں رات کو آنے والا تھا۔"

سلمیٰ نے پوچھا۔ "اب جو بیوی نہیں رہی' اس کے ابا سے کیوں ملنے جاؤ گے؟"

"وہ بات یہ ہے کہ نجمہ کے والد سے کچھ پرانا لین دین ہے۔"

"نجمہ بہن دوپہر کو آئی تھیں اب شام ہو چکی ہے۔ اتنی دیر میں دو عورتیں ایک دوسرے کے سامنے پورے محلے پڑوس کی ہسٹری بیان کر دیتی ہیں۔ کیا تمہاری ہسٹری اب تک چھپی رہی ہو گی؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "نجمہ! اپنے ابا کو جا کر سمجھاؤ' میری شادی میں کافی رقم خرچ ہو چکی ہے۔ میں اس ماہ کا سُود اگلے ماہ ادا کروں گا۔"

نجمہ نے کہا۔ "تم نے شادی کی ہے تم بھگتو۔ آج رقم نہ ملی تو کل ابا گرجتے اور گالیاں دیتے پہنچ جائیں گے۔"

وہ سلمیٰ کے سامنے بے عزتی محسوس کرتے ہوئے غصے سے بولا۔ "اپنے باپ سے کہو' میں عزت دار آدمی ہوں' گالیاں برداشت نہیں کروں گا۔ انہیں صرف اپنی رقم سے مطلب ہونا چاہئے۔ میں اگلے ماہ کی پہلی تاریخ کو دو ماہ کے بیس ہزار ادا کر دوں گا۔"

سلمیٰ نے پوچھا۔ "کیا تم سُود ادا کرنے کے لئے شادیاں کرتے ہو؟ پہلی دو بیویوں کو

مجھ سے چھپا گئے۔ پتا نہیں ان بے چاریوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو گا لیکن ہم بے چاریاں نہیں ہیں۔ میرے مہر کر رقم عندالطلب ہے۔ میں بھی ایک لاکھ کا مطالبہ کر رہی ہوں۔"

وہ بولا۔ "یہ کیا پاگل پن ہے۔ تم پندرہ لاکھ کی کوٹھی کی مالک ہو۔ یہ ایک لاکھ کی اہمیت تمہارے سامنے کچھ نہیں ہے۔"

"بہت اہمیت ہے۔ تم سُود ادا کرتے کرتے کنگال ہو جاؤ گے' کوٹھی بیچ دو گے تو میرے مہر کی رقم ادا کرنے کے قابل نہیں رہو گے۔ دانشمندی یہ ہے کہ میں اپنی رقم پہلے وصول کرلوں۔"

"تم دیکھ رہی ہو کہ میں نجمہ کی رقم ادا نہیں کرپا رہا ہوں۔ یہ میری بیوی نہیں ہے اس لئے پریشان کر رہی ہے۔ تم تو ایسا نہ کرو۔"

"پریشان کیوں ہوتے ہو۔ تم نے ایک غریب لڑکی کا جہیز دینے کے لئے چار لاکھ کی کار پچاس ہزار روپے میں بیچ دی تھی۔ کیا دو بیویوں کے مہر کی جائز رقم ادا کرنے کے لئے یہ کوٹھی نہیں بیچ سکتے؟"

وہ غصے سے تلملاتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ نجمہ نے کہا۔ "میں جا رہی ہوں۔ ویسے تمہارے میاں کی شامت آ گئی ہے۔ میرے ابا نے کہا تھا......... آج رقم نہ ملی تو کل وہ اپنی گاڑی میں مائیکروفون اور لاؤڈ اسپیکر لگا کر آئیں گے اور کوٹھی کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی رقم کا تقاضا کریں گے۔ اس طرح لوگوں کو معلوم ہو گا کہ یہ نمائشی سرمایہ دار ہے۔ اونچی سوسائٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کوا ہے' ہنس کی چال چلنا چاہ رہا ہے۔"

وہ جانے لگی' زبیر نے فوراً ہی کمرے سے نکل کر کہا۔ "رک جاؤ۔ یہ کوئی شرافت نہیں ہے کہ پورے علاقے کو میرے مقروض ہونے کی بات بتائی جائے۔ پلیز اپنے باپ کو سمجھاؤ۔ میں اگلے ماہ........."

"میں تمہاری طرف سے کیوں سمجھاؤں؟ میرا تم سے کیا رشتہ ہے؟ جو کہنا ہے میرے باپ سے کہو۔"

وہ منہ پھیر کر چلی گئی۔ زبیر پریشانی سے سوچتا رہا۔ سلمیٰ نے کہا۔ "سوچنے کا وقت گزر چکا ہے۔ تم نے میرے سامنے خود کو رئیسِ اعظم ثابت کیا تھا۔ کل تمہاری رئیسی کا جنازہ نکلے گا۔ پتا نہیں تمہارا سابقہ سُود خور سسر تمہیں مہلت دے گا یا نہیں؟ میں ایک ہفتے کی مہلت دے رہی ہوں۔ میرے مہر کی رقم ایک لاکھ ادا کر دو۔"

"بکواس مت کرو۔"

"بیوی کے رشتے سے لحاظ کر رہی ہوں۔ ورنہ میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ تمہاری ساری زندگی بکواس ہے۔ ایک ہفتہ بعد میرے وکیل کی طرف سے ایک لاکھ کی ادائیگی کا نوٹس آئے گا۔ پھر عدالتی کارروائی شروع ہو جائے گی۔"

"نجمہ نے آ کر تمہیں بہکا دیا ہے۔"

"نہیں' اس نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ تمہارے لئے بھی یہ بہتر ہے۔ کوٹھی بیچ کر کوئی چھوٹا سا مکان خرید لو۔ میری اور نجمہ کی رقم ادا کر دو۔ باقی جو رقم بچے اس سے ایک اور شادی کر لو۔"

یہ مشورہ دے کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ زبیر نے اب تک بڑی کامیابی سے اپنی امارت کا بھرم رکھا تھا۔ اس نے پہلے دو شادیاں کیں' اس سے تجربہ ہوا کہ عورت نادان' کمزور اور مرد کی محتاج ہوتی ہے۔ دلہن بن کر اپنا سب کچھ مرد کے حوالے کر دینے کے بعد اس کے پاس کچھ نہیں رہتا۔ وہ پہلی دو بیویاں واقعی نادان تھیں۔ ہار کر چلی گئیں۔ ان کے بعد شاید نجمہ بھی ہار جاتی لیکن اس کے باپ نے اسے سُود کے شکنجے میں کس لیا۔ سلمیٰ ایک نادانی کی سزا پا رہی تھی اس نے نجمہ اور اس کے باپ کے رویے سے سمجھ لیا کہ اب دانائی سے کام نہیں لے گی تو مہر کی رقم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گی۔

زبیر نے نجمہ کے باپ کے پاس آ کر ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "خدا کے لئے میری عزت رکھ لیں۔"

سابقہ سسر نے پوچھا۔ "کیا تم نے میری بیٹی کی عزت رکھی؟ تم لڑکیوں کی نادانیوں سے فائدہ اٹھا کر' انہیں جھوٹی شان و شوکت دکھا کر ان سے شادی کرتے ہو۔ پھر انہیں طلاق دے کر انہیں بیوی رہنے دیتے ہو نہ بیوہ......... اور نہ ہی وہ کنواری رہتی ہیں۔ تم ان کے کنوارے پن کا مان ختم کر دیتے ہو۔ سوسائٹی میں مطلقہ عورت کی کیا عزت رہتی ہے؟ تم انہیں عزت کے قابل نہیں رہنے دیتے اور مجھ سے عزت کی بھیک مانگنے آئے ہو۔"

"انکل! مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ پلیز مجھے ایک ماہ کی مہلت دیں۔ آپ ہی میری عزت رکھ سکتے ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں حاتم طائی نہیں ہوں۔ میں نے بیٹی کے مہر کی رقم پر اس لئے صبر کیا ہے کہ اس کا سُودا ادا کر رہے ہو۔ اگر سُود کی ادائیگی میں بھی دیر کرو گے تو تمہاری جھوٹی عزت کا پول کھول دوں گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سُود سے کیسے نجات ملے گی۔ اس پر آپ کی بیٹی نے میری بیوی کو بھڑکا دیا ہے' وہ بھی اپنے مہر کی رقم مانگ رہی ہے' اس نے ایک ہفتے کی مہلت دی ہے۔ اس کے بعد وہ بھی قانونی کارروائی کی دھمکی دے رہی ہے۔"

"یہ تو اور اچھی بات ہے۔ تم پر کیچڑ اچھالنے والوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ویسے تمہاری موجودہ بیوی بہت سمجھدار ہے' اس نے نجمہ کی ٹھوکر سے فوراً ہی سبق سیکھ لیا ہے۔"

"لیکن میرے لئے تو مصیبت بن گئی ہے۔"

"عورت جب عقل سیکھتی ہے تو غلط کار کے لئے عذاب بن جاتی ہے۔"

"میں آپ کی دانشورانہ باتیں تسلیم کر رہا ہوں۔ آپ بھی مہربانی کریں۔ مجھے تھوڑی مہلت دے دیں۔"

"تمہاری موجودہ بیوی نے جو مہلت دی ہے وہی مہلت میں دے رہا ہوں۔"

"انکل! میں ایک ہفتے کی مہلت میں کوٹھی فروخت کرنا چاہوں گا تو اتنی جلدی کوئی خریدار نہیں ملے گا۔"

"خریدار تمہارے سامنے ہے۔ اس علاقے میں جو قیمتیں چل رہی ہیں میں وہ قیمت ادا کر کے تمہاری مشکل آسان کر دوں گا۔ تمہیں کسی بہانے سے بچ کر نکلنے نہیں دوں گا۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ نجمہ کے باپ نے کہا "گھر جاؤ اور آدمی بن کر سوچو کہ اپنی حیثیت سے اونچی جگہ رہو گے تو ذلیل ہوتے رہو گے۔ اگر تم نے کل کوٹھی فروخت کر کے رقم ادا کرنے کا فیصلہ نہ کیا تو میں پرسوں لاؤڈ اسپیکر کے ساتھ تمہارے محلے میں آ کر تمہاری جھوٹی شان و شوکت کی دھجیاں اڑا دوں گا۔ اب جاؤ یہاں سے۔"

وہ گھر آ گیا۔ نجمہ اور سلمٰی کے سلسلے میں دو لاکھ روپے کی ادائیگی پہاڑ بن گئی تھی۔ استعمال شدہ کاریں فروخت کرنے اور کمیشن حاصل کرنے سے صرف گھر کا کچن چلتا تھا کوئی اور ضرورت پوری نہیں ہوتی تھی۔ پچھلے ایک ماہ سے کوئی کہانی بھی ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ پبلشر ادھار نہیں دے رہا تھا۔ اپنے بدترین حالات کو قدرے بہتر بنانے کے لئے ایک کوٹھی رہ گئی تھی جسے فروخت کر کے سُود سے نجات حاصل کر کے وہ نئے سرے سے کوئی نیا کاروبار کر سکتا تھا۔

اس رات اس نے خواب میں دیکھا کہ نجمہ کے باپ نے اس پر تیزاب پھینکا ہے۔

تیزاب سے کپڑے گل گئے ہیں اور وہ ننگا ہو گیا۔ دنیا والے اس کی عریانی پر قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ نیند سے چونک کر اٹھ بیٹھا۔ بھلا دنیا والوں کے سامنے ننگا ہونا کون چاہتا ہے۔ وہ پریشان ہو کر بستر سے اٹھ گیا۔ صبح ہو رہی تھی اور کہا جاتا ہے کہ صبح کا خواب سچا ہوا کرتا ہے۔

اس نے اپنے کمرے سے نکل کر سلمٰی کے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک کے بعد اس نے نیند بھری آواز سے پوچھا۔ "کون ہے؟"

وہ گرج کر بولا۔ "میں ہوں۔ میری نیند حرام کر کے خود سکون سے سو رہی ہو۔ باہر آؤ۔"

وہ دروازہ کھول کر بولی۔ "کیوں اتنے سویرے بھونک رہے ہو۔ کوئی عورت کسی مرد کی نیند حرام نہیں کرتی۔ مرد خود اسے دیکھ کر کروٹیں بدلتا ہے اور الزام عورت کو دیتا ہے۔"

"میں تمہاری وجہ سے کوٹھی فروخت کرنے جا رہا ہوں۔ تم نے اور نجمہ نے مل کر یہ سازش کی ہے۔ اس کا باپ مجھے مہلت نہیں دے رہا ہے۔"

"مجھے بیاہنے سے پہلے ہی تم غلطیوں پر غلطیاں کرتے چلے آ رہے ہو۔ ان کے نتائج اب سامنے آ رہے ہیں تو مجھے الزام دے رہے ہو۔ ویسے صبح ہوتے ہی تم نے خوش خبری سنائی ہے کہ کوٹھی فروخت کر کے میرے مہر کی رقم ادا کرو گے۔"

"صرف رقم نہیں دوں گا' طلاق بھی دوں گا۔"

"شکریہ۔ یہ دوسری خوشخبری ہے۔"

اس نے دروازے کو زوردار آواز سے بند کر دیا۔ وہاں سے دوڑتی ہوئی آ کر بستر پر اوندھے منہ گری اور بے اختیار رونے لگی۔ اپنی نادانیوں کی سزا پانے میں طلاق جیسی گالی بھی شامل ہو گئی تھی۔

اس نے اب تک اپنی باجی سے یہ حقیقت چھپائی تھی کہ ازدواجی زندگی ناکام رہی ہے۔ اب طلاق سے ظاہر ہو جائے گا۔ مرد جب طلاق دے کر چھوڑتا ہے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ عورت اس کے قابل نہیں ہے۔ اگر قابل ہوتی تو مرد اسے چھوڑنے کے لئے ایک لاکھ کی بھاری رقم سے ہاتھ نہ دھوتا۔

وہ بڑی دیر تک روتی رہی پھر اس نے اٹھ کر غسل کیا پتا نہیں کب رقم ملنے والی تھی اور کب اسے گھر چھوڑ کر جانا تھا۔ وہ ابھی سے اپنی ضروری چیزیں سمیٹ کر اٹیچی میں رکھنے لگی۔ ان ضروری چیزوں میں پرائز بانڈ بھی تھے۔ ان میں سے ایک پرائز بانڈ ایسا تھا

جسے زبیر نے اس کا گھونگٹ اٹھانے سے پہلے اسے دیا تھا اور کہا تھا۔ "عام طور پر دلہن کا
چہرہ دیکھنے سے پہلے دلہا اسے سونے انگوٹھی پہناتا ہے یا کوئی قیمتی چیز تحفے کے طور پر دیتا
ہے۔ میں یہ پرائز بانڈ دے رہا ہوں۔ شاید آج تک کسی دلہا نے ایسا تحفہ نہ دیا ہو۔ یہ
ایک کاغذ کا ٹکڑا ہے لیکن پرائز نکل آئے تو ایک ہزار سے ایک لاکھ اور دس لاکھ بھی مل
سکتے ہیں۔"

سلمٰی نے اس وقت تحفہ رکھ لیا تھا لیکن یہ نہ سمجھ پائی تھی کہ وہ شخص ایک کاغذ کا
ٹکڑا کیوں دے رہا ہے؟ بعد میں بات کھلتی گئی کہ وہ کنگال ہے۔ مقروض ہے۔ رقم نہیں
تھی اس لئے سلمٰی کو سادگی سے بیاہ کرلایا تھا۔ تحفہ دینے کے لئے بھی نقد روپے نہیں تھے
اس لئے پرائز بانڈ دے کر ٹرخا دیا تھا۔

اس نے شادی سے پہلے بھی دولت مندی کے خواب دکھائے تھے۔ سہاگ کی سیج پر
پرائز بانڈ کے ذریعے لاکھوں روپے کی آس دلائی تھی۔ وہ پتا نہیں اور کب تک بیوقوف
بنتی رہتی' نجمہ ناہید نے آکر اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی
کہ طلاق نہیں لے گی تو سہاگن کے بستر پر کنواری آگ میں جلتی رہے گی۔

☆==========☆==========☆

طلاق ہو گئی۔ پھر ایک برس گزر گیا۔ محلے کی عورتوں نے باتیں بنائیں کہ اونچی
اُڑان والے جلد ہی زمین پر گرتے ہیں۔ وہ اونچی کوٹھیوں میں رہنے کے قابل نہیں تھی
اس لئے زبیر ایک ماہ تک گلچھڑے اڑانے کے بعد اسے طلاق کے جوتے مار کر پھینک گیا
ہے۔

محلے کے لوگ اسے ایسے دیکھتے تھے جیسے ایک مرد نے اس کتاب کو کھول کر سب کو
پڑھنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ اب وہ پبلشر کے ہاتھ سے نکل کر روپیہ لائبریری میں پہنچ گئی
ہے۔ اپنی گلی سے مین روڈ کی طرف جانے تک بڑی گرم گرم آہیں اور ذومعنی فقرے سنائی
دیتے تھے۔ وہ نگاہوں اور آہوں سے ٹکے کے بھاؤ پڑھی جا رہی تھی اور کوئی بعید نہیں تھا
کہ کسی دن کوئی سر پھرا اسے اٹھا کر لے جاتا۔

وہ اپنے آپ سے ڈرنے لگی تھی۔ پورا لباس پہننے اور اوپر سے چادر ڈالنے کے
باوجود پھٹ پڑنے والی جوانی نگاہوں کو پکارتی تھی۔ جوان عورت کے ساتھ یہی ایک مشکل
ہے۔ وہ اپنا خزانہ ساتھ لئے پھرنے پر مجبور رہتی ہے۔ اسے گھر چھوڑ کر نہیں آ سکتی۔
دیکھنے والوں کے ساتھ بھی مشکل ہے' وہ اپنی آنکھیں نہیں پھوڑ سکتے اور آنکھیں بند کر
کے بھی نظر آنے والے نظاروں کو چھوڑ نہیں سکتے۔

سائرہ باجی نے کہا۔ "ہماری سلامتی اسی میں ہوتی ہے کہ کسی ایک مرد کی پناہ میں
رہیں۔ تم کسی ایک سے منسوب ہو جاؤ گی تو دوسرے تمہارے حصول سے باز آ جائیں
گے۔"

سائرہ یہ باتیں نہ سمجھاتی' تب بھی سلمٰی کو ایک جیون ساتھی کی ضرورت تھی۔ وہ
پہلے کے ساتھ پیاسی گئی تھی اور اسے چھوڑ کر پیاسی آئی تھی۔ پھر ایک برس سے تشنگی کے
صحرا میں بھٹک رہی تھی۔ یوں تو وہ کسی کو بھی اپنا سکتی تھی مگر اب چھاچھ بھی پھونک
پھونک کر پینا چاہتی تھی۔ پہلے اچھی طرح یقین کرنا چاہتی تھی کہ جسے اپنا رہی ہے' وہ کھوٹا
نہیں ہے۔

ایسی ہی برس بھر کی تلاش کے بعد عبدالمجید سے سامنا ہوا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے

درزی تھا مگر گفتگو، سلیقہ اور لباس کی عمدگی سے درزی نہیں لگتا تھا۔ اسی لئے امیر ترین گھرانوں کی بیگمات اسے ماسٹر کہتی تھیں۔

ٹیلر ماسٹر مجید نے پہلی ملاقات سے اسے متاثر کیا تھا۔ وہ جیسے قیافہ شناس تھا۔ سمجھ گیا تھا کہ چھوٹے علاقے سے کپڑے سلوانے آئی ہے اور اونچے خواب دیکھتی ہے۔ وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ وہ ایسا ٹیلر ماسٹر ہے جو نیا لباس پہنانے سے پہلے پرانا لباس اتروا لیتا ہے۔ اور وہ پرانا لباس اس نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ کیوں رکھ لیا تھا؟ جبکہ کوئی کسی کی اترن کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔

ماسٹر نے کہا تھا کہ اس کا لباس لانڈری سے دھلوا کر دے گا۔ یوں دوسری بار ملاقات کا بہانہ ہو گیا تھا۔ وہ دوسرے دن دکان میں آئی۔ ماسٹر نے لباس کی سلائی کا معاوضہ صرف ایک روپیہ طلب کیا تھا اور اس نوٹ پر اس کے دستخط کا مطالبہ کیا تھا۔ سلمٰی نے دستخط شدہ نوٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے کپڑے لینے آئی ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "یہ اقرار نہیں کرو گی کہ مجھ سے ملنے آئی ہو۔"

"تمہیں اپنے متعلق بڑی خوش فہمی ہے۔"

"میں تمہاری ذہانت کے سلسلے میں خوش فہم ہوں کہ تم اچھی طرح سوچ سمجھ کر مجھے دوستی کے قابل سمجھ رہی ہو۔"

"کیا دوستی ضروری ہے؟"

"ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے ضروری ہیں۔"

"یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"ایسے کہ تم نے ایک شخص سے دھوکا کھایا ہے۔"

"تم کیسے جانتے ہو؟"

"میں تمہارے محلے میں گیا تھا۔ بزرگ کہتے ہیں دو پیسے کی ہانڈی بھی لو تو ٹھونک بجا کر پرکھ لو۔ میرا دل تمہیں اتنی شدت سے طلب کر رہا ہے کہ میں نے تمہارے متعلق کسی حد تک معلومات حاصل کر لیں۔"

"محلے والوں نے میرے خلاف کہا ہو گا؟"

"یہ ہر محلے کا المیہ ہے۔ ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کو کمتر سمجھتا ہے۔ میں سوچ کر گیا تھا کہ تمہارے متعلق جتنی برائی ہو گی حقیقتاً تم میں اتنی ہی اچھائی ہو گی۔ تمہارے چہرے سے، آنکھوں سے اور اندازِ گفتگو سے تمہارے کردار کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہ بدبخت تھا جس نے تمہاری قدر نہیں کی۔"

وہ سر جھکائے سن رہی تھی۔ اس کی گفتگو سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اس کے متعلق صحیح اندازہ لگا رہا ہے اور صحیح قدر کر رہا ہے۔ اس کی زبان سے اپنی تعریفیں سن کر دل میں انگڑائیاں سی اٹھ رہی تھیں۔ پہلے مرد نے جو قصیدہ پڑھا تھا اس کا انجام بھول رہی تھی۔ اپنی تعریف سن کر کوئی اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ تعریف کرنے والے کے اختیار میں چلا جاتا ہے۔

سلمٰی نے پوچھا۔ "میرے کپڑے دھل گئے؟"

"مجھے افسوس ہے کہ میرے ملازم سے وہ لباس کہیں گم ہو گیا ہے۔ اس نے اس کے عوض یہ لباس تیار کیا ہے۔"

اس نے نیا لباس اس کے سامنے رکھا۔ وہ بولی۔ "پرانا گم ہو گیا تھا، اس کے بدلے نیا دے رہے ہو۔ پھر یہ کپڑا تو بہت قیمتی ہے۔"

"کچھ زیادہ نہیں، سات سو روپے کا سوٹ پیس ہے۔"

"سات سو روپے!" اس نے دل میں حیرانی سے کہا۔ حیرانی ظاہر نہیں کی مگر بے اختیار اس قیمتی کپڑے کو سہلاتی رہی۔

اس نے کہا۔ "کیبن میں جاؤ اور اسے پہن کر دیکھو۔ مجھے بھی دکھاؤ۔"

"یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"مجھے اچھا سمجھو گی تو یہ اچھا لگے گا۔ جاؤ شاباش۔"

وہ لباس لے کر کیبن میں گئی۔ اسے پہن کر آئینے میں دیکھا تو شخصیت ہی بدل گئی۔ یوں انکشاف ہوا کہ رئیس زادیاں عام عورتوں سے منفرد کیوں لگتی ہیں۔ مہنگی کاروں اور قیمتی ملبوسات میں یوں دکھائی دیتی ہیں جیسے آسمان سے اتر کر آئی ہوں۔

اس نے ماسٹر مجید کو بلا کر دکھایا تو وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ جذبوں میں ڈوب کر بولا۔ "بس وہ تمام حقوق مجھے دے دو کہ روز ایک اتاروں اور ایک پہناؤں۔" سلمٰی نے فوراً ہی شرما کر منہ پھیر لیا۔

ماسٹر مجید نے دو چار ملاقاتوں میں بڑے درد و کرب سے اسے بتایا کہ اس کی بیوی اپاہج ہے۔ دونوں پیروں سے معذور ہے۔ سلمٰی پہلے تو ناراض ہوئی پھر دونوں پیروں سے معذوری والی بات سنی تو اسے معذور شائلہ پر ترس آیا اور ماسٹر سے محبت بڑھی کہ بیچارہ برسوں سے خود کو وفادار شوہر ثابت کرتا آ رہا ہے۔

وہ بولی۔ "مجید! میری زندگی میں آنے والا پہلا شخص اتنا جھوٹا اور فریبی تھا کہ میں آئندہ کسی پر بھروسا نہیں کرنا چاہتی۔ تم میری ہمدردی اور محبت حاصل کرنے کے لئے

بھی ایک فرضی معذور بیوی کا قصہ سنا سکتے ہو۔"

"تم شبہ کرنے میں حق بجانب ہو۔ میں تمہیں شمائلہ کے پاس لے چلوں گا۔"

اس رات اس نے شمائلہ سے کہا۔ "میں نے تمہیں خاوند کی بھرپور محبت دی۔ بیٹے دیئے بیٹیاں دیں۔ اگر کوئی کمی رہ گئی ہو تو بتاؤ؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "خدا گواہ ہے آپ نے مجھے سارے جہان کی خوشیاں دی ہیں۔ میری طرف سے کمی ہوتی رہی ہے۔"

"تو پھر وہ کمی پوری کر دو۔"

"کیسے کروں؟"

"مجھے دوسری شادی کی اجازت دے دو۔"

شمائلہ کو یوں لگا جیسے مجید نے کھڑے کھڑے اس کے سینے پر لات ماری ہو۔ اسے چپ لگ گئی۔ ماسٹر مجید نے تھوڑی دیر جواب کا انتظار کرنے کے بعد پوچھا۔ "کیا یہ کمی پوری نہیں کرو گی کہ ایک عورت میرے شانہ بہ شانہ چلے۔ محفلوں' تقریبات اور تفریح گاہوں میں میرے ساتھ گھومتی پھرے؟"

شمائلہ نے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے شادی سے پہلے ہی دوسری کی اجازت دے دی تھی۔"

"ہاں پھر بھی میں یہ بات تمہارے علم میں لانا چاہتا تھا۔ پھر یہ کہ سلمٰی تم سے ملنا چاہتی ہے۔"

"کیا وہ میری معذوری پر ترس کھانے آ رہی ہے؟"

"نہیں' وہ یقین کرنا چاہتی ہے کہ تم معذور ہو۔"

"سوکن بن کر آنے والی کو پہلی فکر یہ ہوتی ہے کہ پہلی والی اس کے پیچھے نہ دوڑے۔ ٹھیک ہے' اسے آ کر دیکھ لینے دو۔"

وہ بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔ اپنے ایک بازو میں اسے سمیٹ کر کہا۔ "تم بہت اچھی ہو' بہت سمجھ دار ہو۔ میں قسم کھاتا ہوں' تمہارے لئے میری محبت میں کمی نہیں ہو گی۔"

شمائلہ نے اپنے بدن سے اس کا ہاتھ آہستگی سے ہٹا دیا۔ کیا خوب شوہر تھا' بیوی کا مان ختم کر رہا تھا اور قسم کھا رہا تھا کہ اس کی محبت میں کمی نہیں کرے گا۔

وہ شوہر کے جانے کے بعد بڑی دیر تک روتی رہی۔ شادی سے پہلے یہی شمائلہ تھی جس نے بڑی فراخدلی سے کچے کاغذ پر لکھ دیا تھا کہ اس کا ہونے والا شوہر جب چاہے دوسری شادی کر سکتا ہے۔ ایسا لکھتے وقت وہ بیوی نہیں تھی۔ بیوی بن کر پتا چل رہا تھا کہ

شوہر چھن جائے تو دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

ویسے وہ ابتدا ہی سے اپنی معذوری کے پیش نظر ایک سوکن کی توقع کرتی رہی تھی۔ شوہر کی محبت اور بھرپور توجہ پا کر اس اندیشے کو بھول جاتی تھی۔ کسی بات کو بھول جانے سے وہ بات ختم نہیں ہو جاتی۔ دماغ کے کسی گوشے میں وہ دوسری موجود تھی جسے وہ لاشعوری طور پر برداشت کرتی آ رہی تھی۔

دوسرے دن سلمٰی اس سے ملنے آئی تو اس نے خود کو اچھی طرح سنبھال لیا۔ آنسو چھپا کر مسکراتی رہی۔ سلمٰی نے پوچھا۔ "کیا آپ جانتی ہیں کہ میں کون ہوں اور کیوں آئی ہوں؟"

"جانتی ہوں۔"

"پھر بھی مسکرا رہی ہیں؟"

"کیا رونے سے مسائل حل ہو جاتے ہیں؟"

"اگر میں مسئلہ ہوں تو آپ سے دور چلی جاؤں گی۔"

"میرا مسئلہ معذوری ہے۔ مذہبی اور قانونی طور سے میرے شوہر کو یہ حق ملتا ہے کہ وہ پاؤں والی بیوی لائے۔"

"درست ہے۔ میں سوکن بن کر نہیں آؤں گی تو کوئی دوسری آ جائے گی۔"

"اس لئے تم ہی آ جاؤ۔"

شمائلہ نے آنسو نہیں دکھائے پھر بھی سلمٰی کا دل بھاری ہو رہا تھا۔ یہ خیال ستانے لگا کہ وہ ایک معذور عورت پر ظلم کر رہی ہے۔ ان حالات میں انسان مجبور ہوتا ہے۔ زمین پر چلنے کے لئے مٹی کے کیڑوں کو روندتے ہوئے گزرنا پڑتا ہے۔ سلمٰی نے بار بار اپنے دل کو یہی ایک بات سمجھائی کہ شمائلہ کو ایک سوکن کا وجود برداشت کرنا ہی ہو گا۔ ماسٹر مجید بھی مجبور تھا۔ آج تک اسے دونوں پاؤں پر کھڑی ہونے والی پوری عورت نہیں ملی تھی وہ ایسی ایک عورت کو اپنانے کا حق رکھتا تھا۔

واپسی میں اس نے سلمٰی سے کہا۔ "چلو میں تمہیں گھر تک چھوڑ دوں۔"

"میں تمہاری کار میں وحدت کالونی تک جاؤں گی۔"

"میں تمہاری باجی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"پہلے مجھے شادی کے لئے آمادہ ہونے دو۔"

"کیا شمائلہ کی معذوری متاثر کر رہی ہے؟"

"صرف معذوری نہیں' اس کی تم سے محبت' اس کا تم پر اعتماد بھی متاثر کر رہا ہے۔"

کیا بتا سکتے ہو کہ اس نے ازدواجی زندگی گزرانے میں کس بات کی کمی کی ہے؟"

"مجھے پوری بیوی چاہئے۔"

"پھر آدھی کیوں لائے تھے؟"

"وہ ایک جذباتی غلطی تھی۔"

"میں کسی حادثے میں اپاہج بن جاؤں تو تیسری آئے گی؟"

"دیکھو سلمیٰ، میں مذہبی احکامات کے مطابق عمل کر رہا ہوں۔"

"میں مانتی ہوں۔ تمہارا عمل جائز ہے لیکن معذور بیوی کا مستقبل کیسے محفوظ رہے گا۔"

"میں نے پچیس لاکھ روپے کی کوٹھی اس کے نام کی ہے۔ اس کے بینک اکاؤنٹ میں تیس لاکھ اور لاکر میں بیس لاکھ کے زیورات ہیں۔"

"اور میرے مستقبل کا کیا ہو گا؟"

"تمہارے مہر کی رقم دو لاکھ ہو گی۔"

"ہمارے مذہب میں ایک سے زیادہ شادی کی اجازت اس شرط پر دی گئی ہے کہ بیویوں سے برابر انصاف کیا جائے۔ لہٰذا مجھے بھی اتنا ہی دو جتنا پہلی بیوی کو دے رکھا ہے۔"

"سلمیٰ! تمہارے لئے جان بھی حاضر ہے لیکن میں بیک وقت اتنا نہیں کر سکوں گا۔ شائلہ کو بھی میں نے تھوڑا تھوڑا کر کے دیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ شادی سے پہلے آدھا انصاف کرو۔ باقی شادی کے بعد تھوڑا تھوڑا کرتے رہنا۔"

"کیا تم مجھ پر بھروسہ نہیں کرو گی؟"

"بھروسا کرنے کے لئے یہ دیکھنا ہو گا کہ تم نے پہلی بیوی کے بھروسے کو کہاں تک قائم رکھا ہے۔ جب ایک مثال میرے سامنے موجود ہے تو میں کیسے بھروسا کروں؟"

وہ چپ رہا۔ اگرچہ ٹیلر ماسٹر تھا اور زبان قینچی کی طرح چلتی تھی تاہم وہ روانی بھول گیا تھا۔ باتیں بنانے کو وہ سو طرح کی باتیں بنا سکتا تھا مگر یہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ وہ ایک مرد سے دھوکہ کھا چکی ہے۔ اپنے محفوظ اور خوشحال مستقبل کی ضمانت حاصل کئے بغیر شادی نہیں کرے گی۔

اس نے وحدت کالونی کی ایک گلی میں کار روک کر کہا۔ "تم نے مجھے الجھا دیا ہے۔ میں بڑی سے بڑی قیمت ادا کر کے تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن یکمشت ادائیگی نہیں

کر سکوں گا۔ میں کوئی راستہ نکالوں گا۔ تم بھی اپنے فیصلے میں لچک پیدا کرو۔ کل تمہارا انتظار کروں گا۔"

وہ کار سے اتر گئی۔ ماسٹر چلا گیا۔ اس نے گلی سے گزرتے ہوئے سوچا۔ ہر معاملے میں لچک پیدا کر سکتی ہوں لیکن مرد کے معاملے میں ذرا سی ڈھیل دے کر پچھتاتے رہنے کی حماقت نہیں کروں گی۔

وہ گھر پہنچی تو سائرہ باجی نے پوچھا۔ "تم پھر ماسٹر کے پاس گئی تھیں؟"

"ہاں، اس کی معذور بیوی سے مل کر آ رہی ہوں۔ اس بار دھوکہ نہیں کھاؤں گی۔ شادی سے پہلے میں نے کڑی شرائط رکھی ہیں۔"

"شادی کیسے کرو گی؟ تمہیں زبیر سے طلاق نہیں ہوئی ہے۔"

"ہو چکی ہے۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں، اس سے مہر کی رقم لے چکی ہوں۔"

سائرہ باجی نے ایک لفافہ اسے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ خط زبیر نے لکھا ہے۔ اس پڑھو۔"

اس نے خط کھول کر پڑھا، لکھا تھا۔ "میری شریکِ حیات سلمیٰ، تم ناراض ہو کر گئی ہو۔ ناراضگی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک برس چار مہینے میکے میں رہ جاؤ۔ میں نے سنا ہے کہ تم خود کو مطلقہ ظاہر کر رہی ہو۔ یہ نہایت ہی غلط بات ہے۔ مہر کی رقم عندالطلب تھی اس لئے تمہارے طلب کرنے سے وہ رقم ادا کر دی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم خود کو مطلقہ سمجھو۔ غصہ تھوک دو اور فوراً چلی آؤ۔"

سلمیٰ نے خط کو مٹھی میں بھینچ کر کہا۔ "یہ کیا بدمعاشی ہے۔ اس نے میرے منہ پر تین طلاقیں دی ہیں۔"

باجی نے پوچھا۔ "کوئی گواہ ہے؟ کیا عدالت سے تحریری طلاق حاصل کی ہے؟ تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اس نے تمہیں طلاق نہیں دی ہے۔"

"میں اس کا منہ توڑ دوں گی۔"

وہ غصے سے باہر جانے لگی۔ سائرہ نے کہا۔ "رک جاؤ، اکیلی نہ جاؤ، میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔"

"نہیں باجی! میں تنہا اس سے نمٹ لوں گی۔ ابھی آجاؤں گی۔"

زبیر نے اپنی کوٹھی فروخت کر کے نجمہ اور سلمیٰ کے دو لاکھ ادا کئے تھے۔ پھر دو بیڈروم کی ایک چھوٹی سی کوٹھی نو لاکھ میں خرید لی تھی۔ وہ آج بھی اپنی رئیسانہ شان

وشوکت برقرار رکھے ہوئے تھا۔ سلمٰی نے سوچا تھا کہ وہ فریبی سدا کا بیمار ہے۔ اسے
دو چار ہاتھ جما کر طلاق نامہ لکھوا لے گی لیکن اس کے سامنے پہنچی تو اسے دیکھ کر حیران رہ
گئی۔

وہ کافی صحت مند اور نوجوان سا لگ رہا تھا۔ چہرے پر تازگی اور مسکراہٹ تھی۔
اس نے کہا۔ ”میں جانتا تھا کچے دھاگے سے بندھی آئیں گی سرکار میری..........“

”کسی خوش فہمی میں نہ رہنا۔ تمہارے جیسا جھوٹا اور مکار میں نے نہیں دیکھا۔ تم
نے مجھے تین طلاقیں دیں اور اب انکار کر رہے ہو؟“

”کسی عالم دین سے پوچھ لو۔ تین طلاقوں کے درمیان وقفہ ہونا چاہئے۔ وہ وقفہ
نہیں تھا۔ میں ان دنوں بیمار رہا کرتا تھا اور بیمار ذہن سے اور بیمار کی زبان سے دی ہوئی
طلاقیں معتبر نہیں ہوتی۔“

”یہ سب تمہاری سوچ ہے اس سے حقیقت نہیں بدل سکتی‘ اب کاغذ پر طلاق لکھ
دو۔“

”کس لئے دوں؟ مجھ میں کیا کمی ہے۔ میں نے ایک برس چار ماہ میں خود کو نمایاں
طور پر تبدیل کیا ہے۔ جسمانی مشقت کی ہے۔ صبح وشام ورزش کرتا رہا ہوں۔ جان بناتا رہا
ہوں۔ یہ دیکھو۔“

اس نے ایک کاغذ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”میڈیکل سرٹیفکیٹ ہے۔ یہ طبی رپورٹ
ثابت کرتی ہے کہ میں ازدواجی رشتہ قائم رکھنے کے قابل ہوں۔“

وہ کاغذ کو جھپٹ کر اسے ایک طرف پھینکتے ہوئے بولی۔ ”ایسی میڈیکل رپورٹ
ڈاکٹر نہیں بیوی پیش کرتی ہے اور میں دعوے سے کہتی ہوں کہ تم سراسر..........

بات پوری ہونے سے پہلے زبیر نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ اپنا
بازو چھڑانے لگی۔ دوسرے ہاتھ سے اسے مارنا چاہتی تھی۔ اس نے وہ ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ یہ
نئی بات تھی۔ پہلے وہ دھکا دیتی تھی تو وہ گر پڑتا تھا۔ آج اس نے دھکا دے کر اسے صوفے
پر پھینک دیا۔

اور ایک نئی بات یہ تھی کہ دسمبر کی سردی میں زبیر نے ململ کا کرتا پہن کر رکھا تھا۔
پہلے وہ ہلکی سی سردی میں پوری آستین کا سوئٹر پہن کر کمبل اوڑھ لیا کرتا تھا۔ اور ایک نئی
بات یہ ہوئی کہ سلمٰی کو پسینہ آنے لگا۔

فون کی گھنٹی بجتی رہی۔ پھر بجتی چلی گئی۔ باہر کال بیل بجی۔ وہ بھی بجتی چلی گئی۔
لیکن کوئی کتنی دیر تک بجاتا رہ سکتا ہے۔ آخر کار خاموش ہونا پڑا۔ فون کی گھنٹی بھی تھک

کر چپ ہو گئی۔ جو کمال کو پہنچتا ہے‘ وہ زوال کو پہنچتا ہے۔ زبیر ایک صوفے پر ایک سیب کو
کاٹ کاٹ کر یوں چبا رہا تھا جیسے کوئی درندہ گوشت کھانے کے بعد ہڈیاں چبا رہا ہو۔

وہ آنکھیں بند کئے صوفے پر پڑی ہوئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کاش زبیر کی بات
درست ہو اور طلاق نہیں ہوئی ہو۔ یوں بھی خوشگوار ماحول میں طلاق نہ دی جاتی ہے نہ
لی جاتی ہے۔ وہ دشمن بن کر آئی تھی اور وہ دوست بن رہا تھا لیکن اس کی جبری دوستی پر
غصہ آ رہا تھا۔

وہ آنکھیں کھول کر صوفے پر بیٹھ گئی اور اسے گھور کر دیکھنے لگی۔ وہ سیب چباتے
ہوئے مسکرا کر بولا۔ ”میرے ٹرینر نے دن رات مجھ سے ورزش اور محنت کرائی ہے۔ صبح
وشام میرا پسینہ نکلتا رہا ہے۔ آج یہ پسینہ رائیگاں نہیں گیا۔“

وہ اٹھ کر غصے سے چلتی ہوئی ایک کمرے کے باتھ روم میں آئی‘ اسے غصہ نہیں
آ رہا تھا مگر وہ دکھا رہی تھی۔ اس نے آئینے میں دیکھا‘ زلفیں بکھر گئیں تھیں اور چہرے پر
مرادوں بھری تازگی تھی۔ اس نے منہ ہاتھ دھوتے ہوئے سوچا۔ ”زبیر لاکھ سپرمین بن
جائے‘ اس سے ازدواجی رشتہ نہیں ہو سکتا۔ ٹھیک ہے کہ طلاق کا گواہ کوئی نہیں ہے لیکن
میں خود گواہ ہوں۔ یہ غلط ہے کہ کسی وقفے کے بغیر دی ہوئی طلاق تسلیم نہیں کی جاتی۔
گالی وقفے سے دی جائے یا وقفے کے بغیر‘ وہ گالی ہوتی ہے۔ میں اب اسے شوہر تسلیم نہیں
کروں گی۔“

اس نے تولئے سے منہ ہاتھ پونچھ کر بالوں کو برش کیا پھر کمرے سے ڈرائنگ روم
میں آ کر بولی۔ ”تم جبراً مجھے بیوی بنا کر نہیں رکھ سکو گے۔ ہمارے درمیان ایسا کوئی رشتہ
باقی نہیں رہا۔“

وہ محبت سے بولا۔ ”غصہ تھوک دو سلمٰی۔ بند کمرے میں میاں بیوی کے ہزار
جھگڑے ہوتے ہیں۔ طیش میں آنے سے طلاق کا لفظ بھی زبان سے نکل جاتا ہے۔ ازدواجی
زندگی کو اتنا کمزور نہ سمجھو کہ جنون میں آ کر ہذیان بک دینے سے طلاق ہو جائے گی۔“

”تم کوئی عالم دین نہیں ہو۔ مجھے غلط سبق نہ پڑھاؤ۔ میں ایک مطلقہ عورت ہوں
اور جلد ہی دوسری شادی کرنے جا رہی ہوں۔“

”ایسا جرم نہ کرنا۔ عدالتی فیصلے تک تم میری منکوحہ رہو گی۔“

”تو پھر میں عدالت کے ذریعے طلاق نامہ حاصل کروں گی۔“

وہ فوراً ہی سلمٰی کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بولا۔ ”خدا کے لئے ذرا ٹھنڈے دماغ سے
سوچو۔ میں ہر طرح تمہارے قابل ہوں۔ اب میں کسی سے بھی شادی کر سکتا ہوں لیکن

تمہارا دیوانہ ہوں۔ تمہارے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔"

وہ منہ پھیر کر بولی۔ "سامنے سے ہٹو' مجھے جانے دو۔"

وہ اٹھ کر بولا۔ "میں تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔ تم کل تک ٹھنڈے دماغ سے سوچو میں کل شام تمہارے دروازے پر سوالی بن کر آؤں گا اور تمہیں عزت سے اپنے گھر لے آؤں گا۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ کار کی اگلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "سلمیٰ! میرے حالات سنبھل رہے ہیں۔ آمدنی کے ذرائع وسیع ہوتے جا رہے ہیں۔ میں نے گرین ٹاؤن سے آگے زمین کا بہت بڑا حصہ کوڑیوں کے مول خریدا ہے۔ ایک لاکھ پیشگی کے طور پر دیا ہے۔ دو لاکھ اور ادا کردوں گا تو زمین میرے نام ہو جائے گی۔ میں وہاں دو بیڈ روم کے مکانات بنواؤں گا اور سلمیٰ ٹاؤن کے نام سے ایک بستی آباد کروں گا۔ اس سلسلے میں صرف تمہارا ساتھ چاہتا ہوں۔ تم ساتھ دو گی تو ہم لکھ پتی........ پھر کروڑ پتی ہو جائیں گے۔"

"میرے ساتھ دینے سے کروڑ پتی کیسے بن جاؤ گے؟"

"یہ میرے تمہارے درمیان راز کی باتیں ہیں' تم اپنا سامان میکے سے لے کر آجاؤ گی تو میں طریقہ کار بتاؤں گا۔"

"کیا پھر مجھے الو بنانے کا ارادہ ہے؟"

"تمہاری جان کی قسم' تمہیں دھوکا دینا چاہوں تو فوراً مرجاؤں۔ وہ زمین میرے نام سے ہے لیکن باقی دو لاکھ ادا کرتے ہی اسے تمہارے نام کر دوں گا۔ سلمیٰ ٹاؤن کی تمام آمدنی تمہاری ہو گی۔"

"میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ کسی سلطانہ یا ریحانہ کے نام سے ٹاؤن کیوں نہیں آباد کرتے۔"

"ایک بہت بڑے نجومی نے کہا ہے میرے اور تمہارے ستارے خوب ملتے ہیں۔ یہ سال ہماری ترقی اور عروج کا ہے۔"

"تم آخر کیا چیز ہو؟ قلم کار ہو' کار ڈیلر ہو' ایک نیا ٹاؤن آباد کرنے والے معمار ہو اور اب علم نجوم کے چکر میں ڈال رہے ہو۔"

"میری جان! تم مجھ پر بالکل اعتماد نہ کرو۔ مجھے فراڈ سمجھو مگر ایک بار اپنے تمام سامان سمیت میرے گھر آجاؤ۔ میں ایک ہفتے کے اندر زمین کے باقی دو لاکھ ادا کردوں گا اور وہ تمام زمین تمہارے نام ٹرانسفر کردوں گا تو پھر مجھ پر اعتماد کرنے لگو گی۔"

وہ وحدت کالونی کے پاس اتر گئی۔ زبیر نے کہا۔ "میں شوہر ہوں تمہارے گھر جا سکتا ہوں۔"

"ابھی میں سوچوں گی' فیصلہ کروں گی کہ تم میرے شوہر ہو یا نہیں۔ اگر نہیں ہو تو مجھے تمہارے ساتھ اپنے محلے میں نظر نہیں آنا چاہئے۔"

کوئی کار قریب آکر رکی۔ سلمیٰ نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ ماسٹر مجید تھا' کار سے باہر آکر بولا۔ "سلمیٰ بیگم! کیا تم اپنے ہر عاشق کے ساتھ کار میں بیٹھ کر اسی موڑ تک آتی ہو؟"

زبیر نے کار سے نکل کر پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

"مجھے ماسٹر مجید کہتے ہیں۔ میں شام سے ان محترمہ کا پیچھا کر رہا ہوں جنہیں میں نے شادی کی پیشکش کی ہے اور اس وقت سے اب تک تمہاری کوٹھی کے قریب انتظار کر رہا تھا اور وہاں تمہارے نام کی تختی پڑھ کر سوچ رہا تھا کہ طلاق ہو چکی ہے تو تین گھنٹے سے تم دونوں اندر کیا کر رہے ہو؟"

"ماسٹر مجید' تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں نے طلاق نہیں دی ہے' یہ بدستور میری بیوی ہے۔"

"بیوی ہے تو اس کے گھر کیوں نہیں جاتے؟"

"یہ ہمارا ذاتی مسئلہ ہے۔ تم کوئی پڑھے لکھے جاہل ہو۔ تم نے میری بیوی کو شادی کی آفر کی لیکن طلاق نامہ نہیں دیکھا۔ ویسے کہاں سے دیکھتے؟ جبکہ طلاق نہیں ہوئی ہے۔"

ماسٹر نے سلمیٰ کو ناگواری سے دیکھ کر کہا۔ "کتنی معصوم لگتی ہو اور خود کو مطلقہ ظاہر کر کے مجھ سے فراڈ کرتی رہی ہو۔ مجھ سے شادی کرنے سے پہلے لاکھوں روپے اپنے نام کرانا چاہتی تھیں۔ میں اتنا احمق نہیں ہوں' دیکھ لو کیسی جاسوسی کی ہے۔"

وہ کشمکش میں تھی کیا جواب دے۔ زبیر نے طلاق زبانی دی تھی اور آج زبردستی شوہر کا حق حاصل کیا تھا۔ وہ مطلقہ تھی یا نہیں' اس کا صحیح اندازہ وہ کسی عالمِ دین سے مل کر ہی سکتی تھی۔

وہ بولی۔ "تم مردوں نے مجھے الجھا کر رکھ دیا ہے۔ مجھے ایسی طلاق ہوئی ہے جس کا کوئی گواہ نہیں ہے اور طلاق دینے والا انکار کر رہا ہے۔"

ماسٹر مجید نے زبیر سے کہا۔ "یہ کیا حرکت ہے مسٹر! تم مذہبی احکامات سے پھر رہے ہو۔"

زبیر نے سلمیٰ سے کہا "گھر جاؤ اور ہمارے رشتے کو مذاق نہ بناؤ۔ ورنہ اس ماسٹر کی

مداخلت سے معاملہ عدالت تک پہنچ جائے گا۔"

ماسٹر نے کہا۔ "مجھے تم لوگوں کے معاملات سے اب دلچسپی نہیں رہی۔ سلمٰی! تم نے سابقہ شوہر کے پاس تین گھنٹے گزار کر اپنے کردار کو مشکوک بنایا ہے۔ میں تمہاری جیسی عورت کو اپنی بیوی کے برابر حقوق اور انصاف دینے کی حماقت سے بچ گیا ہوں۔ تم جیسی عورتوں سے خدا ہی سمجھے گا۔"

وہ غصے سے چلتا ہوا اپنی کار میں بیٹھا' اسے اسٹارٹ کرتے وقت دور کھڑی ہوئی بے وفا عورت کو دیکھا۔ دل اسے مانگ رہا تھا' اسے بے وفا نہیں کہہ رہا تھا لیکن سابقہ شوہر کے ساتھ وقت گزارنے والی کو وہ پارسا تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی پھر تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

سلمٰی نے زبیر سے کہا۔ "اب تم بھی جاؤ اور میرا فیصلہ سنتے جاؤ کہ تم نے پورے ہوش و حواس میں طلاق دی ہے اور میں نے پورے ہوش و حواس میں رہ کر تین بار طلاق کا لفظ سنا ہے۔ یہ بات میں عدالت میں کہوں گی اور وہیں باقاعدہ طلاق نامہ حاصل کروں گی۔"

وہ پلٹ کر جانے لگی۔ زبیر نے اس کے پیچھے آتے ہوئے کہا۔ "ایسا غضب نہ کرو۔ طلاق کو بھول جاؤ۔ میرا ساتھ نہیں دو گی تو میں سلمٰی ٹاؤن بنا نہیں پاؤں گا۔"

"جہنم میں گیا تمہارا سلمٰی ٹاؤن۔ میرے پیچھے مت آؤ۔"

وہ پیچھے آتا رہا اور اس سے ازدواجی رشتے کی بھیک مانگتا رہا۔ حتیٰ کہ گھر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ سائرہ باجی نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ "ارے اسے اپنے پیچھے کیوں لگا لائی ہو؟"

سلمٰی نے کہا۔ "کیا کروں؟ یہ بڑا ڈھیٹ ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ مجھے بیوی بنا کر کیوں رکھنا چاہتا ہے۔"

سائرہ نے اس سے کہا۔ "تم جاتے ہو یا محلے والوں کو بلاؤں۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "باجی! آپ مجھے جوتے مار لیں مگر میری ایک بات کا یقین کرلیں کہ میں اور سلمٰی لکھ پتی بن سکتے ہیں۔"

"اندر آؤ اور کم سے کم الفاظ میں بتاؤ کہ لکھ پتی کیسے بن سکتے ہو۔"

وہ دروازے سے اندر آکر بولا۔ "میں صرف ایک ہفتہ کی مہلت چاہتا ہوں۔ سلمٰی کو اپنے تمام سامان کے ساتھ میرے گھر بھیج دیں۔ میں ایک ہفتہ کے اندر............"

سلمٰی نے بات کاٹ کر پوچھا۔ "یہ تم بار بار میرے سامان کی بات کیوں کرتے ہو؟

میں تمہارے گھر سے کون سا قیمتی سامان اٹھا لائی ہوں؟ وہاں سے صرف ایک اٹیچی لائی تھی۔"

"بس وہی اٹیچی لے کر میرے ساتھ چلو۔"

سائرہ نے پوچھا۔ "میری بہن کی اٹیچی سے تمہیں کیا دلچسپی ہے؟"

"باجی! ابھی کوئی سوال نہ کریں۔"

سائرہ نے گہری سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر کہا۔ "تم یہاں منجی پر بیٹھو اور سلمٰی' تم میرے ساتھ آؤ۔"

وہ بہن کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں آئی۔ پھر دروازے کو اندر سے بند کر کے بولی۔ "یہ پکا بدمعاش ہے' کوئی ہیرا پھیری کر رہا ہے۔ ذرا اپنی اٹیچی کھول کر دیکھو۔ اس میں کیا خاص بات ہے؟"

"باجی! ایک برس چار مہینے میں سیکڑوں بار اسے کھول چکی ہوں۔ اس میں کوئی خزانہ نہیں ہے۔"

"وہ اٹیچی پر زور دے رہا ہے۔ ضرور کوئی بات ہے' مجھے دکھاؤ۔"

دونوں بہنیں اسے کھول کر ایک ایک چیز دیکھنے لگیں۔ اس میں صرف کپڑے اور دو چار کتابیں تھیں۔ کپڑوں کے نیچے ایک پرائز بانڈ تھا۔ سائرہ نے اسے اپنے پاس رکھ لیا پھر کپڑے اور کتابیں رکھ کر اٹیچی کو بند کر کے آنگن میں لے آئی۔ اسے منجی پر رکھ کر بولی۔ "اس میں سے تمہیں جو چاہیئے وہ لے جاؤ اور ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔"

زبیر نے جلدی سے اسے کھول کر اس کی تلاشی لی پھر ذرا مایوس ہو کر بولا۔ "سلمٰی! تمہیں یاد ہے' میں نے شادی کی رات تمہاری صورت دیکھنے سے پہلے ایک پرائز بانڈ دیا تھا۔"

سلمٰی نے کہا۔ "ہاں دیا تھا۔"

"وہ کہاں ہے؟"

سلمٰی سے پہلے سائرہ نے فوراً ہی کہا۔ "وہ تو ہم نے بیچ دیا۔"

وہ تڑپ کر بولا۔ "کہاں بیچ دیا؟ کیوں بیچ دیا؟"

"ہمیں رقم کی ضرورت تھی اس لئے بیچ دیا۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو!؟"

وہ اٹیچی کو ایک طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ "تمہاری جیسی جاہل عورتیں اور کیا کر سکتی ہیں۔ وہ پرائز بانڈ جسے فروخت کیا ہے اسے پانچ لاکھ مل چکے ہوں گے۔"

دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ غصے سے جا رہا تھا۔ سائرہ نے کہا۔

"ٹھہرو!"

اس نے رک کر انہیں دیکھا۔ سائرہ نے کہا۔ "میں مانتی ہوں کہ تم نے میری بہن کو طلاق نہیں دی ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

"کون کہتا ہے میں نے طلاق نہیں دی ہے۔ میں کل ہی طلاق نامہ بھیج دوں گا۔ اپنی بہن کو اپنے پاس ہی رکھو۔"

وہ پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا باہر چلا گیا۔ سلمٰی کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔

سائرہ نے اپنے گریبان سے پرائز بانڈ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "اس کمبخت کو اس کے نمبر یاد تھے۔ وہ پرائز لسٹ میں پانچ لاکھ کا انعام دیکھ کر پرانے عشق کی تجدید کر رہا تھا۔ اب ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔"

سلمٰی وہ بانڈ لے کر ہنسنے لگی۔ اسے تو اپنی توہین پر ہنسی آ رہی تھی کہ وہ کاغذ کے ایک ٹکڑے کے سامنے کچھ نہیں ہے۔ وہ ہنستے ہنستے بولی۔ "باجی! آپ نے بہت اچھا کیا کہ ایک شوہر نہیں پالا۔"

☆==========☆==========☆

ٹیلر ماسٹر عبدالمجید نے فرش پر گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ سامنے پلنگ پر بیٹھی ہوئی شمائلہ اس سے کہہ رہی تھی۔ "آپ فرش پر سے اٹھ جائیں۔ مجھے شرمندہ نہ کریں۔"

"شرمندہ تو میں ہوں۔ تمہاری محبت اور وفاداری کو نظر انداز کر کے سلمٰی کی چکا چوند میں گم ہو رہا تھا۔"

"میرا صبر کام آیا ہے۔ آپ کو اچھے برے کی تمیز ہو گئی' یہی میرے لئے بہت بڑا انعام ہے۔"

وہ فرش سے اٹھ کر بولا۔ "آئندہ کوئی مجھے سحر زدہ نہیں کر سکے گی۔ میں تمہارا ہوں' صرف تمہارا ہی رہوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ سر جھکا کر وہاں سے جانے لگا۔ شمائلہ سوچ رہی تھی کہ پچھتا رہا ہے اس لئے اس سے لپٹ کر پچھتاوے کے آنسو بہائے گا وہ دور ہی دور سے ندامت کا اظہار کر کے چلا گیا تھا۔ اس کے قریب نہیں آیا تھا جیسے بیچ میں اب بھی ان دیکھی دیوار موجود ہو۔

وہ بہت دیر تک سوچتی رہی۔ دل کو سمجھاتی رہی۔ اپنا مرد اپنا ہی ہوتا ہے۔ کھونٹے سے بندھے ہوئے بیل کی طرح رسے کی لمبائی تک دور بھاگتا ہے پھر رسے کے اختتام کا جھٹکا کھا کر کھونٹے کی طرف لوٹ آتا ہے۔

دل کو سمجھانے کے باوجود ایک بے اعتباری تھی' بے چینی سی تھی۔ یوں لگ رہا تھا' دوسری عورت اس کمرے میں ہے جہاں ماسٹر ابھی گیا تھا۔

جب قصہ ہی ختم ہو چکا تھا تو بھلا سلمٰی اس کے شوہر کے پاس کیوں آتی؟ لیکن بہت دھیمی دھیمی سی آواز آ رہی تھی۔ وہ کسی سے سرگوشی میں بول رہا تھا۔ وہ بول رہا تھا اور تجسّس بڑھ رہا تھا۔

وہ بستر پر اوندھی ہو گئی۔ وہاں سے کھسکتی ہوئی پلنگ کے سرے پر آئی پھر آہستہ آہستہ نیچے کی طرف لٹکتی ہوئی فرش پر پہنچ گئی۔ دونوں گھٹنے ٹیک کر آدھی کھڑی ہو گئی۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایک بستر پر بیٹی اور دوسرے بستر پر بیٹا سو ہا تھا۔ معذور ماں نے ممتا بھری نظروں سے انہیں دیکھا پھر گھٹنے ٹیکتی ہوئی کمرے سے باہر

آگئی۔

چند قدم کے فاصلے پر دوسرا کمرہ تھا لیکن وہ جیسے قدموں کے حساب سے نہیں معذوری کے حساب سے میلوں کا فاصلہ طے کر کے دوسرے دروازے تک پہنچی' وہ کھلا ہوا تھا۔ ماسٹر نے شاید اس لئے کھلا چھوڑ دیا تھا کہ اپاہج بیوی کبھی ادھر نہیں آسکتی تھی۔

وہ آگئی تھی۔ اس نے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ سلمیٰ موجود نہیں تھی مگر تھی۔ وہ کچھ بول رہا تھا اور ایسی گہری سانسیں لے رہا تھا جیسے اترن کی مہک کو اپنے اندر اتار رہا ہو۔

شمائلہ پہلے ہی آدھی تھی اور آدھی ہو کر فرش پر گرتے ہوئے چوکھٹ سے لگ گئی۔ یہ خیال پتھر کی لکیر بن گیا کہ جب تک شوہر سدا بہار رہے گا اسے کسی نہ کسی حسینہ کا پسینہ پکارتا رہے گا۔

==================

حیانامہ

حُسن و رعنائی کی پیکر ایک لڑکی جس کی زندگی جذبوں' خواہشوں اور بے شمار رنگین خوابوں سے عبارت تھی۔ اس کا حُسن جاں بہ لب مریضوں میں جینے کی اُمنگ پیدا کرتا تھا مگر اس کا اپنا وجود زخم زخم تھا۔ اُس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو ستائشی لفظوں کی گرمی اور پروانوں کے والہانہ انداز نے اسے شمع کی مانند پگھلا دیا۔ اُس پر وہ رازہائے دروں منکشف ہوگئے جنہیں جاننے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ سندر سپنوں سے بہلنے کی عمر میں ہی اس نے ان کی تعبیر پالینے کے لئے قدم آگے بڑھا دیئے اور خود کو لہولہان کرلیا۔

میں نے کبھی ایک کاکروچ یا چھپکلی نہیں ماری تھی۔ اس کے باوجود ایک بندہ مار چاہتی تھی۔

اُس بندے کا نام جواد فہمی تھا۔ وہ میری آنکھوں کی نیند تھا۔ اس امید پر سوتی تھ کہ میرے خوابوں میں آئے گا۔ وہ میری صبح کا آفتاب تھا۔ اسی کے نام سے میرا دن طلو ہوتا تھا' وہ میرا سکون تھا' میری شانتی تھا' میرا دل تھا' دماغ تھا اور میری جان تھا۔ اسی لۓ میں اِس کی جان لینا چاہتی تھی کہ وہ میری جان تھا اور مجھے اپنی جان لینے کا پورا پورا ح تھا۔

جب وہ پہلی بار بیمار ہو کر اسپتال آیا تو میں اسے دیکھتے ہی بیمار ہو گئی تھی۔ کیا غضب کی مردانہ وجاہت تھی' سیدھی گولی کی طرح لگتی تھی۔ میں ایک ڈاکٹر اور وارڈ بوائے کی مدد سے اسے قے کرا رہی تھی۔ اس کے اندر سے زہر نکال رہی تھی۔ کم بخت نے زہریلی شراب پی لی تھی۔ ایسے اور کئی شرابی اسپتال میں لائے گئے تھے جنہوں نے کم پی تھی اور جلد نارمل ہو گئے تھے' ان سے پولیس والے بیان لے رہے تھے۔ دوسری تمام نرسیں اِدھر اُدھر دوڑتی پھر رہی تھیں۔ ایک ایک متاثرہ شرابی کو اٹینڈ کر رہی تھیں۔ جہاں زیادہ ضرورت ہوتی تھی' وہاں پہنچ جاتی تھیں۔ ایک میں ہی تھی کہ جواد کے بستر سے چپک کر رہ گئی تھی۔

یہ بستر عورت کو پاگل کر دیتا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو شاید پھولوں کی پتیاں نہ ہوتیں' دلہن کا گھونگٹ نہ ہوتا' ہاتھوں میں مہندی اور مہندی میں ارمان نہ ہوتے لیکن یہ سب کچھ ہماری دنیا میں اور ہمارے دلوں میں ہے۔ اُس رات پہلی بار جواد کو دیکھ کر گمان ہوا کہ بستر کسی خواب گاہ میں نہیں ہوتا وہ عورت کے دل میں بچھا ہوتا ہے۔

اسے دیکھ کر یاد آیا کہ میں نے آج تک کوئی مراد نہیں مانگی ہے۔ کوئی منت نہیں مانی ہے۔ کبھی کسی مزار پر نہیں گئی ہوں اور تو اور بچپن میں پڑھی ہوئی نمازیں بھول گئی ہوں۔ یہ بھی یاد نہیں رہا ہے کہ کس وقت کی نماز میں کتنی رکعتیں ہوتی ہیں۔ یہ صرف میری ہی بات نہیں تھی' یہ دیکھنے اور سننے میں آیا ہے کہ لوگ بچپن کی نمازیں بڑھاپے

میں پڑھتے ہیں۔ بیچ میں جوانی کی پوجا پاٹ جاری رہتی ہے لیکن میں دین اور دین کے احکامات کو اس لئے بھولی ہوئی تھی کہ دل میں کوئی خوشی اور خواہش نہیں رہی تھی۔ میرے ماضی سے مستقبل تک گہرا سناٹا تھا۔ میں حیات کے ویرانے سے گھبرا کر بیماروں اور مجبوروں سے دل لگانے کے لئے نرس بن گئی تھی۔

یوں دل لگانے میں بڑی طمانیت تھی۔ بیماروں کی دعائیں ملتی تھیں لیکن جواد سے جو دل لگا تو اس کی نوعیت کچھ اور تھی' یکبارگی خدا یاد آیا۔ "یا خدا! اس کے اندر سے ساری زہریلی شراب نکال دے۔"

خدا کہتے وقت احساس ہوا کہ کئی صدیوں کے بعد اسے پکار رہی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میری کوئی ضرورت' کوئی آرزو تھی ہی نہیں' پھر اسے کیا پکارتی؟ پڑوسن نمک مانگتے وقت اور مریض دوا مانگتے وقت پکارتا ہے۔ دوا تو میں کر رہی تھی' دعا کے لئے معبود کو یاد کر رہی تھی۔

وارڈ بوائے نے اس کی شرٹ اتار دی تھی۔ اس کے تمام بدن پر گھنے بال تھے بالکل ریچھ لگتا تھا وہ۔ جھک کر قے کرتے وقت تکلیف سے جھٹکے کھاتا تھا۔ میں دونوں ہاتھوں سے سہارا دیتے وقت اس سے لگ جاتی تھی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ایک عجیب بے خودی سی تھی۔ وہ محض ایک مریض نہیں تھا' میری مرضی بھی تھا۔

اس کے اندر سے کھایا پیا سب نکل گیا۔ وہ نڈھال سا ہو کر بستر پر چاروں شانے چت ہو گیا' اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی' گہری گہری سانسیں لینے کے باعث چٹان جیسا بالوں بھرا سینہ بچھونے کی طرح پھیل رہا تھا۔ میں جھک کر اپنی ہتھیلی سے سینے کو سہلاتے ہوئے بولی۔ "حوصلہ کرو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمہارے پاس ہوں۔"

میں چاہتی تھی کہ اسے نقاہت اور نیم بے ہوشی کے وقت بھی میری موجودگی یاد رہے۔ میں نے پوچھا۔ "اپنا ایڈریس اور فون نمبر بتاؤ۔ میں تمہارے گھر والوں کو اطلاع دوں گی۔"

اس نے بڑی کمزوری سے آہستہ آہستہ آنکھوں کو ذرا سا کھول کر دیکھا۔ دیکھنے کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ میں اس کی نظروں میں دھندلا گئی ہوں' وہ دیکھ نہیں پا رہا ہے' پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر اسے چیک کر رہا تھا۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق اسے انجکشن لگایا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "سب کچھ تو نکل گیا ہے لیکن زہر پھر زہر ہوتا ہے کچھ تو اثر چھوڑے گا اگر رات گزار لے تو سمجھو خطرہ ٹل گیا ہے۔"

ہم مریضوں کی خدمت کرنے والی نرسیں رحم دل کم اور سنگدل زیادہ ہوتی ہیں۔ بیماروں کی تکلیفوں، آہوں اور کراہوں کا اثر نہیں لیتیں، میں اثر لے رہی تھی جیسے وہ برسوں سے میرا اپنا تھا اگر وہ صبح تک موت سے نہ لڑ سکا تو میں اتنی بڑی دنیا میں تنہا رہ جاؤں گی۔

میری ڈیوٹی کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ جولی ڈیوٹی کے لئے آئی۔ شاید میں پاگل ہو گئی تھی، وہ آئی تو یوں لگا سوکن آئی ہے۔ تمام رات اسی ایک بستر کی ہو رہے گی۔ ہماری ملازمت بھی کچھ ایسی ہی ہے، سالہا سال تک ہماری ڈیوٹی کا بستر وہی رہتا ہے۔ مریض بدلتے رہتے ہیں۔ اپنا شوہر بھی آئے تو دوسرے مرد کے لئے یہ بستر ہمارے پاس چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس رات، میں وہ بستر جولی کے لئے نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "آج چھٹی کر لو۔"

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "کیا ملازمت سے نکلواؤ گی؟"

"میں دشمن تو نہیں ہوں۔ تمہاری جگہ صبح تک رہوں گی۔"

اس نے جواد کی طرف دیکھا پھر مسکرا کر بولی۔ "ہینڈسم ہے۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا سر تھام کر اس کا منہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "ادھر مت دیکھو، نظر لگ جائے گی۔"

وہ ہنسنے لگی۔ "چلو ڈیوٹی شیٹ پر میرا نام کاٹ کر اپنا نام لکھو اور دستخط کرو۔"

میں نے ڈیوٹی بدلنے کے دستور کے مطابق شیٹ پر اس کی جگہ اپنا نام لکھا اسے مطمئن کر کے رخصت کیا پھر جواد کے پاس آئی۔ ان لمحات میں ایسی خوشی ہو رہی تھی جیسے ایک رات کے لئے اسے جیت لیا ہو۔

ایک خرابی یہ تھی کہ تمام شرابیوں کے ساتھ اسے بھی جنرل وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ آدھی رات کے بعد بھی کچھ مریض جاگ رہے تھے۔ میں جواد کو زیادہ اٹینڈ کرتی تو وہ کسی نہ کسی تکلیف کا اظہار کر کے مجھے اپنی طرف بلانے لگتے، ویسے یہ اچھا لگ رہا تھا۔ لو اسٹوریز کی طرح ہمارے درمیان سماج حائل ہو رہا تھا۔

وہ تمام رات گہری نیند میں رہا جو زہر اس کے اندر رہ گیا تھا اسے دواؤں نے اور میری دعاؤں نے بے اثر کر دیا۔ صبح اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے مجھے ہی دیکھا۔ اس کے دیکھنے سے خیال آیا کہ میں نے دکھانے کے لئے سنگار نہیں کیا ہے۔ جو صورت لے کر پیدا ہوئی تھی اسے پالش کئے بغیر سامنے آ گئی ہوں۔ تمام رات جاگنے کے باعث چہرے پر تازگی نہیں رہی تھی۔ کلی اپنی شاخ پر رات بھر جاگتی ہے، شبنم کے موتی چنتی ہے اور

صبح تازہ پھول بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس عورت کو رات بھر جگاؤ تو صبح رخسار پر تھکن سی آ جاتی ہے۔

وہ تھکے ہوئے انداز میں کمزوری سے مسکرایا پھر بولا۔ "تم وہی ہو نا؟"

"وہی؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "وہی کون؟"

"وہ جو رات کو بھی یہاں تھی۔ میں قے کر رہا تھا۔ زہر اگل رہا تھا تو وہ مجھے بانہوں میں سنبھال رہی تھی۔ میں بے ہوش ہو رہا تھا تو میرے کانوں میں رس گھولتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "حوصلہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمہارے پاس ہوں..........""

میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس نے بے ہوش ہوتے وقت ڈوبتی ہوئی سماعت میں میری باتیں سنی تھیں اور میرا ایک ایک لفظ یاد رکھا تھا۔ یہ میری رات بھر کی خدمت کا انعام تھا کہ اس نے پہلے ہی دن مجھے اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیا تھا۔

میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تعجب ہے۔ زندگی اور موت کی کشمکش میں بھی میرا چہرہ یاد رہا؟"

وہ بولا۔ "کوئی کوئی چہرہ ایسا ہوتا ہے جو دوا کا کام کرتا ہے اور زندگی و موت کی کشمکش میں موت کو پیچھے دھکیل دیتا ہے۔"

"کیا شراب پینا اچھی بات ہے؟"

"بات اچھی ہو یا بری، بس میں تو یہ جانتا ہوں کہ پینے کی قانونی اجازت ہے۔"

یہ 1970 کی بات ہے۔ اُن دنوں شراب نوشی اور اس کی خرید و فروخت پر پابندی بھی نہیں تھی۔ کراچی کی شاہراہوں اور بازاروں میں شراب کی دکانیں کھلی رہتی تھیں۔

میں نے کہا۔ "میڈیکل اسٹورز میں زہر بھی بکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ قانون زہر کھانے کی اجازت دیتا ہے۔"

"میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"کیا اکثر درد رہتا ہے؟"

"نہیں، جب کوئی بات میرے مزاج کے خلاف ہو تو سر بھاری ہو جاتا ہے۔"

اس نے یہ بات کہہ کر مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس کی باتیں اور اس کی عادتیں اٹل ہیں۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "وارڈ بوائے کو بھیج رہی ہوں۔ منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کرو۔ دوسری نرس کی ڈیوٹی شروع ہونے والی ہے۔ میری ڈیوٹی دوپہر ایک بجے سے ہے۔"

"میرے حساب سے تم نے ڈبل ڈیوٹی کی ہے۔ میرے لیے رات بھر جاگتی رہی ہو۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے۔"

اس بات نے مجھے پھر خوش کر دیا ورنہ یہ سن کر مایوسی ہوئی تھی کہ اپنے مزاج کے خلاف اس نے میری بات بھی برداشت نہیں کی تھی اور اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ میں نے ایک بجے آنے کا وعدہ کیا پھر اسپتال سے ملحق ہاسٹل کے کمرے میں آگئی۔ دروازہ بند کرکے بستر پر لیٹ گئی۔ رات کی نیند پوری کرنے کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔ بند آنکھیں بھی دیکھتی ہیں۔ میں نے دیکھا' اپنی ہتھیلی سے اس کے بالوں بھرے چٹانی سینے کو سہلا رہی ہوں۔ اوہ گاڈ! کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔ میں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے اندر بے چینی محسوس ہوئی' چین پانے کے لئے کروٹ لی اور پھر دوسری کروٹ لی۔ کبھی اوندھی ہوئی' کبھی سیدھی۔ بستر پر کبھی الٹ رہی تھی کبھی پلٹ رہی تھی۔

اس کی یادوں کی انگلیوں پر سکے کی طرح اچھل کر کبھی چاند ہو رہی تھی کبھی پھول۔

بالآخر پریشان ہو کر اٹھ بیٹھی۔ توبہ ہے۔ ساری رات جاگنے کے بعد بھی نیند نہیں آرہی تھی' وہ آرہا تھا اور جارہا تھا۔ میں ایک جوڑا اور تولیا صابن لے کر کمرے سے نکلی۔ کامن باتھ روم میں آکر شاور کو پوری طرح کھول دیا' اس کے نیچے بھیگنے لگی تو تھوڑی دیر میں سر ٹھنڈا ہوا۔ غسل سے فارغ ہو کر واپس بستر پر آئی پھر دو ایک کروٹیں بدلنے کے بعد ہی نیند آگئی۔

اُس نے دن کے گیارہ بجے جگا دیا۔ میں نے فوراً آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ نہیں تھا' کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ بند آنکھوں میں آنے والے کا راستہ بند دروازہ نہیں روک سکتا تھا۔ وہ جیسے کہہ رہا تھا۔ "اٹھو! کیا میرے پاس نہیں آنا ہے۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور تکئے کو سینے سے لگا کر کھینچ لیا۔ اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ تکیہ نامحرم نہیں تھا لیکن نرم تھا۔ دو کوڑی کا لگ رہا تھا۔ میں اسے ایک طرف پھینک کر واش روم میں چلی گئی۔ دانتوں کو ایک بار برش کیا لیکن چہرے کو دو بار صابن سے دھویا۔ اس کا خیال آرہا تھا کہ وہ دھلے ہوئے چہرے کی صباحت دیکھنے کے لیے بے چین ہو گا۔

وہاں جانے کے لیے اندر سے بڑی جلدی تھی مگر اوپر سے میں نے دیر کی۔ اتنی نفسیات تو جانتی ہوں کہ کسی کو انتظار میں تھکا مارو۔ اسے ذرا مایوس کرنے کے بعد ملو تو ملنے والی چھپے ہوئے خزانے کی طرح ہاتھ آئی ہوئی لگتی ہے۔ میرے اختیار میں ہوتا تو

بہترین لباس پہنتی اور چہرے کو میک اَپ سے چمکاتی لیکن نرسوں کو یہ اجازت نہیں ہے۔ میں نے ناشتا کرنے کے بعد وہی نرسنگ والا سفید لباس پہنا پھر ڈیوٹی کے وقت آدھا گھنٹہ لیٹ اسپتال پہنچی۔ انچارج نے ناراضگی دکھائی۔ میں نے اسے منالیا پھر جنرل وارڈ میں آئی تو ٹھٹک گئی' اس کا بستر خالی تھا۔

میں نے دور تک متلاشی نظروں سے دیکھا پھر وارڈ بوائے سے پوچھا۔ "یہ سات نمبر کا مریض کہاں ہے؟"

"وہ تو جاچکا ہے۔"

میں تیزی سے چلتی ہوئی انچارج کے پاس آئی۔ "کیا بیڈ نمبر سات کی چھٹی ہو گئی ہے؟"

"چھٹی نہیں ہوئی ہے۔ ہماری لاعلمی میں بھاگ گیا۔ انسپکٹر نے ہم سے کہا تھا کہ زہریلی شراب پینے والا کوئی مریض یہاں سے اجازت کے بغیر نہیں جائے گا۔ ہم نے تھانے میں رپورٹ کی ہے۔"

میں نے تھانے کا نمبر پوچھا پھر فون کیا۔ دوسری طرف انسپکٹر نے ریسیور اٹھایا' میں نے کہا۔ "میں عاصمہ بول رہی ہوں۔ سول اسپتال کی نرس ہوں۔ وہ ہمارے سات نمبر بیڈ کا مریض ...."

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "آئی سی' اس کے فرار ہونے کی رپورٹ مل گئی تھی لیکن وہ اسپتال سے سیدھا تھانے چلا آیا تھا۔ نہ آتا تو ہم اسے دن میں تارے دکھا دیتے۔"

"کیا وہ حوالات میں ہے؟"

"اوہ' نہیں بی بی! بڑا چنگا بندہ ہے۔ ہم نے تڑی دے کر چھوڑ دیا ہے۔"

"شکریہ' آپ بہت اچھے ہیں' کیا اس کا ایڈریس دے سکتے ہیں؟"

"ایڈریس؟ آپ کیوں پوچھ رہی ہو؟ اس سے کیا معاملہ ہے؟"

"اسپتال کے رجسٹر میں مریضوں کے نام اور پتے لکھے جاتے ہیں۔ کل اس کی حالت نازک تھی' آج وہ چلا گیا۔ رجسٹر کی خانہ پُری رہ گئی ہے۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "اوئے منشی شیدے! ادھر آؤ۔ بی بی کو جواد فہمی کا پتا نوٹ کراؤ۔"

تھوڑی دیر بعد منشی کی آواز آئی۔ اس نے جواد کے دو پتے نوٹ کرائے۔ ایک اس کی رہائش گاہ کا تھا اور دوسرا موٹر گیراج کا۔ پتا نوٹ کرنے کے بعد میرے اندر کی عورت نے کہا۔ "جو چلا گیا سو چلا گیا۔ جس نے جاتے وقت تجھے نہیں پوچھا تو اسے پوچھنے جائے

گی؟" واقعی اس کی بے مروتی سے دکھ پہنچا تھا۔ میں نے اس کے بستر سے لگ کر شام سے صبح کر دی تھی۔ بے حساب خدمت کے ساتھ بے پناہ محبت بھی دی' اس کے دل میں میرے لئے اپنایت نہ سہی انسانیت تو ہوتی۔ شکریہ ادا کر کے تو جا سکتا تھا لیکن وہ ایسے گیا جیسے میں صرف تنخواہ پانے والی نوکرانی تھی جس کا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا۔

اچھا لگتا ہے' اپنا مرد بے نیازی دکھائے۔ ہمیں دیکھے مگر کم کم دیکھے۔ ہم سے بولے مگر بولنے والی بات دبالے۔ ہم سے ملے اور ملتے ملتے جوئے شیر کے لئے فرہاد بن کر پہاڑ کاٹنے پر مجبور کر دے۔ دل میں رہے اور ڈھونڈنے کے لیے ہمیں انا کے خول سے نکال دے تو ایک دن ایسے مرد کو توڑ مروڑ کر اپنے پرس میں ڈال لینا اچھا لگتا ہے۔

میں نے سوچا تھا' ڈیوٹی کے بعد موٹر گیراج کی طرف جاؤں گی۔ اس کے گھر جانے میں قباحت تھی کہ اس کی گھر والی ہو سکتی تھی۔ اگرچہ میں جواد میں کسی کی حصے داری برداشت نہیں کر سکتی تھی لیکن مجھ سے پہلے کوئی موجود ہو گی تو اُس بے چاری کو برداشت کرنا ہو گا کیوں کہ میں اس کے آدمی پر شب خون مارنے والی تھی۔ دل میں چور تھا اس لیے میں نے اس کے گھر نہ جانے کا فیصلہ کیا۔

شام کو ڈیوٹی ختم کرنے سے پہلے اس کا فون آ گیا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر اپنا نام بتاتے ہی اس کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے آواز سے پہچان سکتی ہو تو پہچان لو ورنہ اجنبی سمجھا گیا تو فون بند کر دوں گا۔"

"فون بند کرو گے تو گھر آ جاؤں گی۔ تمہاری گھر والی پوچھے گی تو کہہ دوں گی تھانے سے ایڈریس لیا ہے۔"

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میری کوئی گھر والی نہیں ہے۔"

میں نے خوش ہو کر پوچھا۔ "دوسرے گھر والے تو ہیں؟"

"میں اتنی بڑی دنیا میں اکیلا آیا' اکیلا ہوں اور اکیلا جاؤں گا۔"

میں نے اور خوش ہو کر کہا۔ "اچھا کوئی لگام دینے والی نہیں ہے اس لیے خوب پیتے ہو؟"

"میں تھوڑی پیتا ہوں اور یہ کبھی نہیں چاہتا کہ میری زندگی میں بیوی نام کی کوئی چیز آئے۔"

میں بچی نہیں تھی' سمجھ رہی تھی کہ اس نے دوستی کے لیے فون کیا ہے اور بیوی نام کی چیز سے انکار کر کے دوستی کی نیت واضح کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا۔ "فون کس لیے کیا ہے؟"

"تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہی ہو؟"

"یہی سہی۔ تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں۔"

"تو پھر سنو تمہیں ایک بار دیکھا ہے' بار بار دیکھنے کی ہوس ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تم نے کبھی لوہے کا چنا چبایا ہے؟"

"چبانے کو ملا تو تخت یا تختہ ہو گا۔ دانت ٹوٹیں گے یا چنا پسے گا۔ آزمائش شرط ہے۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ مانتی ہوں کہ دیکھنے میں ہی زبردست دکھائی دیتا تھا ایسی بھاری بھرکم آواز تھی کہ دل میں بجتی تھی۔ میں جیسا ساتھی چاہتی تھی وہ اس سے بھی سوا تھا۔ میں نے ریسیور رکھ کر رابطہ توڑا تھا ناتا نہیں توڑا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ اب ذرا انتظار کر کے دیکھنا چاہتی تھی کہ اسے میری کتنی ضرورت ہے۔ میں اپنے بالوں میں پھول لگاتی ہوں لیکن کاغذ نہیں لگاتی۔

دوسرے دن ڈیوٹی کے وقت پھر اس نے فون کیا اور پوچھا۔ "کیا ناراض ہو؟"

میں نے کہا۔ "کل فون پر بول رہے تھے اس کے باوجود تمہارے منہ سے بدنیتی کی بساند آ رہی تھی۔"

"جسے تم بدنیتی کہتی ہو' اسے میں صاف گوئی کہتا ہوں اگر میں جھوٹ بولتا' ایک عاشق بن کر فریب دیتا تو تم ہواؤں میں اڑتیں اور بہاروں کے جھولے میں جھولتے جھولتے ایک دن سچائی کا زخم کھا کر اوندھے منہ گر پڑتیں۔ میں نہیں جانتا کہ تم بھی مرد کے دیئے ہوئے خوابوں سے بہلنے والیوں میں سے ہو۔"

"مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم فریبی نہیں ہو' سچ بولتے ہو لیکن گناہ کی زبان سے نکلا ہوا سچ مشکوک ہوتا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "اسی بات کو الٹ کر بولو کہ سچ کی زبان سے نکلا ہوا ذکرِ گناہ کبھی عملی نہیں ہوتا۔ یہ بات فون پر سمجھ میں نہ آئے تو اسپتال سے باہر ملو۔"

میں خاموش رہی۔ فوراً ہاں کہہ کر سر پر چڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ "میری گھڑی میں سات بجنے میں تیس منٹ باقی ہیں۔ میں ٹھیک سات بجے اسپتال کے گیٹ پر سفید کار میں آؤں گا۔"

میں کچھ نہ بولی۔ اس نے منت کی۔ "کچھ بولو۔"

اسے خود پر اعتماد نہیں تھا کہ اس کی آواز پر دوڑی چلی آؤں گی۔ اتنا تو سمجھنا چاہیے تھا کہ عورت پہلی بار خاموشی سے ان سنی ہاں کہتی ہے۔ وہ بہرا نہ سن رہا تھا' نہ سمجھ رہا

تھا۔

اس نے پھر پوچھنے کے انداز میں کہا۔ "تو پھر میں آ رہا ہوں۔"

ایک خیال سا آیا کہ کبوتر اُڑ نہ جائے۔ میں نے منہ ریسیور کے ماؤتھ پیس کے اور قریب کیا۔ "ہاں" تو نہیں کہا۔ "ہا" کی آواز نکالتے ہوئے لمبی سانس چھوڑ دی۔

وہ ٹھیک سات بجے آ گیا۔ میں نے اس کی کار دیکھی۔ اس نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "یہ میری نہیں ہے۔ تم سے جھوٹ بولتے ہوئے گرفتاری کا خوف آتا ہے۔ لٰہذا یہ بتا دوں کہ یہ ایک کسٹمر کی کار ہے۔ مرمت کے لیے گیراج میں آئی ہے۔"

میں بیٹھ گئی۔ وہ کار کے سامنے سے گھوم کر اسٹیئرنگ پر آیا' کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "کار بے شک دوسرے کی ہے لیکن پٹرول میرے پیسے کا ہے۔ یہ گاہک سے بے ایمانی اس لیے نہیں کہلائے گی کہ مرمت کے بعد اس کی ٹیسٹنگ ہو رہی ہے۔"

"تم موٹر مکینک ہو؟"

"ہاں' اے ون مستری ہوں مگر ہمارے ملک میں کاریگروں کی قدر نہیں ہے۔ میں مڈل ایسٹ جانے کی کوشش میں ہوں' چانس لگ گیا تو ہزاروں روپے کماؤں گا۔"

"مڈل ایسٹ کہاں جاؤ گے۔"

"کہیں بھی' سعودی عرب' عراق' مسقط' بحرین جہاں چانس ملے گا نکل جاؤں گا۔"

"چانس تو مجھے ملتا رہتا ہے' جہاں چاہوں جا سکتی ہوں۔"

"ہاں' عورت تو دنیا کے ہر ملک میں کیش ہو جاتی ہے۔ مرد کو پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ بائی دی وے' تم باہر کیوں نہیں جاتیں؟ مال کمانے کا شوق نہیں ہے؟"

"کس کے لیے کماؤں؟ کس کے لیے بچاؤں؟ میرا کوئی نہیں ہے۔ اکیلی جان کے لیے یہاں کی تنخواہ بہت ہے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ پیسہ بھی کبھی بہت ہوتا ہے؟ جتنا کماؤ اتنا کم ہوتا ہے۔ آج تمہارا کوئی نہیں ہے۔ کل تو ہو سکتا ہے۔ کل کوئی تمہارا ہو گا اور کمانے کے مواقع نکل جائیں گے تو پھر اپنے لیے اس کے لیے اور اپنے..........اپنے .... بچوں کے لیے کچھ نہیں کر سکو گی۔"

"میں تو اتنی دور تک نہیں سوچ رہی تھی۔"

اس نے سڑک کے کنارے گاڑی روک کر میری طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ دوسری ملاقات میں بات اتنی دور تک پہنچ سکتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کتنی دور؟"

"پہلے یہ بتاؤ' کیا واقعی تمہارے باہر جانے کا چانس ہے؟"

"میں دو بار باہر کی آفر کو ٹھکرا چکی ہوں؟"

"وعدہ کرو۔ اب کوئی آفر آئے گی تو قبول کرو گی اور مجھے بھی قبول کرو تو ہم ایک دوسرے کے تعاون سے اپنی ایک نئی دنیا آباد کریں گے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیسا تعاون؟"

"اگر تمہیں باہر جانے کا موقع ملے گا تو میں شوہر کی حیثیت سے تمہارے ساتھ جا سکوں گا۔"

"شوہر؟" میں نے سانس کھینچ کر اسے دیکھا جیسے اپنے اندر اسے کھینچ لیا ہو۔ وہ میرے دل کی بات بول رہا تھا مگر بڑی جلدی بول رہا تھا۔ نہ عشق و محبت' نہ جدائی' نہ انتظار' نہ ایک دوسرے کے لیے کوئی تڑپ' کوئی بے چینی' سیدھا شادی کے بستر پر دندناتا چلا آ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "عجیب آدمی ہو۔ میں تمہیں نہیں جانتی' تم مجھے نہیں جانتے اور کچھ جانے بوجھے بغیر.........."

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "جاننا کیا ہے' تم بھی دنیا میں اکیلی ہو میں بھی اکیلا ہوں۔"

"پہلے اکیلی نہیں تھی۔ دو شادیاں کر چکی ہوں۔ دو طلاقیں لے چکی ہوں۔ دونوں شوہروں سے دو بچے تھے۔ جنہیں وہ اپنے ساتھ لے گئے' اب بولو۔"

"آں؟" وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیوں مذاق کرتی ہو۔ تمہارے وجود کی تازگی بتا رہی ہے کہ ایک بھی شادی نہیں ہوئی اور تم دو شادیاں میرے حلق سے اتار رہی ہو۔"

"تم یقین نہ کرو' تب بھی یہی حقیقت رہے گی۔"

وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ بڑی سستی سے کار اسٹارٹ کی پھر اتنی آہستگی سے آگے بڑھایا جیسے کار ڈرائیو نہ کر رہا ہو' زندگی کی گاڑی دھکیل رہا ہو۔ ہمارے درمیان کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ بولا۔ "میرا دل نہیں مان رہا ہے مگر ایسی عورتیں بھی دیکھی ہیں جو چھ بچے پیدا کر کے بھی صحت مند اور تر و تازہ دکھائی دیتی ہیں۔"

میں خاموش رہی۔ اس نے جواب مانگنے والی کوئی بات نہیں کی تھی۔ ابھی وہ اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ اسے کشمکش میں دیکھ کر مزہ آ رہا تھا۔ آخر میری ہی ذات کے لیے کشمکش میں تھا۔ ابھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس حد تک میرا طالب ہے۔ کیا دو شوہروں

کی بیوی اور دو بچوں کی ماں کو گلے لگانے کا حوصلہ رکھتا ہے؟

یہی معلوم کرنے کی گھڑی تھی کہ مرد عورت کی محبت روحانی ہوتی ہے یا جسمانی۔ میں عورت کی حیثیت سے کہتی ہوں کہ اس کی بھرپور مردانہ شخصیت پر مرمٹی تھی۔ میں نے اسے الجھانے کے لیے جھوٹ کہا تھا۔ نہ میرا کوئی شوہر تھا نہ کوئی بچہ' اگر وہ ایک بار کہہ دیتا کہ تمہارے جسم سے زیادہ تمہاری ذات اور تمہارے کردار سے پیار کرتا ہوں تو میں اس کے پاؤں کی دھول بن جاتی لیکن وہ بدستور کشمکش میں تھا۔

اس نے پوچھا۔ "یہ ایک نہیں دو دو شوہروں سے طلاقیں کیسے ہو گئیں؟ کسی ایک سے بھی نباہ نہ ہو سکا؟"

"میں نرس ہوں۔ زخموں کی مرہم پٹی کرتی ہوں۔ نہ اپنے' نہ کسی کے زخم کو کریدتی ہوں۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ نئی بات کرو۔"

"یہی میں کہنے والا تھا۔ جو ہو گیا اسے بھول جانا چاہیے۔ آئندہ شادی کا خیال دل سے نکال دو۔"

یہ بات میری توقع کے خلاف تھی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ "بار بار شادیاں کرنے والی عورت الیزبتھ ٹیلر بن جاتی ہے۔ یکے بعد دیگرے اس کی زندگی میں آنے والے شوہر اس پر بھروسا نہیں کرتے۔ وہ دنیا والوں میں معتبر نہیں رہتی۔ ایسی عورت کو چاہیے کہ خود اعتمادی سے کسی اور کو شوہر نہیں' صرف دوست بنا کر زندگی گزارے۔"

میں نے پوچھا۔ "اگر دوستی اس کے مزاج کے خلاف ہو تو؟"

"تو وہ شادیاں کرنے والی کبھی یقین سے نہیں کہہ سکے گی کہ اسے کاندھا دینے والے آخری شوہر کا نمبر شمار کیا ہو گا؟"

مجھے اس کی بات بری نہیں لگی کیونکہ میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا' ہاں یہ دکھ دینے والی بات تھی کہ وہ مجھے شادی سے منع کر کے اپنا دامن بچا رہا تھا۔

"میں ایک معقول مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ اس پر غور کرو گی اور عمل کرو گی تو ہم ایک دوسرے کے تعاون سے خوب دولت کمائیں گے۔"

"تم مجھے شادی کے لیے منع کر رہے ہو پھر ہم ایک دوسرے سے تعاون کس طرح کریں گے؟"

"دوست بن کر۔ تمہارے ساتھ یہ سہولت ہے کہ تم باہر جا سکتی ہو۔ میں اس سلسلے میں ناکام رہا ہوں اگر ایک جعلی نکاح نامے کے مطابق تم مجھے اپنا شوہر بنا کر لے جاؤ گی تو

وہاں مجھ جیسے مکینک کی چاندی ہو جائے گی۔ مجھے کسی بھی گیراج یا موٹر کمپنی میں ملازمت مل جائے گی۔ کسی بھی پروجیکٹ میں گاڑیوں کا ڈرائیور بن سکتا ہوں۔"

وہ بول رہا تھا اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھ پر تھوک رہا ہو۔ میری ذات کی نفی کر رہا ہو۔ مجھے ایک فاضل پرزہ بنا کر اپنی زندگی کی گاڑی میں لگا رہا ہو۔ وہ جعلی نکاح نامے کا مشورہ دے رہا تھا۔ جھوٹے منہ سے یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ میں تمہارا تیسرا شوہر بنوں گا۔ تمہیں ایک مرد کا پیار دوں گا لیکن وہ مجھے باہر جانے کا پاسپورٹ بنا رہا تھا۔

مجھے اپنی توہین پر غصہ آ رہا تھا۔ میں دانت پر دانت جمائے .... ہونٹوں کو سختی سے بھینچے ہوئے برداشت کر رہی تھی۔ عورت کے پاس ایک دل ہوتا ہے کسی ایک کو چاہنے کے لیے' ایک بدن کا حسن ہوتا ہے کسی ایک کو دینے کے لیے اگر وہ مجھے چھین جھپٹ لیتا تو غصہ نہ آتا کیونکہ یہ بدن اسی کے لیے تھا۔ وہ میری بوٹی بوٹی کر سکتا تھا مگر توہین کر رہا تھا کہ مجھے طلب نہیں کر رہا تھا۔ میرے حوالے سے ملنے والے ریال اور درہم مانگ رہا تھا۔ میرا گھر نہیں بسا رہا تھا' میرا جعلی گھر والا بن کر اپنا گھر اور بینک بیلنس بنانا چاہتا تھا۔ ہماری دنیا میں ایسے بہت سے ہوں گے لیکن میں زندگی میں پہلی بار ایسا خود غرض اور مطلب پرست دیکھ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "ہم جعلی نکاح نامے کے ذریعے میاں بیوی بن کر رہیں گے تو گھر کے اندر اور باہر اور ملک کے اندر اور باہر میاں بیوی کہلائیں گے جب سماجی اور دنیاوی طور پر ہر جگہ ایک ہی رشتہ قائم رکھیں گے تو پھر ایسا قانونی طور پر کیوں نہ ہو؟"

"وہ بولا۔ "قانونی طور پر ہمیں پھر ازدواجی تعلق قائم کرنا پڑے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھ سے بھی کوئی بچہ ہو اور تم مجھ سے بھی طلاق لو۔"

"اگر ہم مذہب اور قانون کے مطابق نکاح کر لیں اور آپس میں یہ معاہدہ کر لیں کہ ہمارے درمیان میاں بیوی والے تعلقات نہیں ہوں گے' تم بیوی کے بند کمرے میں نہیں آؤ گے تو مجھ جیسی دو بچوں کی ماں سے دور رہنے کی خواہش پوری ہو جائے گی۔"

"جب ہم تنہائی میں میاں بیوی نہیں رہیں گے تو نکاح پڑھوانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"نکاح کے بعد میرا ضمیر یہ تو نہیں کہے گا کہ میں تمہاری داشتہ بن کر یہاں سے دوسرے ملک جا رہی ہوں۔ نکاح ایک آنچل ہے جو عورت کو حیا والی اور عزت دار ثابت کرتا ہے۔ نکاح ایک ڈھال ہے۔ اس کے آگے کوئی دوسرا اپنا حق جتانے نہیں آتا۔ نکاح اس سچائی کا سرٹیفکیٹ ہے کہ عورت ایک خدا کی بندی اور ایک مجازی خدا کی باندی ہے

اگر تم مجھے بیساکھی بنانا چاہتے ہو تو شریعت کے مطابق نکاح ہو گا پھر ملک سے باہر جانے کی بات ہو گی۔"

"اگر نکاح ہو جائے اور باہر تمہیں ملازمت نہ ملے تو؟"

اس سوال کے پیچھے اس کی خود غرضی چھپی ہوئی تھی۔ مجھے بہت دکھ پہنچا پھر بھی میں نے فراخدلی سے مسکرا کر کہا۔ "میرے لیے عراق میں ملازمت رکھی ہوئی ہے۔ میرے انکار کے باوجود ریکروٹنگ ایجنٹ نے میرا سروس ریکارڈ دیکھ کر ہیڈ نرس بننے کی آفر دی ہے۔ بصرہ میں ایک نیا اسپتال قائم ہو رہا ہے' وہ چھ ماہ تک مکمل ہو گا۔ ایجنٹ نے مجھے سوچنے اور فیصلہ کرنے کا موقع دیا ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "تنخواہ کیا بتائی ہے؟"

"ماہانہ بارہ ہزار روپے۔"

اس کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ اُن دنوں بارہ ہزار کی رقم اتنی بڑی تھی کہ متوسط طبقے میں ایک عورت کی اتنی زیادہ تنخواہ کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ فوراً ہی کار ایک طرف روکتے ہوئے بولا۔ "تم بے وقوف ہو۔ پاگل ہو۔ اتنی بڑی رقم کو کچرا سمجھ کر لینے سے انکار کر رہی ہو۔"

"اب انکار نہیں کروں گی۔ کل ایجنٹ سے بات کروں گی۔ تم اپنی بات کرو۔"

"میں تو حکم کا بندہ ہوں جو کہو گی وہ کروں گا۔"

"میں جلد ہی تمہیں بصرہ اسپتال کا اپائنٹمنٹ لیٹر دکھاؤں گی۔ اس کے دوسرے دن ہماری شادی ہو گی اور شادی سے پہلے ایک تحریری معاہدہ ہو گا۔"

"مجھے منظور ہے۔ یہ لو تمہارا ہاسٹل آ گیا۔"

اس نے اسپتال کے پیچھے ہاسٹل کے قریب کار روک دی' اگر میں دو بچوں کی ماں نہ ہوتی تو اتنی جلدی ہاسٹل نہ آتا۔ پتا نہیں مجھے کہاں کہاں لیے گھومتا رہتا۔ رات کے دس بجنے والے تھے۔ میں نے کہا۔ "تم نے تو نہیں پوچھا۔ میں پوچھ رہی ہوں کھانا کس ہوٹل میں کھاؤ گے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "شرمندہ نہ کرو۔ یہ تو مجھے پوچھنا چاہئے۔ بات یہ ہے کہ حوالات سے نکلنے کے لیے کل تھانے والوں کو ایک ہزار روپے دیئے۔ جیب خالی ہو گئی۔ ایک دوست سے ادھار لے کر گاڑی کی ٹنکی فل کرائی ہے۔"

"اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے؟ حالات تمہارے موافق نہیں ہیں۔"

میں نے پرس کھول کر پچاس پچاس کے نوٹ نکالے۔ وہ چور نظروں سے دیکھنے لگا۔

میں نے پرس میں لگے ہوئے آئینے میں اسے دیکھا۔ پھر دس نوٹ گن کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ پانچ سو رکھو۔"

"یہ......... تم مجھے کیوں دے رہی ہو؟"

"تمہاری جیب خالی ہے۔ مجھے روٹی کیسے کھلاؤ گے؟"

"ہاں مگر یوں تم سے رقم لینا اچھا نہیں لگتا ہے۔"

"ٹھیک ہے نہ لو۔ آنکھیں ذرا بند کرو۔"

"کیوں؟"

"میں کہتی ہوں بند کرو۔"

اس نے بند کر لیں۔ میں نے وہ تمام نوٹ اس کی اوپری جیب میں ٹھونس دیئے اس نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔ "یہ کیا؟"

"تم لینا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے میں نے تمہیں ہاتھ پھیلانے نہیں دیا۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم بہت چالاک ہو۔ مجھے لاجواب کر دیا ہے۔"

اُس نے بندو خاں کے کباب کھلائے۔ کئی بار جتایا کہ وہ رقم قرض ہے وہ اسے جلد ہی لوٹا دے گا لیکن وہ پانچ سو آج تک نہیں لوٹائے۔ میں دوسرے دن ریکروٹنگ ایجنٹ شمشاد بھائی کے پاس گئی۔ اسے سب شمشاد بھائی کہتے تھے۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "کیوں میرا دھندا چوپٹ کر رہی ہو؟ تمہارے انکار کے بعد دو تجربہ کار نرسوں کو لے کر گیا۔ شیخ نے دونوں کو ریجیکٹ کر دیا۔ وہ اپنے اسپتال کے لیے جوان اور مستعد لڑکیاں چاہتا ہے اگر کوئی دوسرا ایجنٹ اس کا ڈیمانڈ پورا کرے گا تو مجھے یہ آفس بند کرنا پڑے گا۔"

میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "شیخ کہاں ہے؟"

"ہوٹل انٹرکان میں ہے۔"

"ریسیور اٹھاؤ' نمبر ملاؤ اور اس سے ٹائم لو۔ میں جانے کو تیار ہوں اور ہمارے اسپتال کی تین نرسیں بھی جانا چاہتی ہیں......... میری وجہ سے وہ بھی نہیں جا رہی تھیں۔ اب خوشخبری سناؤں گی تو وہ دوڑی چلی آئیں گی۔"

اس نے رابطہ کیا۔ اسے بتایا کہ چار خوبصورت اور جوان لڑکیاں انٹرویو کے لیے تیار ہیں۔ شیخ نے شام سات بجے ہوٹل میں آنے کو کہا ہے۔ میں نے فون کے ذریعے سہیلیوں سے پوچھا۔ "کیا چند ماہ بعد بصرہ جانے اور دولت کمانے کا ارادہ ہے؟"

وہ تو پہلے ہی راضی تھیں۔ شام سات بجے ہوٹل میں آنے کے لیے تیار ہو گئیں۔ اپنی آپ بیتی کے اس موڑ پر لازمی ہو گیا ہے کہ میں اپنے کردار کا ایک مختصر سا خاکہ پیش

کردوں۔ میں آسمان سے نہیں ٹپکی تھی۔ مجھے کسی ماں نے پیدا کیا تھا اور میرا باپ بھی تھا۔ بہن بھائی بھی تھے۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے میرا تعلق ہے۔

کیا نام بتاؤں اپنے عزت دار والدین کا اور پیارے شہر کا؟ مجھے اپنے شہر سے اور اپنے عزیزوں سے اتنی محبت ہے کہ میں نام بتا کر ان اجالوں پر دھبے نہیں ڈالوں گی۔ جب سے بولنے اور سمجھنے کے قابل ہوئی ہوں' اپنے حسن کی تعریفیں سنتی آئی ہوں۔ گھر میں آنے والی محلے کی عورتیں اور بیٹھک میں حقہ پینے والے مرد مجھے گود میں بٹھا کر کہتے تھے۔ چاند کا ٹکڑا ہے۔ اللہ میاں نے خاص اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ دوسرے بھائی بہنوں کے مقابلے میں میری پذیرائی زیادہ ہوتی تھی۔ اسکول میں لڑکیاں مجھے سہیلی بنانے میں پہل کرتی تھیں' جب چودہ برس کی ہوئی تب اسکول آتے جاتے اپنے بدن پر پرائی نگاہوں کی آنچ محسوس کرنے لگی۔ آج میں یقین سے کہتی ہوں کہ لڑکیاں جوانی میں جوان نہیں ہوتیں۔ انہیں بچپن ہی سے مردانہ گود میں بٹھا کر' چوم کر' ہر روز' ہر ماہ' ہر سال انہیں نگاہوں سے گرماتے گرماتے ان کی معصومیت کو زخمی کیا جاتا ہے اور وقت سے پہلے انہیں مردوں کو دیکھنے سمجھنے کی مجرمانہ ہوشیاری دی جاتی ہے۔

پندرہ برس کی عمر میں ایک نوجوان میرے پیچھے پڑ گیا۔ میں نے برا نہیں مانا۔ اس وقت تک یہ سبق یاد ہو گیا تھا کہ آہیں بھرنے' اشارے کرنے اور تعاقب کرنے کا مطلب ہے حسن کی پذیرائی اور میرے غیر معمولی ہونے کا اعتراف۔ میں مغرور ہو گئی تھی' کسی سے بولتی نہیں تھی۔ کسی کا اشارہ ناگوار ہوتا تو ایک طرف تھوک کر چلی جاتی تھی۔ مجھے پہلی بار بالا اچھا لگا تھا۔ نام اقبال تھا مگر سب اسے بالا کہتے تھے' بالکل فلمی ہیرو سا لگتا تھا۔ اسکول سے گھر تک پیچھا کرتے ہوئے کہتا تھا۔ "چل لاہور بھاگ چلتے ہیں' مجھے ہیرو اور تجھے ہیروئن کا چانس ضرور ملے گا۔"

"چل جا' بڑا آیا بھگا کر لے جانے والا۔ ابا نے سن لیا تو جوتے مار مار کر تیرا سر گنجا کر دیں گے۔"

ایک دوپہر اسکول سے آتے وقت اس نے ایک کتاب دی اور کہا۔ "گھر والوں سے چھپا کر پڑھنا بڑی دھانسو کتاب ہے۔ پڑھے گی تو آخر تک پڑھتی ہی رہ جائے گی۔"

میں نے گھر آ کر ایک کمرے میں چھپ کر پڑھا تو بدن گرم ہو گیا۔ شام کو بخار تیز ہو گیا۔ امی نے پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹی رکھی۔ ابا نے ڈاکٹر کو بلایا۔ دوائیں دی گئیں۔ میری نظر اتاری گئی۔ یہ سب ہی کی متفقہ رائے تھی کہ میرے حسن کو نظر لگ جایا کرتی ہے۔ بعد میں بالے نے میری نظر اتار کر رکھ دی۔ ایسا کب ہوا؟ کیسے ہوا' یہ قصہ طولانی ہے۔ ہمارے معاشرے میں پہرے بٹھائے جاتے ہیں۔ دیواریں کھڑی کی جاتی ہیں لیکن ان دیواروں میں گناہوں کے دروازے بنتے رہتے ہیں۔ میں تو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ بچپن میں میرے ذہن کو اور میرے احساسات کو کس طرح آلودہ کیا گیا تھا۔ میں تہذیبی کتابیں پڑھنے جاتی تھی' میرے ہاتھوں میں شیطانی کتاب تھما دی گئی۔ بھٹکنے کی ایک عمر ہوتی ہے۔ میں عمر سے پہلے بھٹک گی۔ بالے نے مجھے اپنا عادی بنا دیا تھا۔ میں اسے مانگتی تھی۔ وہ ہمیشہ نہیں ملتا تھا۔ اسے ہمیشہ پانے کے لئے اس کے ساتھ گھر سے بھاگ کر لاہور آ گئی۔

بالا کئی بار لاہور آ چکا تھا۔ فلم والوں سے اس کی اچھی دوستی تھی۔ وہ مجھے ایک دوست کے گھر لے گیا۔ دوست کے پاس بھی ایکسٹرا رول کرنے والی ایک عورت تھی۔ عجیب گندہ سا ماحول تھا۔ میں وہاں ایک منٹ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ بالے نے کہا۔ آج کی رات گزارہ کر لو' کل ہم دوسرا مکان کرائے پر حاصل کر لیں گے۔

میں بالے کے بہکانے پر دو ہزار نقد اور ہزاروں روپے کے زیورات گھر سے چرا کر لائی تھی۔ ایک تو مجھے اپنے حسن و شباب پر ناز تھا اس پر بالا ڈینگیں مارتا تھا کہ میں ایک بار اسکرین پر آ جاؤں گی تو صبیحہ اور مسرت نذیر کی چھٹی ہو جائے گی۔ جو نقدی اور زیورات لائی ہوں اس سے زیادہ دولت کما کر گھر والوں کو دوں گی۔ ایک شام وہ مجھے لکشمی چوک لے کر آیا۔ وہاں ہر طرف سینما ہال نظر آ رہے تھے۔ جہاں نظر اٹھا کر دیکھو فلمی پوسٹر اور اداکاراؤں کی بڑی بڑی تصویریں دکھائی دیتی تھیں۔ مجھے ایک تنگ سی گلی کے ایک فلمی دفتر میں لے آیا۔ وہاں فلم پروڈیوسر' ڈائریکٹر اور نہ جانے کون کون بیٹھے ہوئے تھے۔ دو چار لڑکیاں بھی تھیں۔ شراب کی بوتل سے صرف پروڈیوسر اور ڈائریکٹر پی رہے تھے۔ باقی چمچے ان کی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔

میں سر جھکائے ہوئے تھی مگر محسوس کر رہی تھی کہ ساری نظریں مجھ پر جمی ہوئی ہیں۔ پروڈیوسر نے کہا۔ "بالے! اتنے دن کہاں غائب رہا؟"

بالے نے کہا۔ "آپ کا خادم ہوں جناب! دیکھیں کیا چیز لایا ہوں۔ پورے لاہور میں ڈھونڈ لیں ایسا ایک پیس بھی نہیں ملے گا۔"

"مانتے ہیں بھئی' مانتے ہیں۔ جب بھی لاتے ہو ہیرا ڈھونڈ کر لاتے ہو۔ یہ کچھ بولتی بھی ہے یا نہیں؟ نام کیا ہے؟"

بالے نے مجھے کہا۔ "نام بتا۔ کچھ باتیں کر۔ نہیں تو گونگی سمجھیں گے۔"

میں نے سر اٹھا کر کہا۔ "میرا نام عاصمہ ہے۔"

"ڈائریکٹر نے پوچھا۔ "کچھ ایکٹنگ شیکٹنگ آتی ہے۔ ذرا چل کر دکھاؤ۔"

میں نے انکار کے انداز میں بالے کو دیکھا' وہ بولا۔ "شاہ جی! ابھی نئی ہے' سب کے سامنے شرماتی ہے۔"

پروڈیوسر نے دوسروں سے کہا۔ "تم لوگ جاؤ۔ کل اسٹوڈیو آ جانا۔"

وہ ایک ایک کر کے وہاں سے چلے گئے۔ صرف پروڈیوسر اور ڈائریکٹر رہ گئے۔ ڈائریکٹر نے کہا۔ "بالے! ذرا لپک کے جا' دو سوڈے کی بوتلیں لے کر آ۔"

"ابھی لایا شاہ جی۔"

وہ جانے لگا تو میں نے اس کی قمیض کا دامن پکڑ لیا۔ اس نے کہا۔ "کیا کرتی ہو۔ ہم بادشاہ لوگوں کی خدمت نہیں کریں گے تو فلم میں چانس نہیں ملے گا۔ میں ابھی گیا' ابھی آیا۔"

وہ چلا گیا۔ ڈائریکٹر نے کہا۔ "شرماؤ گی تو ایکٹنگ کیسے کرو گی؟ اٹھو' کھڑی ہو جاؤ۔"

میں کرسی پر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ میرے پاس آیا۔ میری کمر میں ہاتھ ڈال کر بولا۔ "ایکٹنگ کرو۔ سینے نال لگ کر محبت سے مسکراؤ۔"

میں دور ہٹ گئی۔ پروڈیوسر نے کہا۔ "شاہ جی! پہلے اسکرین ٹیسٹ لے لو۔ جاؤ اسٹل فوٹوگرافر کو لے آؤ۔"

ڈائریکٹر حکم کی تعمیل کے لیے چلا گیا۔ پروڈیوسر نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا اور میرے حسن و شباب کے گن گانے لگا' اِدھر اُدھر سے پکڑنے لگا۔ میں نے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا حرکتیں ہیں' مجھے جانے دو۔"

"فلموں میں کام کرنے کے لیے پہلے شرما شرمی دور کرنا ضروری ہے۔"

"مجھے نہیں کام کرنا ہے فلموں میں۔"

"تو پھر کیا کرو گی۔ نقدی زیورات چرانے کے جرم میں جیل میں چلی جاؤ گی۔"

میں نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ "بالے نے تمہاری پوری ہسٹری بتا دی ہے۔ اب ذرا سوچو پولیس انکوائری ہو گی۔ پکڑی جاؤ گی تو بالے کے ساتھ تمہاری تصویریں اخبارات میں شائع ہوں گی۔ تمہارے ماں باپ شرم سے مر جائیں گے اور جیل میں تمہاری جوانی کا جو حشر ہو گا اسے یاد کر کے ساری زندگی روتی رہو گی۔ کیوں دس ہاتھوں میں جانا چاہتی ہو۔ اسی ایک شریف آدمی کے پاس رہو۔"

میں نے بے بسی سے دروازے کی طرف دیکھا جیسے بالا ابھی آ کر لے جائے گا لیکن اندر چٹخنی لگی ہوئی تھی اور وہ دلال سوڈا لانے کے بہانے بلبل کو صیاد کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ بچپن میں............ حسن معصوم تھا اس لئے صرف تعریفیں ملتی

تھیں۔ جوانی میں یہ حسن و شباب دو دھاری خنجر بن گیا ہے اس لیے محض تعریفیں نہیں کالے پیلے سڑے گلے عیاشوں کا عذاب بھی نازل ہو رہا تھا۔

میں نے بعد میں بالے سے جھگڑا کیا۔ اسے گالیاں دیں لیکن ایسا کرنے سے ماں کی چادر سر پر نہیں آ سکتی تھی۔ وہ چار دیواری نہیں مل سکتی تھی جو ابا نے میرے لیے بنائی تھی۔ میں اپنے معزز خاندان کے لیے بہت بڑی گالی بن گئی تھی۔ عزت دار اور صفائی پسند لوگ باہر سے کچرا گھر میں نہیں آنے دیتے۔ وہ ہوا کی مہربانی سے آنا چاہے تو کھڑکیاں دروازے بند کر لیتے ہیں۔

میں ہاتھ سے بے ہاتھ ہو گئی۔ ایک رات فلم کے دفتر پر پولیس کا چھاپہ پڑا۔ پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کے ساتھ میں بھی دھر لی گئی۔ مجھے تھانے لے جایا گیا۔ پروڈیوسر نے بھاری رشوت دے کر جان چھڑائی۔ میرے پاس جان چھڑانے کے لیے جوانی تھی۔ تھانے دار نے رشوت لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ صبح تک میرا ایسا دیوانہ ہوا کہ دوسری رات کے لیے بھی حوالات میں بند رکھا۔ گھر سے نکلے ہوئے دس مہینے ہو گئے تھے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں دِلی بھی ایسی نہ اجڑی ہو گی جیسی دس ماہ میں مَیں اجڑ گئی تھی۔ چہرہ سوج گیا تھا۔ بدن بیمار ہو گیا تھا۔ دماغ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ کسی مرد کو دیکھتے ہی ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے تھے۔ پتا نہیں یہ کیسے مرد تھے؟ کن ماؤں نے انہیں جنم دیا تھا؟ یہ تو سمجھ گئی تھی کہ نجات کا راستہ نہیں ہے۔ ایک بار عورت کی بو سونگھ کر پھر کتے پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ان کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

میں دوسری رات حوالات میں چکرا کر گر پڑی پھر ایسی بے ہوش ہوئی کہ اسپتال پہنچ کر ہوش آیا۔ میری بے ہوشی کے دوران تھانے دار' فلم پروڈیوسر' ڈائریکٹر اور بالے وغیرہ کے ہوش اُڑے ہوئے تھے کیوں کے لیڈی ڈاکٹر ساجدہ راٹھور نے مجھ پر ہونے والی زیادتی کی رپورٹ تیار کی تھی۔ تھانے دار وغیرہ اس رپورٹ کو آگے نہ بڑھنے دیتے لیکن لیڈی ڈاکٹر کا شوہر بیرسٹر تھا۔ ساجدہ راٹھور نے اپنے شوہر مجید راٹھور کو اس رپورٹ کی ایک کاپی دے دی تھی تاکہ یہ معاملہ دبایا نہ جا سکے۔

بالے سے لے کر تھانے دار تک جتنے لوگوں نے مجھ سے زیادتی کی تھی اب وہ سب میرے رحم و کرم پر تھے۔ میرا بیان انہیں ڈبو سکتا تھا اور بچا سکتا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر ساجدہ راٹھور لاہور وومین ایسوسی ایشن کی جنرل سیکرٹری تھی۔ اصولوں کی پابند ایک سخت مزاج خاتون تھی۔ عورتوں پر ہونے والے کسی بھی ظلم کی داد رسی کے لئے عدالت میں پہنچ جاتی تھی۔ اس خاتون کے چنگل میں آ کر بڑے بڑے عیاشوں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔

تھانے دار کو اپنی وردی اترنے اور جیل جانے کا یقین ہو گیا تھا۔

ساجدہ راٹھور نے مجھے ایک ایسے کمرے میں منتقل کر دیا تھا جہاں کوئی اجازت کے بغیر مجھ سے ملنے نہیں آسکتا تھا۔ میں نے طویل بے ہوشی کے بعد آنکھیں کھولیں۔ سوچنے لگی میں کہاں تھی اور اب کہاں ہوں؟ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کیا وہ تھانے دار پھر میرے پاس آئے گا؟ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے چیخ کر کہا۔

"نہیں نہیں۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔ مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ گھر سے بھاگنے کی اتنی بڑی سزا نہ دو۔"

میں بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک نرس اور وارڈ بوائے دوڑتے ہوئے آئے تو پتا چلا' میں حوالات میں نہیں اسپتال میں ہوں۔ نرس کہہ رہی تھی۔ "ڈرو نہیں۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ آرام سے رہو۔"

اس نے مجھے دو گولیاں کھانے کو دیں۔ پینے کے لئے پانی دیا پھر دوا کھلانے کے بعد لٹا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "ابھی بڑی ڈاکٹرنی آئیں گی ان کے میاں بیرسٹر ہیں۔ جن لوگوں نے تم سے زیادتی کی ہے وہ ان سب کو جیل پہنچا دیں گے۔ وہ جو تھانے دار بنتا ہے نا اس کی بھی وردی اتر جائے گی۔"

یہ باتیں سن کر یوں لگا جیسے ماں کی گود میں آگئی ہوں۔ مجھے وہاں سے غنڈے اور تھانے دار کے چیچے سپاہی نہیں لے جاسکیں گے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "آرام سے لیٹی رہو۔ جب تم سے بیان لیا جائے تو کسی سے نہ ڈرنا۔ سب کچھ کھول کر بیان دینا۔ بڑی ڈاکٹرنی کے آگے کسی پولیس والے کی نہیں چلتی۔"

میں نے دس ماہ کے بعد خود کو اس قدر محفوظ دیکھا تو ذرا سی دیر میں بڑے سکون سے نیند آگئی۔ بعد میں لیڈی ڈاکٹر آئی تھی۔ اس نے مجھے نیند سے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے انسپکٹر کو بیان لینے کے لئے شام پانچ بجے بلایا تھا۔ اس لئے مجھے خوب سونے دیا۔ نرس نے دوپہر دو بجے مجھے کچھ کھانے پینے کے لئے جگایا۔ میں سونے' کھانے اور اچھی طرح آرام کرنے کے بعد سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گئی تھی۔ اپنے حالات پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ بیان دینے سے والدین کا نام پتا بتانا ہو گا۔ میرے آبرو باختہ ہونے کی روداد عدالت اور اخبارات تک جائے گی تو میرے والدین کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ لہٰذا جب تک ممکن ہو سکے' مجھے گمنامی میں رہنا چاہئے۔

اس دن سے میرے اندر سوچنے سمجھنے والی سنجیدگی پیدا ہو گئی۔ میرے اندر کی

ناداں الھڑ دوشیزہ مرگئی تھی۔ جس حسن و شباب پر مجھے ناز تھا' اسے میں نے اپنے لئے گالی سمجھ لیا۔ اپنے گھر سے بھاگنے کی تاریخ یاد تھی۔ اسپتال پہنچنے کی تاریخ یاد کر لی اور قسم کھائی کہ پھر ایسے حالات پیش آئیں گے' کوئی میرے قریب آنا چاہے گا تو میں جان دے دوں گی مگر ہوس پرستوں کے ناپاک ارادے پورے نہیں ہونے دوں گی۔

شام کو لیڈی ڈاکٹر اپنے شوہر مجید راٹھور کے ساتھ آئی۔ ایک پولیس افسر بھی تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے چیک کیا۔ پھر نسخہ بدلتے ہوئے کہا۔ "بالکل نارمل ہو۔ اپنا نام پتا لکھوا دو۔ تمہارے والدین یا شوہر وغیرہ کو اطلاع دی جائے گی۔"

میں نے کہا۔ "میری شادی نہیں ہوئی ہے۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔"

ڈاکٹر ساجدہ نے مجھے گھور کر سخت لہجے میں پوچھا۔ "گھر نہیں ہے؟ کیا جنگل سے آئی ہو؟"

"آپ مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔ میں کچھ بولنے اور کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں۔"

بیرسٹر مجید راٹھور نے کہا۔ "تم خوفزدہ ہو۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ تھانے دار اب تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ یہ جو پولیس افسر ہیں' تمہارا بیان لیں گے اور اس تھانے دار کو جیل پہنچائیں گے۔"

میں چپ رہی۔ ڈاکٹر ساجدہ نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "بیان دو۔ تم پر جو گزری ہے اسے تفصیل سے بیان کرو۔"

افسر نے پوچھا "تمہارا نام؟"

میں نے ہونٹوں کو سختی سے بند کر لیا۔ سب نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ افسر نے پوچھا۔ "کیا بیان نہیں دو گی؟"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ بیرسٹر نے پوچھا۔ "ان سے ڈرتی ہو؟"

میں نے پھر انکار میں سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر ساجدہ نے کہا۔ "جب ڈرتی نہیں ہو تو بیان دو۔"

میں نے کہا۔ "بیان دینے سے میرے والدین اور خاندان کا نام بدنام ہو گا۔"

"تمہیں اغوا کیا گیا ہے یا خود گھر سے بھاگ کر آئی ہو؟"

"ڈاکٹر صاحبہ! کچھ تو ہوا ہے۔ اغوا کیا گیا ہے یا گھر سے بھاگنے کا جرم ہوا ہے جس کی میں نے اتنی سزا پائی ہے' جتنی جہنم میں بھی نہ ملتی۔ اب بیان دے کر کیا ملے گا؟"

"مجرموں کو سزا ملے گی۔"

"انہیں سزا ملنے سے مجھے کیا حاصل ہو گا؟"

ڈاکٹر ساجدہ نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "کیوں بے تکی باتیں کر رہی ہو؟"

میں نے ڈانٹ کا جواب ڈانٹ سے دیا۔ "بے تکی بات یہ ہے کہ جو لڑکی روح پر زخم کھا کر آتی ہے' آپ اس کے جسم پر اسپتال کی دوا لگاتی ہیں۔"

میں نے بیرسٹر سے کہا۔ "آپ مجرموں کو سزا دلا کر ایسے مطمئن ہو جائیں گے جیسے میں اسپتال سے باہر جاؤں گی تو مجھے آپ کی دنیا میں فرشتے ہی فرشتے ملیں گے اور آپ کا قانون ہوس پرستوں کو ختم کر چکا ہو گا۔"

ڈاکٹر ساجدہ نے کہا۔ "ہم تمہیں حفاظت سے تمہارے گھر پہنچا دیں گے۔"

"میں کہہ چکی ہوں میرا کوئی گھر نہیں۔"

"دارالامان تو ہے۔ وہاں تم محفوظ رہو گی۔ کوئی اچھا رشتہ آئے گا تو تمہاری شادی کر دی جائے گی۔"

"آئندہ کوئی مرد شادی کے بہانے بھی آئے گا تو میں اس پر تھوک دوں گی۔"

افسر نے گرج کر کہا۔ "شٹ اپ میں بیان لینے آیا ہوں اور تم ہمیں دوسری باتوں میں الجھا رہی ہو۔ جانتی ہو تم پر بھی بدکاری کا الزام عائد ہو گا تو جیل ہو جائے گی۔"

"افسر صاحب! آج میں اپنے اندر اتنا حوصلہ پا رہی ہوں کہ مجھے دنیا کی کوئی طاقت نہ ڈرا سکے گی' نہ جھکا سکے گی۔ آخری بار کہتی ہوں کہ جان دے دوں گی مگر اس معاملے کو عدالت میں نہیں جانے دوں گی۔ اپنے والدین اور اپنے خاندان کو بدنام نہیں کروں گی۔ ایسا وقت آنے سے پہلے جان پر کھیل جاؤں گی۔"

ڈاکٹر ساجدہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ اس کی سخت مزاجی اچانک ہی بدل گئی تھی۔ وہ نرمی سے بولی۔ "میں عورت ہوں اور تمہارے اندر ایک ایسی عورت کو دیکھ رہی ہوں جو خاندانی عزت اور شرافت کے لئے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیتی ہے۔"

مجھے محبت ملی تو میں نے کہا۔ "میری دو بہنیں دو چار برسوں میں جوان ہو جائیں گی خاندان میں اور بھی لڑکیاں ہیں۔ میری بدنامی ان سب کو کھا جائے گی۔ ان کے لئے شریف گھرانوں سے رشتے نہیں آئیں گے اگر کسی طرح ان کی شادیاں ہوں گی تو میرا حوالہ دے کر ساری عمر سسرال میں طعنے دیئے جائیں گے۔ ان کے شوہر ان کی حیا اور پاکیزگی پر ہمیشہ شبہ کرتے رہیں گے۔"

بیرسٹر مجید راٹھور نے کہا۔ "بے شک ہم نے اس پہلو سے نہیں سوچا تھا۔ تعجب ہے' تم نے پہلے اتنی ذہانت اور ذمے داری سے کیوں نہ سوچا۔"

میں نے کہا۔ "آپ اس بات پر تعجب کریں کہ پندرہ برس کی عمر معصومیت سے کھیلنے کودنے کی ہوتی ہے۔ اس عمر میں میرے اندر حیات کی تلخیاں بھر دی گئی ہیں۔ مجھے ایک پکی عورت بنا دیا گیا ہے۔"

ڈاکٹر ساجدہ نے کہا۔ "واقعی یہ بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔ مجھے بتاؤ ہم تمہارے لئے کیا کریں؟ تم گھر نہیں جاؤ گی' دارالامان نہیں جاؤ گی' پھر کیا چاہتی ہو؟"

"میں تنہا عزت اور شرافت کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ کسی ایسے ادارے میں ملازمت مل جائے جہاں خود پر انحصار ہو اور کسی مرد کی مداخلت نہ ہو تو باقی عمر مردوں سے توبہ کرتی رہوں گی۔"

"دیکھو' سارے مرد ایسے نہیں ہوتے جیسا تم سمجھ رہی ہو۔ یہ بیرسٹر صاحب میرے میاں ہیں۔ یہ انسپکٹر صاحب تمہیں انصاف دلانے کے لئے اپنے ہی محکمے کے ایک افسر کی وردی اتارنا چاہتے ہیں۔ لاکھوں کروڑوں مرد شریف اور مہذب ہیں اسی لئے میری جیسی عورتیں شریفانہ گھریلو زندگی گزار رہی ہیں' ابھی تمہارا زخم تازہ ہے لہٰذا فی الحال مرد ذات پر بحث نہ کرو۔ تمہارے ارادے کے مطابق ایک ایسی ملازمت ہے جس کے ذریعے خود پر انحصار کر سکو گی۔ کیا نرس اور مڈوائف کا کام کرو گی؟"

میں نے ہاتھ تھام کر کہا۔ "ضرور کروں گی۔ آپ یہاں کی بڑی ڈاکٹر ہیں۔ مجھ پر مہربانی کریں گی تو میری بگڑی ہوئی زندگی سنور جائے گی۔"

پھر واقعی ڈاکٹر ساجدہ نے میری زندگی سنوار دی۔ مجھے اسی اسپتال میں ملازمت دلائی۔ میں نے آٹھ جماعتیں پاس کی تھیں۔ نرسنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس لئے ٹریننگ حاصل کرنے کے دوران میں اسپتال میں آیا کا کام کرتی رہی۔ میرے اندر جو مغرور دختر چوہدری تھی اسے میں نے مار ڈالا تھا۔ اب یہ فخر تھا کہ اپنے اندر میں ایک عورت کی انا اور خودداری کو مضبوط تر بنانے کے لئے ایک آیا کے کردار سے نئی زندگی شروع کر رہی ہوں اور یہ ایسی زندگی ہے جس میں مردوں سے کم سامنا ہوتا ہے۔

میں نے تین برس میں نرسنگ کے کورس کے ساتھ دسویں جماعت کے امتحانات بھی پاس کئے' ان تین برسوں میں یہ بھی عقل آئی کہ اس عمر میں لڑکیوں کو اپنی زندگی کا ایک مقصد متعین کر لینا چاہئے۔ دنیا کی تمام ضرورتوں سے' خواہشوں سے اور جذبات سے منہ موڑ لینا چاہئے اگرچہ یہ مشکل ہوتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ لڑکیاں میری طرح زخم کھا کر مشکلیں آسان کریں' ٹھوکر کھانے سے پہلے ہی سمجھ لیں کہ بائیس یا پچیس برس سے پہلے کوئی مرد ہماری زندگی میں داخل نہ ہو تو ہمیں تعلیم اور ہنر حاصل کرنے اور زندگی کے

نشیب و فراز کو سمجھنے کے بے حد تجربات حاصل ہوتے ہیں پھر ہمیں کسی مرد کو الزام دینے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ اس نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ دھوکا تو ہم اپنی نادانی سے کھاتے ہیں۔ بہکانے اور بہکنے کے مسئلے میں یہ اٹل حقیقت ہے کہ آدم اور حوا حکم خداوندی کے خلاف عمل کرنے کے برابر مجرم ٹھہرائے گئے۔ بہکانے کے بعد اور بہکنے کے بعد کوئی معصوم نہیں رہتا۔ اس عرصے میں یہ عقل آ گئی کہ میں ناحق مردوں کو الزام دے رہی تھی۔

میں ماضی پر مٹی ڈال چکی تھی۔ ایک نرس کی حیثیت سے ان مردوں کی خدمت کرتی تھی جو مریض بن کر اسپتال میں آتے تھے۔ وہ بے ضرر ہوتے تھے۔ مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ بعض عورتیں انتقام لینے کے لئے مختلف ہتھکنڈوں سے مردوں کی اچھی طرح مرمت کرتی ہیں لیکن میں توجہ اور محبت سے ان کی مرمت کرتی تھی جو ٹوٹ پھوٹ کر آتے تھے۔ اسپتال ایسی ہی جگہ ہے جہاں بڑے بڑے شہ زور بیماریوں سے اور حادثات سے کمزور ہو کر آتے تھے اور میرے رحم و کرم پر رہتے تھے۔

یوں میں نے دس برس گزار دیئے۔ پچیس برس کی ایک بھرپور عورت ہو گئی۔ اس دوران کتنے خوبرو جوانوں اور رئیسوں نے اپنی رال ٹپکائی۔ کتنے ہی رشتے آئے' میرے انکار نے کسی کی طلب میں شدت پیدا کی' کسی کو ضدی بنا دیا۔ ڈاکٹر ساجدہ نے مجھے سمجھایا۔ "اب تمہیں شادی کر لینی چاہئے۔ کسی شریف اور اچھا کمانے والے کو جیون ساتھی بنا لو۔"

میں نے کہا۔ "میرا دل نہیں مانتا۔ دس برس سے نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں اب مجھے کسی مرد کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میرے سامنے غیر فطری باتیں نہ کرو۔ تم ایک نارمل عوت ہو اور نارمل عورت احساسات اور جذبات سے بھرپور ہوتی ہے چونکہ تمہیں جذبات پر قابو پانے کا سلیقہ آتا ہے اس لئے اوپر سے سرد اور بے حس نظر آتی ہو لیکن یاد رکھو تم نے صحیح وقت پر شادی نہ کی تو پھر تم سے کوئی نادانی سرزد ہو جائے گی۔ لوگ تو کالی پیلی کو نہیں چھوڑتے تو تمہیں کون چھوڑے گا۔ واردات کرنے والے آم کھا کر گٹھلی نہیں پھینکتے۔ یہ پودا بازارِ حسن میں لگا دیتے ہیں۔ عقل سے سوچو جب تک اپنے جملہ حقوق کسی کے نام محفوظ نہیں کرو گی اور اپنے حسن و شباب پر کسی شوہر کے نام کا لیبل نہیں لگاؤ گی تب تک محفوظ نہیں رہو گی۔"

ڈاکٹر صاحبہ کی باتیں دل پر اثر کرتی تھیں۔ یہ درست تھا کہ میں اپنے جذبات دبا کر

رکھتی تھی۔ اب نہ بہکنا چاہتی تھی اور نہ شادی کے نام پر کسی کو اپنا حاکم بنانا چاہتی تھی۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ کسی کی شخصیت متاثر کرتی تھی۔ دل کہتا تھا ایسا ہی جیون ساتھی چاہئے لیکن میں دل کی بات دل ہی میں رکھتی تھی۔ مجھے جذبوں کو قابو میں رکھنا آ گیا تھا۔ اس لئے میں دیوانی نہیں ہوئی تھی۔

ایک روز میری طبیعت کچھ خراب ہو گئی تو میں نے چھٹی لے لی۔ رات کی ڈیوٹی کے لئے اسپتال نہیں گئی۔ صبح پتا چلا نرس شہلا کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ تھانے میں رپورٹ کی گئی۔ پولیس نے تفتیش شروع کی۔ شام تک کوئی سراغ نہ ملا پھر اندھیرا ہوتے ہی وہ واپس آ گئی۔ خلافِ توقع مجرموں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔

اس نے بیان دیا۔ "میں رات کو اسپیشل وارڈ سے باہر آ رہی تھی۔ دو بندوں نے میرے دونوں طرف آ کر ایک نے کہا۔ یہ دیکھو ہمارے پاس پستول ہیں پھر انہوں نے پستول کو جیب میں رکھ کر کہا پستول جیب میں ہیں' مگر تم نشانے پر رہو گی۔ ذرا بھی شور مچاؤ گی یا کسی کو کوئی اشارہ دو گی تو ہم تمہیں گولی مار دیں گے۔

"رات کے دو بجے تھے اسپتال کے باہر کوئی بندہ نظر نہیں آ رہا تھا اگر میں حوصلے سے کام لے کر کسی کو بلانا چاہتی تو سڑک پر صرف کتے ہی نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے ایک گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھا کر آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ وہ گاڑی تقریباً ایک گھنٹے تک چلتی رہی پھر رک گئی۔ ایک نے مجھے سہارا دے کر اتارا۔ تھوڑی دور چلا کر لے گئے پھر جب آنکھوں سے پٹی کھولی تو خود کو ایک عالیشان کوٹھی کے اندر پایا۔ وہ کسی بہت ہی امیر کبیر کی کوٹھی ہو گی۔ وہ ڈرائنگ روم کے ایک پردے کے پیچھے کھڑا تھا۔ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہاں سے گرج کر بولا۔ "گدھے کے بچو! یہ کسے اٹھا لائے ہو؟ میں نے عاصمہ کو لانے کے لئے کہا تھا۔ وہ ابھی ڈیوٹی پر ہو گی؟"

"ایک نے کہا۔ "جناب یہی ڈیوٹی پر تھی۔ ہم نے وہاں کوئی دوسری نرس نہیں دیکھی۔ اس لئے اندازہ لگایا کہ یہی عاصمہ ہے۔"

میں نرس شہلا کا یہ بیان سن کر لرز گئی۔ وہ بے چاری میری جگہ ڈیوٹی پر تھی۔ میری بیماری نے مجھے بچا لیا تھا اسے پھنسا دیا۔ جس رئیس نے اغوا کرایا تھا اس نے شہلا کو ہاتھ بھی نہیں لگایا کیونکہ وہ میرا دیوانہ تھا۔ مجھے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے حواریوں سے کہا تھا کہ شہلا کو واپس چھوڑ کر آؤ لیکن ان حواریوں نے اسے نہیں چھوڑا اسے شہر سے باہر لے جا کر شام تک رکھا پھر شام کو ریلوے کراسنگ نہر کے پاس لا کر چھوڑ دیا اور دھمکی دی کہ کبھی پولیس والوں کے سامنے انہیں پہچانے گی تو دوسری بار

عزت کے ساتھ اپنی جان بھی گنوائے گی۔

شہلا کی بہت بری حالت کی گئی تھی۔ مجھے دس برس پہلے کے درندے یاد آ گئے تھے۔ میرے ساتھ دوسری بار بھی وہی ہونے والا تھا۔ شہلا کے کیس میں پولیس والوں نے کیا کارروائی کی' یہ ایک الگ بات ہے۔ میرے تو اپنے ہوش اُڑ گئے تھے۔ ڈاکٹر ساجدہ نے مجھ سے تنہائی میں کہا۔ "پتا نہیں وہ کون عیاش رئیس ہے اگر تم ہتھے چڑھ جاتیں تو پھر کبھی اسپتال واپس آنے نہ دیتا۔ میں نے آئی جی صاحب سے درخواست کی ہے کہ آج رات سے کم از کم چار سپاہی اسپتال میں ڈیوٹی دیں گے لیکن تمہیں دوسرے ضروری کاموں سے باہر جانا پڑتا ہے۔ یہاں سے باہر سپاہی تمہارے باڈی گارڈ بن کر نہیں رہ سکتے۔ باڈی گارڈ ایک ہی ہوا کرتا ہے۔ جسے شوہر کہتے ہیں۔"

ڈاکٹر ساجدہ نے میری نائٹ ڈیوٹی ختم کر دی تھی تاکہ میں رات کو ہاسٹل میں محفوظ رہوں اور یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ یہ حفاظتی اقدامات صرف اسپتال اور ہاسٹل تک محدود ہیں۔ شاپنگ یا آؤٹنگ وغیرہ کے لئے فوراً کسی کو اپنا ساتھی بنا لو اور اگر ایسا نہیں کر سکتی ہو تو کراچی میں ایک ریکروٹنگ ایجنٹ ہے اسے مشرق وسطیٰ کے لئے تجربہ کار نرسوں کی ضرورت ہے' میں اس کا نام پتا اور اس کے نام ایک خط لکھ دیتی ہوں۔ چانس مل جائے تو ملک سے باہر چلی جاؤ۔ ویسے باہر بھی فرشتے نہیں ملیں گے لیکن میں نہیں چاہتی کہ میرے سائے میں رہ کر کبھی تم درندوں کے ہاتھوں میں پڑ جاؤ۔ ایسا ہو گا تو مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا۔"

میں نے لاہور چھوڑ دیا اور کراچی آ گئی۔ یہاں ایجنٹ شمشاد بھائی سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "نوکری پکی ہے۔"

میں نے کاغذ دکھائے تو اس نے کہا۔ "تمہارا سروس ریکارڈ ایسا ہے کہ وہاں ہیڈ نرس کی ملازمت ملے گی۔ میں ابھی شیخ صاحب سے تمہاری ملازمت فائنل کراؤں گا۔ آؤ ہوٹل چلیں۔"

ہوٹل انٹرکان کے ایک سوئٹ میں شیخ صباح بن زید کا قیام تھا۔ میں شمشاد بھائی کے ساتھ کمرے میں گئی تو شیخ نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "سبحان اللہ' بیوٹی فل!"

اس نے انگریزی میں شمشاد بھائی سے کہا۔ لڑکی پسند ہے۔ دو سال کے لئے ایگریمنٹ کر لو۔ اس نے اپنی کرنسی کے حساب سے جو تنخواہ بتائی اس کے مطابق پاکستانی کرنسی میں مجھے بارہ ہزار روپے ملنے والے تھے۔ میں خوش ہو رہی تھی۔ شمشاد بھائی نے

مجھ سے کہا۔

"تم شیخ صاحب سے باتیں کرو۔ میں نیچے سے سگریٹ لے کر آتا ہوں؟"

میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک بار بالا بھی مجھے شکاری کے پاس چھوڑ کر سوڈا واٹر لانے گیا تھا۔ میں نے شیخ کے سامنے ہی شمشاد بھائی کا گریبان پکڑ کر کہا۔ "دلّے بھائی! تو جو ڈراما کر رہا ہے اس کا یہ سین میں پہلے بھی کر چکی ہوں۔ کیا تو اپنی بہن کو یہاں چھوڑ کر نیچے سگریٹ لانے جا سکتا ہے۔"

"ارے .... ارے یہ کیا کرتی ہو۔ گریبان چھوڑو' شیخ صاحب کیا سوچیں گے۔"

شیخ نے مسکرا کر کہا۔ "میں تمہاری لینگویج نہیں سمجھتا مگر دوشیزہ کا انکار سمجھ گیا ہوں۔ اس کا یہ انداز اچھا لگ رہا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں .... شمشاد کہ تم گریبان نہیں چھڑا سکو گے۔"

وہ ہنسنے لگا۔ میں نے گریبان چھوڑ کر انگلش لینگویج میں کہا۔ "باہر جانے والے ملازموں کی محنت خریدی جاتی ہے عزت نہیں خریدی جاتی۔ مسلمان ہو تو عزت دار عورتوں کی بھی عزت رکھو۔ ان سے بھی صرف ان کی محنت اور ہنر خریدو۔ میں بکنے والی چیز نہیں ہوں۔"

میں وہاں سے چلی آئی۔ ڈاکٹر ساجدہ راٹھور نے مجھے دس برس کے عرصے میں اتنی زبردست ٹریننگ دی تھی کہ نصف ڈاکٹر بنا دیا تھا۔ میرا سروس ریکارڈ دیکھ کر مجھے کسی بھی اسپتال میں ملازمت مل جاتی تھی۔ میں نے دوسرے ہی دن سول اسپتال میں ملازمت حاصل کر لی۔

ڈاکٹر صاحبہ کو خط لکھا۔ "آپ نے درست فرمایا تھا' ملک سے باہر بھی مجھے فرشتے نہیں ملیں گے۔ میں نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ سول اسپتال میں ملازمت کر رہی ہوں۔"

انہوں نے خط کے جواب میں دعائیں دیں اور کہا۔ "جہاں رہو خوش رہو۔ اگر شادی کر لو تو پھر میرے پاس چلی آؤ۔ میں نے تمہیں غلط ہاتھوں سے بچانے کے لئے نظروں سے دور کیا ہے ورنہ اسپتال میں اور خاص طور پر آپریشن تھیٹر میں تمہاری بہت کمی محسوس کرتی ہوں۔ تم بڑے سے بڑے آپریشن کے وقت بجلی کی تیزی اور حاضر دماغی سے مجھے اسسٹ کرتی تھیں۔ خدا کے لئے جلدی شادی کرو اور چلی آؤ۔"

وہ خط پڑھ کر میں نے ہمیشہ کی طرح تسلیم کیا کہ ڈاکٹر صاحبہ روشنی کا مینار ہیں۔ ان کے اندر ممتا بھی ہے کہ بیٹی اپنے گھر کی ہو جائے اور شوہر کے سائے میں عزت دار

رہے۔ میں سنجیدگی سے سوچنے لگی۔ اب زندگی کا طور بدلنا چاہئے۔ آئندہ کوئی دل کو بھائے تو دیر نہ کی جائے اور فوراً ہاسٹل چھوڑ کر گھر آباد کرنا بہتر ہے۔

اسپتال کا ایک ڈاکٹر مجھ میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ دیکھنے سننے میں اچھا تھا' میں نے دل کو اس کی طرف مائل کرنا شروع کیا۔ جب تک دل مائل نہ ہو شادی ڈھول کے پول کی طرح کھوکھلی ہوتی ہے۔ ہاسٹل میں رہنے والی نرس سہیلیاں کہتی تھیں۔ عشق شروع کر دو ڈاکٹر سچ مچ دیوانہ نکلا تو شادی کرلے گا۔

میں اس ڈاکٹر کے عشق کو آزما نہ سکی۔ اچانک مقدر نے میری کھوپڑی الٹ دی۔ میں نے پہلی بار جواد فہمی کو اسپتال کے بستر پر دیکھا تو اسے دیکھتے ہی بیمار ہو گئی۔ کیا غضب کی مردانہ وجاہت تھی۔ سیدھی گولی کی طرح لگتی تھی۔ میں جو مردوں کے نام سے دور بھاگتی آ رہی تھی' اس کی طرف کھنچتی چلی گئی اگر صبر سے انتظار کیا جائے تو ہماری زندگی میں ایسا کوئی آتا ہے۔ ضرور ایسا کوئی ہے جسے دیکھتے ہی اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لینے کو دل چاہتا ہے۔

دل نے کہا۔ اسے چھوڑ کر نہ جاؤ تو میں نے ڈبل ڈیوٹی کی۔ صبح تک اس کے بستر کے پاس جاگتی رہی اور اسے دیکھ دیکھ کر خود کو ہارتی رہی۔ دوسرے دن پتا چلا وہ ایک موٹر مکینک ہے' اپنے گھر میں اور اس دنیا میں اکیلا ہے۔ ایک بار ڈاکٹر صاحبہ نے سمجھایا تھا جو شخص خود کو اکیلا کہتا ہو اس پر اعتبار نہ کرنا۔ وہ جھوٹ بولتا ہے کیونکہ ماں باپ کے بغیر کوئی دنیا میں نہیں آتا پھر وہ اکیلا کیسے ہو سکتا ہے' والدین مر چکے ہوں تو خاندان کے افراد دور یا نزدیک کے ضرور ہوتے ہیں۔ دوسری صورت میں صرف ایسا شخص اکیلا رہ جاتا ہے جس میں کھوٹ ہونے کے باعث خون کے رشتے اور زبان کے رشتے اسے قبول نہیں کرتے۔

ڈاکٹر صاحبہ کی یہ باتیں یاد نہیں آئیں۔ عشق اور دیوانگی سے دیکھو تو اکیلا شخص بے چارہ سا مظلوم سا ٹھکرایا ہوا سا لگتا ہے۔ بڑھ کر گلے لگانے کو جی چاہتا ہے۔ صرف دو ہی دنوں میں جواد کا صحیح کردار سامنے آ رہا تھا۔ یہ کردار ڈاکٹر صاحبہ کے سامنے آ جاتا تو انہیں میرے انتخاب پر اعتراض ہوتا اور وہ جواد کو کبھی پسند نہ کرتیں۔ ادھر میرا دل اسے بری طرح مانگ رہا اور کہہ رہا تھا کہ میں اس شخص کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال لوں گی۔

میں نے دوسری ملاقات میں سمجھ لیا کہ وہ خود غرض ہے۔ مجھے ایک ذریعہ بنا کر ملک سے باہر جانا اور دولت کمانا چاہتا ہے۔ میں نے اس کی خودداری کو آزمانے کے لئے پانچ سو روپے دیئے تو اس نے بظاہر جھجک دکھائی لیکن رقم قبول کرلی۔ میں ایسے شخص کو اپنا محتاج

بنا کر ہمیشہ اپنے زیردست رکھ سکتی تھی۔

ایک سوال پیدا ہوا کیا کسی کو اپنا محتاج اور ضرورت مند بنا کر اس سے محبت کرائی جا سکتی ہے؟ جواب سیدھا سا تھا۔ لاکھوں مرد اپنی بیویوں کو گھر کی چار دیواری میں محتاج بنا کر رکھتے ہیں اور بیویاں ساری عمر محبت اور وفاداری سے ساتھ نباہتی رہتی ہیں۔ میں بھی جواد کے لئے اتنی اہم اور بدانہ مل جائے گا بن جاؤں گی کہ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکے گا۔
ازمت ٹھیک

ایک طویل عرصے یعنی تلخ تجربات سے بھرے ہوئے پچیس برس گزار لینے کے بعد ایک جواد ہی ایسا تھا جو مجھے دیوانہ کر رہا تھا اور میں دیوانگی میں بھی ہوش و حواس سے فیصلہ کر چکی تھی کہ اسے چھوڑوں گی نہیں' چاہے اس کے لئے دنیا چھوڑنا پڑے۔

وقت اپنے آپ کو مختلف صورتوں میں دہراتا رہتا ہے۔ پندرہ برس کی عمر میں ایک شخص کے لئے گھر چھوڑا تھا۔ اب دوسرے شخص کے لئے دنیا چھوڑنے کو تیار تھی۔ پہلی ناکام چاہت میں دھوکا کھا کر بھی اس لئے عقل نہیں آتی کہ دوسری چاہت کی مسرتیں کچھ سوچنے کا موقع نہیں دیتیں پھر بھی اتنی دانائی تھی کہ تمام حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کے بعد اسے قبول کرنے والی تھی۔

وہ مجھے بیساکھی بنا کر ملک سے باہر جانا چاہتا تھا اور میں اپنے حسن و شباب کو رشوت کے طور پر پیش کر کے اسے دوسرے ملک لے جانا نہیں چاہتی تھی۔ جانا ہوتا تو اسی دن ہوٹل انٹرکان کے بند کمرے میں عراق کا ویزا حاصل کر لیتی۔ بعد میں ایجنٹ شمشاد بھائی دوسری نرسوں کی تلاش میں اسپتال آیا تو دوبارہ اس سے ملاقات ہوئی اس نے بتایا کہ شیخ میرا عہدہ اور میری تنخواہ بڑھانے کو تیار ہے۔

میں نے اسے اسپتال سے بھگا دیا۔ دوسری نرسوں سے ملنے نہیں دیا جب کہ تین نرسوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ باہر جا کر خوب روپے کمانا چاہتی ہیں۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ تم سب عورت ہو کر اپنا عورت پن برقرار نہیں رکھو گی اور بے حیائی کو فروغ دینا چاہو گی تو نرسنگ کے پیشے کا تقدس ختم ہو جائے گا پھر کوئی ہم نرسوں کو عزت کی نگاہ سے سسٹر نہیں کہے گا۔

وہ میری نصیحت سے ناراض ہو گئی تھیں۔ ان کے خیال میں ان سے میں جلتی تھی۔ انہیں باہر جا کر ترقی کرتے نہیں دیکھ سکتی تھی پھر پتا چلا کہ تینوں پارسا نہیں ہیں۔ اسپتال کے باہر اوور ٹائم لگاتی ہیں۔ مجھے افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ نصیحت کی۔ جب جواد نے بھی مجھے دو بچوں کی ماں سمجھ کر باہر جانے والی خود غرضی کی باتیں کیں تو میں نے سوچ لیا کہ

ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔

میں شمشاد بھائی کے پاس گئی تو اس نے کہا۔ ”کیوں میرا دھندہ چوپٹ کر رہی ہو؟ تمہارے انکار کے بعد دو تجربہ کار نرسوں کو لے کر گیا۔ شیخ نے دونوں کو ریجیکٹ کر دیا۔“

میں نے اسے بتایا کہ میرے اسپتال کی تین نرسیں باہر جانا چاہتی ہیں۔ شمشاد بھائی نے خوش ہو کر شیخ سے ملاقات کا وقت لیا اسے ۔سہیلیاں کہنے خوبصورت اور جوان لڑکیاں انٹرویو کے لئے آئیں گی۔ میں نے پوچھا۔ ”تم نے یوں کا ذکر کیوں کیا ہے۔

میں نے کہا تھا تین نرسیں جانے کو تیار ہیں۔“

”بھئی چوتھی تم ہو۔ کیا تم نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا ہے؟“

”صرف محنت بیچنے کی بات ہو تو ابھی جانے کو تیار ہو جاؤں گی۔“

”عاصمہ! کیوں ضد کرتی ہو۔ شیخ بہت زندہ دل ہے۔ تم نے جس انداز میں میرا گریبان پکڑا تھا اس سے وہ بہت محظوظ ہوا۔ بعد میں جانتی ہو کیا کہہ رہا تھا؟“

”کیا کہہ رہا تھا؟“

”کہہ رہا تھا‘ عورت کو اتنا ہی خوددار اور آبرو مند ہونا چاہئے جتنی تم ہو۔ وہ تمہاری تنخواہ بڑھانے کو تیار ہے۔“

”کیا وہ تنخواہ آبرو مندی سے بڑھے گی؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا۔“

”تو پھر جاؤ۔ اس سے ابھی پوچھو۔“

اس نے فون اٹھا کر رابطہ کیا پھر اسے بتایا کہ عاصمہ دفتر میں موجود ہے۔ شیخ نے کہا۔

”اسے ریسیور دو۔“

اس نے مجھے ریسیور دیا۔ میں نے اسے کان سے لگا کر سلام کیا۔ وہ سلام کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ ”کیا شمشاد نے ہماری دوسری آفر دی ہے؟“

”جی ہاں لیکن مجھے زیادہ تنخواہ نہیں چاہئے۔ میں اپنے مزاج کے خلاف ملازمت نہیں کروں گی۔“

”یہ تو ہم نے پہلی ملاقات میں سمجھ لیا تھا اور یہ ایمان کی بات ہے کہ اسی دن ہم نے دل ہی دل میں تمہاری ملازمت پکی کر دی تھی۔ شمشاد کے پاس جو کاغذات ہیں انہیں پُر کرو۔ میرے دستخط کے بعد ویزا وغیرہ آسانی سے حاصل ہو جائے گا۔“

”آپ ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میں راضی ہو گئی ہوں۔“

”تمہیں تو راضی ہونا ہی پڑے گا کیوں کہ یہ ملازمت تمہارے مزاج کے مطابق ہو

گی۔ کیا اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔“

میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”شکریہ جناب۔“

پھر اس نے فون کے ذریعے شمشاد کو میرے سلسلے میں حکم دے کر رابطہ ختم کر دیا۔

شمشاد بھائی نے خوش ہو کر کہا۔ ”عاصمہ تم نے تو میری چاندی کر دی ہے۔ ابھی کاغذات پُر کرو۔ کل تمہیں تقرری کا پروانہ مل جائے گا۔ پاسپورٹ دو چار روز میں مل سکتا ہے۔ ویسے جلدی بھی نہیں ہے۔ ملازمت ٹھیک چھ ماہ بعد شروع ہو گی۔ تم اگست کے آخر میں یہاں سے جاؤ گی۔“

”میں اپنے شوہر کے ساتھ جاؤں گی۔“

”آں!“ اس نے چونک کر کہا۔ ”تم نے تو کہا تھا کہ تمہاری شادی نہیں ہوئی ہے۔“

”درست کہا تھا۔ نہیں ہوئی ہے لیکن ان چھ ماہ میں ہو سکتی ہے۔“

”عاصمہ! جہاں اتنی عمر گزاری ہے وہاں دو سال اور گزار دو۔ واپس آ کر شادی کر لینا۔ یہاں سے شادی کر کے جاؤ گی تو دگنے اخراجات میں پڑو گی۔ عراق بہت مہنگا ملک ہے وہاں سے کچھ بچا کر نہیں لا سکو گی۔“

”کیوں نہیں لا سکوں گی؟ شوہر کو لے جاؤں گی تو دو برس میں دو بچے کما کر لاؤں گی۔ تم میری فکر نہ کرو‘ لاؤ میں کاغذات پُر کرتی ہوں۔“

دوسرے دن میں نے وارڈ بوائے سے ایک اسٹیمپ پیپر منگوایا۔ شام کو جواد سے ملاقات ہوئی وہ پھر گیراج کی ایک گاڑی لے کر آیا تھا۔ میں اس کے ساتھ شمشاد بھائی کے پاس آئی اسے ایک کمرے میں بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ کمرا ایک طرح کی انتظار گاہ تھا۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ جب میں شمشاد بھائی سے اپائنٹمنٹ لیٹر لے کر جواد کے پاس آئی تو وہ تقرری کا پروانہ دیکھتے ہی مارے خوشی کے مجھ سے لپٹ گیا۔

میں بیان نہیں کر سکتی کہ اس وقت میری کیا حالت ہوئی۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ انتظار گاہ کی تنہائی میں وہ اچانک بے قابو ہو جائے گا۔ میری جان نکال لے گا۔ ایک طویل مدت کے بعد بلکہ سیکڑوں ہزاروں سالوں کے بعد ایک آدم زاد نے پکڑ لیا‘ جکڑ لیا‘ لپیٹ لیا اور سمیٹ لیا تو میری اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ اگر میں فوراً ہی حواس پر قابو پا کر سانس نہ لیتی تو دم نکل جاتا۔ شاید اسی کو دم بخود رہ جانا کہتے ہیں کہ عورت پھر اسی کے دم سے رہنے لگتی ہے۔

میں ذرا جدوجہد کرتی تو اس کی قید کے جال سے نکل جاتی لیکن میں نے دیر کر دی۔ یہ چڑیمار اچھی طرح جانتے ہیں کہ چڑیا جال میں پھنستے ہی نہیں پھڑپھڑاتی پہلے حواس باختہ

ہوتی ہے کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا؟ پھر اس خیال سے دبک جاتی ہے کہ ابھی جال اس پر نہیں آیا ہے ابھی یہ خواب ہے۔ وہ بہت بعد میں پھڑپھڑاتی ہے۔

میں نے بھی ایک خواب سمجھا کہ وہ آیا ہے اور میرے وجود کو گرفتار کر رہا ہے۔ میں خیالوں میں دیکھتی تھی کہ شیر آیا ہے۔ شیر آیا ہے۔ ایسے میں سچ مچ شیر آ جائے تو یقین کرنے میں دیر لگتی ہے۔

میں یکبارگی تڑپ کر الگ ہو گئی پھر سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ "یہ کیا حرکت ہے؟"

وہ پھر میرے دونوں بازوؤں کو گرفت میں لے کر بولا۔ "اتنی بڑی خوشی کے موقع پر حرکت نہیں، برکت دیکھی جاتی ہے۔ اب ہماری کمائی میں برکت ہو گی۔"

اف اللہ! اس نے بازوؤں کو ایسے پکڑ لیا تھا جیسے اپنا ہی مال ہو۔ میں جذبوں سے مالا مال ہو رہی تھی لیکن اپنی کوئی بھی چیز ہو، آسانی سے کسی کو نہیں دینا چاہئے۔ ہماری نادانی سے دوسرے کو سلطانی مل جاتی ہے۔ میں نے آواز میں سختی پیدا کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ "شمشاد بھائی آ جائیں گے۔"

"آنے دو۔ میں نے اپنی جان کو پکڑا ہے۔"

"میں تمہاری جان نہیں ہوں۔ ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اب تم نے نہ چھوڑا تو میں یہ اپائنٹمنٹ لیٹر پھاڑ دوں گی۔"

اس نے یکبارگی گھبرا کر مجھے یوں چھوڑ دیا جیسے میں نے خوشیوں کے منہ پر طمانچہ مارا ہو۔ اس کی خوشیاں میں نہیں تھی۔ میرے لئے کوئی ارمان کوئی خواب نہیں تھا اس کے خواب کی تعبیر میرے ہاتھوں میں تھی۔ وہ کاغذات تھے جنہیں میں پھاڑ دیتی تو وہ پھٹیچر بن جاتا۔

اس نے کہا۔ "سوری، تم نے ایسی خوشی دی ہے کہ میں بے قابو ہو گیا تھا۔"

"آئندہ محتاط رہنا۔ مجھے بے حیائی پسند نہیں ہے۔ ہمارے درمیان یہ طے پایا تھا کہ اپائنٹمنٹ لیٹر ملنے کے بعد ہماری شادی ہو گی۔"

"بے شک، میں زبان کا پکا ہوں۔ جس دن کہو قاضی کو لے کر آؤں گا۔"

"ہمارے درمیان یہ بھی طے پایا تھا کہ یہ شادی محض دنیا کو دکھانے کے لئے ہو گی۔"

"ہاں، مگر ہم بہترین دوست بن کر ایک دوسرے کے کام آتے رہیں گے۔"

"اللہ نے چاہا تو میں ہی تمہارے کام آتی رہوں گی۔ تمہیں یہ توفیق نہیں ہو گی۔"

"وقت آنے دو پھر ثابت کروں گا کہ تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔"

اس نے بڑی محبت سے اپنی چاہت کا اظہار کیا۔ کاش میں اس کی چاہت پر ناز کر سکتی جو شخص دکھاوے کی شادی کر رہا ہو، وہ بھلا دل سے کیا چاہے گا۔ میں نے پرس سے اسٹیمپ پیپر نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "ہم نے یہ بھی طے کیا تھا کہ شادی سے پہلے ایک تحریری معاہدہ ہو گا۔"

وہ ہاتھ میں اسٹیمپ پیپر لے کر سوچنے لگا۔ میں نے کہا۔ "اس پر لکھو کہ تم نے مجھ سے نمائشی شادی کی ہے۔ مجھ سے کبھی ازدواجی رشتہ قائم نہیں کرو گے اور تنہائی میں مجھے ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے۔"

وہ گہری سوچ میں تھا۔ میں نے اس کی طرف قلم بڑھایا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "ابھی میں نے تمہیں ہاتھ لگایا تھا۔ مجھے کچھ ایسا لگا جیسے میں نے اپنی آغوش میں بجلی بھر لی تھی۔ میری عقل نہیں مانتی ہے کہ تم..........؟"

"کہ میں دو بچوں کی ماں ہوں اور دو شوہروں سے طلاقیں لے چکی ہوں۔ یہ تمہاری عقل تسلیم نہیں کرتی ہے تو میں کیا کروں؟"

"میں الجھ رہا ہوں۔ مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع دو۔"

"ضرور سوچنا سمجھنا چاہئے۔ میں بھی تمہیں سمجھنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔"

میں نے اس سے کاغذ اور قلم لے لیا۔ عراق کے اپائنٹمنٹ لیٹر کو تہہ کر کے پرس میں رکھنے لگی۔ ایسے وقت اسے دیکھا تو اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے اس کے اندر سے روح کھینچ کر پرس میں رکھ لی ہو۔ اس نے کہا۔ "تم بہت حسین ہو اور بہت کماتی ہو۔ تمہارے لئے تو بہت رشتے آتے ہوں گے؟"

"رشتوں اور ملازمتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ میں نے دو دنوں میں بہت بڑی ملازمت حاصل کر کے دکھائی، اگلے دو دنوں میں کسی سے شادی بھی کر سکتی ہوں۔"

"لیکن تم تو مجھ سے محبت کرتی ہو۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔ "تم نے ان پانچوں دنوں میں کبھی محبت کا ذکر کیا ہے؟"

"نہیں، مگر ہم دوست ہیں۔ تم نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا ہے؟"

"وعدہ کیا ہے لیکن تمہارے نخرے برداشت کرنے کا وعدہ نہیں کیا ہے۔ تم نے کہا تھا، تقرری کا پروانہ ملتے ہی شادی کرو گے لیکن تحریری معاہدہ کرنے سے پھر رہے ہو۔ سوچنے کی مہلت مانگ رہے ہو لیکن اس دوران کوئی مجھ سے سچ مچ شادی کرنا چاہے گا تو مجھے کس کا انتخاب کرنا چاہئے۔ اس سچے کا یا تمہارے جیسے فراڈ کا جو محض اپنے مقصد کے

لئے نکاح پڑھانا چاہتا ہے۔"

"میں فراڈ نہیں ہوں۔ تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔ تمہارے حسن کو، تمہارے رنگ و روپ کو دیکھ کر دیوانہ ہو جاتا ہوں پھر سوچتا ہوں شادی کے بعد یہ جسم میرا ہو گا اور میں جسم کا عادی ہو جاؤں گا اس کے بعد تم طلاق لے لو گی تو میرا کیا بنے گا۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔"

میں نے اس بار اسے محبت سے دیکھا۔ اسے اس پہلو سے نہیں سمجھا تھا کہ میرا دیوانہ ہے مگر ہوشمندی سے میرا عادی اس لئے نہیں بننا چاہتا ہے کہ میں اسے چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ اگر وہ ایسا سوچتا ہے تو اپنی جگہ درست ہے جو عورت دو شوہروں کو بھگتا چکی ہو وہ اسے بھی چھوڑ سکتی ہے۔ ایسے میں اس کی زندگی ویران ہو جائے گی۔ وہ پھر اتنی بڑی دنیا میں اکیلا رہ جائے گا۔

اس پہلو سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں اس سے جھوٹ بول رہی تھی۔ جھوٹ کے جواب میں مجھے جھوٹ ہی ملنا چاہئے تھا۔ وہ باہر جانے کے لئے مجبور تھا اس لئے جھوٹا رشتہ قائم کر رہا تھا۔ اگر میں سچ کہہ دیتی کہ آج تک کسی کی دلہن نہیں بن سکی۔ مذہب اور قانون کی اجازت سے میری زندگی میں آنے والے تم پہلے مرد ہو تو وہ پوری سچائی اور محبت سے مجھے گلے لگا لیتا۔ یوں ہم ایک خوشگوار زندگی کی ابتداء کر لیتے۔

میں نے کہا۔ "تمہاری اس بات میں سچائی ہے کہ جب میرے عادی ہو جاؤ گے پھر میں تمہیں چھوڑ کر جاؤں گی تو میرے بغیر نہیں رہ سکو گے۔ تمہارے پیار کی یہ سچائی دیکھ کر آج یہ سچ کہہ رہی ہوں کہ نہ کبھی میری شادی ہوئی تھی' نہ کوئی بچہ ہے۔"

وہ ایک دم خوش ہو کر بولا۔ "سچ کہہ رہی ہو؟"

"بالکل سچ۔ میں تمہیں آزمانا چاہتی تھی۔ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ صرف میرے بدن سے لگاؤ ہے یا اس سے قطع نظر میری ذات سے' میری شخصیت سے بھی محبت ہے۔"

"تم نے یہ سوال پہلے کیا ہوتا تو میں جواب دیتا کہ باذوق شخص پہلے کتاب کا سرِورق دیکھتا ہے کہ وہ کس حد تک خوبصورت ہے اور اس کا عنوان کیسی معنویت رکھتا ہے اس کے بعد وہ کتاب کھول کر پڑھتا ہے۔ کتاب اندر سے خوبصورت ہو تو اس کی خوبی کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ ہر عورت ایک کتاب ہے جس کا سرِورق پہلے دیکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ اس سرِورق میں کشش ہو تو پھر دین مہر کی ادائیگی کے وعدے پر وہ کتاب کھول کر پڑھی جاتی ہے اس کے بعد اس عورت کی ذات اور شخصیت سے محبت ہوتی ہے مگر تم خلافِ دستور پہلے اپنی شخصیت کا اعتراف کرانا چاہتی تھیں۔"

میں نے ندامت سے کہا۔ "واقعی مجھ سے بھول ہوئی ہے۔ تم نے بڑے سلیقے سے سمجھایا ہے۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ اور عمل مرد کا ہوتا ہے۔ عورت اس کے ساتھ چلتی ہے۔"

"میرا جی چاہتا ہے ابھی تمہیں دلہن بنا کر لے چلوں لیکن میرا گھر اس قابل نہیں ہے کہ دو افراد کا گزارا ہو سکے۔ چونکہ تنہا تھا اس لئے چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا ہوٹل میں کھاتا تھا اور حمام میں جا کر غسل کرتا تھا۔ اب دو کمروں کا ایسا مکان تلاش کروں گا جس میں کچن اور غسل خانہ بھی ہو اور کسی اچھے علاقے میں ہو۔"

یہ میرا برسوں کا خواب تھا کہ میرا جیون ساتھی مجھ سے ایک گھر آباد کرے۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔ "ہم دونوں مل کر اچھا سا مکان تلاش کریں گے۔ چولہا ہانڈی' برتن' الماری' بستر اور فرنیچر وغیرہ خریدیں گے۔ ہمارے گھر میں ضرورت کا ہر سامان ہو گا۔"

وہ کچھ پریشان سا ہو گیا تھا لیکن مسکرا رہا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ قلاش تھا اسے گیراج سے ایک ہزار روپے ماہانہ ملتے تھے اتنی ساری ضروریات کا سامان خریدتے خریدتے سال چھ مہینے گزر جاتے حالانکہ اُن دنوں آج جیسی مہنگائی نہیں تھی۔ دو کمروں کا مکان آنگن کے ساتھ اچھے علاقے میں ماہانہ سو روپے تک کرائے پر مل جاتا تھا اور اسے حاصل کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔

ہم نے دوسرے دن پاپوش نگر میں ایک مکان پسند کیا۔ مالک مکان نے بتایا کرایہ سو روپے ہے اور چھ ماہ کی پیشگی رقم ادا کرنی ہو گی۔ جواد نے کہا۔ "ہمیں ایسا مکان دیکھنا چاہئے جس کا کرایہ ساٹھ ستر روپے ہو اور پیشگی بھی کم ہو۔"

میں نے پرس میں سے چھ سو روپے نکال کر مالک مکان کو دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ ہوادار مکان پسند ہے۔ آج سے ہم آپ کے کرایہ دار ہیں۔"

ہم مکان کی چابیاں لے کر کار میں آ بیٹھے۔ جواد نے کہا۔ "تم نے پیشگی رقم ادا کر کے مالک مکان کے سامنے مجھے شرمندہ کیا ہے۔"

"تم خوامخواہ شرمندہ ہو رہے ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں دنیا یہی سمجھے گی کہ میرے پرس میں تمہاری کمائی ہے جسے میں خرچ کر رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے کہ دنیا یہی سمجھے گی لیکن مکان تو مجھے لینا چاہئے' گھر تو مجھے آباد کرنا چاہئے۔"

"ہم دونوں الگ نہیں ہیں۔ جو تمہارا ہے وہ میرا ہے۔ جو میرا ہے وہ تمہارا ہے۔"

"میرا تو کچھ بھی نہیں ہے' جو تمہارا ہو سکے۔"

"تم جو ہو۔ تمہارے بعد مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔"

میں نے اس کے شانے پر سر رکھ دیا۔ مجھے ایسی مسرتیں مل رہی تھیں جو اب تک خواب تھیں اور ایک نیا گھر' اپنا گھر بسانے کی مسرتوں کو تو صرف ایک عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔ اس گھر کے لئے وہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتی ہے۔ میں ہر ماہ چار پانچ سو روپے بچایا کرتی تھی۔ دس برسوں میں میرے پاس کثیر رقم جمع ہو گئی تھی۔ جس طرح ایک مرد تمام عمر کی کمائی اپنی گھر والی پر خرچ کرتا ہے اسی طرح میں اپنے گھر والے پر خرچ کر رہی تھی۔ میں نے تین دنوں میں چولہے ہانڈی اور گھر گرہستی کا تمام سامان خرید کر اس گھر کو فرنیچر اور پردوں سے آراستہ کر دیا۔

مالک مکان کی ایک بیوی اور دو جوان بیٹیاں تھیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اسی گھر میں جواد فہمی سے میرا نکاح پڑھایا جائے گا۔ لاہور سے میری سرپرست ڈاکٹر ساجدہ راٹھور آئیں گی اور جواد فہمی کے چند دوست بھی شریک ہوں گے۔ مالک مکان کی بیوی نے نکاح پڑھوانے اور باراتیوں کو کھلانے پلانے کا سارا انتظام اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ میں نے اسے مزید ایک ہزار روپے دے دیئے تھے۔ ڈاکٹر ساجدہ راٹھور نے فون پر وعدہ کیا تھا کہ وہ شام کی فلائٹ سے آئیں گی اور میری خوشیوں میں شریک رہ کر چند گھنٹوں کے بعد واپس چلی جائیں گی' انہوں نے وعدہ پورا کیا اور یوں میری شادی اور خانہ آبادی کا مرحلہ طے ہو گیا۔

مالک مکان کی بیٹیوں نے دلہن کا کمرا بڑی خوبصورتی سے سجایا تھا۔ میں نے سرخ جوڑے میں پھولوں کی سیج پر بیٹھ کر اس کمرے کو دیکھا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دس برس پہلے درندوں نے مجھ سے یہ حق چھین لیا تھا کہ کبھی مجھے عزت آبرو سے سہاگ کی سیج نصیب ہو گی۔ اب نصیب ہوئی تو خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے آنکھیں بھیگ گئیں۔

اس رات میں نے جواد کو اپنے وجود کی پاکیزگی اور سچائی دی۔ سچائی اس لئے کہ میرے کردار میں کوئی غلاظت نہیں تھی۔ دس برس پہلے میں جبراً جس طرح میلی کی گئی تھی اس میل کو رگڑ رگڑ کر دھونے اور ختم کرنے کے لئے کسی مرد کو چور راستے سے آنے نہیں دیا۔ سہاگ کی سیج پر کہہ سکتی ہوں کہ میں جواد کے لئے دس برس تک جذبات کو کچلتی رہی اور جو شیطانی خواہشات کم عمری میں پیدا کر دی گئی تھیں انہیں نوچ نوچ کر اپنے اندر سے نکالتی رہی۔ میں نے نیک نیتی سے اپنے کردار کی تطہیر کی تھی۔ جس کے صلے میں مجھے جواد جیسا گبھرو مرد حاصل ہوا تھا۔

اس رات میں نے کہا۔ "میرے جسم و جان کے مالک! میں بیان نہیں کر سکتی کہ اپنا گھر آباد کر کے کتنی خوشی مل رہی ہے اگر یہ مکان ہمارا اپنا ہوتا تو کہیں زیادہ مسرتیں حاصل ہوتیں۔"

اس نے کہا۔ "جب ہم دو چار برس کے بعد عراق سے واپس آئیں گے تو ہمارے پاس لاکھوں روپے ہوں گے۔ لاکھ ڈیڑھ لاکھ میں پکی چھت والا بڑا سا مکان بنا لیں گے۔"

میں نے کہا۔ "انشاء اللہ! صرف دو برس میں کافی رقم ہو جائے گی۔ میں چاہوں تو کل ہی سے ایک چھوٹے سے مکان کی تعمیر شروع کروا سکتی ہوں۔ میرے پاس تقریباً چالیس ہزار روپے ہیں۔"

وہ لیٹا ہوا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ "چالیس ہزار؟ کیا تم نے چالیس ہزار روپے کہا ہے؟"

مجھے اس کی حیرانی سے خوشی ہوئی اور یہ فخر بھی کہ میں ایک چونکا دینے والی رئیسہ ہوں۔ اس نے سرہانے کے لیمپ کو آن کر کے مجھے مسکراتے ہوئے دیکھا پھر پوچھا۔ "مذاق کر رہی ہو؟"

میں نے جواب میں اسے بتایا کہ ڈاکٹر ساجدہ راٹھور مجھ پر کس طرح مہربان رہیں اور کس طرح کامیاب زندگی گزارنے کے طور طریقے بتاتی رہیں۔ ان کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے میں نے دس برس میں اتنی رقم جمع کی ہے۔

"اس نے پوچھا۔ "اتنی بڑی رقم کہاں ہے؟"

"لاہور کے ایک بینک میں ہے۔"

"تم یہاں رہتی ہو اور رقم وہاں رکھتی ہو اگر اچانک برے وقت میں رقم کی ضرورت پیش آئے تو؟"

"خدا نہ کرے کوئی برا وقت آئے۔"

"میں بھی یہی کہتا ہوں' خدا نہ کرے کبھی ایسا ہو مگر حادثے اور مصیبتیں اچانک نازل ہوتی ہیں۔"

"اسی لئے شادی کی ہے۔ ایسے وقت میں شوہر کام آتا ہے۔"

"آں؟ ہاں! وہ تو ٹھیک ہے مگر میری تنخواہ بہت کم ہے۔"

"میری تنخواہ اس میں شامل کرو۔ زیادہ ہو جائے گی۔"

"درست کہتی ہو مگر علاج اور دوائیں مہنگی ہوتی جا رہی ہیں۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ مجھے یا خدانخواستہ تمہیں کچھ ہوا تو ہمارا مفت علاج ہو گا۔"

دوائیں بھی مفت ملیں گی۔"

وہ بستر چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ "مجھے چھوڑ کر پریڈ کیوں کر رہے ہو؟"

وہ آیا پھر مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر بولا۔ "تم بہت نادان ہو۔ نادانوں سے بھی زیادہ نادان ہو۔ بھلا کوئی اپنی دولت بھی کسی دوسری جگہ رکھتا ہے۔"

"وہ رقم جہاں بھی ہے محفوظ ہے۔ تم اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟"

"میں تمہیں اور تمہاری ہر چیز کو اپنے پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔"

میں نے بستر پر سے اٹھ کر اٹیچی کھولی۔ اس میں سے بینک کے کاغذات اور ڈپازٹ بک نکال کر دکھائی۔ وہ توجہ سے ایک ایک کو پڑھنے لگا۔ میں نے کہا۔ "تم میری ہر چیز کو اپنے پاس دیکھنا چاہتے ہو اچھی طرح دیکھو۔ یہ کاغذات اسی گھر میں تمہارے قریب رہا کریں گے۔"

"لیکن عاصمہ یہ تو محض کاغذات ہیں۔ رقم تو لاہور میں ہے۔"

"تم کیوں چاہتے ہو کہ وہ رقم یہاں لاؤں؟ کبھی مقدر خراب ہو گا اور رقم کی ضرورت ہو گی تو ایک فون کرنے پر ڈاکٹر صاحبہ میری ضرورت کے مطابق میرا مسئلہ حل کر دیں گی۔"

"ہمارے معاملات میں کسی تیسری ہستی کو نہیں آنا چاہئے۔"

"وہ تیسری نہیں پہلی ہیں۔ تم سے بھی پہلے میری زندگی کو بنانے اور سنوارنے والی ایسی ہستی ہیں جن کے خلاف میں ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کروں گی۔"

"تو پھر صاف کہہ دو میری کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تمہاری نظروں میں میرا کوئی مقام نہیں ہے۔ میری باتوں اور مشوروں میں کوئی وزن نہیں ہے۔ میں بہت ہلکا اور گرا ہوا شخص ہوا ہوں۔"

"کیا اوٹ پٹانگ بول رہے ہو؟ مجھ سے بڑی حماقت ہوئی کہ پہلی ہی رات میں نے اپنے بینک بیلنس کا ذکر کر دیا۔"

وہ منہ پھیر کر لیٹ گیا' میں بھی لائٹ آف کر کے لیٹتے ہوئے بولی۔ "میں نے بینک بیلنس کا ذکر کر کے حماقت نہیں کی' اپنی حیثیت معلوم کر لی۔ تمہیں میری نہیں چالیس ہزار کی ضرورت ہے۔"

میں بھی اس کی طرف سے منہ پھیر کر لیٹ گئی۔ ان لمحات میں میری انا کو ٹھیس پہنچ رہی تھی۔ میں نے اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیا تھا لیکن میری فراخدلی اور نئی دلہن کی سوغات کم پڑ گئی تھی۔ چالیس ہزار کے بغیر میرا کوئی وزن نہیں رہ گیا تھا۔

مجھے ڈاکٹر صاحبہ کی باتیں یاد آئیں۔ انہوں نے حیرانی سے پوچھا تھا۔ "تم نے دو ہی دنوں کی ملاقاتوں میں اسے کیا دیکھ کر پسند کیا ہے؟ میں تمہاری خوشی میں شریک ہونے آئی ہوں رنگ میں بھنگ نہیں ڈالوں گی لیکن تم نے دس برس میں جلدی نہیں کی دو دن میں جلدی کر کے ایسی غلطی کی ہے جس کا احساس تمہیں بعد میں ہو گا۔"

میں نے پوچھا تھا۔ "آپ نے جواد کے سلام کا جواب دیا۔ صرف دو چار باتیں کیں پھر چند منٹوں میں کیسے جان لیا کہ میرا انتخاب غلط ہے؟"

"میں نے کبھی تمہیں کچھ ہدایات دی تھیں جنہیں تم بھول گئیں۔ جو شخص تنہا ہو اور اپنا خاندانی پس منظر بتانے سے گریز کرتا ہو۔ جس کی شادی میں نزدیک و دور کا کوئی رشتے دار نہ آئے تو وہ اپنے خاندان اور اپنے گھر کا دھتکارا ہوا ہوتا ہے۔ تم بھی بے گھر اور بے خاندان ہو لیکن میری اور لاہور وومن ایسوسی ایشن کی سرپرستی تمہیں حاصل ہے۔ کیا جواد معاشرے کے کسی معزز اور معروف شخص کو ضامن یا سرپرست کی حیثیت سے پیش کر سکتا ہے؟"

میں جواب نہ دے سکی۔ کیوں کہ میں نے جواد سے ایسی کوئی ضمانت نہیں مانگی تھی اور اب منہ پھیر کر لیٹنے والا کردار سمجھ میں آ رہا تھا اور آئندہ بھی سمجھنے کے لئے پتا نہیں کیا کچھ رہ گیا ہو گا۔ رات کے پچھلے پہر اس نے کروٹ لی اس کا ہاتھ میرے بدن پر آیا پھر اس نے پوچھا۔ "سو گئیں؟"

میں بھلا کانٹوں کے بستر پر کیسے سو سکتی تھی مگر خاموش رہی۔ اس نے تاریکی میں مجھے اپنی طرف گھما لیا پھر کہا۔ "اٹھو! کیا یہ رات سونے کے لئے ہوتی ہے۔"

میں نے طے کر لیا تھا کہ نہیں بولوں گی لیکن اس کی قربت بڑی ظالم تھی اگر مُردہ ہوتی تب بھی اس کی قربت سے جی اٹھتی۔ وہ بڑا فنکار تھا۔ مُردے جلانا جانتا تھا۔ ساز خاموش پڑا رہے تو اسے بجانا آتا تھا۔ جذبات کی لوڈ شیڈنگ کرو تو سوئچ کے ایک بٹن سے بدن کی کائنات میں بجلی دوڑا دیتا تھا۔ میری بے اختیاری نے سمجھا دیا کہ میں اس کے اختیار میں رہنے لگی ہوں۔

کوئی کب تک سحر پھونک سکتا ہے۔ دوسری صبح سحر نکلی تو ہوشمندی سے سوچنے لگی اب تو یہ اپنا مرد ہو چکا ہے خود کو اس کے حوالے کر چکی ہوں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اسے چھوڑ کر دوسرے کو پکڑوں' میری حیا گوارا نہیں کرے گی۔ ایسی ہی بے راہ روی اختیار کرنی ہوتی تو دس برس تک عزتِ نفس کو برقرار نہ رکھتی لہٰذا قسم کھا لی کہ جوانی کے

آخری دن تک اسے پیار دوں گی اور بڑھاپے کی آخری سانس تک اس کے کام آتی رہوں گی لیکن اس کی خودغرضی اور کم ظرفی سے شکست کھا کر اس کا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔ میں نے عزت دی تھی' کوئی مذاق نہیں کیا تھا۔

ہمارے ابتدائی چند روز بڑے عیش و آرام میں گزرے۔ میں نے اسپتال سے اور اس نے گیراج سے ایک ہفتے کی چھٹی لی تھی۔ ہم راتوں کو جاگتے تھے اور دن کو سوتے تھے۔ وہ پیار و محبت کے دوران مستقبل کو خوشگوار بنانے کے لئے لمبے لمبے منصوبے بناتا تھا جب کہ اس کی جیب میں اپنا ایک روپیہ نہیں ہوتا تھا۔ اس نے مجبوری بتائی تھی کہ شادی کے ایک ہفتے بعد تنخواہ ملے گی۔ میں نے حیرانی سے پوچھا تھا۔ ”تم برسوں سے ملازمت کر رہے ہو اور گیراج کے مالک نے تمہیں شادی کے لئے ایڈوانس رقم نہیں دی۔“

”میں کسی ایک گیراج میں مستقل کام نہیں کرتا ہوں۔ کبھی کوئی زیادہ تنخواہ دیتا ہے یا کبھی کبھی گیراج والے سے جھگڑا ہو جاتا ہے تو میں کام چھوڑ دیتا ہوں۔ بار بار چھوڑ کر جانے والے کو کوئی ایڈوانس نہیں دیتا۔“

”اب تم بیوی والے ہو۔ بچوں والے بھی ہو جاؤ گے۔ تمہاری ذمہ داریاں بڑھتی جائیں گی اب کبھی جھگڑا کر کے کام نہ چھوڑنا۔ یہ مکان کرائے پر لینے اور تمام گھر کا سامان خریدنے سے لے کر شادی تک میری رقم خرچ ہو رہی ہے کیا تم چاہتے ہو آئندہ بھی میں ہی گھر کے اخراجات پورے کرتی رہوں؟“

”بھئی احسان نہ جتاؤ۔ یہ صرف میرا نہیں تمہارا بھی گھر ہے اگر اپنے گھر کے لئے کچھ کرتی ہو تو مجھ پر احسان اور سخاوت نہیں کرتی ہو۔ رہ گئی میری بات تو تنخواہ ملنے دو میں اس گھر میں اپنے کھانے پینے کا بل ادا کر دوں گا۔“

میں نے غصے سے بھڑک کر پوچھا۔ ”کیا میں نے گھر نہیں بسایا ہے؟ ہوٹل کھول رکھا ہے کہ یہاں کھانے پینے کا بل ادا کرو گے۔ کیا تم مجھے ہوٹل میں سونے والی عورت سمجھ کر آتے ہو؟“

”تم احسان جتاؤ گی تو مجھے غصہ آئے گا اور غصے میں تو کوئی بھی الٹی سیدھی بات زبان سے نکل جاتی ہے۔“

”میں الٹی سیدھی بات سننے کی عادی نہیں ہوں۔ اس گھر کے جو اخراجات ہیں وہ ہم آدھے آدھے برداشت کریں گے۔“

”تمہاری تنخواہ زیادہ ہے میری کم ہے اس حساب سے تمہیں زیادہ اخراجات

برداشت کرنا چاہئیں۔“

”مرد تو ہر معاملے میں برتر ہوتا ہے۔ تم تنخواہ کے معاملے میں کم تر کیوں بن رہے ہو۔ زیادہ محنت کرو اوور ٹائم کرو۔“

”میں تو تمہاری توقعات سے زیادہ کما سکتا ہوں اگر میں اپنا گیراج قائم کر لوں' کم از کم ماہانہ دس ہزار کی آمدنی ہوا کرے گی۔“

میں اس کی اونچی اڑان کا مقصد سمجھ گئی۔ اس کی بات سنی ان سنی کر کے کچن میں آ گئی۔ رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ اسے مایوسی ہوئی کہ ماہانہ دس ہزار کی آمدنی کا آئیڈیا مجھے چونکا نہیں سکا تھا۔ وہ کچن میں آ کر بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ میری آمدنی اتنی ہو جائے کہ پھر میں تمہیں ملازمت نہ کرنے دوں۔ اپنی جان کو گھر کی ملکہ بنا کر رکھوں۔“

”جس دن گھر کی ملکہ بن کر آرام کروں گی اس رات گھی کے چراغ جلاؤں گی۔“

”تمہیں ابھی یقین نہیں آئے گا۔ میرے ساتھ ناظم آباد گول مارکیٹ چلو۔ مین روڈ پر گاڑیوں کی ریپئرنگ کا کارخانہ ہے۔ خوب کام چلتا ہے۔ اس کا مالک بنگالی ہے۔ ڈھاکا واپس جا رہا ہے۔ پورا کارخانہ پچیس ہزار میں دے کر جانے کو تیار ہے۔ وہ بھی اس لئے ستا دے رہا تھا کہ مجھ سے برسوں کی یاری ہے ورنہ اس کارخانے کی پوزیشن پچاس ساٹھ ہزار سے کم نہیں ہے۔“

”میں کاروباری باتیں نہیں سمجھتی ہوں۔ تم خود اپنا بھلا برا سمجھو۔“

”میں نے اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہے' اس کارخانے پر ایک بڑا سا سائن بورڈ لگاؤں گا اس پر جلی حرفوں میں لکھا ہو گا۔ عاصمہ کار ریپئرنگ ورکشاپ' نیز نئی اور پرانی کاروں کی خرید و فروخت بھی ہوتی ہے۔“

”میں کہہ چکی ہوں کہ کاروبار کی باتیں مجھ سے نہ کرو اور نہ میرے نام سے کاروبار کرو۔“

”کیا تم اس لئے کترا رہی ہو کہ تمہاری رقم ڈوب جائے گی؟ میری جان! وہ ایسا چلتا ہوا کاروبار ہے کہ ....“

میں نے بات کاٹ کر پوچھا۔ ”میں نے یہ کب کہا ہے کہ اپنی رقم لگا رہی ہوں جس کے ڈوبنے کا اندیشہ مجھے ہے؟ کیا میں نے تمہیں پچیس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا؟“

وہ ذرا ہچکچایا پھر بولا۔ ”میں تمہارا شوہر ہوں' تم سے ملازمت نہیں کرانا چاہتا تمہیں آرام اور سکھ پہنچانے کے لئے کاروبار کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں میرے ساتھ بھرپور تعاون کرنا چاہئے۔“

"جہاں تک تعاون کا تعلق ہے میں تمہارے کارخانے میں مزدوری کر سکتی ہوں لیکن رقم لگانے کی بات نہ کرو۔"

"اعتراض کی کوئی معقول وجہ بتاؤ۔"

"دو وجوہات ہیں۔ بینک کے چالیس میں سے تیس ہزار فکس ڈپازٹ میں ہیں۔ چھ برس گزر چکے ہیں۔ آئندہ چار برس کے بعد وہ رقم دگنی ہو جائے گی۔ مجھے تیس کی جگہ ساٹھ ہزار روپے ملیں گے۔ میں تمہارے کاروبار کے لئے دگنی آمدنی کو لات نہیں ماروں گی۔ چار برس سے پہلے ایک روپیہ بھی بینک سے نہیں نکالوں گی۔"

وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا پھر جھنجلا کر بولا۔ "تم نے فکس ڈپازٹ کی بات پہلے کیوں نہیں بتائی؟"

"میں نے بنک کے تمام کاغذات تمہیں دکھائے تھے۔ مجھے کیا معلوم تھا تم انگریزی اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے ہو۔ میرے اعتراض کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم چھ ماہ کے بعد ملک سے باہر جا رہے ہیں۔ یہاں تم کس کے بھروسے پر کاروبار چھوڑ کر جاؤ گے؟"

"جب کاروبار خوب چلے گا تو میں باہر نہیں جاؤں گا۔"

"میں نے تمہیں یہاں چھوڑ کر جانے کے لئے شادی نہیں کی ہے۔ میں نے تمہاری خاطر عراق جانے کے کاغذات پر دستخط کئے ہیں۔ ہم ہر حال میں وہاں جائیں گے۔ کسی کاروبار کے لئے نہ سوچو۔ ایک کاریگر یا مستری کی طرح پانچ چھ ماہ گزار لو۔ دو سال بعد واپس آ کر سوچیں گے یہاں کیا کرنا ہے۔"

مجھ سے بھاری رقم وصول کرنے کی پلاننگ دھری رہ گئی۔ وہ تلملا کر بولا۔ "میں نے کارخانے کے مالک کو رقم کی ادائیگی کا بڑے فخر سے وعدہ کیا تھا۔ تم نے مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا ہے۔"

"تم اسے منہ نہ دکھاؤ۔ میں جا کر معذرت کر لوں گی' مجھے اس کا پتا بتاؤ۔"

جواد نے پتا نہیں بتایا۔ غصے میں بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ وہ ایسے ہتھکنڈوں سے میری رقم نکلوانا چاہتا تھا۔ میں عام بیویوں کی طرح اس کے پیش کئے ہوئے سبز باغ دیکھ لیتی اس کی باتوں میں آ جاتی تو اپنی ساری جمع پونجی اس کے نامعلوم کاروبار میں ڈبو دیتی۔

☆========☆========☆

اس رات میں نے دستک کی آواز سن کر دروازہ کھولا تو وہ نشے میں لڑکھڑاتا ہوا اندر آیا۔ شادی کے بعد پہلی بار پی کر گھر آیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "اس حالت میں کیوں آئے ہو؟ یہ گھر ہے طوائف کا کوٹھا نہیں ہے۔"

وہ گرج کر بولا۔ "جانتا ہوں یہ ایک مکار عورت کا شیش محل ہے' اس محل میں وہ چالیس ہزار کے جھولے میں جھولتی ہے اور ایک شوہر کی مجبوریوں کا مذاق اڑاتی ہے۔ آج میں نے غم غلط کرنے کے لئے پی ہے۔"

"جواد! میں نے یہ گھر شراب پینے اور غلط طور سے زندگی بسر کرنے کے لئے نہیں بسایا ہے۔ آج میں برداشت کر لیتی ہوں کل سے پی کر آؤ گے تو دروازہ نہیں کھولوں گی۔"

"کیسے نہیں کھولو گی۔ تم بینک کا دروازہ نہیں کھولتی ہو گھر کا دروازہ تو تمہارا باپ بھی کھولے گا۔"

"خبردار! میرے باپ کو بیچ میں نہ لانا۔ ورنہ ...."

بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس نے میرے منہ پر زور کا طمانچہ مارا۔ کیا زبردست ہاتھ تھا۔ میں دوسری طرف گھوم گئی اس نے میرے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر کہا۔ "دو کوڑی کی نرس! تیری اوقات کیا ہے کہ میرے ساتھ بسر اوقات کرے۔ میں مرد ہوں۔ مجبور نہیں ہوں اگر ابھی پاؤں زمین پر ماروں تو چالیس ہزار نوٹ باہر نکل آئیں گے۔"

وہ میرے بالوں کو مٹھی میں لے کر جھٹکے دے رہا تھا۔ میں تکلیف کی شدت سے چیختی ہوئی بولی۔ "جواد! بہت پچھتاؤ گے' یہ گالیاں' یہ زیادتیاں تمہیں بہت مہنگی پڑیں گی۔ خیریت چاہتے ہو تو مجھے چھوڑ دو۔"

اس نے مجھے اور دو چار ہاتھ جمائے پھر زور سے دھکا دیا۔ میں سامنے رکھی سنگار میز کے آئینے سے ٹکرائی۔ آئینہ ٹوٹا تو مجھے اپنے چہرے پر اپنا ہی گرم لہو محسوس ہوا۔ آئینے کے ٹکڑے ٹکڑے میں' میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نظر آئی۔ ہر ٹکڑے پر میرا چہرہ لہولہان دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے زخم کھانے کے بعد مجھے چکرا کر گر جانا چاہئے تھا لیکن میں سخت

جان ہوں۔ ڈاکٹر صاحبہ کے ساتھ آپریشن تھیٹر میں انسانی جسموں کی چیر پھاڑ اور لہو کے اڑتے ہوئے چھینٹے دیکھ چکی ہوں‘ میں نے غرا کر پلٹتے ہوئے جواد کو دیکھا۔ وہ میری طرف پشت کئے جیب سے ایک چھوٹی سی بوتل نکال کر منہ سے لگا رہا تھا۔

میں تیزی سے چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں آئی‘ چابیوں سے الماری کھولی اس میں سے پرس نکالا۔ الماری کو دوبارہ بند کیا پھر ایک چادر اپنے اوپر ڈالی۔ دوسرے کمرے سے اس کی آواز آئی۔ ”اے، تم کہاں ہو؟ ادھر آؤ اور اپنے مجازی خدا کے سامنے کان پکڑ کر معافی مانگو اور وعدہ کرو کل ہی لاہور سے اپنی تمام رقم یہاں ٹرانسفر کرواؤ گی۔“

میں تیزی سے چلتی ہوئی باہر آگئی۔ اپنے چہرے کو اچھی طرح چھپا لیا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ گلیاں سنسان تھیں۔ چاندنی چوک کے پاس ایک ٹیکسی نظر آئی۔ میں نے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”سول اسپتال چلو۔“

ڈرائیور نے سر گھما کر مجھے پچھلی سیٹ پر دیکھا پھر اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ”خوب پردہ ہے کہ چادر میں چھپی بیٹھی ہو۔ کہاں سے بھاگ کے آئی ہو۔ مکھڑا تو دکھاؤ۔“

میں نے چہرے سے چادر ہٹائی تو وہ ایک دم سے گھبرا گیا۔ اسے ایسا ہی لگا ہو گا جیسے لہو میں نہائی ہوئی کوئی چڑیل ٹیکسی میں آگئی ہے۔ وہ ذرا پیچھے ہو کر بولا۔ ”کون ہو تم؟“

”تمہاری ماں ہوں۔ قبر سے اٹھ کر آئی ہوں۔ فوراً اسپتال چلو۔“

”میں نہیں جاؤں گا۔ یہ پولیس کیس معلوم ہوتا ہے۔“

”میں نے تم جیسے لوگوں سے نمٹنا اچھی طرح سیکھ لیا ہے اگر تم نے گاڑی اسٹارٹ نہ کی تو چیخنا شروع کر دوں گی۔ پولیس کو تمہارے خلاف بیان دوں گی کہ تم نے مجھے لہولہان کیا ہے۔“

یہ سنتے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ تیزی سے ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔ ”خدا کے لئے مجھے کسی مصیبت میں نہ پھنسانا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ بیوی بیمار ہے۔“

میں خاموش رہی اس نے مجھے اسپتال پہنچا دیا۔ وہ اسپتال گویا میرا گھر تھا وہاں سب ہی میرے اپنے تھے۔ میری حالت پر سب ہی کو تشویش ہوئی‘ ایمرجنسی کیس اٹینڈ کرنے والے ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”یہ معاملہ کیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”آپ اسے پولیس کیس بنائیں اور میڈیکل رپورٹ کے پیشِ نظر قریبی تھانے کے انچارج کو کال کریں۔“

سب ہی کو مجھ سے ہمدردی تھی۔ وہ میری مرضی کے مطابق عمل کرنے لگے۔ ایک نرس سہیلی نے کہا۔ ”غصہ تھوک دو آخر وہ تمہارا شوہر ہے۔ میاں بیوی میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے‘ گھر کی بات تھانے میں نہ لے جاؤ۔“

”یہی ہم عورتوں کی کمزوریاں ہیں۔ بے چارے شوہر کو سزا سے بچانے کے لئے اس کی عزت رکھنے کے لئے اور اس کی محتاج رہنے کے لئے ساری عمر اس کے لات جوتے کھاتی رہتی ہیں۔ جب ہم قانون کی مدد سے ظالم شوہر کو مہربان بنا سکتی ہیں تو ہمیں ایسا ضرور کرنا چاہئے۔“

تھانے کا انچارج آگیا۔ میری مرہم پٹی ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے پرس میں سے ایک کارڈ نکال کر پولیس افسر کو دیتے ہوئے کہا۔ ”میں لاہور وومن ایسوسی ایشن کی ممبر ہوں۔ اس کی ایک برانچ یہاں بھی ہے۔ ان معزز خواتین کو میری اس حالت کا علم ہو گا تو وہ اس معاملے کو عدالت میں لے جائیں گی۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”ایسے شرابی شوہر کو سخت سے سخت سزا ملنی چاہئے۔ یہ تو خیریت ہوئی کہ صرف پیشانی زخمی ہوئی ہے۔ ورنہ پورا چہرہ بدنما ہو سکتا تھا۔“

افسر نے مجھ سے پوچھا۔ ”سسٹر! تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں تنہائی میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“

ڈاکٹر‘ نرسیں اور وارڈ بوائز وہاں سے چلے گئے۔ میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا پھر افسر کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اپنے پرس سے ایک ہزار روپے نکال کر اس کی جیب میں رکھ دیئے‘ وہ بولا۔ ”یہ کیا کر رہی ہو؟“

میں نے کہا۔ ”اس اسپتال کے ذریعے ہونے والے کتنے ہی پولیس کیس دیکھ چکی ہوں۔ ہمارے آپ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے‘ آگے بولو۔“

”میں اپنے شوہر کو بہت چاہتی ہوں۔ وہ میری زندگی کا پہلا مرد ہے اور وہی آخری ہو گا۔ میں اسے دل سے چاہنے کے باوجود سر پر چڑھانا نہیں چاہتی۔ آپ اسے تھوڑی سزا دیں۔“

”اپنے گھر کا ایڈریس لکھو۔ میرے سپاہی اسے پکڑ کر تھانے لے آئیں گے۔“

میں نے پتا لکھ کر دیا پھر افسر سے پوچھا۔ ”کیا آپ اس سے تحریری بیان لے سکتے ہیں کہ وہ شرابی جواری ہے‘ اس کے برے اعمال کے باوجود اس کی بیوی عاصمہ اس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہے لہٰذا جب تک عاصمہ نہیں چاہے گی وہ اسے طلاق نہیں دے

گا یعنی طلاق یکطرفہ نہیں ہو گی۔ اسے عدالت میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔"

"سسٹر! یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میں اس کے باپ سے بھی ایسا بیان لے سکتا ہوں۔"

ہم کمرے سے باہر آئے۔ افسر نے ایک سپاہی کو میرے گھر کا پتا دے کر کہا۔ "یہاں جواد فہمی نام کا ایک بندہ ہے۔ ابھی نشے میں ہو گا۔ اسے پکڑ کر تھانے لے آؤ۔"

سپاہی چلے گئے۔ ایک سسٹر نے کہا۔ "عاصمہ! آج کی رات تم ہمارے پاس رہ جاؤ۔ شوہر کے پاس نہ جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "یہی تو موقع ہے شوہر کے پاس رہنے کا۔ آج کی رات وہ کبھی نہیں بھلا پائے گا۔"

میں پولیس افسر کے ساتھ تھانے میں آئی۔ وہاں افسر نے مجھے چائے پلائی۔ تھوڑی دیر بعد تین سپاہی جواد کو پکڑ کر لے آئے۔ شاید راستے میں پٹائی کی ہو گی۔ اس لئے وہ قدرے ہوش میں تھا۔

مجھے وہاں دیکھ کر چونک گیا۔ افسر نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "ارے جواد فہمی یہ ہے؟ یہ تو دو بار میرے ہتھے چڑھ چکا ہے۔ کیوں بے! اپنے باپ کو پہچان رہا ہے؟"

جواد نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکا لیا۔ مجھے بڑا ترس آیا پھر میں نے دل کو سخت کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے باپ کو بیچ میں نہ لاؤ لیکن تم شوہروں کو غصہ آتا ہے تو بیوی کو سب سے پہلے ماں باپ کی گالیاں دیتے ہو اور بیچاریاں اسی طرح خاموشی سے سن لیتی ہیں جیسے ابھی تم آفیسر کو باپ سمجھ کر ہاتھ جوڑ رہے ہو۔"

وہ بے بسی سے بولا۔ "میں نشے میں تھا' مجھ سے بھول ہو گئی۔"

میں نے افسر سے پوچھا۔ "میرے میاں صاحب دو بار حوالات میں کیوں آئے تھے؟"

"ایک بار سمندر کے ساحل پر ایک عورت کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔"

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ بدکار بھی ہو گا۔ وہ لالچی اور خود غرض تھا اس کی یہ خرابیاں میرے لئے قابلِ برداشت تھیں لیکن بدکاری سے تو مجھے اپنی زندگی کے پہلے بدکار حادثے سے نفرت چلی آ رہی تھی۔ یہ مجھے نیا زخم لگا کہ دس برس پہلے کی طرح پھر ایک بدکار میری زندگی میں شوہر بن کر آ گیا تھا۔

میں نے حقارت سے کہا۔ "آفیسر! میں اسے معاف نہیں کروں گی اور اس کا پیچھا بھی نہیں چھوڑوں گی۔ آپ اپنی کارروائی کریں۔"

افسر کے حکم سے سپاہی اسے حوالات میں لے گئے تھے تھوڑی دیر بعد اس کی آہیں' کراہیں اور چیخیں سنائی دینے لگیں۔ ایسے وقت میں مجھے ایک سنگدل اور بے وفا بیوی کہا جا سکتا ہے میں مار کھا کر خاموش رہتی تو وفادار کہلاتی۔ ہمارے ہاں وفاداری کی کسوٹی بدل گئی ہے۔

وہ جیسے جیسے چیخ رہا تھا مجھے لاہور کا وہ تھانے دار یاد آ رہا تھا جو پندرہ برس کی ایک لڑکی کی دھجیاں اڑا رہا تھا' وہ لڑکی چیخ رہی تھی چلا رہی تھی' لیکن کوئی اس بے حیا تھانے دار کے عذاب سے بچانے والا نہیں تھا۔ وہ معصوم لڑکی میں تھی' اب سنگدل بن کر اپنے شوہر کی چیخیں سن رہی تھی۔ میرے شوہر نے بھی سمندر کے کنارے اس عورت کی چیخیں نہیں سنی ہوں گی جس کے ساتھ رنگے ہاتھوں گرفتار ہو کر اسی حوالات میں آیا تھا۔ اس نے گھر کے اندر پٹائی کرتے وقت میری بھی چیخیں نہیں سنی تھیں۔ مجھے ایسے ہی حالات نے سنگدل بہری بنا دیا ہے۔

میں نے اس کے لئے گھر لیا تھا' اپنے پیسوں سے اس کی شادی کرائی تھی' اسے ملک سے باہر لے جانے والی تھی۔ ساری زندگی اس کی پرورش کرنے کا حوصلہ رکھتی تھی پھر بھی میں اس کے لئے کچھ نہیں تھی۔ عورت جب تک خود کو کچھ ثابت نہ کرے شوہر کے ساتھ آبرومندانہ زندگی نہیں گزار سکتی۔ ازدواجی زندگی میں ہمیشہ "کچھ نہیں" رہتی ہے۔

جب اسے حوالات سے نکال کر افسر کے سامنے لایا گیا تو وہ مجھے ایسی رحم طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اب میں اس کی نظروں میں "کچھ" ہو گئی ہوں۔

افسر نے پوچھا۔ "کیوں بے! ہڈیاں کیا بول رہی ہیں؟"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "خدا کے لئے مجھے معاف کر دیں۔ میں کبھی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔"

"تیری یہ بیوی کیسی ہے؟"

"حضور! ہیرا ہے۔ نیک بندی ہے۔ میں نے اس کی قدر نہ کی۔"

"چل یہاں بیٹھ جا اور اپنی گھر والی کا قصیدہ لکھنا شروع کر دے۔ یہ کاغذ ہے اور یہ قلم آخر میں یہ ضرور لکھنا کہ بیوی کو کبھی اس کی مرضی کے بغیر نہیں چھوڑے گا۔"

وہ لکھنے لگا۔ "میں مسمی جواد فہمی ولد صمد محمد خان یہ اعتراف کرتا ہوں کہ آج تک میں نے مجرمانہ زندگی گزاری ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ بھی لکھو کہ کیسی مجرمانہ زندگی رہی ہے۔"

اس نے لکھا۔ "میں شراب پیتا ہوں' جوا کھیلتا ہوں' ایک بار جوئے کے اڈے میں

پکڑا گیا۔ دوسری بار سمندر کے کنارے ایک عورت کے ساتھ گرفتار ہوا۔ تھانے میں میرے جرائم کی فائل اور تصویریں موجود ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ لکھو کہ آج میں نے شراب کے نشے میں اپنی شریکِ حیات عامرہ کو قتل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بچ گئی۔ میں ہوش میں آ کر اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوں۔ اگر شریکِ حیات کی غیر طبعی یا حادثاتی موت واقع ہوئی تو میں اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاؤں گا۔"

وہ لکھنا نہیں چاہتا تھا۔ ہچکچانے لگا۔ افسر نے ڈانٹ کر کہا۔ "جب تم گھر والی کی جان کے دشمن نہیں ہو تو لکھو۔ ورنہ یہ سپاہی پھر حوالات میں لے جائیں گے۔"

وہ مجبور ہو کر لکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ "یہ بھی لکھو کہ اپنی وفادار شریکِ حیات کو نہ کبھی طلاق دو گے۔ نہ علیحدگی اختیار کرو گے۔ ایسا کرو گے تو یک طرفہ طلاق کو کورٹ میں چیلنج کیا جاسکے گا۔"

میں نے جیسا چاہا ویسا لکھوایا۔ اس کے اعتراف نامے پر اس نے‘ میں نے اور افسر نے دستخط کئے۔ اس کی کاربن کاپی تھانے میں رکھی گئی۔ اصل تحریر مجھے دے دی گئی۔ اگرچہ وہ اعتراف نامہ مجھے ایک ہزار میں پڑا تھا لیکن اس رقم کے عوض جواد میرے رحم وکرم پر پڑا رہے گا۔ دوست بنے گا تو میں اس کے قدموں میں رہوں گی۔ فرعون بنے گا تو اسے اپنے قدموں میں رکھ چھوڑوں گی مگر اسے نہیں چھوڑوں گی۔

میں اسے تھانے سے اسپتال لے گئی۔ سپاہیوں نے پٹائی کے دوران اوپر زخم نہیں آنے دیا تھا۔ اس کی ہڈیوں کو چوٹ پہنچاتے رہے تھے۔ اس کے نتیجے میں وہ سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ جگہ جگہ سے ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ میں نے اسے اسپتال کے بیڈ پر سیدھا لٹایا۔ ڈاکٹر نے اسے توجہ سے اٹینڈ کیا۔ میں دوائیں لے کر اسے گھر لے آئی۔ پھر دن رات کی تیمارداری میں لگ گئی۔ وہ چپ چاپ سا تھا۔ کبھی کبھی چور نظروں سے دیکھتا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا دیکھتے ہو کیا میں وفادار اور خدمت گزار نہیں ہوں؟"

اس نے نظریں جھکا لیں۔ میں نے کہا۔ "تمہاری حرام کاری کے بعد مجھے طلاق لے لینا چاہئے تھی اس کے برعکس میں نے لکھوایا کہ تم کبھی مجھے طلاق نہیں دو گے۔"

وہ ندامت سے بولا۔ "میں جانتا ہوں تم مجھے دل و جان سے چاہتی ہو۔"

"اور تم کسی اور کے ساتھ منہ کالا کرتے پکڑے گئے تھے؟"

"وہ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ قسم کھا کر کہتا ہوں تمہیں پا لینے کے بعد اب کسی کی ضرورت نہیں رہی۔"

"ایسی ہی باتیں بیویوں کو خوش کرتی ہیں۔ میں تمہیں صرف اپنے نام کر کے خوش ہونا چاہتی ہوں مگر تم نے اعتبار کھو دیا ہے۔"

"میں جلد ہی کھویا ہوا اعتبار بحال کر لوں گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو پھر تم دیکھو گے کہ میں تمہاری کنیز بن کر رہوں گی۔" میں اس کے پاؤں دبا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اپنا سر اس کے قدموں میں رکھ دیا وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ کیا؟ سر اٹھاؤ۔"

میں نے سر اٹھایا۔ میری آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "آج جو کچھ ہوا‘ وہ میں نہیں چاہتی تھی۔ میں نے تو یہ سمجھ کر شادی کی تھی کہ میاں بیوی برابر ہوتے ہیں۔ تم نے مجھے گالیاں دے کر مجھ پر ہاتھ اٹھا کر مجبور کر دیا کہ میں طاقت کا توازن برابر رکھوں۔ بڑے بڑے ممالک بیلنس آف پاور کی بات کرتے ہیں تاکہ کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے اور دنیا میں امن و امان قائم رہے‘ آج سے تم بھی ازدواجی زندگی کا توازن برقرار رکھو گے۔"

کچھ لوگ ایک ٹھوکر کے بعد سنبھل جاتے ہیں کچھ لوگ سنبھلنا نہیں جانتے۔ ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں اور ڈھیٹ بنتے رہتے ہیں اور ایسے فراخدل تو شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے ہیں جو عورت سے مات کھا کر اسے اپنی ذلت نہیں سمجھتے۔ جواد نے تسلیم کیا تھا کہ وہ غلطی پر تھا لیکن اندر ہی اندر بھڑک رہا تھا۔ اس نے بیوی کو ذلیل کیا کوئی بات نہیں‘ بیوی نے اسے کیوں ذلیل کیا؟ یہ ذلت برداشت نہیں ہو پا رہی تھی۔

مجھے پتا نہیں تھا کہ اس کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ وہ نارمل نظر آ رہا تھا۔ میرے ساتھ بڑے پیار سے دن گزار رہا تھا۔ شراب بھی چھوڑ دی تھی۔ اس لئے میں مطمئن ہو گئی تھی اور اسے راہِ راست پر لانے کے لئے جو ایک زیادتی کی تھی‘ اس کی ہر ممکن تلافی کر رہی تھی۔ اس سے یہ نہیں پوچھتی تھی کہ وہ برابر کام پر کیوں نہیں جاتا ہے۔ تنخواہ آدھی کیوں لاتا ہے اور جب میں ڈیوٹی پر جاتی ہوں تو وہ کہاں وقت گزارا کرتا ہے؟

میں اپنی کمائی پر پلنے والے مرد کو ایک حد تک پابند رکھتی تھی۔ تھوڑی سی ڈھیل اس لئے دے دی تھی کہ اسے پھر میری طرف سے زیادتی کا احساس نہ ہو۔ میں نے لاہور میں کبوتر بازی بہت دیکھی تھی اور سوچتی تھی‘ کیا فضول شوق ہے۔ اب یہ شوق بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میرا کبوتر کہیں بھی جاتا تھا‘ رات سے پہلے میرے پاس آ جاتا تھا۔

میں بہت خوش تھی۔ اکثر اسے بازار لے جاتی تھی۔ جوتے‘ جرابیں اور سوٹ کے کپڑے خرید کر دیتی تھی۔ اپنی پسند سے اس کا لباس سلواتی تھی۔ جیب خرچ زیادہ مانگتا تو

ڈانٹ دیتی تھی وہ ناراض ہوتا تو جیب میں نوٹ رکھ کر اسے پیار کرتی تھی۔ جو ہمارے رحم و کرم پر رہے اس پر بڑا پیار آتا ہے۔ اس لئے مرد اپنی وفادار بیویوں کو دل سے چاہتے ہیں۔ اس لئے میں بھی اپنے وفادار پر دل و جاں سے اپنا سب کچھ نچھاور کر رہی تھی۔

میری زندگی کے وہ تین ماہ بڑی مسرتوں میں گزرے۔ میرا خیال تھا' میں نے اپنے شوہر کو ہر پہلو سے جیت لیا ہے اور اسے ہر طرح سے خوش اور مطمئن رکھتی ہوں لیکن ایک رات وہ منہ لٹکا کر میرے پاس آیا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

اس نے کہا۔ ”میرا ایک بچپن کا دوست ہے' حال ہی میں اس سے ملاقات ہوئی ہے۔ آج پتا چلا کہ اس نے اپنی بہن کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے والدین نے اس حرکت سے اسے باز رکھا ہے۔“

”وہ بہن کو قتل کیوں کرنا چاہتا ہے؟“

”وہ خاندان کی بدنامی کا باعث بن گئی ہے' شادی سے پہلے ماں بننے والی ہے۔“

”اوہ خدایا! کس شیطان نے ایسی حرکت کی ہے؟“

”وہ نام نہیں بتاتی ہے۔ خود مرجانا چاہتی ہے لیکن اسے بدنام نہیں کرنا چاہتی۔“

”دیکھو' عورت کیا ہوتی ہے۔ مرد کے لئے کتنی قربانیاں دیتی ہے اور مرد انہیں ذلتیں دے کر منہ چھپالیتے ہیں۔ اس طرح تو اس لڑکی کی زندگی برباد ہو جائے گی۔“

”تم چاہو تو اسے بربادی سے بچا سکتی ہو۔ ایک غلط کام کرنے والی لیڈی ڈاکٹر اسقاط حمل کے لئے دو ہزار مانگتی ہے۔ لڑکی کے والدین بہت غریب ہیں اور اس کا بھائی بے روزگار ہے۔“

”مجھے ان کے گھر لے چلو۔ ایک خاندان کی عزت کا سوال ہے۔ میں یہ مشکل آسان کر دوں گی۔“

”میں نے اپنے دوست سے کہا تھا کہ میری عاصمہ بہت رحم دل اور خدا ترس ہے۔ جب اسے پتا چلا کہ تم یہ کیس ختم کر سکتی ہو تو اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا' میں بھائی کے سامنے نہیں جاؤں گا۔ غیرت اور شرم سے مرجاؤں گا۔ آج وہ حیدر آباد گیا ہے۔ تم ابھی چلو تو بہتر ہو گا۔“

میں ایک بیگ میں ضروری سامان اور دوائیں رکھ کر جواد کے ساتھ لسبیلہ کی ایک گلی میں آئی۔ ایک چھوٹے سے مکان کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ دروازہ ہونے کے باوجود ماں باپ نے غریب کی عزت کو ٹاٹ سے چھپایا تھا مگر عزت پھر بھی لٹ گئی تھی۔ جوانی کو نارمل رکھنے کا نسخہ آج تک بوڑھوں کے ہاتھ نہیں آیا اور یہ بھی ستم

ظریفی ہے کہ اطلس و کمخواب میں لپٹی عورت اتنا نہیں للچاتی جتنا پیوند لگے ٹاٹ کے پیچھے غریب کی جوانی پکارتی ہے۔ جواد نے کہا۔ ”یہ لوگ سخت پردے کے پابند ہیں۔ ماں بیٹی میرے سامنے نہیں آتی ہیں۔ تم اندر جاؤ۔“

میں نے اندر آ کر دیکھا۔ ماں بیٹی فرش پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ باپ ایک ٹوٹی ہوئی چار دیواری میں منہ چھپائے پڑا تھا۔ اس نے آہٹ سن کر مجھے دیکھا میں نے کہا۔ ”میں آپ کے بیٹے کے دوست جواد فہمی کی وائف ہوں۔ میرے خاوند باہر ہیں' آپ بھی جائیں' میں لڑکی کو دیکھوں گی۔“

وہ جلدی سے اٹھا پھر میرے سامنے سے سر جھکا کر گزرتا ہوا باہر چلا گیا۔ لڑکی منہ چھپا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”اب منہ چھپانے سے کیا حاصل ہو گا؟ لیٹ جاؤ۔“

وہ دونوں ایک چٹائی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ماں ایک طرف ہٹ گئی۔ بیٹی لیٹ گئی' میں نے اسے چیک کرنے کے دوران کہا۔ ”میں تمہاری مشکل آسان کرنے آئی ہوں اس بدنامی سے ابھی نجات مل جائے گی لیکن مجرم کو سزا ملنی چاہئے۔ مجھے اس کا نام اور پتا بتاؤ۔ میں تم سے شادی کرنے پر اسے مجبور کر دوں گی۔“

ماں نے کہا۔ ”میرا بیٹا شرم سے گھر نہیں آتا ہے۔ تم یہ بات گھر سے باہر لے جاؤ گی تو وہ گھر کے ساتھ ہمیں بھی چھوڑ کر چلا جائے گا۔ بس بیٹی' آج یہ مہربانی کر دو۔ ہم کل ہی سے کوئی رشتہ ڈھونڈیں گے۔ جوان ہو' بوڑھا ہو' گورا ہو' کالا ہو جو بھی ملے گا اس کے پلے باندھ دیں گے۔“

میں نے دروازے پر آ کر جواد سے کہا۔ ”لڑکی کمزور ہے۔ مجھے گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا اس کے نارمل ہونے تک رہنا ہو گا۔ تم یہ انجکشن لے آؤ۔“

میں نے ایک انجکشن لکھ کر دیا۔ وہ چلا گیا۔ کمرے میں ہم تین عورتیں رہ گئیں۔ میری ہدایت پر اس کی ماں پانی گرم کرنے چلی گئی۔ میں نرس کے علاوہ مڈوائف کے فرائض بھی انجام دیتی تھی۔ اکثر گھروں میں زچگی کے سلسلے میں جاتی تھی۔ اس مقصد کے لئے میں نے ایک بیگ میں ضرورت کا سامان رکھا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر تو نہیں تھی لیکن نصف ڈاکٹر ضرور بن گئی تھی۔

نصف گھنٹے بعد میں نے اسے انجکشن لگایا پھر گرم دودھ پلانے کے لئے کہا۔ ان کے پاس دودھ کے پیسے نہیں تھے۔ میں نے اس کے باپ کو ایک سو روپے دے کر کہا۔ ”کوئی دکان کھلی ہو تو ہارلکس' کچھ پھل اور دودھ لے آنا۔“

جوان بیٹی کی ماں مجھے دعائیں دے رہی تھی ایک گھنٹے بعد جواد انجکشن لے کر آیا۔

میں نے پوچھا۔ ”اتنی دیر کر دی؟“

”کیا کروں؟ اتنی رات ہو چکی ہے۔ ساری دکانیں بند ہو گئیں ہیں۔ ادھر گول مارکیٹ سے دوا لینے گیا تو واپسی کے لئے نہ رکشا مل رہا تھا' نہ ٹیکسی بڑی مشکل سے ایک رکشے والا ملا اسے زیادہ پیسے دے کر آیا ہوں۔ اسے روک رکھا ہے کیا واپس چلو گی؟“

میں نے دوسرا انجکشن اسے لگایا چونکہ یہ کیس ابتدائی مہینوں کا تھا اس لئے لڑکی کو خطرہ نہیں تھا۔ میں نے دوائیں لکھ کر دے دیں پھر جواد کے ساتھ رکشے میں بیٹھ کر چاندنی چوک تک آئی۔ ہماری گلی میں پائپ لائن بچھانے کے لئے گڑھے کھودے گئے تھے۔ ہم گلی کے سرے پر اتر گئے۔ رکشے والے کو کرایہ دے کر رخصت کیا پھر پیدل مکان کی طرف چلے۔ اس گلی میں پانچواں مکان ہمارا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی میرے منہ سے ہلکی سے چیخ نکل گئی تالا ٹوٹا ہوا چوکھٹ پر پڑا تھا اور دروازہ کھلا ہوا تھا۔

میں نے بڑے پیار سے وہ گھر آباد کیا تھا۔ ایسے گھر کے دروازے کا تالا ٹوٹے تو سب سے پہلے عورت کا دل ٹوٹتا ہے۔ چوری اور نقصان کا صدمہ بعد میں ہوتا ہے۔ جواد نے کہا۔ ”اوہ گاڈ! یہ کیا ہو گیا؟“

ہم تیزی سے اندر آئے۔ جواد نے سوئچ آن کیا۔ سب سے پہلے کارنر ٹیبل پر نظر گئی۔ وہاں سے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی غائب تھا۔ ان دنوں ہمارے ملک میں رنگین ٹی وی سیٹ نہیں پہنچے تھے۔ بلیک اینڈ وائٹ بہت اہم اور قیمتی سمجھے جاتے تھے۔ اس کمرے میں رکھا ہوا ریڈیو بھی نظر نہیں آیا۔ ہم بھاگتے بھاگتے دوسرے کمرے میں آئے تو میں الماری کو دیکھتے ہی ٹھٹک گئی۔ چند لمحوں کے لئے مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ جیسے کسی کے خواب ٹوٹتے ہیں ویسے ہی وہ الماری ٹوٹ گئی تھی۔

اس کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ الماری کی اندرونی سیف کا لاک بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے قریب جا کر دیکھا۔ چوروں نے اندر جھاڑو پھیر دی تھی۔ وہاں میرے ڈھائی ہزار روپے نقد اور دس ہزار روپے کے زیورات رکھے ہوئے تھے۔ اب وہاں ایک تنکا بھی نہیں تھا۔

چوری کرنے والے صرف نقدی اور زیورات ہی نہیں' ہمارا نکاح نامہ اور جواد کا وہ اعتراف نامہ بھی لے گئے تھے جو اس نے تھانے میں اپنے جرائم کو قبول کرتے ہوئے لکھا تھا۔ بینک کے کاغذات اور ڈپازٹ بک الماری کے باہر پڑے ہوئے تھے۔ یہ چیزیں ان کے کام کی نہیں تھیں اس لئے پھینک گئے تھے لیکن ہمارا نکاح نامہ اور جواد کا اعتراف نامہ بھی ان کے کسی کام نہ آتا پھر وہ اسے کیوں لے گئے؟

میں نے الماری کے تمام کپڑے ہٹا ہٹا کر دیکھے حالانکہ وہ کاغذات وہاں نہیں سیف میں رکھے تھے پھر بھی پوری الماری کھنگال کر دیکھ لی۔ جواد کمرے کی دوسری چیزیں دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”یہاں تو سب موجود ہے۔ وہ اس کمرے سے ٹی وی اور ریڈیو لے گئے' الماری میں کیا تھا بتاؤ؟“

”کیا بتاؤں؟ کیا تم نے نہیں دیکھا تھا دلہن بننے کے لئے دس ہزار کے زیورات بنوائے تھے۔ تین ہزار نقد تھے' پانچ سو پرس میں لئے گئی تھی۔ ڈھائی ہزار سیف میں رکھ دیئے تھے۔ ہمارا نکاح نامہ اور وہ تمہارا تھانے والا اعتراف نامہ ....“

میں بولتے بولتے جواد کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گئی۔ وہ ذرا سٹپٹایا۔ ذرا نظریں چرائیں پھر بولا۔ ”تت .... تم مجھے اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ چور تمہارا اعتراف نامہ کیوں لے گئے ہیں؟“

وہ انجان بن کر بولا۔ ”کیا میرا لکھا ہوا کاغذ بھی لے گئے ہیں؟“

”ہاں اور نکاح نامہ بھی۔“

اس نے کہا۔ ”چور کی اس حرکت سے پتا چلتا ہے کہ وہ جاہل گنوار تھے۔ پڑھے لکھے ہوتے تو ان کاغذات پر ایک نظر ڈال کر سمجھ لیتے کہ وہ ان کے مطلب کی چیز نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”وہ پڑھنا جانتے تھے تب ہی بینک کے کاغذات پھینک کر گئے ہیں کیوں کہ ان کاغذات کے ذریعے میرے اکاؤنٹ سے رقم نہیں نکال سکتے تھے۔“

”ہمارا نکاح نامہ وغیرہ چرا کر وہ کیا حاصل کریں گے؟“

میں نے کہا۔ ”یہ تو اب پولیس والے ہی معلوم کریں گے۔“

میں نے اتنی رات کو قریبی تھانے میں جا کر چوری کی رپورٹ درج کرائی اور پولیس کو گھر لے آئی۔ تھانے دار نے اچھی طرح معائنہ کرنے اور تفتیش کرنے کے بعد واضح طور سے کہا۔ ”بی بی .... عاصمہ! اعتراف نامے کی چوری سے صرف تمہارے شوہر جواد صاحب کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔“

جواد نے کہا۔ ”آفیسر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟“

”تمہاری وائف کے بیان کے مطابق تم نے ایک تھانے میں بیٹھ کر تھانے دار کے سامنے اپنے جرائم کا تحریری اعتراف کیا تھا۔ اس کا مطلب ہے بہت مجبوری میں ایسا کیا تھا۔ اب وہ اعتراف نامہ غائب ہو گیا ہے۔ تمہارے دامن سے تمام دھبے مٹ گئے ہیں۔“

”جناب! یہ تو سوچیں۔ وہ یہاں سے چوری ہو گیا تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا

کیوں کہ اس کی کاربن کاپی عید گاہ تھانے کے ریکارڈ میں موجود ہے۔"

تھانے دار نے کہا۔ "بچو! میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ پندرہ دن پہلے اس تھانے میں آگ لگ گئی تھی۔ وہاں کی تمام فائلیں اور مجرموں کی تصویریں وغیرہ جل گئی ہیں۔ تمہارے دامن پر داغ لگانے والی اور تمہیں بیوی کے قابو میں رکھنے والی صرف ایک تحریر اس الماری میں تھی جو آج یہاں سے غائب ہو گئی اور وہ اب کبھی نہیں ملے گی۔ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ اپنے ہی گھر میں چوری کا اعتراف کر لو۔"

میں کشمکش میں تھی۔ تھانیدار کی ایک ایک بات درست لگ رہی تھی لیکن دل نہیں مان رہا تھا کہ جواد نے ایسا کیا ہے۔ میں نے کہا۔ "آفیسر! یہ میرے ساتھ گھر سے نکلے تھے۔ دو گھنٹے تک میری ساتھ باہر رہے۔ اسی دوران چوری ہوئی ہے۔ میں گواہ ہوں کہ اس چوری میں میرے شوہر کا ہاتھ نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے' یہ تمہارے ساتھ تھے۔ چوری نہیں کر سکتے تھے لیکن چوری کرا تو سکتے ہیں۔"

میں نے چونک کر جواد کو دیکھا۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر بولا۔ "عاصمہ! یہ چوری تو میرے لئے مصیبت بن گئی ہے۔ تمہیں قسم ہے ایسے جبری الزام پر شبہ نہ کرنا۔ میری بے گناہی کی ایک تم ہی گواہ ہو' اگر یہ شبہ ہے کہ میں کسی کے ذریعے چوری کرا سکتا ہوں تو پہلے اس شبہے کی تصدیق کرو۔ ہم ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں' صرف شک کی بنا پر اس زندگی کو عذاب نہ بناؤ۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے آفیسر! آپ کسی طرح چوری کا مال برآمد کر لیں پھر چور بھی پکڑا جائے گا۔ میں وہ ساری نقدی اور زیورات آپ کے قدموں میں رکھ دوں گی' مجھے صرف وہ اعتراف نامہ چاہئے۔ چور ہمیں اسے چوری کرنے کا مقصد بتائے گا۔"

تھانے دار نے کہا۔ "اچھی بات ہے' اب میں چور کو مرغا بنا کر تمہارے سامنے لاؤں گا۔ ذرا میرے ساتھ باہر چل کر ایک بات سن لو۔"

میں جواد کو گھر میں چھوڑ کر باہر آئی۔ تھانے دار نے دھیمی آواز میں راز داری سے کہا۔ "بی بی! تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے اگر تھانے میں تحریری رپورٹ نہ کراؤ تو نقدی اور زیورات کی چوری کا کوئی ریکارڈ درج نہیں ہو گا۔ وہ میں رکھ لوں گا' چور اور اعتراف نامہ تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

میں اصل چور پکڑوانا اور اس سے اگلوانا چاہتی تھی کہ نکاح نامہ اور اعتراف نامہ چرانے کے مقاصد کیا رہے تھے۔ میں راضی ہو گئی۔ تھانے دار نے کہا۔ "پھر تو تم آرام

سے گھر میں رہو۔ میں چور کے پورے خاندان کو پکڑ کر لے آؤں گا۔ ویسے ایک سوال ہے۔ یہ بتاؤ جب چوری کی واردات ہوئی تو تم اپنے شوہر کے ساتھ کہاں گئی تھیں؟"

"میں مڈوائف ہوں۔ ایک زچگی کے سلسلے میں گئی تھی۔"

"زچگی کے معاملے میں تمہارے شوہر کیا کر رہے تھے؟"

"جواد کے دوست کی بہن کا کیس تھا۔ وہی مجھے وہاں لے گئے تھے۔"

"کیا تمہارا شوہر اس سے پہلی بھی کوئی زچگی کا کیس لایا تھا؟"

"نہیں' ایسا پہلی بار ہوا ہے۔ یہ ان کے دوست کا معاملہ تھا۔"

"زچگی میں کتنا وقت لگا؟"

"تقریباً ڈیڑھ گھنٹا۔"

"اس دوران جواد صاحب کیا کرتے رہے؟"

"میں نے ایک انجکشن لانے کو کہا تھا۔ رکشا' ٹیکسی نہ ملنے کے باعث وہ ایک گھنٹے بعد واپس آئے تھے۔"

"اوہ آئی سی۔" اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلا کر کہا۔ "اب مجھے اس مکان کا پتا بتا دو۔"

میں نہیں چاہتی تھی کہ تھانے دار وہاں جائے اور ایک غریب لڑکی کا پول کھل جائے۔ میں نے پوچھا۔ "آپ اس مکان کا پتا کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

اس نے سوال کیا۔ "تمہیں بتانے میں کوئی اعتراض ہے؟"

"نہیں .... مگر........." میں ہچکچانے لگی۔

"دیکھو بی بی! مجھ سے چھپاؤ گی تو چور ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"آفیسر! ایک غریب لڑکی کی عزت کا سوال ہے۔ آپ وہاں جائیں گے تو بات بڑھ جائے گی۔ وہ بے چاری بدنام ہو جائے گی پھر کہیں اس کی شادی نہیں ہو سکے گی۔"

"میں سمجھ گیا' تم نے خلاف قانون کیس بھگتایا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ تمہاری طرف سے مجھے کافی مال مل رہا ہے' اس لئے میں اس غریب لڑکی کو بدنام نہیں ہونے دوں گا۔ ہم جس سے مال کھاتے ہیں اس سے وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ میں وعدہ کرتا ہوں صرف اپنے طور پر انکوائری کر کے وہاں سے آ جاؤں گا۔ لڑکی نیک نام رہے گی۔"

میں نے اس مکان کا پتا بتا دیا۔ تھانے دار نے کہا۔ "ایک مشورہ دیتا ہوں اس پر عمل کرو۔ اپنے شوہر کو یہ نہ بتاؤ کہ تم نے اس مکان اور لڑکی کے متعلق مجھ سے گفتگو کی ہے۔"

"آپ کی تفتیش کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔ میں جواد کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ چلا گیا۔ میں اندر آئی' جواد بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "وہ اتنی دیر تک کیا بکواس کر رہا تھا؟"

"الٹے سیدھے سوالات کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں تم پر شبہ کروں۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ میرے شوہر کو چور کہہ کر میری توہین نہ کرو۔"

"تم نے بہت اچھا کیا۔ پتا نہیں وہ کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

"پولیس والے تو اپنے باپ پر بھی شبہ کرتے ہیں۔ چلو دروازہ بند کرو' بتی بجھاؤ' میں تھک گئی ہوں۔"

میں بستر پر بیٹھ گئی۔ ایک بھرپور انگڑائی لے کر لیٹ گئی۔ اس نے باہر کا دروازہ بند کرنے کے بعد بتی بجھا دی۔ میں اس کے پاس پہنچ کر ساری دنیا کو بھول جاتی تھی' ایسے وقت سوچنا سمجھنا اچھا نہیں لگتا تھا لیکن اس رات میں سوچتی رہی خود کو اس کے اختیار میں دے کر بھی میں اپنے اختیار میں رہی۔ میرا ذہن کہتا رہا کہ یہ ابھی میرے سامنے مجھے محبت سے خرچ کر رہا ہے لیکن پیٹھ پیچھے پوری طرح خرچ کر کے کنگال بنا چکا ہے۔ میں جن کمزوریوں کی وجہ سے اسے اپنے بنا کر رکھنا چاہتی تھی ان کمزوریوں کو مٹا چکا ہے۔ اب یہ ایک ہی مجبوری کے تحت میرے پاس رہے گا کہ میں اس کے رہنے کے لئے مکان کا کرایہ دیتی ہوں۔ اگر میری جیسی کوئی دوسری پرورش کرنے والی مل جائے گی تو مجھے چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔

اس رات میں ایسی بیوی تھی جو شوہر سے مات کھانے کے بعد حالات سے مجبور ہو کر گزارہ کرتی ہے۔

اگر اسی نے چوری کرائی تھی تب بھی میں ثبوت کے بغیر شکایت یا جھگڑا کرتی تو وہ عالمِ طیش میں گھر سے چلا جاتا اور میں کبھی اپنی زندگی سے اسے جاتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ایک بار اس نے کہا تھا کہ اگر میں تمہارا عادی ہو جاؤں گا تو تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ آج میرا دل' میرا دماغ اور میرے تقاضے کہہ رہے تھے کہ میں اس کی عادی ہو چکی ہوں وہ مجھے چھوڑ کر جائے گا تو اس کے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔

دو دن بعد ہی ایسا ہوا' وہ شام کو نہیں آیا۔ میں نے رات کے کھانے پر انتظار کیا۔ ایسے وقت میں محبت کو اندر چھپا لیتی تھی۔ یہ ظاہر کرتی تھی کہ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ میں اس کے انتظار میں بھوکی رہنے والی احمق بیوی نہیں ہوں۔ اس رات بھی میں

نے روٹی کھا لی لیکن اس کی بغیر سو نہ سکی۔ آدھی رات کے بعد تشویش ہوئی کہ وہ کہاں رہ گیا ہے؟

میں نے کئی بار سونے کی کوشش کی' اگر وہ رات کے کسی حصے میں آ کر مجھے نیند میں دیکھتا تو ثابت ہو جاتا کہ میں اس کے بغیر گہری نیند ہو سکتی ہوں لیکن میری بے ایمان آنکھیں اس کے لئے جاگتی رہیں۔ یہ میری آنکھیں تھیں اور میرے کہنے پر نہیں سو رہی تھیں' اسے مانگ رہی تھیں۔

صبح ہو گئی پھر شام ہو گئی۔ میں نے گیراج میں جا کر معلوم کیا' پتا چلا وہ دو دن سے کام پر نہیں آ رہا ہے۔ میں نے اسپتال سے ایک وارڈ بوائے کو ساتھ لیا وہ جواد کو جانتا تھا۔ میں اسے شہر کے کئی شراب خانوں اور قمار خانوں میں لے گئی۔ خود اندر جانا مناسب نہیں تھا۔ وارڈ بوائے اندر جا کر اسے تلاش کر رہا تھا۔ وہاں کے مالکان سے اس کے متعلق پوچھا تھا لیکن سب لاعلمی ظاہر کرتے تھے۔

میں تھک ہار کر گھر آ گئی' رات کے گیارہ بجے تھے۔ وہ دوسری رات بھی نہیں آیا۔ بھوک اور تھکن سے برا حال تھا۔ کھانے پینے کو دل نہیں چاہتا تھا مگر زندہ تو رہنا تھا۔ انڈا فرائی کر کے ڈبل روٹی کے ساتھ کھایا۔ پچھلی رات سے جاگ رہی تھی۔ ایک ذرا پلک نہیں جھپکائی تھی۔ سوچا کرسی پر بیٹھے بیٹھے ذرا آنکھ جھپک لوں اس سے پہلے میں نے باہر والے دروازے کو کھول دیا اگرچہ اس کے پاس چابی تھی۔ دل نے کہا۔ شاید چابی کھو گئی ہو اسے دروازہ کھلا ملنا چاہئے۔ چوروں کی پروا نہیں تھی۔ جب وہ میرا سکون چرا کر لے گیا تھا تو چور میرا اور کیا لے جاتے۔

میں کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی پھر پتا نہیں چلا کہ کب نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو صبح ہو گئی۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ کر دیکھا۔ شاید وہ بستر پر سو رہا ہو مگر وہ نہیں تھا۔ غسل خانے میں بھی نہیں تھا۔ ایک دم سے یوں لگا میرا دل خالی ہو گیا ہے اب یہ کبھی دھڑکنوں سے نہیں بھرے گا۔ خالی ہی رہے گا۔ معلوم نہیں کتنے عرصے کے بعد میں بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جس جگہ وہ سوتا تھا اسی جگہ اوندھی ہو گئی۔ بستر سے بولنے لگی۔ "کہاں چلے گئے ہو؟ ابھی آ جاؤ۔ میرا دم الجھ رہا ہے۔"

سچ مچ ایسا ہی لگ رہا تھا اس کی ہر یاد کے ساتھ سانس روک لیتی تھی کہ وہ باہر نہ جائے پھر الجھ الجھ کر سانسوں کو چھوڑنے اور پکڑنے لگتی تھی۔ ہائے ربا! اسے کہاں پکڑوں؟

میں نے اسپتال سے چھٹی لے لی تھی۔ دن رات گھر میں رہتی تھی۔ پتا نہیں وہ

کب آ جائے۔ میری عجیب حالت ہو گئی تھی۔ تمام دن بھوکی رہنے کے بعد مجبور ہو کر تھوڑا کھاتی تھی۔ تمام رات جاگتے رہنے کے بعد صبح تھوڑا سا سوتی تھی پھر میرے اندر کا پیار جھنجوڑ کر جگا دیتا تھا کہ دیکھ رات کا بھولا صبح گھر آ گیا ہے مگر حدِ نظر تک اس کی پرچھائیں بھی نظر نہیں آتی تھی۔

کوئی پانچویں دن یاد آیا کہ میں نے پورا شہر دیکھ لیا مگر وہ گھر نہیں دیکھا جہاں لڑکی کو بدنامی سے بچانے گئی تھی' لڑکی کا بھائی جواد کا دوست ہے وہ دوست ہی مجھے جواد کے پاس پہنچا سکتا ہے۔ امید کی ایک نئی کرن نظر آتے ہی میں نے فوراً غسل کیا' لباس پہنا' پرس اٹھایا پھر لسبیلہ کے اس مکان میں پہنچ گئی۔

دروازے پر وہی ٹاٹ کا پردہ تھا۔ میں نے ٹاٹ کو ذرا ہٹا کر دروازے پر دستک دی۔ لڑکی نے آ کر دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھتے ہی کچھ پریشان ہوئی پھر جبراً مسکرا کر بولی۔ "آیئے تشریف لایئے۔"

پھر جلدی سے پلٹ کر چلی گئی۔ میں نے اندر آ کر دیکھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں جا رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "آپ تشریف رکھیں' میں اماں کو بھیج رہی ہوں۔"

اس لڑکی کا انداز کھٹک رہا تھا۔ میں کمرے میں نہیں بیٹھی۔ اس کے پیچھے دوسرے کمرے میں پہنچ گئی' وہ جلدی جلدی اپنی کلائیوں سے سونے کی دو چوڑیاں اتارتے ہوئے بولی۔ "اماں! جواد کی گھر والی آئی ہے۔ تم جا کر اس سے باتیں کرو میں یہ چھپا کر ابھی.........."

وہ کہتے کہتے رک گئی' مجھ پر نظر پڑ گئی تھی۔ دونوں ماں بیٹی مجھے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ میں نے پوچھا۔ "جواد کہاں ہے؟"

وہ اپنے سر اور دونوں ہاتھوں کو انکار میں ہلاتے ہوئے بولی۔ "مم.......... میں نہیں جانتی۔"

"کیا وہ یہاں نہیں آتا ہے؟"

"نہیں' بالکل نہیں۔"

"پھر یہ سونے کی چوڑیاں تمہیں کس نے دی ہیں؟"

اس کی ماں نے کہا۔ "یہ تو اس کے ابا نے بنوائی ہیں۔"

میں نے حقارت سے کہا۔ "اس کے ابا کا ابا بھی سونے کی چوڑیاں نہیں بنوا سکتا۔ گھر میں تو فاقے ہوتے ہیں اور بیٹی سونا پہنتی ہے۔ میں دور سے اپنی چوڑیاں پہچان رہی ہوں۔

پولیس والے چوری کا مال برآمد کرنے کے لئے چور کی تلاش کر رہے ہیں۔ میں ان کی مشکل آسان کر دوں گی۔ ابھی دروازے پر جا کر محلے والوں کو آواز دیتی ہوں وہ آئیں گے' پہلے یہ چوڑیاں اپنے قبضے میں لیں گے پھر چوری کے مال کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی تھانے لے جائیں گے۔"

وہ سہم گئی تھی اس کی ماں دونوں ہاتھ جوڑتی ہوئی آئی پھر میرے پاؤں پکڑنے کے لئے جھکی تو میں پیچھے ہٹ گئی۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی' زمین پر اوندھی گر پڑی۔ مجھے شرمندگی سی ہوئی کہ میں نے اسے گرنے سے نہیں بچایا۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ "نہیں بیٹی! محلے والے پہلے ہی ہمارے خلاف ہیں۔ وہ ہمیں یہاں سے نکال دیں گے۔ گھر کی بات باہر نہ لے جاؤ۔"

"کوئی بات آگے نہیں بڑھے گی' جواد کا ٹھکانہ بتا دو' میں یہاں سے چپ چاپ چلی جاؤں گی۔"

وہ سر اٹھا کر آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "میں جوان بیٹی کی قسم کھا کر کہتی ہوں وہ پچھلے چھ دنوں سے نہیں آیا ہے۔ آخری بار آیا تھا۔ یہاں ایک آدھ گھنٹا رہ کر اسے یہ چوڑیاں دے گیا تھا۔"

میرے کلیجے پر گھونسا سا لگا۔ سونے کی چوڑیاں اسے دینے کا مطلب سمجھ میں آ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر لڑکی کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک جھٹکا دیتے ہوئے پوچھا۔ "وہ بچہ جواد کا تھا؟"

وہ رونے لگی تکلیف سے کراہتے ہوئے کہنے لگی۔ "مار ڈالو تم نے ایک ذلت سے اس رات بچایا تھا۔ آج بھی بدنامی اٹھانے سے پہلے مجھے بچا لو مجھے مار ڈالو۔ نہیں مارو گی تو خود ہی جان دے دوں گی۔"

میں نے اسے دھکا دے کر زمین پر گراتے ہوئے پوچھا۔ "تیرا بھائی کہاں ہے؟"

"میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ تمہارے میاں نے تم سے جھوٹ کہا تھا۔ میرا باپ چرس کا عادی ہے۔ دن بھر گلی میں تاش کھیلتا رہتا ہے۔ کوئی بھائی ہوتا اور کما کر لاتا تو جواد جیسے عیاش کو گھر میں گھسنے بھی نہ دیتا۔ وہ ہر مہینے آٹھ سو روپے دیتا ہے۔ ہمارے گھر کا چولہا میری کمائی سے چلتا ہے۔"

وہ بولتی جا رہی تھی اور روتی جا رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ کبھی دن کو اور کبھی رات کو آتا تھا۔ یعنی اسپتال میں میری رات کی ڈیوٹی ہوتی تو وہ رات کو وہاں آتا تھا اگر میں رات کو اس کے پاس گھر میں رہتی اور دن کو ڈیوٹی پر جاتی تو وہ دن کو اس لڑکی کے

پاس وقت گزارتا تھا۔ ہائے رے مرد! تیرے لئے رات بھر دسترخوان سجاؤ تب بھی صبح بھوکا اٹھتا ہے۔ تیری ہوس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔

اس لڑکی کی رُوداد سے معلوم ہوا' بات صرف ہوس کی نہیں برتری اور اقتدار کی بھی تھی' وہ جب بھی آتا تھا کسی نہ کسی بات پر ناراض ہو کر اس کی پٹائی کرتا تھا کبھی ہاتھوں سے اور کبھی لاتوں سے مارتا تھا۔ کبھی محبت سے پچکارتا تھا۔ وہ مار کھاتے وقت دوپٹے کے سرے کو منہ میں ٹھونس لیتی تھی تاکہ رونے اور چیخنے کی آواز باہر نہ جائے۔ وہ کبھی کبھی اسے محبت سے آغوش میں لے کر کہتا تھا۔ "جب تم روتی ہو' گڑگڑاتی ہو' میرے قدموں سے لپٹنے لگتی ہو تو اچھا لگتا ہے۔ مار کھا کر بھی محبت کرنے والی عورت پر بڑا پیار آتا ہے۔"

میں اس لڑکی کی زبان سے جواد کی مردانگی اور حاکمیت کا یہ قصہ سن کر سوچ میں پڑ گئی' وہ جو برتری مجھ پر دکھا نہیں پاتا تھا وہ یہاں آکر دکھاتا تھا۔ اس نے ماہانہ آٹھ سو روپے میں ایک عورت خریدی تھی وہ میرے پاس سے اپنی بے بسی اور محتاجی کا غصہ لے کر جاتا تھا اور دوسری عورت کو محتاج بنا کر اس کی ایسی کی تیسی کرتا رہتا تھا۔

میں یہ باتیں سن رہی تھی اور مجھے اپنی ذلت اور پستی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں اپنا تن' من اور دھن دے کر بھی اپنے مرد کو نہ پا سکی تھی اور وہ محتاج بن کر میرا حصہ حاصل کرتی رہی تھی۔ اگر میں بھی اسے ظالمانہ مردانگی کی اجازت دے دیتی' اس کی تھوڑی سے گالیاں اور تھوڑے سے لات جوتے کھاتی رہتی تو وہ مجھے چھوڑ کر دوسری کے پاس نہ جاتا لیکن گالیاں تو جاہل گنوار یا محتاج عورتیں سنتی ہیں۔ یہ تو غیر قانونی اور غیر مہذبانہ مردانہ فطرت ہے۔ اسے کوئی شریف اور نارمل عورت برداشت نہیں کرتی اور میرا مزاج بھی اس کا متحمل نہیں تھا۔

میں نے سونے کی دو چوڑیاں اٹھا کر کہا۔ "میں نے ایک درجن بنوائی تھیں' باقی دس کہاں ہیں؟"

وہ قسمیں کھا کر بولی: "آپ پورے گھر کی تلاشی لے لیں یہی دو ہیں' وہ آخری بار آیا تو نشے میں تھا کہہ رہا تھا دس ہزار کے زیور چھ ہزار میں بیچ دیئے یہ دو چوڑیاں میرے لئے بچا کر لایا ہے اور اب وہ بہت دور جا رہا ہے' اگر یہاں پولیس کا خوف نہ ہوتا تو اپنی مغرور چالیس ہزار والی بیوی کو قتل کر کے یہاں سے چلا جاتا۔"

میں نے نفرت سے کہا۔ "وہ ایک بار نظر آجائے تو اسے میں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ یہ چوڑیاں لے جا رہی ہوں اگر فاقوں سے نجات چاہتی ہو تو میں تمہیں عزت سے

زندگی گزارنے کا موقع دوں گی۔ یہ چوڑیاں بھی دوں گی شرط یہ ہے کہ میرے مجرم کو کہیں سے بھی ڈھونڈ کر لاؤ۔"

میں وہاں سے آگئی گھر میں پہنچتے ہی بستر پر گر پڑی۔ جواد کی بے مروتی اور فریب نے میری آدھی جان نکال لی تھی۔ میں نے اس کی گالیوں اور مار پیٹ سے اپنا بچاؤ کیا تھا۔ یہی ایک دانائی اسے زہر لگی تھی ورنہ کیا کمی کی تھی؟ وہ خواب دیکھ کر آتا تھا میں تعبیر بن جاتی تھی وہ پھول مانگتا تھا' میں ہار بن جاتی تھی۔ اپنی حیات کو بھول جاتی تھی' محبت کا سارا آبِ حیات اسے پلا دیتی تھی۔ وہ پی پی کر بھی پیاسا رہتا تھا۔ مجھ میں مار کھانے والی عورت کی تازگی نہیں پاتا تھا اور یہ تو ہوتا آیا ہے کہ تازگی سے حجت نہیں ہوتی اور باسی سے محبت نہیں ہوتی۔ کیا خدا کی خدائی ہے کہ مرد کسی پہلو سے باسی نہیں ہوتا۔

اکثر ایسی خبریں بھی پڑھنے اور سننے میں آتی ہیں کہ بیوی کی بے وفائی اور بدکاری سے مشتعل ہو کر شوہر نے اسے قتل کر دیا۔ میرے اندر بھی یہ شعلہ بھڑک رہا تھا۔ میں اس بدکار شوہر کو تڑپا تڑپا کر خوب مارنا چاہتی تھی۔ اتنا مارنا' اتنا مارنا چاہتی تھی کہ وہ توبہ کرتے کرتے مر جائے' میں نے آج تک ایک کاکروچ یا ایک چھپکلی نہیں ماری مگر اس فریبی بدکار کو قتل کرنا چاہتی تھی۔

اگر وہ میری وفاؤں کا حساب کر کے صرف میرا ہی بن کر رہتا تو اس کی مردانگی کا یہ ریکارڈ قائم نہ ہوتا کہ اس نے ایک کے بعد دوسری کو فتح کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا' اپنے مرد کو صرف اپنا بنا کر رکھنے کے لئے عورت کیا کرے۔ اسے کیا نہیں دیا؟ وہ سب کچھ دیا جو میرے پاس ہے۔ ایک جان نہیں دی' وہ بھی دیتی تو کم پڑ جاتی۔

ہماری دنیا میں کسی کو تابع فرمان بنا کر رکھنے کا کوئی فارمولا نہیں ہے۔ کوئی بات مان کر راہِ راست پر آتا ہے' کوئی لات کھا کر بات مانتا ہے' کسی کو روپے پیسے اور کھانے کا محتاج بنا کر اپنے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ خاص طور پر میاں بیوی کے درمیان تاحیات اختیارات کی جنگ جاری رہتی ہے کبھی میاں اپنے ہتھکنڈوں سے مات دیتا ہے اگر میاں بیوی میں ایسا ہوتا رہتا ہے تو میں اس قدر نقصانات اٹھا کر بھی جواد کو قبول کرنے کو تیار تھی' مگر وہ لاٹری کا ٹکٹ تھا۔ میرے نام نہیں نکل رہا تھا' پتا نہیں اور کتنی سوکنوں کے نام نکل رہا ہوگا۔

کبھی جی میں آتا تھا اسے گولی ماردوں لیکن رات کو بستر پر اس کی خالی جگہ دیکھ کر اسے پکارتی تھی۔ آؤ جواد آؤ! مجھے ایسے نہ مارو پہلے گلے سے لگاؤ پھر گلا کاٹ لو۔ میری سیج کی کائنات میں سارا جہان دو پھر جان لے لو۔ میں نفرت سے تمہیں مارنا چاہتی ہوں اور

محبت سے مر جانا چاہتی ہوں۔

میں نے تھانے دار سے ملاقات کی' اس نے کہا۔ ''میں لسبیلہ کے مکان میں گیا تھا۔ وہ لڑکی اور اس کے والدین بہت غریب ہیں۔ ان کے گھر سے چوری کا سامان برآمد نہیں ہوا۔ میں نے تو اسی رات کہہ دیا تھا کہ تمہارا خاوند چور ہے۔''

''ہاں۔ اب میں تسلیم کرتی ہوں اسی نے چوری کی تھی۔ ایک ہفتہ ہو چکا ہے وہ گھر نہیں آیا ہے' پتا نہیں کہاں چھپا پھر رہا ہے۔''

''بس تو اب صبر ہی کر لو۔ ویسے کہیں نظر آیا تو گردن سے پکڑ کر لاؤں گا۔''

میں مایوس ہو چکی تھی۔ عراق جانے میں ایک ماہ رہ گیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیا کروں گی وہاں جا کر؟ اسی بے مروت کے لیے زیادہ کمانا چاہتی تھی۔ اب کسی دن جا کر شمشاد بھائی سے انکار کرنا چاہتی تھی۔ ایک خیال روکتا تھا کہ شاید جواد واپس آجائے۔ اللہ کرے آہی جائے میں اس کے لیے زیادہ سے زیادہ کمانے جاؤں گی' دنیا اولاد کے لیے کماتی ہے' میں شوہر کے لیے کماؤں گی۔

ایک دن اچانک ہی ہسپتال کے پتے پر اس کا خط آیا۔ اس نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ تحریر بھی بدلی ہوئی تھی۔ شاید اس نے کسی سے لکھوایا تھا تاکہ میں اسے کسی قانونی گرفت میں نہ لاسکوں۔ اس نے لکھا تھا۔ ''یہ خط اس کے لیے ہے' جو عورت ہو کر مرد بننا چاہتی تھی۔ کلائیوں میں چوڑیاں پہن کر مرد سے پنجے لڑانا چاہتی تھی۔ ایسی بکری کے لیے ہے جو شیر پر سوار رہنا چاہتی تھی۔ اب اس نادان بکری کو شیر نے چیر پھاڑ کر رکھ دیا ہے۔

''اگر وہ بکری اب بھی زندہ ہے تو اسے نوید ہو کہ شیر کسی کی محتاجی کے بغیر عراق پہنچ گیا ہے اگر اب بھی اسے خوش فہمی ہے کہ اتنی ٹوٹ پھوٹ کے بعد بھی شیر پر سوار ہو سکتی ہے تو آجائے۔ میں اس کی باقی ماندہ ہڈیاں بھی توڑ کر رکھ دوں گا۔

''ایک آخری بات ایسی بتا دوں جسے پڑھ کا اس کا سارا غرور خاک میں مل جائے گا۔ بکری کبھی شیر کی گھروالی نہیں بن سکتی۔ اس لیے شیر نے کبھی اس سے باقاعدہ نکاح نہیں پڑھوایا تھا۔ رجسٹریشن آفس سے سادہ نکاح فارم حاصل کر کے اپنے ایک داڑھی والے دوست کو قاضی بنا کر بکری کو ہوس کے دسترخوان پر لے گیا تھا۔ بکری جائے' رجسٹریشن آفس کی تمام فائلیں کھنگال لے اسے باقاعدہ نکاح نامہ نہیں ملے گا کیوں کہ نکاح ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ داشتہ بن کر رہتی آئی تھی۔''

وہ خط میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ہوا میں لہراتا ہوا اس واشنگ پاٹ میں چلا گیا جس میں ایک مریض کے زخم کا خون اور پیپ اور دوسری آلودگیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میرا سر

چکرا رہا تھا۔ میرا مزاج' میری انا یہ برداشت نہیں کر پا رہی تھی کہ میں فریب کھاتی رہی تھی اور ایک مکار کی داشتہ بنی ہوئی تھی۔ میں چکرا کر گر پڑی۔

جب ہوش آیا تو اسپتال کے بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ اسپتال کا پورا اسٹاف ایک ایک کر کے مجھے دیکھنے آرہا تھا۔ مجھ سے ہمدردی کر رہا تھا۔ ڈاکٹر اور اسپتال کے انچارج وغیرہ مجھے تسلیاں دے رہے تھے' ان سب نے وہ معنی خیز خط پڑھا تھا اور سمجھ گئے تھے کہ اس کا تعلق مجھ سے ہے انہیں میرے موجودہ حالات کا علم تھا۔ گھر کے واقعات اور شوہر کے بھاگ جانے کا قصہ بھی معلوم تھا۔ وہ مجھے یقین دلا رہے تھے کہ جواد دو برس بعد عراق سے واپس آئے گا تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔

آہ! دس برس پہلے ایسا ہی لاہور کا ایک ہسپتال تھا۔ ڈاکٹر ساجدہ راٹھور اور ان کے بیرسٹر شوہر ان سب کو سزائیں دلانا چاہتے تھے جنہوں نے فلم کے دفتر میں اور حوالات میں میرے ساتھ درندگی کی تھی اور میں نے کہا تھا کہ اپنے والدین کو اور اپنے معزز خاندان کو بدنامی سے بچانے کے لیے اس معاملے کو عدالت میں جانے نہیں دوں گی۔ اپنے والدین اور اپنے شہر کا نام کبھی نہیں بتاؤں گی۔

جنہوں نے میری آبرو کا ستیاناس کیا تھا' وہ اس حد تک دیانتدار تھے کہ انہوں نے کھلم کھلا بد کار بن کر ایسا کیا تھا لیکن جواد نے تو مذہب اور قانون کا سرٹیفکیٹ حاصل کر کے مجھ سے بدکاری کی۔ اتنا بڑا کمینہ پہلے کبھی دیکھا نہ تھا نہ ایسی مثال سنی تھی۔

میں نے ڈاکٹروں سے کہا۔ ''آپ اس کے خلاف قانونی کارروائی کریں گے؟ عدالت میں سیکڑوں حاضرین کے سامنے یہ کہیں گے کہ میں نے اپنی رقم سے کرائے کا مکان لیا۔ اپنی رقم سے گھر بسایا اور وہاں دو ٹکے کی بازاری عورت بن کر جواد کے ساتھ سوتی رہی؟''

میں بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''عدالت میں جواد کی عزت نہیں جائے گی کیوں کہ مجرم اپنی عزت عدالت کے باہر چھوڑ کر آتے ہیں۔ میرے لٹنے کی جو بات چھپی ہوئی ہے وہ عدالت کے ذریعے اخبارات میں آئے گی۔ جواد کو چند برسوں کی قید ہوگی۔ مجھے تو عمر بھر کی ذلت اور رسوائی ملے گی۔''

میں بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ڈاکٹروں سے بولی۔ ''آپ لوگ میری صحت اور عزت کی فکر نہ کریں۔ میں چکرائی نہیں تھی۔ میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی تھی۔ اس خط کا تعلق مجھ سے نہیں تھا۔ میرے مرد کا بلاوا آیا ہے۔ میں عراق جا کر شیر اور بکری کے قصے کو انجام تک پہنچاؤں گی۔''

میں ڈاکٹر کے ساتھ اس کے چیمبر میں آئی۔ وہاں سے شمشاد بھائی کو فون کیا۔ اس

سے کہا۔" معاہدے کے مطابق مجھے ایک ماہ بعد عراق جانا ہے۔ شیخ سے پوچھو کیا میں ایک ماہ پہلے اپنے اخراجات پر نہیں جا سکتی؟"

شمشاد بھائی نے کہا۔" اول تو شیخ یورپ کے دورے پر گیا ہے دوم یہ کہ ابھی کئی ماہ تک عراق جانے کا چانس نہیں ہے۔ وہاں ملک کے کئی حصوں میں موت رقص کر رہی ہے۔ کیا تم اخبار نہیں پڑھتی ہو۔ وہاں فوڈ پوائزننگ پھیلی ہوئی ہے۔ لوگ سیکڑوں کی تعداد میں کیڑے مکوڑوں کی طرح مر رہے ہیں۔"

میں نے ریسیور رکھ کر ڈاکٹر سے پوچھا۔" کیا عراق کسی کرائسس میں ہے؟"

"ہاں میں نے آج ہی کے اخبار میں ایک مختصر سے خبر پڑھی ہے' ابھی تک تفصیل نہیں معلوم ہوئی کہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں کیوں بیمار ہو رہے ہیں۔ مر رہے ہیں؟"

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ اس شیطان تک پہنچنے کے تمام راستے بند ہو گئے تھے۔ کبھی یوں لگتا ہے کہ قسمت ظالموں کا ساتھ دیتی ہے اور بدقسمتی مظلوموں کے پاؤں کی زنجیریں جاتی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے دور تک اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس اندھیرے میں اپنی عزت کے قاتل کو ڈھونڈنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے بے بسی سے اور اپنی توہین کے احساس کی شدت سے میز پر گھونسا مار کر کہا۔" میں جاؤں گی۔ کسی طرح بھی جاؤں گی۔ چاہے سمندر میں چھلانگ لگا دوں۔ مر جاؤں گی یا تیر کر وہاں پہنچ جاؤں گی مگر اس ذلیل کمینے کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

ڈاکٹر نے کہا۔" اپنے دل سے انتقام کا ارادہ اور دماغ سے غصہ نکال دو۔ اس سے تمہارے ذہنی صدمات بڑھتے جائیں گے۔ دشمن کا کچھ نہیں بگڑے گا۔"

"مجھے نصیحت نہ کریں۔ وہاں جانے کا راستہ بتائیں۔"

"کوئی راستہ نہیں ہے۔ جب موت شہروں اور قصبوں میں پھیلی ہوئی ہے تو یقیناً ائرپورٹ اور بندرگاہیں بند کر دی گئی ہوں گی۔ وہاں کے لوگوں کو باہر جانے کی اجازت ہو گی تاکہ اپنی جانیں بچا سکیں لیکن باہر سے لوگوں کو اس ملک میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہو گی۔"

دوسرے ڈاکٹر نے کہا۔" عاصمہ! خبریں سنتی رہو۔ اخبارات پڑھتی رہو۔ وہاں کے حالات نارمل ہوں گے تو تمہارے لیے کوئی راستہ نکل آئے گا۔"

ایک دم سے میرے دماغ میں بجلی سی کوندی۔ میں نے میز پر ایک ہاتھ مار کر کہا۔" راستہ مل گیا۔"

میں اپنی جگہ سے اٹھی پھر ڈاکٹر کے قدموں میں بیٹھتی ہوئی بولی۔" آپ ایک مہربانی

کریں تو ڈاکٹروں کی ایسوسی ایشن میں یہ فیصلہ کرا سکتے ہیں کہ ہم پاکستانی ڈاکٹروں اور نرسوں کو اپنے مسلمان بھائیوں کی طبی امداد کے لیے عراق جانا چاہیے۔"

ایک لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔" واقعی یہ زبردست پوائنٹ ہے۔"

میں نے کہا۔" اگر سرکاری طور پر کوئی رکاوٹ ہو تو کم از کم یہ اجازت دلائیں کہ جو نرس اور ڈاکٹر اپنے اخراجات پر رضاکارانہ خدمات کے لیے جانا چاہے اسے ویزا مل جائے گا۔"

ڈاکٹر نے کہا۔" تم پاگل ہو گئی ہو مگر ہوشمندی کی بات کر رہی ہو۔ ہمیں مسلمان بھائیوں کی طبی امداد کے لیے وہاں جلد جانا چاہیے۔ میں ابھی ڈسٹرکٹ میڈیکل آفیسر سے بات کرتا ہوں۔"

وہ ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ بہتر ہے کہ میں پہلے عراق کے اُس وقت کے صحیح حالات پیش کر دوں۔ یہ کوئی من گھڑت کہانی نہیں ہے۔ میری زندگی سے تعلق رکھنے والی عراق کی ایک تاریخی سچائی ہے۔ یہ سچائی 1971ء کے اخبارات میں اور اب ورلڈ ہسٹری میں پڑھی جا سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اجتماعی زہر خورانی کی ایسی مثال کہیں نہیں ملتی ہے۔

واقعہ یُوں ہے کہ 16 ستمبر 1971ء کو ایک بحری جہاز جنوبی عراق کی بندرگاہ بصرہ پر لنگر انداز ہوا۔ وہ گندم اور جو کی بوریوں سے لدا ہوا تھا۔ عراق میں پچھلے سال فصلیں خشک ہو گئی تھیں۔ قحط سالی کے اثرات نمایاں ہو گئے تھے۔ اُن دنوں وہاں کی آبادی دس ملین تھی۔ ان کی خوراک کا مسئلہ حل کرنے کے لیے بعث پارٹی نے ایک امریکی کمپنی کو 3000 ٹن گندم اور 2000 ٹن جو کا آرڈر دیا تھا۔ چونکہ یہ بوائی اور کاشت کے لیے منگوایا گیا تھا اس لیے کیمیکل پروسس سے گزارا گیا تھا جس کے نتیجے میں یہ صرف کھیتوں کو کھلایا جا سکتا تھا' انسانوں کے لیے یہ زہر تھا۔

مال بردار جہاز میں جتنی بوریاں تھیں۔ ان پر انگریزی زبان میں " زہر آلود" لکھا ہوا تھا اور اسپینی زبان میں بھی درج تھا۔" خوراک کے لیے استعمال نہ کریں۔" وہاں اسپینی زبان کوئی نہیں جانتا تھا۔ خاص سرکاری ملازمین یا چند تعلیم یافتہ لوگ انگریزی جانتے تھے لیکن اُس ہزاروں ٹن اناج کو کسانوں اور ساہوکاروں میں تقسیم ہونا تھا جو صرف اپنی مقامی زبان جانتے تھے اور انگریزی ہجے کر کے بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔

پھر یہ کہ حکومت نے اعلان کیا تھا کہ ان اجناس کی بوائی کے بعد فصل پکنے تک سرکار ان کی قیمت وصول نہیں کرے گی۔ انہیں ادائیگی کے لیے سال بھر کی مہلت دی

گئی۔ اس اعلان سے منافع خوروں کی بن آئی۔ رشوت خور سرکاری ملازمین نے بوریوں کی تعداد میں ہیرا پھیری کی اور ہزاروں بوریاں چور دروازوں سے بازاروں میں پہنچا دیں۔ ساہوکاروں نے بھی کسانوں کو برائے نام بوائی کے لیے گندم اور جو دی۔ باقی بازاروں میں بیچ ڈالی۔

عوام کا خیال تھا کہ قحط سالی کے آثار ہیں۔ اناج مہنگا ہو گا لیکن وہ بوائی کے لیے آنے والی اجناس مہنگی نہیں تھیں۔ بازاروں میں مناسب قیمت پر فروخت ہوئی تو سب نے خریدی۔ عورتوں نے گندم اور جو کی روٹیاں پکائیں۔ پورے گھر نے مزے لے لے کر کھائیں۔ سب نے کہا کہ اس سے لذیذ روٹیاں انہوں نے پہلے کبھی نہیں کھائی تھیں۔ اناج کا ذخیرہ کر لیا گیا تھا۔ باہر سے آنے والے مہمانوں نے اور ہوٹلوں میں قیام کرنے والے مسافروں نے بھی وہ روٹیاں کھائی تھیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے مزے دار روٹیوں کے بھیانک نتائج ظاہر ہونے لگے۔ ہر جگہ عورتیں' بچے' بوڑھے اور جوان قے پر قے کرنے لگے۔ جو قے کرتے ہوئے گر جاتے تھے وہ اٹھ نہیں پاتے تھے جو کھڑے رہتے تھے وہ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ ان کے ذہن ماؤف اور اعصاب مفلوج ہو جاتے تھے۔

جب یہ تفصیلی رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی تو پاکستان کے مختلف صوبوں سے ڈاکٹروں کی ٹیمیں اپنے مسلمان بھائیوں کی طبی امداد کے لیے روانہ ہونے لگیں ان میں نرسیں بھی تھیں اور ان نرسوں میں میرا نام بھی تھا۔ میں نے روانگی سے پہلے رجسٹرار آفس میں جا کر وہاں کے ایک کلرک کی جیب گرم کی اور اپنا نکاح نامہ تلاش کرایا۔ یہ معاملہ پرانا نہیں تھا۔ صرف پانچ ماہ پہلے نکاح ہوا تھا اس لیے تلاش کرنے میں دیر نہیں لگی۔ اس تاریخ اور اس مہینے میں کسی عاصمہ اور جواد کا نکاح نہیں پڑھایا گیا تھا۔ ہمارے ناموں سے ہونے والا کوئی نکاح نامہ کسی فائل میں نہیں تھا۔ یوں تصدیق ہو گئی کہ وہ ایک جعلی نکاح نامے کے ذریعے میری عزت' شرافت اور پارسائی کی دھجیاں اڑاتا رہا تھا۔

میں نے قسم کھالی کہ اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی ویسے بھی نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بعد کوئی مرد میری زندگی میں آئے اس لیے اپنی قسم میں یہ لچک پیدا کی کہ پہلے اسے صحیح نکاح پڑھانے پر مجبور کروں گی۔ یہ تہذیبی اصول ہے' پہلے غلطی کی تصحیح کی جائے' تصحیح نہیں ہو پائے تو پھر غلطی کو مٹا دیا جائے۔

میں نے بینک سے کافی رقم نکالی تاکہ اسے تلاش کرنے کے لیے غیر سرکاری طور پر مزید وہاں رہ سکوں اور ایسے وقت اخراجات کے سلسلے میں مشکلات پیش نہ آئیں۔ روانگی سے ایک دن پہلے شمشاد بھائی کو اسپتال لایا گیا۔ اس کے چہرے پر کسی نے تیزاب پھینک

دیا تھا۔ چہرہ اتنا بگڑ گیا تھا کہ میں اسے پہچان نہ سکی۔ اس کی آنکھ ذرا سی کھلی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر مخاطب کیا اور اپنا نام بتایا تو میں چونک گئی۔ ''شمشاد بھائی! یہ تم ہو؟ تم سے کس نے دشمنی کی ہے؟''

وہ تکلیف سے کراہتا ہوا بولا۔ ''میرے اعمال نے دشمنی کی ہے۔ ہمارے اپنے اعمال ہمیں سزا دیتے ہیں۔ دو برس پہلے میں نے دس بارہ لڑکیاں باہر بھیجی تھیں۔ ان میں ایک ملازمت کی مدت پوری کر کے آج میرے دفتر میں آئی پھر مجھ پر تھوک کر بولی' عورتوں کے دلال' اپنی ماں بہنوں کو باہر کیوں نہیں بھیجتا؟ تو نے کہا تھا کہ عزت کی نوکری ہے مگر آج میں اپنی نظروں سے گر کر اپنے ملک واپس آئی ہوں۔ میں تمہیں سزا دوں گی تاکہ تم آئندہ ہماری قوم کی بیٹیوں کی دلالی نہ کر سکو۔ یہ کہتے ہی اس نے مجھ پر تیزاب پھینک دیا۔''

میں نے پوچھا۔ ''وہ کون تھی؟ کہاں ہے وہ؟''

''بھاگ گئی۔ میں اس کا نام اور پتا نہیں بتاؤں گا میں مر رہا ہوں مگر میرا ضمیر بیدار ہو رہا ہے۔ تم سے التجا کرتا ہوں۔ باہر نہ جانا' تمہارے ساتھ دھوکہ ہو رہا ہے۔ شیخ نے یہاں تمہیں ہاتھ نہیں لگایا ہے لیکن وہاں تمہیں ٹریپ کرے گا۔ اسی لیے تمہیں ملازمت دی ہے۔ میں جان بوجھ کر تمہیں جہنم میں جھونک رہا تھا مگر اب سچ بول کر گناہوں کا بوجھ ہلکا کر رہا ہوں۔''

میں اس کے بستر کے پاس خاموش کھڑی رہی۔ اسے دیکھ کر سوچتی رہی کہ حسین عورت کو اسی لیے ملازمت دی جاتی ہے کہ دیر سویر اس سے اپنے کمینے جذبات کی پیاس بجھائی جا سکے۔ آدمی حوالات میں پہنچ کر باہر کے مظالم سے محفوظ رہتا ہے لیکن عورت وہاں بھی قانون کے سائے میں لٹ جاتی ہے حتیٰ کہ نکاح جیسے مقدس قانون اور مذہبی حکم کو بھی استعمال کر کے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ مرد کی دنیا میں عورت کہیں محفوظ نہیں ہے۔

میں نے کہا۔ ''شمشاد! تم جیسوں کی موت اس سے زیادہ بھیانک ہونی چاہئے۔ مجھے تم پر ایک ذرا ترس نہیں آ رہا ہے اور تم مجھے عراق جانے سے روک کر کوئی نیکی نہیں کر رہے ہو' میں کل جا رہی ہوں کیوں کہ مرد کی عیاشی ہر ملک' ہر شہر' ہر گھر اور ہر بستر پر ہے۔ میں کہیں بچ نہ پاؤں گی۔''

وہ بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ بدکاروں کو آخری وقت خدا کیوں یاد آتا ہے اور وہ ایک چٹکی نیکی سے سارے گناہ دھو ڈالنے کی کوشش کیوں

کرتے ہیں لیکن میں کچھ نہ کہہ سکی۔ میرے برسوں کے تجربات نے دور ہی سے یہ سمجھا دیا کہ وہ اپنے اعمال کی گٹھڑی اٹھا کر جا چکا ہے۔ میں نے اس کے منہ پر چادر بھی نہیں ڈالی منہ پھیر کر چلی آئی۔

ہم دوسرے دن عراق کے ساحلی شہر بصرہ پہنچے۔ ائرپورٹ کی ویرانی نے بتا دیا کہ شہر قبرستان ہو رہا ہے۔ وہاں مختلف طیاروں سے باہر جانے والے غیر ملکی تھے۔ باہر کسی جگہ سے آنے والا کوئی نہیں تھا۔ صرف ہم تھے جو انسانوں کے اس آخری اسٹیشن پر اترے تھے۔

میڈیکل بورڈ کے چند ڈاکٹر ہمارے استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں ریڈ کراس کی گاڑیوں میں بٹھا کر شہر کے مختلف حصوں سے گزرنے لگے اور وہاں کے حالات بتانے لگے۔

ابتدا میں اچانک ہی انکشاف ہوا تھا کہ لوگوں کے پیٹ میں زہریلی خوراک جا رہی ہے پھر پتا چلا کہ یہ زہریلی گندم اور جو کی کرامات ہیں۔ ڈاکٹروں کی ہدایات کے مطابق ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے اور پمفلٹ کے ذریعے لوگوں کو بتایا گیا کہ جس کے پیٹ میں یہ زہریلا اناج جائے وہ فوراً دودھ یا پانی میں انڈے کی سفیدی پھینٹ کر پی لے اس کے بعد نیم گرم پانی سے بھرے ہوئے گلاس میں چمچہ بھر نمک حل کر کے اسے حلق سے اتار لے۔ متاثر ہونے والے اس کے ذریعے کھڑے رہنے اور ڈاکٹروں کے پہنچنے کے قابل ہو جاتے تھے۔

وہاں کے تمام چھوٹے بڑے اسپتال متاثرین سے بھرے ہوئے تھے۔ برآمدوں اور درختوں کی چھاؤں میں اور خیموں میں وہ دم توڑنے والے کیڑے مکوڑوں کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر میں جواد کے ظلم کو اور اپنی ذات کے دکھوں کو بھول گئی۔ دن رات ان کی تیمارداری میں لگ گئی۔

جو مر رہے تھے' وہ زندوں سے بہتر تھے کیوں کہ بچ رہنے والوں میں سے کوئی بینائی سے محروم ہو گیا تھا اب اس دنیا کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ کوئی سماعت سے محروم ہو گیا تھا۔ اس دنیا کی کوئی آواز سن نہیں سکتا تھا اور کوئی ایسا تھا جو زندہ لاش بن کر لیٹا رہتا تھا اس کی ریڑھ کی ہڈی اس قابل نہیں تھی کہ اسے اٹھا کر بٹھایا جا سکے۔ حکومت کی طرف سے گندم اور جو کے استعمال پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ ساہوکاروں اور کسانوں کو حکم دیا گیا تھا کہ ان کے پاس جتنی بوریاں ہیں انہیں سرکاری گودام میں لا کر جمع کر دیں لیکن بوریاں بچی ہی کتنی تھیں' چند ہزار گوداموں میں واپس آئیں۔ باقی انسانوں اور مویشیوں کے پیٹ میں اتر گئی تھیں۔

مویشیوں کی زہرخوانی کے باعث گوشت کی فروخت بند کر دی گئی تھی کیوں کہ بازار سے خرید کر گوشت کھانے والے بھی متاثر اور معذور ہو رہے تھے۔ ہم نے سوچا تھا' ڈیوٹی آٹھ گھنٹوں کی ہوتی ہے۔ ہم دس گھنٹے رہا کریں گے لیکن متاثرین کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ میں کبھی بارہ گھنٹے اور کبھی پندرہ گھنٹے کام کرتی چلی جاتی اور مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔

ہمیں مختلف اسپتالوں اور ریلیف کیمپوں میں بھیجا جاتا تھا۔ ایسے ہی ایک اسپتال میں وہ نظر آ گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ بھی متاثر نہ ہو۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی تھی کہ اسے زہریلی خوراک سے موت نہ آ جائے۔ دعا قبول ہوئی تھی' وہ زندہ تھا مگر کچھ مُردہ سا لگ رہا تھا۔

میں نے قریب آ کر دیکھا۔ وہ مجھے نہیں دیکھ رہا تھا۔ بستر پر آدھا لیٹا ہوا اور آدھا بیٹھا ہوا تھا۔ سر جھکائے سوچ رہا تھا۔ میں نے اس کے سر اٹھانے کا انتظار کیا پھر ایک پیر فرش پر مارا۔ اونچی ایڑی کی سینڈل نے کھٹ کی آواز پیدا کی تو اس نے سر کو اٹھایا پھر دونوں آنکھیں میچ کر یوں دیکھنے لگا جیسے کم نظر آ رہا ہو' یا میں نظروں میں دھندلا گئی ہوں ایسے کئی مریضوں کو پہلے اٹینڈ کر چکی تھی۔ اس لیے اس کی کمزوری کو سمجھ گئی۔

اس نے پوچھا۔ ''کون ہو؟''

''ایک بکری ہوں۔''

وہ ہڑبڑا کر بیٹھنا چاہتا تھا مگر نقاہت کے باعث کراہنے لگا۔ کہنے لگا۔ ''تم .... تم ہو؟ میں آواز پہچان رہا ہوں۔ کیا واقعی تم ہو؟''

''تم نے لکھا تھا کہ بکری یہاں آئے گی تو شیر اس کی باقی ماندہ ہڈیاں بھی توڑ کر رکھ دے گا۔ میں آ گئی ہوں اور حشر کا مکالمہ دہرا رہی ہوں۔ شیر کس حال میں ہے؟''

اس نے سر کو جھکا لیا۔ میں نے پوچھا۔ ''ہمارے آگے گرجنے والے شیر یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ قدرت انہیں بیمار اور لاعلاج بنا دیتی ہے پھر وہ اس قابل بھی نہیں رہتے کہ اپنی ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی بھی اڑا سکیں۔''

میں نے اور ذرا قریب ہو کر کہا۔ ''ذلیل انسان! تُو نے جعلی نکاح پڑھوا کر مجھے دھوکے میں رکھا۔ میں تیرے پاس شریکِ حیات بن کر آتی رہی تُو مجھے داشتہ بنا کر وصول کرتا رہا اگر تُو سچ مچ نکاح پڑھوا لیتا تو تیرا کیا بگڑتا؟''

''ہاں' اب سوچتا ہوں کچھ نہ بگڑتا مگر شادی سے پہلے تمہارے تیور بتا رہے تھے کہ تم مرد

پر حاوی رہنے والی عورت ہو۔ مجھ سے زیادہ کماتی ہو۔ تمہارا پلڑا بھاری رہے گا۔ تھانے میں میرا ریکارڈ خراب ہے اور تم بے داغ ہو' میں تمہاری سماجی حیثیت کے سامنے کم تر ہوں اگر شوہر بننے کے لئے مذہب اور قانون کی زنجیریں پہن لوں گا تو تم مجھے کبھی آزاد نہیں ہونے دو گی اور پھر شادی کے بعد تم نے تھانے میں یہی مجھ سے لکھوایا کہ میں اپنی مرضی سے تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔ مجھ جیسے عادی مجرم کی دی ہوئی طلاق کو کورٹ میں چیلنج کیا جا سکے گا۔ میں نے تم سے زیادہ چالاکی دکھائی۔ طلاق کا جھنجھٹ ہی نہیں رکھا۔ جب شادی نہیں ہوئی تو طلاق کیسی؟"

میں نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر مارا۔ دوسرے مریض چونک کر دیکھنے لگے۔ ایک ڈاکٹر اور دو وارڈ بوائے تیزی سے میری طرف آئے۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ "یہ کیا حرکت ہے عاصمہ! کیا مریضوں سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ڈاکٹر! یہ وہی ذلیل ہے جو شوہر بن کر مجھے دھوکا دیتا رہا تھا۔"

"اوہ گاڈ!" ڈاکٹر نے چونک کر جواد کو دیکھا پھر میرا بازو پکڑ کر ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ "یہ مت بھولو کہ ہمارا پیشہ معزز ہے' منفرد ہے اور صبر آزما ہے اگر دشمن بھی زندگی اور موت کی جنگ لڑتا ہوا آئے تو غصے اور انتقام کو بھول کر اسے زندگی دینے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں' اسے توانائی دینے کے لئے انجکشن کی سوئی چبھوتے ہیں مگر کانٹا چبھنے نہیں دیتے اور تم نے اسے تھپڑ مارا ہے؟ یہ ہم سب کے لئے شرم کی بات ہے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میری اس حرکت سے آپ کو تکلیف پہنچی لیکن آپ اس عورت کی تکلیف کو نہیں سمجھ سکتے جسے دھوکے سے لوٹا گیا ہو۔"

"میں سمجھتا ہوں مگر........"

"آپ نہیں سمجھتے اور نہ کبھی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ زخم ان کی روح میں لگتا ہے جن کی بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔"

"عاصمہ! مجھ سے جذباتی بحث نہ کرو' میں تمہیں یہاں لانا نہیں چاہتا تھا۔ تم نے پاکستان میں وعدہ کیا تھا کہ دشمن سے انتقام نہیں لو گی' خیرسگالی اور خدمت کے جذبے سے عراق جاؤ گی اور اگر جواد ملے گا تو اسے سمجھایا جائے گا کہ وہ اپنی غلطی کی تلافی کرے اور صحیح نکاح پڑھوا کر گناہ آلود رشتے کا داغ دھو ڈالے۔"

میں ایک جگہ بیٹھ کر رونے لگی جو داغ لگ جاتا ہے وہ کبھی نہیں مٹتا۔ ہاں اگر داغ لگانے والا ہی مذہب اور قانون کے مطابق رشتہ قائم کرلے تو پھر ذلت کا احساس نہیں رہتا۔

لٹیرا مجازی خدا بن کر اس کا مان بڑھا دیتا ہے۔ جب چور ڈاکو توبہ کرنے کے بعد مہاتما اور ولی بن سکتے ہیں تو ایک بدکار توبہ کے بعد شوہر کیوں نہیں بن سکتا؟

ڈاکٹر نے مجھے سمجھا منا کر وارڈ سے باہر بھیج دیا پھر جواد کے پاس جا کر نہ جانے کیا کچھ بولتا رہا۔ میں باہر کھڑی دیکھتی رہی۔ یہ تو میں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ وہ انسان بن جانے پر آمادہ ہو گا' پھر سے نکاح پڑھوا کر میری ذلت کو عزت میں بدل دے گا تو میں بھی تمام نفرتوں کو محبت میں بدل دوں گی۔

ڈاکٹر نے میرے پاس آ کر کہا۔ "مسائل خواہ کتنے ہی پیچیدہ کیوں نہ ہوں وہ ذہانت اور محبت سے سلجھائے جاتے ہیں۔ تم اسے تھپڑ مارو گی' گولی بھی مار دو گی تو گئی ہوئی عزت واپس نہیں ملے گی۔ خدا کے بعد وہی ایک شخص ہے جو تمہیں عزت دے سکتا ہے۔ میں نے اُسے محبت سے سمجھایا ہے' وہ مان گیا ہے۔ اپنی غلطیوں پر نادم ہے' تم سے باقاعدہ نکاح پڑھوانے کو تیار ہے۔"

ان لمحات میں محسوس ہوا' میں عزت دار ہوں۔ پندرہ برس کی عمر سے اب تک میری عزت پر جتنے زخم لگائے گئے تھے جواد کی ایک "ہاں" نے وہ سارے زخم بھر دیئے ہیں۔ اب کوئی مجھے لوٹ کا مال سمجھ کر کبھی دھوکے سے حاصل نہیں کرے گا۔ جواد کا پیش کیا جانے والا نکاح نامہ میرے عزت دار ہونے کی سند رہے گا۔

میری گم شدہ مسرتیں پھر لوٹ آئیں۔ میں نے جواد کے پاس آ کر پوچھا۔ "مجھ سے باقاعدہ نکاح پڑھواؤ گے؟"

اس نے پوچھا۔ "کسے پڑھانے کو کہہ رہی ہو؟"

ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ زہریلی خوراک کے باعث اس کی قوتِ سماعت بھی کمزور ہو گئی ہے۔ اسے جلد سے جلد پاکستان لے جا کر علاج کرایا جائے تو بصارت اور سماعت کی یہ کمزوریاں موجودہ اسٹیج پر رک جائیں گی ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ مکمل طور پر اندھا اور بہرا ہو جائے گا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کان کے قریب جھک کر پوچھا۔ "مجھ سے نکاح پڑھواؤ گے؟"

"ہاں عاصمہ! جتنی جلدی ہو سکے مجھے گناہ کے بوجھ سے نجات دلاؤ۔ نکاح پڑھوالو۔"

ایک لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "جب تک نکاح نہ ہو تم ایک دوسرے کے لئے نامحرم ہو۔ اسلامی قوانین اور رسم و رواج پر عمل کرو اور اب اس وارڈ میں جواد کے پاس نہ آیا کرو۔"

واقعی یہ مذہبی قوانین عورت کو عزت اور تحفظ دیتے ہیں۔ میں نے جواد سے پردہ کر

لیا۔ دوسرے وارڈ میں ڈیوٹی دینے لگی۔ چند پاکستانی اور عراقی ڈاکٹروں نے آپس میں طے کیا کہ چوتھے روز جمعہ ہے۔ بعد نمازِ جمعہ ہمارا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔ میری خوشی میں سب ہی شریک تھے۔ بڑی لگن اور توجہ سے جواد کا علاج کر رہے تھے تاکہ وہ ایک نارمل شوہر کی طرح میری ساتھ ازدواجی زندگی گزار سکے۔

میں نے لاہور اور کراچی کی تمام نرس سہیلیوں کو یہ خوشخبری سنائی کہ مجھے میری گمشدہ عزت واپس مل رہی ہے۔ میں نے کراچی والا کرائے کا مکان نہیں چھوڑا تھا اس لئے کہ عراق صرف ایک ماہ کے لئے آئی تھی۔ میں نے مالک مکان کی بیوی کو بھی خط لکھا کہ میرا شوہر مجھے مل گیا ہے اور میں بہت جلد اس کے ساتھ واپس آنے والی ہوں۔

جمعے کے دن صبح کے وقت میں نے ڈاکٹر ساجدہ راٹھور سے فون پر بات کی۔ خوشی سے روتی ہوئی بولی۔ "آپ مجھے دعا دیں۔ میری فریب خوردگی کے دن گزر گئے ہیں۔ مجھے میری کھوئی ہوئی سماجی حیثیت اور عزت واپس مل رہی ہے۔ پانچ گھنٹوں کے بعد جواد سے میرا باقاعدہ نکاح پڑھایا جائے گا۔ مجھے باقاعدہ دلہن بننے کا سرٹیفکیٹ مل جائے گا۔"

ڈاکٹر صاحبہ نے کہا۔ "میں تمہارے لئے فکر مند رہتی ہوں اور دعا کرتی ہوں' خداوند کریم تمہاری مرادیں پوری کرے۔ عاصمہ! میں نے تم جیسی بار بار لٹنے والی شریف زادی نہیں دیکھی۔ ایک شریف عورت کی انا کو اور اس کی روح کو اس وقت اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے جب اسے ایک شریف مرد کی شریف بیوی ہونے کی سند حاصل ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے' آج تمہیں یہ سند مل جائے گی۔"

اسپتال کے ایک چھوٹے سے کمرے میں ہمارا نکاح پڑھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ کسی مکان میں بھی ہو سکتا تھا لیکن جواد بہت کمزور تھا اسے اسپتال سے دور لے جانا مناسب نہیں سمجھا گیا پھر ہم سب متاثرین کے علاج اور تیمارداری میں دن رات مصروف رہتے تھے اس لئے ایسے انتظامات کئے گئے تھے کہ ڈیوٹی بھی ہوتی رہے اور ہم رشتۂ ازدواج میں بھی منسلک ہو جائیں۔

چند نرسیں مجھے عام لباس میں دلہن بنا کر لئے آئیں۔ میں نے دوپٹے کو گھونگٹ بنا لیا تھا۔ مجھے ایک گوشے میں بٹھا دیا گیا۔ وہاں فرشی نشست کا انتظام تھا۔ دوسرے گوشے میں جواد دو آدمیوں کے سہارے چلتا ہوا آ کر بیٹھ گیا تھا۔ قاضی صاحب وکیل اور گواہوں کے ساتھ پہلے میرے پاس آئے اور نکاح قبول کرایا اور نکاح نامے پر دستخط لئے پھر وہ سب جواد کے سامنے جا کر بیٹھ گئے۔ قاضی صاحب نے پہلے کلام پاک کی ایک آیت تلاوت کی۔ جواد کمزوری کا

کے باعث دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور خلا میں تک رہا تھا۔ قاضی صاحب نے اس سے پوچھا۔ "عاصمہ بی بی کے ساتھ نکاح قبول ہے؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ پاس بیٹھے ہوئے پاکستانی ڈاکٹر نے اس کے شانے کو ہلا کر کہا۔ "قاضی صاحب پوچھ رہے ہیں نکاح قبول ہے؟"

"آں؟" وہ اپنی بے نور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مجھے گزشتہ روز اطلاع ملی تھی کہ وہ اپنی بینائی سے محروم ہو گیا ہے۔ یہ سن کر صدمہ ہوا تھا لیکن اسے پا لینے کی خوشی میں یہ حوصلہ ہو رہا تھا کہ پاکستان لے جا کر ڈاکٹر ساجدہ راٹھور سے باقاعدہ علاج کراؤں گی اور اس کی بینائی لانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گی۔

قاضی صاحب نے پوچھا۔ "کیا تمہیں نکاح قبول نہیں ہے؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "اسے قبول ہے مگر یہ بہرا ہے۔"

پھر ڈاکٹر نے اس کے کان سے اپنا منہ لگا کر کہا۔ "بولو عاصمہ سے نکاح قبول ہے؟"

جواد نے اپنے کان سہلاتے ہوئے زبان کھولی تو پتا چلا۔ زبان میں لکنت پیدا ہو گئی ہے۔

وہ بولا۔ "مے.......... میلے کال کے پاس کول اے؟" (میرے کان کے پاس کون ہے؟)

جس حد تک بات سمجھ میں آئی اس سے ثابت ہوا کہ وہ مکمل طور پر سماعت سے محروم ہو گیا ہے۔ آلہ سماعت سے بھی سن نہیں سکے گا۔ قاضی صاحب نے کہا۔ "یہ نکاح نہیں ہو سکتا۔"

میں نے دوپٹے کا گھونگٹ نوچ کر ایک طرف پھینک دیا۔ "نکاح کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"اس لئے کہ میں نے کلام پاک کی آیت تلاوت کی' اس نے نہیں سنی۔ یہ کلام پاک نہیں سن سکتا ہے' نکاح کے بول نہیں سن سکتا ہے۔ نکاح قبول نہیں کر رہا ہے پھر نکاح کیسے ہو گا؟"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "قاضی صاحب! یہ شخص میری عزت اور پارسائی کی سند ہے۔ آپ نکاح نامے پر اس کے دستخط لے سکتے ہیں۔"

"بی بی! یہ کس بات پر دستخط کرے گا۔ کیا سمجھ کر دستخط کرے گا اسے تو نکاح نامہ بھی نظر نہیں آتا ہے۔"

"کیا کسی اندھے اور بہرے کا نکاح نہیں ہو سکتا؟"

"میں نے آج تک ایسا نکاح نہیں پڑھایا ہے۔ یہ بول بھی نہیں سکتا' زبان میں لکنت ہے اور یہ دیکھو اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ یہ تو دستخط کرنے کے بھی قابل نہیں ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں۔ زہریلی خوراک نے ہزاروں افراد کو قبروں میں پہنچا دیا ہے‘ جو زندہ ہیں ان کی یہی حالت ہے۔ نہ بول سکتے ہیں‘ نہ سن سکتے ہیں‘ نہ دیکھ سکتے ہیں‘ تھرتھراتے ہوئے ہاتھ سے لقمہ بھی اٹھا نہیں سکتے۔“

قاضی صاحب نے اٹھ کر جاتے ہوئے کہا۔ ”معذرت خواہ ہوں‘ کسی زندہ لاش کے ساتھ نکاح نہیں پڑھا سکتا۔“

وہ جانے لگے‘ میں چیختی ہوئی جواد کے پاس آئی پھر اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ ”تم زندہ لاش نہیں ہو۔ مجھے نکاح کے بغیر زندہ لاش بنا رہے ہو۔ بولو......... بولو ایک بار بولو‘ قبول ہے۔“

اس نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے میرے ہاتھوں کو پکڑا پھر انہیں پہچان کر بولا۔
”عا......... عامہ......... ما......... ما......... قبول.........“

قاضی صاحب جاتے جاتے رک گئے۔ میں خوشی سے چیخ مار کر اپنے خاوند کی گود میں گر پڑی۔

قاضی صاحب کہہ رہے تھے۔ ”بیٹی‘ یہ قبول کر چکا ہے۔ نکاح نامے پر اس کا انگوٹھا چلے گا اور.........“

میں پوری بات نہ سن سکی‘ ساری دنیا بھول گئی۔ بہت عرصے بعد شوہر ملا تھا۔ مکان نہ سہی کھنڈر ملا تھا۔ سر چھپانے کے لئے ٹوٹی ہوئی چھت اور آنسو پونچھنے کے لئے پھٹا ہوا رومال ملا تھا۔ ملا تو تھا۔

==================

کاغذ نامہ

یہ الزام محض بچوں پر ہے ورنہ کاغذ کی ناؤ بڑے بھی چلاتے ہیں اور اب ڈوبتے ہیں کہ تب ڈوبتے ہیں والا معاملہ ہوتا ہے۔

کاغذ کی ناؤ جیسی ان کی زندگی جب مکافاتِ عمل کے گرداب میں پھنستی ہے تو ان کی مدد کو کوئی نہیں آتا......... اپنے بھی نہیں۔

ان کرداروں کی شرمناک داستان جن کی زندگی کا دارومدار کاغذ کے چند پرزوں پر تھا۔

آدمی کیا ہے؟ کاغذ ہے۔

آگ میں جائے تو جل جاتا ہے۔ پانی میں جائے تو گل جاتا ہے۔ ہوا میں اڑے تو کٹی پتنگ ہو جاتا ہے۔

پائیداری نہیں ہے' نہ کاغذ میں' نہ آدمی میں۔

آدمی کا لباس کیا ہے' کاغذ کا پیرہن ہے۔ پیرہن خواہ ریشم کا ہو یا ٹاٹ کا' آدمی اسے کاغذ کی طرح پھاڑتا ہے اور جاتے رنگا کرتا ہے۔

آدمی کا ایمان کیا ہے؟ ہے۔ بے ایمانی کے بہاؤ میں کاغذ کی ناؤ کی طرح ڈوب جاتا ہے۔

آدمی کا مقصدِ حیات کیا ہے؟ ہوا میں اُڑتا ہوا کاغذ کا پرزہ ہے' جو ہاتھ نہیں آتا۔

امبر کے ہاتھ کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ ایسا کچھ چاہتی تھی کہ ابھی جو ہے' اس سے سوا ہو جائے۔ ستارہ ہے تو ماہتاب ہو جائے۔ ماہتاب ہے تو آفتاب ہو جائے۔ وہ زمین پر رہتے ہوئے آسمان کو چھو لینے کی کوشش کرتی تھی۔ کوششیں اگر مثبت ہوں تو اچھا ہی ہے' آدمی آسمان کو نہ سہی' بادلوں کو ضرور چھو لیتا ہے۔

وہ سڑک کے کنارے رکشا یا ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی ہوئی تھی۔ لڑکی یوں تنہا ہو' سراپا انتظار ہو تو سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ٹیکسی چاہتی ہے یا کسی کار والے سے لفٹ لینا چاہتی ہے۔ اس نے شوخ رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ انداز میں شوخی اور بے باکی نمایاں تھی۔ دوپٹے کا آنچل ہواؤں کی چھیڑخانی سے یوں لہرا رہا تھا جیسے گارڈ کی جھنڈی آخری اشارہ دے رہی ہو کہ ٹرین جانے والی ہے۔ جسے آنا ہو' فوراً چلا آئے۔

ذکیہ اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر تھی۔ کار گلی سے گزر کر اس سڑک پر پہنچنے والی تھی' جہاں امبر آنچل کی جھنڈی لہرا رہی تھی۔ ذکیہ اسے دور سے دیکھتے ہی پریشان ہو گئی۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ "گاڑی روکو۔"

اس نے روک دی۔ یوں رکنے کی وجہ صرف امبر نہیں تھی۔ ذکیہ سوئٹ ڈش بھول آئی تھی۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ "کوٹھی میں جاؤ اور فریج میں سے کھیر کی ڈش

نکال کر لے آؤ۔"

وہ کار سے اُتر کر چلا گیا۔ امبر کوئی غیر نہیں تھی۔ ذکیہ کی کزن اور بچپن کی سہیلی تھی۔ دونوں میں دوستی اور بے تکلفی کے باوجود ذہنی ہم آہنگی نہیں تھی۔ امبر خود کو اس قدر نمایاں رکھنے کی عادی تھی کہ ذکیہ کے شوہر اعظم سے بھی فری ہو جاتی تھی۔ ذکیہ نے ایک بار دبی زبان میں اسے ٹوکا تو اس نے کہا تھا۔ "میں سالی ہوں۔ ضرور تیرے میاں کو چھیڑوں گی۔ کیا اپنے میاں پر بھروسا نہیں ہے؟"

اسے پورا بھروسا تھا۔ وہ فخر سے کہتی تھی۔ "میرے میاں کھونٹے سے بندھے ہوئے بیل ہیں۔ میں نے ان سات برسوں میں انہیں اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ وہ عورتوں کے معاملے میں بزدل ہیں۔ تُو نے خود ہی دیکھا ہے کہ تجھ سے کیسے جھینپتے ہیں۔"

"اسی لیے تو اعظم صاحب کو چھیڑنے میں مزہ آتا ہے۔"

ذکیہ یہ سن کر جل جاتی تھی کہ وہ سالی کے رشتے سے اعظم بھائی نہیں کہتی تھی۔ ہمیشہ اعظم صاحب کہا کرتی تھی بھائی کہتی تو کیا زبان جل جاتی؟ اسے توقع تھی کہ آئندہ صاحب بھی نہیں رہے گا۔ صرف اعظم رہ جائے گا۔

پھر ان سات برسوں میں اسے پختہ یقین ہو گیا کہ اس کا اعظم بلاشبہ عظیم ہے۔ وہ چوری چھپے بھی اپنے میاں کو اچھی طرح ٹٹول چکی تھی۔ میاں بیوی کے درمیان جو اعتماد کا رشتہ قائم ہوتا ہے' وہ ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ امبر کی شوخیوں کو اور بے تکلفانہ انداز کو نظر انداز کر دیتی تھی۔

اس نے کار کی پچھلی سیٹ پر سے دیکھا۔ ونڈ اسکرین کے پار دور گلی کے موڑ پر وہ کھڑی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر پشت کی جانب لے جا کر جُوڑے کا کلپ درست کر رہی تھی۔ اس کی دونوں کہنیاں اس انداز سے اٹھ گئی تھیں کہ وہ تیر سے کمان ہو گئی تھی۔ ذکیہ بڑبڑائی۔ "کمبخت گھر سے نکلنے کے بعد بھی خود کو آئینے کے سامنے محسوس کرتی ہے۔"

اس کی ایسی ہی حرکتوں کے باعث ذکیہ اس کے ساتھ کہیں آتے جاتے ہوئے شرم محسوس کرتی تھی۔ کوشش کرتی تھی کہ کہیں سامنا ہو تو نظریں بچا کر نکل جائے لیکن اُس روز تو وہ گلی کے موڑ پر کھڑی ہوئی تھی اور ذکیہ کی کوٹھی سے وہی ایک گلی سڑک پر نکلتی تھی۔

ڈرائیور کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے کھیر کی ڈش اس سے لے کر پچھلی سیٹ پر رکھ لی۔ وہ اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر کار آگے بڑھانے لگا۔ اس نے سوچا۔ "میں دوسری

طرف منہ پھیر کر بیٹھ جاؤں۔ دو ہفتے پہلے پرانی کار بیچ کر یہ نئی کار خرید لی ہے وہ کار بھی نہیں پہچانے گی۔"

وہ دوسری طرف کھسک کر ڈرائیور کے پیچھے ہو گئی۔ ایسا کرتے ہوئے ندامت سی ہوئی کہ چچا زاد بہن سے کترا رہی ہے مگر وہ مجبور تھی۔ اعظم کے لیے لنچ لے جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ دفتر میں بیٹھ کر کھانا چاہتی تھی۔ ایسے میں میاں بیوی کے درمیان مکھی بھی آجائے تو سوکن لگتی ہے۔

امبر نے کار کے اندر ذکیہ کو دیکھا اور نہ ہی نئی کار کو پہچانا۔ اسے نئی پرانی سے کیا لینا تھا۔ گاڑی کوئی سی بھی ہو' وہ تو لفٹ لینے کھڑی تھی۔ اس نے دور ہی سے لفٹ مانگنے کے انداز میں ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ذکیہ نے حیرانی سے سوچا۔ "تعجب ہے اتنی دور سے اس نے مجھے کار کے اندر دیکھ لیا ہے۔"

ڈرائیور نے مالکن کے حکم سے اس کے قریب گاڑی روک دی۔ وہ تیزی سے پچھلی سیٹ کے پاس آئی۔ کھڑکی کے اندر جھانک کر بولی۔ "میں دھوپ میں پریشان ہو رہی ہوں۔ ادھر کوئی رکشا یا ٹیکسی......."

ذکیہ نے سر گھما کر اسے دیکھا تو وہ بات ادھوری چھوڑ کر خوشی سے اچھل پڑی "اری چڑیل! تُو ہے' بڑی بیگم صاحبہ بنی بیٹھی ہے۔ چل دروازہ کھول۔"

اس نے دروازے کا لاک اٹھا کر اسے کھولا۔ وہ اندر آکر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "یہ نئی گاڑی کب لی؟ بڑی فنٹاسٹک ہے۔"

ذکیہ نے جبراً مسکرا کر کہا۔ "گاڑی کی تعریف کا شکریہ۔ یہ بتا اتنی دھوپ میں کہاں مرنے نکلی ہے؟"

"ادھر ایک بچے کو ٹیوشن پڑھاتی ہوں۔ یہ کوٹھی والے بڑے بے حس اور کنجوس ہوتے ہیں۔ ایک مہینے سے پچھلے مہینے کی فیس ادا نہیں کر رہے تھے۔ ابھی میں نے لڑ جھگڑ وصول تو کر لی مگر لڑائی میں ٹیوشن بھی گئی۔"

"اب کہاں ڈراپ کروں تجھے؟"

"میں تیرے سر پر تو نہیں بیٹھی ہوں' گاڑی میں ہوں۔ جہاں تُو جائے گی' وہیں چلوں گی' یہاں تو فرصت ہی فرصت ہے۔"

"لیکن میں تو اعظم کے لیے لنچ لے جا رہی ہوں۔"

"ہائے کھانا! اور وہ بھی تمہارے ہاتھ کا؟ ڈرائیور گاڑی چلاؤ۔"

ڈرائیور نے سوالیہ نظروں سے ذکیہ کو دیکھا۔ اس نے امبر کے حکم سے گاڑی نہیں

چلائی۔ ذکیہ کو عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا۔ وہ بولی۔ "گل جان! چلو۔"

اس نے گاڑی سٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ وہ اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔ اپنے شوہر سے دفتر میں تنہا ملاقات کرنے اور اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کے لیے وہ چھ برس کے بیٹے کو نانی کے پاس چھوڑ کر آئی تھی۔ ادھر یہ بیس برس کی بچی پیچھے لگ گئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "اعظم صاحب کیسے ہیں؟"

"میں کیا بتاؤں؟ تُو ساتھ چل رہی ہے۔ خود ہی دیکھ لینا۔"

"ہاں' اعظم صاحب سے ملے ہوئے کافی دن ہو گئے۔ جب کبھی ملاقات ہوتی ہے تو نہ ملنے کی شکایت کرتے ہیں۔"

آخری فقرہ کھٹاک سے ذکیہ کے دماغ میں لگا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اسے دیکھا۔ اعتماد کی ڈور بڑی کچی ہوتی ہے۔ اس نے دل میں کہا۔ "اعظم نے کبھی ایسی شکایت نہیں کی ہو گی۔ یہ خواہ مخواہ اپنا بھاؤ بڑھا رہی ہے۔"

ویسے شکایت نہ بھی کی ہو اور اس سے ملاقات بھی نہ کی ہو' تب بھی بیوی نے خاوند سے روٹھنے کا بہانہ ڈھونڈ لیا۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ آج رات بات سے بات نکال کر وہ ضرور پوچھے گی کہ امبر بے تکلفی سے اعظم صاحب کیوں کہتی ہے؟ میاں بیوی ایک دوسرے پر خواہ کتنا ہی اعتماد کرتے ہوں' بیوی کو کبھی کبھی زبردستی جھگڑا کرنا چاہیے۔ یوں میاں کو یاد رہتا ہے کہ گھر والی محتاط ہے اور اس کے تمام معاملات سے باخبر ہے۔

اعظم کا آفس ایک کثیر المنزلہ عمارت کے دوسرے فلور پر تھا۔ امبر ذکیہ سے پہلے ہی کار سے اتر کر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر پہنچی۔ معلوماتی کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا لڑکا اٹھ کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے سلام کیا۔ امبر نے سلام کے جواب میں ایک شانِ بے نیازی سے سر کو ہلایا۔ پیچھے سے ذکیہ کی آواز آئی۔ "وعلیکم السلام۔ کیسے ہو احمد؟"

"میڈم! آپ کی مہربانی سے صاحب نے تنخواہ بڑھا دی ہے۔ آپ اندر تشریف رکھیں۔ صاحب میٹنگ میں ہیں۔ میں اطلاع دیتا ہوں۔"

اس نے کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر ذکیہ کے لیے دفتری کمرے کا دروازہ کھولا۔ امبر یہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ یہ سب اس کے خواب تھے۔ کوٹھی' نئی کار اور محبت کرنے والا شوہر' دفتر کے ملازم آگے بڑھ بڑھ کر خدمت کرتے ہوں۔ وہ جہاں جاتی ہو' سب اسے میڈم اور مالکہ کہتے ہوں۔

یہ سب اس کے خواب تھے اور تعبیر ذکیہ نے پائی تھی۔ وہ ذکیہ سے جلتی نہیں

تھی۔ محض دل بہلانے کو اس کی خوشیوں میں سے تھوڑا سا حصہ لے رہی تھی۔ اس کے ڈرائیور کو گاڑی چلانے کا حکم دے رہی تھی۔ اس کے لنچ میں سے دو لقمے کھا لینا چاہتی تھی۔ ورنہ اس کے اپنے گھر میں بھی روٹی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر اس کے شوہر اعظم کو صاحب کہہ کر اپنی زندگی میں آنے والے کسی صاحب کو آواز دیتی تھی۔ بڑی آوازیں دینے کے باوجود ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر بولی۔ "ذکیہ! تو بڑی قسمت والی ہے۔ میں راتوں کو کروٹیں بدلتی ہوں اور سوچتی ہوں' میری قسمت کب کھلے گی؟ کب میرا اپنا گھر ہوگا؟"

"تیری تو منگنی ہو چکی ہے اپنے پھوپھی زاد اکبر علی سے پھر بھی ناشکری ہے۔ شادی کرلے۔ اپنا گھر ہو جائے گا۔"

"ابا اور پھوپھی اماں بلکہ اب تو سب ہی پیچھے پڑ گئے ہیں' شادی کرنے' شادی کرلے۔ وہ مولوی مجھے پسند نہیں ہے۔ سنا ہے ملازمت کے لئے سعودی عرب جا رہا ہے۔ اللہ کرے واپس نہ آئے۔"

ذکیہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "ایک ماروں گی منہ پر۔ کیوں اُسے کوستی ہے۔ ماں کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اُسے تیری کالی زبان لگے گی تو ماں کا کلیجا پھٹ جائے گا۔"

"اچھا بس کر۔ اب کالی زبان سے نہیں بولوں گی۔ مگر اُس سے شادی نہیں کروں گی۔ تُو اور اعظم صاحب چاہیں تو کسی بڑے بزنس مین سے.........." دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ چپ ہوئی' پھر بولی۔ "آہا' اعظم صاحب!"

اعظم کمرے میں داخل ہوتے ہی اُسے دیکھ کر چونک گیا پھر سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "اچھا آپ تشریف لائی ہیں۔ بھئی ذکیہ! اسے کہاں سے پکڑ لائیں؟"

وہ بولی۔ "آپ تو جانتے ہیں یہ کیسی چڑیل ہے۔ خود ہی گلے پڑ گئی کہ ہمارا کھانا چھین کر کھائے گی۔"

اعظم نے کہا۔ "مجھے کھانے سے معاف رکھو۔ میٹنگ کے دوران اتنی چائے پی ہے کہ بھوک مر گئی ہے۔"

"کچھ تو ضرور کھانا ہوگا۔ آپ السر کے مریض ہیں۔ ڈاکٹر نے تاکید کی ہے کہ وقت پر کھایا کریں۔"

امبر نے کہا۔ "ایسی بات ہے تو ضرور کھانا چاہیئے۔ نہیں کھائیں گے تو میں اپنے ہاتھوں سے جبراً کھلاؤں گی۔"

ذکیہ کھانے کی باسکٹ کی طرف جا رہی تھی۔ اس سے پہلے ہی امبر پہنچ گئی۔ باسکٹ

میں سے پلیٹیں نکال کر میز پر رکھنے لگی۔ یہ کام بیوی کا تھا مگر کالی بلی راستہ کاٹ رہی تھی۔ چونکہ وہ بہت عرصہ بعد آئی تھی اور روز روز آنے والی نہیں تھی اس لئے ذکیہ برداشت کر رہی تھی۔

وہ میز پر کھانا لگا کر ہاتھ دھونے کے لئے واش روم میں گئی۔ اعظم نے سرگوشی میں پوچھا۔ "اس بلا کو کیوں لے آئی ہو' اسے تو دیکھ کر میرا موڈ آف ہو جاتا ہے۔"

وہ بھی دھیمی آواز میں بولی۔ "میں خوشی سے نہیں لائی ہوں۔ کمبخت پیچھے پڑ گئی۔ آج آپ برداشت کرلیں۔"

"کیا برداشت کروں؟ نہ تمہیں سینے سے لگا سکوں گا' نہ ہاتھ پکڑ سکوں گا۔"

وہ سر جھکا کر مسکرانے لگی۔ شادی کے اتنے برس بعد بھی میاں پہلی رات کی طرح دیوانہ تھا۔ وہ اندر ہی اندر بند کلی کی طرح کِھل رہی تھی۔

امبر آ گئی۔ وہ تینوں میز کے اطراف کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ ذکیہ نے کہا۔ "اوہ' پانی لانا تو بھول گئی۔"

وہ اٹھ کر فریج سے کے پاس آئی۔ اسے کھول کر دیکھا تو پانی کی بوتلیں نہیں تھیں۔ وہ بولی۔ "آپ کو بوتلیں بھروا کر رکھنا چاہئیں۔ یہاں تو ایک بھی نہیں ہے۔"

"میں نے احمد سے کہا تھا۔ وہ شاید بھول گیا ہے۔ میں ابھی جا کر کہتا ہوں۔"

"نہیں' آپ بیٹھیں .... میں برف منگواتی ہوں۔"

وہ تیزی سے سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ اتنی دیر بعد اعظم نے ذرا آزادی سے سر اٹھایا۔ پہلے دروازے کو دیکھا کہ وہ واقعی بند ہو چکا ہے اور وہ واقعی جا چکی ہے پھر اس نے نظر بھر کے سامنے والی کو دیکھا۔

وہ شوخی سے مسکرائی پھر بولی۔ "کیا زنجیر کٹ گئی؟"

وہ جھینپ کر بولا۔ "آں.......... کیا' کیا مطلب ہے اس بات کا؟"

"ذکیہ کے سامنے مجھے ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ اُس کے جاتے ہی گھورنے کو آنکھیں مل گئیں۔"

"تم ہو ہی ایسی چیز۔ میرا خیال ہے کہ کوئی دس ماہ بعد تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ کتنی بدل گئی ہو۔ غنچے سے پھول ہو گئی ہو۔"

وہ خوش ہو کر اپنی مزید تعریف سننے کے لئے بولی۔ "جھوٹی تعریفیں نہ کریں۔"

"جھوٹ بولوں تو زبان جل جائے۔ اکیلی باہر نہ نکلا کرو۔ کوئی اٹھا کر لے جائے گا۔"

وہ ہنس کر بولی۔ "یہ تعریف ہے یا بددعا؟"

وہ میز پر ذرا اس کی طرف جھک کر بولا۔ "سچ کہتا ہوں، میری نظر لگ رہی ہے۔ گھر جاکر آئینہ دیکھنا اور کالا ٹیکا لگالینا۔"

وہ مسرتوں سے دہری ہونے لگی، پھر بولی۔ "بڑے بڑے لوگوں سے آپ کے تعلقات ہیں۔ جب میں اتنی اچھی ہوں تو کیا آپ اپنے جیسے بزنس مین سے میرا رشتہ نہیں کراسکتے؟"

"کیوں نہیں، ضرور۔ میں کوشش کروں گا۔"

دروازہ کھل گیا۔ ذکیہ آگئی۔ مارشل لاء نافذ ہوگیا، وہ بولی۔ "احمد پانی اور برف لارہا ہے۔ آئندہ آپ یاد سے بوتلیں رکھوالیا کریں۔ بازار والے مصفا پانی سے برف تیار نہیں کرتے ہیں۔ ایسی برف کے استعمال سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔"

وہ ان کے درمیان بیٹھ کر کھانے لگی۔ اعظم سعادت مندی سے سرجھکائے لقمہ چباتے ہوئے بولا۔ "ذکیہ! ہمیں امبر کے لئے کچھ سوچنا چاہیے۔"

وہ منہ میں لقمہ ڈالتے ڈالتے رک گئی، پھر بولی۔ "کیا سوچنا چاہیے؟"

"اس کے رشتے کے لئے۔ میری فیلڈ میں کچھ ایسے لوگ ہیں، جنہوں نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ تم امبر سے اس کی ایک اچھی سی تصویر لے کر رکھ لو۔ ہوسکتا ہے، کسی فیملی میں تصویر دکھانی پڑے۔"

ذکیہ نے کن انکھیوں سے امبر کو دیکھا، پھر سرجھکا کر کھانے لگی۔ سمجھ گئی کہ اس نے بڑی بے حیائی سے اپنے رشتے کی بات اعظم کے کانوں میں پھونکی ہے۔ ایسی باتیں پہلے عورتوں میں ہوتی ہیں پھر عورتیں اپنے مردوں کے ذریعے بات آگے بڑھاتی ہیں۔ ذکیہ خود اعظم سے یہ کہنے والی تھی لیکن امبر کو صبر کہاں تھا؟ اس کے میاں کے سامنے پیٹ کی بات اُگل دی تھی۔ اس نے سوچا۔ "توبہ ہے۔ کان پکڑتی ہوں، آئندہ اسے اعظم سے دور ہی رکھوں گی۔"

وہ کھانے کے بعد کچھ دیر اپنے میاں کے پاس رہتی تھی۔ اُس روز کھانا ختم ہوتے ہی امبر کو ساتھ لے کر چلی آئی۔ اسے اس کے مکان کے سامنے لاکر چھوڑ دیا۔ دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اس کا باپ ایک پرائیویٹ کمپنی کا ملازم تھا۔ ڈیوٹی پر گیا ہوا تھا۔ ذکیہ اس کے ساتھ کار سے اتر کر دروازے تک آئی، پھر بولی۔ "میں بیٹے کو اماں کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں۔ اس لئے جارہی ہوں۔"

"ذرا رک جا۔ میں تجھے فرسٹ کلاس چائے پلاؤں گی۔"

امبر نے دروازہ کھولا۔ وہ اندر آکر بولی۔ "میں نہیں رکوں گی، اپنی ایک تصویر دے

دے۔ اعظم کہیں اچھی جگہ رشتہ دیکھیں گے لیکن ایک بات کہتی ہوں، برا نہ ماننا۔ جو بات مردوں سے کرنے کی نہ ہو، اسے صرف عورتوں سے ہی کرنا چاہیے۔ جب تُو نے مجھے رشتے کے لئے کہہ دیا تھا تو پھر اعظم سے کہنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اپنا سمجھ کے کہہ دیا تھا۔ تجھے کیوں برا لگ رہا ہے؟"

"تُو نے میری بہن ہوکر میرے شوہر سے ایسی بات کی اور تجھے اس میں کوئی بے حیائی نظر نہیں آئی؟"

"تیرے میاں کو کون سی حیا شرم ہے؟ انہوں نے حوصلہ دیا تو میں نے کہہ دیا۔"

"انہوں نے کیا حوصلہ دیا؟ کیا وہ شادی دفتر کھول کر بیٹھے ہیں؟"

"جی نہیں، بیوی موجود نہ ہو تو یہ مرد شاعر بن جاتے ہیں۔ تُو برف لینے گئی تھی۔ وہ میرے حسن و جمال کی تعریفیں کررہے تھے۔"

"بکواس مت کر۔ میں اپنے میاں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ تُو تعریف کی بات کرتی ہے، وہ تو تجھ پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتے ہیں۔"

امبر اس توہین سے بھڑک گئی۔ تڑخ کر بولی۔ "ابھی چل اپنے میاں کے پاس، تیرے سامنے اُس کے منہ پر تھوکوں گی۔ تُو اور تیری اوقات کیا ہے۔ نئی گاڑی میں بیٹھ کر اِترانے لگی ہے۔ کیا میں نہیں جانتی کہ تُو نے شادی سے پہلے اعظم کو کیسے پھانسا تھا۔ میں بھی کسی دولت مند کو پہلے اپنی عزت دوں پھر مجبور کروں تو وہ شادی کرلے گا لیکن میں تیری طرح شادی سے پہلے آبرو باختہ نہیں کہلاؤں گی۔ اس سے پہلے شرم سے مرجاؤں گی۔"

ذکیہ پر سکتہ سا طاری ہوگیا تھا۔ ایک شریف عورت کو بے آبروئی کا الزام دو تو وہ ہکا بکا رہ جاتی ہے۔ اپنی پارسائی کی قسم کھانے کے لئے الفاظ کا ذخیرہ ہوتا ہے پھر بھی سوچتی رہ جاتی ہے کہ کیا بولے اور کیا نہ بولے؟

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "ہمیں معاف کردے اور ہمارا پیچھا چھوڑ دے۔ آئندہ کبھی ہمارے گھر اور دفتر نہ آنا۔ آج سے ہم تیرے لئے مرچکے ہیں۔ میں جارہی ہوں، میری اچھائی برائی اللہ جانتا ہے۔ تیرے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز ہے تو میرے جانے کے بعد غور کرنا اور جھوٹا الزام دینے پر شرمندہ ہوجانا۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ امبر نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ ذکیہ کی باتوں نے اُسے ذرا متاثر نہیں کیا تھا۔ امبر کی جگہ کوئی بھی ہوتی تو گالی کھانے کے بعد نہ بہترین نصیحتوں سے متاثر ہوتی، نہ اپنی غلطی پر نادم ہوتی۔ جو اپنی تعریفیں سننے کی عادی ہو اُس

سے یہ کہہ دیا جائے کہ کوئی شخص اس پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا تو اس کے لئے اس سے بڑی گالی اور نہیں ہوسکتی تھی۔

ایک تو لاہور کی گرمی اوپر سے دماغ گرم ہو رہا تھا۔ وہ غسل خانے میں چلی گئی۔ دیر تک شاور کے نیچے بھیگتی رہی اور دماغ ٹھنڈا کرتی رہی۔ شام کو اس نے سالن پکایا۔ باپ ڈیوٹی سے آتا تو اکثر اندھیرا ہوجایا کرتا تھا۔ محلے کے تندور سے روٹیاں لے آیا کرتا تھا۔ گھر میں کوئی اور نہ تھا۔ جوان بیٹی کو تنہا چھوڑ کر جاتے ہوئے سو طرح کے اندیشے اپنے پیچھے لے جاتا تھا۔ بیٹی کو باربار تاکید کرتا تھا۔ دروازہ اچھی طرح بند رکھا کر۔ پڑوسن خالہ کے سوا کسی کے لئے دروازہ نہ کھولنا۔ باہر کسی ضرورت سے جانا ہو تو خالہ کو ساتھ لے جانا۔ زمانہ بہت خراب ہے۔ جوان لڑکی پر کوئی الزام آجائے تو باپ کی گردن جھک جاتی ہے۔ کمر ٹوٹ جاتی ہے۔

پڑوسن خالہ زبان کی چٹوری تھی۔ امبر روز اپنی ہانڈی سے پلیٹ بھر کر سالن دیا کرتی تھی۔ ٹیوشن کی فیس میں سے دس بیس روپے اس کے ہاتھ میں رکھ دیا کرتی تھی۔ اس لئے وہ امبر کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ باپ سے شکایت نہیں لگاتی تھی کہ اس کے ڈیوٹی پر جانے کے بعد جوان بیٹی باہر کہاں کہاں گھومتی پھرتی رہتی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ آوارہ پھرنے کے باوجود اس کی نیت میں آوارگی نہیں تھی۔ اس کے دماغ میں یہ خبط سمایا ہوا تھا کہ دلہن بن کر کسی بڑی کوٹھی میں جائے گی تو اپنے گھر کو کیسے سجا بنا کر رکھے گی۔ اس گھر کو سجانے کے لئے وہ بڑی بڑی دکانوں میں جاکر قالین، فرنیچر اور فانوس وغیرہ کی قیمتیں معلوم کرتی تھی۔ تیس ہزار اور چالیس ہزار کے فانوس کو ناپسند کردیتی تھی۔ کبھی گلبرگ، کبھی شادمان اور کبھی انارکلی کی دکانوں میں بھٹکتی رہتی تھی۔ کار ڈیلروں سے نئی پرانی کاروں کی قیمت پوچھتی رہتی تھی۔ کتنے ہی دکاندار اسے اچھی طرح پہچان گئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی مسکرا کر استقبال کرتے تھے۔ اس کے خبطی مزاج کو سمجھتے ہوئے اس کی ذات میں دلچسپی لیتے تھے۔ وہ حسین تھی، دلنشین تھی۔ کتنے ہی منچلے لفٹ لینے اور بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے تھے اور اپنے منہ کی کھاتے تھے۔

وہ ہر ایک کو کھری کھری سنادیا کرتی تھی کیونکہ اس کے اندر ایک لکھ پتی یا کروڑ پتی بزنس مین چھپا بیٹھا تھا۔ وہ اندر بیٹھنے والا باہر چھیڑنے والوں میں نظر نہیں آرہا تھا اور وہ اس کے لئے باؤلی پھر رہی تھی۔

وہ حساس اتنی تھی کہ اپنی خودنمائی کو ٹھیس پہنچانے والی بات ہوتو اسے دل پر لے لیتی تھی۔ ان حالات میں وہ اپنے اندر کے کرب یا جذبوں کو باہر نکالنے اور دل کا بوجھ ہلکا

کرنے کے لئے ڈائری کے اوراق لکھتی تھی اور اپنے اندر کی سیاہی اور روشنائی ان پر پھیلاتی جاتی تھی۔

اس کے پاس پچھلے دو برس کی کئی ڈائریاں تھیں، جن میں بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ وہ ڈائریاں الماری میں بند رہتی تھیں۔ سالِ رواں کی ڈائری بھی میز پر اور کبھی تکیے کے نیچے رہا کرتی تھی۔ جب بھی اس کے اندر لکھنے کی تحریک پیدا ہوتی تھی، وہ اسے کھول کر پچھلے اوراق پڑھتی تھی پھر آگے لکھتی جاتی تھی۔ اس کا خط نہایت ہی خوب صورت اور منفرد ہوتا تھا۔ اسکول کے زمانے میں اساتذہ اس کی تعریفیں کرتے تھے۔ وہ سہیلیوں اور رشتے داروں کو خطوط لکھتی تو وہ لوگ دور ہی سے لفافے کی تحریر دیکھ کر کہہ دیتے کہ یہ امبر نے لکھا ہے۔

اُس رات اس نے لکھا۔ میں نے کئی ماہ بعد ذکیہ کو دیکھا، وہ نئی کار اور نئے بہترین لباس میں تھی۔ میں مانتی ہوں، وہ روز ایک لباس بدلتی ہے۔ ہر سال دو سال میں نئی کار خرید لیتی ہے۔ عورت ایک دولت مند شوہر کے سائے میں رہ کر نت نئی خواہشات کی تکمیل کرتی ہے اور ساری دنیا کو اپنے موڈ اور مرضی کے مطابق بدل بدل کر دیکھتی ہے اور نئی بہاروں، نئے نظاروں سے لاکھوں برس پرانی زمین کو جنت بنا دیتی ہے۔

مجھے لگتا ہے، میری دنیا نہیں بدلے گی۔ یہ میرے لئے ویسی ہی لاکھوں برس پرانی رہے گی۔ آج میں نے کیسی ذلت اٹھائی ہے۔ کاش میرا بھی ایک شوہر ہوتا اور میں ذکیہ سے کہہ سکتی کہ میرے میاں تجھ پر تھوکنا بھی گوارا نہیں کرتے ہیں۔

لیکن اب سوچ رہی ہوں کہ ذکیہ خوش فہمی میں ہے۔ اعظم تھوکنے تو کیا، میرے تلوے چاٹنے آجائے گا۔ ایک اعظم ہی کی بات نہیں ہے۔ میں نے کئی شوہروں کو دیکھا ہے، وہ بیوی کے اوجھل ہوتے ہی میری ذات میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

مجھے ذکیہ کا دل نہیں دکھانا چاہیے تھا۔ ایسی ساری بیویوں سے ہمدردی کرنا چاہیے، جن کے شوہر دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ یہ بے چاری بیویاں کاغذی زندگی گزارتی ہیں۔

جی ہاں، کاغذی زندگی۔ کاغذ پر نکاح قبول کرتی ہیں اور کاغذی بھروسے پر اپنی راتیں دیتی ہیں۔

محفلوں میں دعوے کرتی ہیں، میرا میاں، صرف میرا ہے۔ میرا مجازی خدا ہے۔ میرا سرتاج ہے۔ میرے سر کا آسمان ہے۔

اور وہ آسمان کاغذ کا ہوتا ہے۔

ذکیہ کتنے مان سے اعظم کو اپنا اور صرف اپنا کہتی ہے۔ مجھے اُس کا یہ مان رکھنا چاہیے۔ کبھی اسے اپنے میاں کی بدنیتی معلوم ہوگی تو کیا ہوگا؟ ایسے وقت مرد کا کچھ نہیں جاتا۔ البتہ عورت کی خودداری اور آبرو ہار جائے گی۔ دل ٹوٹ جائے گا اور دل ایک کعبہ ہوتا ہے۔ کم از کم میں اسے ٹوٹنے نہیں دوں گی۔ دعا کروں گی کہ ذکیہ تاحیات خوش فہمی میں خوش رہا کرے۔

میں دل کی گہرائیوں سے دعا کروں گی۔ کیونکہ ایک دن میرا بھی کاغذ پر نکاح ہوگا اور میرے سر پر بھی کاغذ کا آسمان ہوگا۔

☆=========☆=========☆
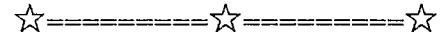
وہ فٹ پاتھ پر چلتے چلتے رک گئی۔ وہاں ایک شخص چھوٹے بڑے رنگین پوسٹر سجائے بیٹھا تھا۔ مختلف قسم کے مناظر کی پینٹنگز اور فلمی ستاروں کے پوسٹرز ایک لمبی ڈور سے بندھے ہوئے تھے' جو راہ گیروں کو اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کردیتے تھے۔ امبر کی نظریں ایک مقامی آرٹسٹ کی بنائی ہوئی تصویر پر ٹھہر گئیں۔

تصویر میں ایک جوان لڑکی دونوں ہاتھ اٹھائے بالوں کا جوڑا درست کررہی تھی۔ لڑکی کو ایسے دلکش زاویے سے پینٹ کیا گیا تھا کہ حسن پرست اسے دیکھنے پر مجبور ہوجاتے اور سوچتے رہ جاتے کہ وہ جوڑا باندھ رہی ہے یا انگڑائی کی اٹھان کو چھورہی ہے؟

امبر اسے دیکھ کر اس لئے ٹھٹک گئی تھی کہ تصویر والی اس سے مشابہ تھی۔ بلکہ ہر زاویے سے امبر کو وہ اپنی ہی تصویر لگ رہی تھی۔ یہ ایک عجیب اتفاق بھی ہوسکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ کسی مصور نے اسے اس انداز میں کہیں دیکھا ہو اور چپکے سے ڈرائنگ بورڈ پر اسکیچ کرلیا ہو۔

اس نے تصویر کو اٹھا کر قریب سے دیکھا' پھر پوچھا۔ "کیا قیمت ہے؟"

"تین سو روپے۔"

وہ قیمت بتا کر چہرے کے تاثرات کو بھانپنے لگا۔ دکان دار ہوں یا فٹ پاتھ پر سامان بیچنے والے ہوں' وہ اپنے گاہکوں کے چہروں کو اتنی چابک دستی اور مہارت سے پڑھتے ہیں کہ کوئی قیافہ شناس اور ماہرِ نفسیات بھی نہ پڑھتا ہوگا۔

وہ جانتا تھا' لڑکیاں بڑا مول تول کرتی ہیں۔ اب وہ تین سو کا آدھا کرے گی۔ وہ انکار کرے گا۔ دونوں کے درمیان حجت ہوگی پھر تصویر دو سو میں اٹھ جائے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ امبر نے پرس کھولا اور سو کے تین نوٹ نکال کر بڑھادیئے۔ اس نے خوش ہوکر رقم لی پھر تصویر کو اخبار میں لپیٹ کر پتلی ڈوری سے باندھنے لگا۔

امبر نے پوچھا۔ "یہ تصویر کس نے بنائی ہے؟"

"وہ جی! تصویر کے نیچے نام لکھا ہوا ہے۔"

"کہاں رہتا ہے؟"

"وہ ٹیشن کے پاس کہیں رہتا ہے۔ کیا اور تصویریں چاہئیں؟"

"نہیں۔ یہ تصویر بالکل میری لگتی ہے۔ کیا تمہیں ایسا نہیں لگا؟"

"وہ جی' بی بی! میری نظر کمزور ہے۔ آپ کہتی ہیں تو یہ آپ ہی کی ہوگی۔"

"میں معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ اُس نے میری تصویر کیسے بنائی جبکہ کبھی میرے سامنے نہیں آیا۔"

"یہ فنکار لوگ وڈے سیانے ہوتے ہیں۔ وہ آئے گا تو میں پچھوں گا۔"

وہ تصویر اٹھا کر مال روڈ کی طرف جانے لگی۔ رکشا' ٹیکسی اور کاروں کی اتنی بھیڑ تھی کہ پیدل چلنے والوں کو آگے جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر عارضی دکانیں لگی ہوئی تھیں' پھر یہ مسئلہ تھا کہ اتنی بڑی تصویر اٹھا کر بس کے اندر کیسے جگہ بنائے گی۔ پرس میں صرف دو سو روپے تھے اور وہ ٹیکسی کے شاہی خرچ کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

ایسے ہی وقت کسی اجنبی نے اُسے آواز دی۔ "امبر!"

وہ چلتے چلتے رک گئی۔ ایک سمت دیکھا۔ ایک صحت مند اسمارٹ نوجوان کاروں اور رکشوں کے درمیان سے گزرتا آ رہا تھا۔ وہ کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ اس نے قریب آ کر کہا "اگر میں دھوکا نہیں کھا رہا ہوں تو تم امبر ہو۔ تمہارا پورا نام امبر سلطانہ ہے۔ سات برس پہلے رحمان پورہ میں ہماری تین منزلہ کوٹھی تھی۔ کوٹھی کے سامنے تم رہتی تھیں۔ تمہارے ابا کا نام شرف الدین ہے۔"

وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ بول گیا۔ امبر نے کہا۔ "وہ تین منزلہ کوٹھی اب بھی وہیں ہے اور میں اُس کے سامنے والے مکان میں آج بھی رہتی ہوں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے کہ میں نے تمہیں دیکھا ہے۔"

گاڑیاں ہارن بجا رہی تھیں۔ راستہ مانگ رہی تھیں اور وہ بیچ سڑک پر کھڑے ہوئے تھے۔ تیزی سے چلتے ہوئے ایک کنارے پر آ گئے' وہ بولا۔ "میں شہزادہ سلیم۔ سات برس پہلے میں ایسا صحت مند نہیں تھا اور تم کوئی بارہ تیرہ برس کی تھیں۔ یہ تم نے ہاتھوں میں کیا پکڑا ہوا ہے' مجھے دو۔"

"رہنے دو۔ یہ تصویر ہے' بھاری نہیں ہے۔"

"پھر بھی سامان اٹھائے ہوئے لڑکیوں کی اسمارٹنس میں فرق آ جاتا ہے۔"

اُس نے تصویر اس کے ہاتھوں سے لے لی پھر کہا۔ "میں بڑی دیر سے تمہارا پیچھا کر رہا تھا۔ دور دور سے دیکھ کر یقین کر رہا تھا کہ تم امبر ہی ہو۔"

"مجھے بھی کچھ یاد آ رہا ہے۔ تمہارے ابا کلیم ٹھیکے دار کے نام سے مشہور تھے؟"

"خوب پہچانا۔ بائی دی وے' ابھی کہاں جا رہی ہو؟"

"رحمان پورہ جاؤں گی۔ کیا وہ ہمارے سامنے والی کوٹھی بیچ دی تھی؟"

"ہاں' ہم نے گلبرگ میں چار ہزار گز کے پلاٹ پر شاندار کوٹھی بنالی ہے۔"

وہ حیرانی سے سوچنے لگی۔ چار ہزار گز کے پلاٹ پر تو محل بنالیا ہوگا۔ اس نے ایسے بڑے بڑے محل دیکھے تھے۔ کبھی ان کے اندر نہیں گئی تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ اس کی کوٹھی میں تین کاریں ہیں اور شاہدرہ سے دس میل دور اُن کی دواساز فیکٹری ہے' جہاں سے لاکھوں روپے کا منافع ہوتا ہے۔

وہ شہزادہ سلیم کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خواب بھر گئے تھے۔ دل کی دھڑکنیں کہہ رہی تھیں کہ یہی وہ لکھ پتی بزنس مین ہے جو اس کے اندر چھپا رہتا ہے۔ آج تقدیر مہربان ہوئی تھی' وہ اندر سے باہر آ گیا تھا۔

اس نے پوچھا۔ "ہم یہاں کب تک کھڑے رہیں گے۔ آؤ شیزان میں چلتے ہیں۔ یہاں قریب ہی میری کار ہے۔"

وہ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ محسوس کر رہی تھی جیسے گر پڑے گی۔ اس نے گرنے سے پہلے ہی شہزادے کے بازو کو تھام لیا۔ وہ مسکرانے لگا۔

کار ٹویوٹا کرولا تھی۔ اس نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا' وہ بیٹھ گئی پھر اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر وہاں تصویر رکھی۔ اس کے بعد سٹیئرنگ سیٹ پر آ کر گاڑی کے ساتھ ساتھ اے سی آن کیا۔ کار کی محدود فضاؤں میں جنت کی ہوا چلنے لگی۔ اس نے دل میں کہا۔ "ہائے! یہ ہے زندگی' یہ ہے دولت اور یہ ہے مرد۔ باہر آگ برس رہی ہو تو ایسا مرد اپنی عورت کے لئے جنت کی ہوا اور آسائشیں خرید لاتا ہے۔"

وہ ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔ "تم حیران نہیں ہوئیں کہ اتنے برسوں بعد میں نے تمہیں کیسے پہچان لیا؟"

"واقعی تم نے کیسے پہچان لیا؟"

"میں نے تمہیں کبھی بھلایا ہی نہیں تھا۔ اس لئے آسانی سے پہچان لیا۔ اُن دنوں میں بیس برس کا تھا۔ تمہیں دیکھ کر سوچتا تھا۔ تم بچپن میں اتنی حسین ہو' جوان ہو کر تو غضب ڈھاؤ گی۔"

وہ اپنی مزید تعریف سننے کے لئے بولی۔ "اور میں غضب نہیں ڈھا رہی ہوں۔ تمہارا اندازہ غلط نکلا۔"

"کیا کہہ رہی ہو۔ میں تو تمہیں دیکھنے کے بعد بھی یقین نہیں کررہا ہوں کہ ابھی جاگتی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ ایسا حسن و جمال تو صرف خوابوں میں دکھائی دیتا ہے۔ مجھے یقین دلاؤ کہ تم میرے قریب ہو اور سچ مچ ہو۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی پھر بولی۔ "میں تمہارے پاس ہوں اور سچ مچ ہوں۔"

وہ سڑک کے کنارے کار روک کر بولا۔ "اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔ مجھے یقین کرنے دو۔"

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ وہ دروازے کی طرف کھسک کر بولی۔ "ایک منٹ پہلے تم یہ سو کا نوٹ لو۔"

اس نے پرس میں سے سو کا نوٹ نکال کر دیا۔ وہ اسے لے کر بولا۔ "یہ کس لئے؟"

"یقین کرلو کہ تمہارے پاس امبر سلطانہ ہے اور اس نے تمہیں سو کا نوٹ دیا ہے۔"

وہ جیب سے ایک ہزار کا نوٹ نکال کر دیتے ہوئے بولا۔ "اسے لو۔ تب یقین آجائے گا۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تم سو کے عوض ہزار دے رہے ہو۔"

"لین دین کی ابتدا تم نے کی ہے لہٰذا انکار نہ کرو۔"

اُس نے وہ بڑا نوٹ اس کے پرس میں ڈال دیا۔ وہ بولی۔ "پلیز، مجھے شرمندہ نہ کرو۔"

"شرمندہ تم نے کیا ہے۔ مجھے ہاتھ پکڑنے نہیں دیا۔"

"میں کسی سے اس حد تک فری نہیں ہوتی کہ ہاتھ پکڑنے کا موقع دوں۔"

"میں نے بھی کبھی کسی لڑکی سے سو روپے نہیں لئے۔ اب یا تو ہزار لو، یا ہاتھ پکڑنے دو۔"

وہ ایک طرف سمٹی رہی۔ اس کے ہاتھ سے ذرا دور رہی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی۔ ہزار کا نوٹ پرس میں رہ گیا۔

وہ نوٹ ایک کاغذ تھا۔

وہ گوری کلائی ایک کنواری کی آبرو تھی۔

آبرو تو ہر حال میں بچائی جاتی ہے اور اس نے پہلی ہی ملاقات میں گرنے سے خود کو بچالیا تھا۔ اس کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔

لیکن وہ کاغذ جو ہوا کی طرح ہلکا تھا اور جسے ایک بچہ بھی پھاڑ سکتا تھا، اس کاغذ نے

اس کی حساس کلائی کو جکڑ لیا تھا۔

کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔ "بینک دولت پاکستان۔ ایک ہزار روپیہ۔ حاملِ ہذا کو مطالبہ پر ادا کرے گا۔"

اور وہ کاغذ مطالبہ کررہا تھا۔ "اے لڑکی! ادا کرو۔"

وہ کاغذ حکومت پاکستان کی ضمانت سے جاری ہوا تھا۔ یہ ضمانت تھی کہ جب بھی مطالبہ کیا جائے گا، ایک ہزار روپے کی مالیت کی چیز مل جائے گی۔

اگر وہ ایک ہزار کی کلائی تھی تو ابھی مل جائے۔ اگر بہت مہنگی تھی تو وہ کاغذ ایڈوانس بکنگ کے طور پر آیا تھا۔

اس نے پرل کان کے احاطے میں کار روکی۔ امبر نے اتنے مشہور فائیو اسٹار ہوٹل میں آکر فخر محسوس کیا۔ وہ اب سے پہلے اس ہوٹل کو باہر سے دیکھ کر گزر جاتی تھی۔ سوچتی تھی، اس کے اندر جانے اور کھانے والے کتنے دولت مند اور کتنی اونچی حیثیت رکھنے والے ہوں گے۔ ڈائننگ ہال میں شہزادہ سلیم کے ساتھ بیٹھ کر اسے بڑائی کا احساس ہوا۔ ساری دنیا میں آباد رہنے والا وہ ہوٹل اس رحمان پورہ والی کے قدموں تلے آگیا تھا۔

شہزادہ نے کھانے کا آرڈر دینے کے بعد پوچھا۔ "تمہاری مصروفیات کیا ہیں؟"

اس نے سر جھکالیا۔ وہ کیا کہتی کہ وہ کیا کرتی ہے؟ باپ ایک فرم میں ملازم ہے اور وہ اپنے ذاتی اخراجات کے لئے ٹیوشن پڑھاتی ہے۔ اتنی بڑی جگہ بیٹھ کر اتنی چھوٹی بات کہتے ہوئے شدید کمتری کا احساس ہورہا تھا۔

اس نے پوچھا۔ "خاموش کیوں ہو؟"

وہ سرد آہ بھر کر بولی۔ "انٹر کرنے کے بعد بے مصرف زندگی گزر رہی ہے۔ ابا اپنی بہن کے بیٹے سے میری شادی کردینا چاہتے ہیں لیکن میں انکار کررہی ہوں۔"

"انکار کی وجہ؟"

"میں روٹین لائف نہیں گزارنا چاہتی۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ جوان ہوئے، شادی کی، بچے پیدا کئے اور مرگئے۔ یہ زندگی ایک بار ملتی ہے اسے انجوائے کرنا چاہیے۔ اگر لندن، پیرس اور سوئٹزرلینڈ نہ گئے تو پھر دنیا کیا دیکھی۔"

"بے شک دنیا ضرور دیکھنی چاہیے۔ تم نے کتنے ملک اور شہر دیکھے ہیں؟"

"گوجرانوالہ، پنڈی اسلام آباد اور ملتان دیکھا ہے۔ کبھی پنجاب سے باہر نہیں گئی۔ ملک سے باہر کیا جاؤں گی؟"

"تو پھر ایسے ذرائع پیدا کرو کہ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پرواز

کرسکو۔ کچھ ایسا کرو کہ جس ملک میں جس شہر میں جاؤ' وہاں کا بینک کاؤنٹر تمہارے لئے کھلا ہو۔"

اس نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔ "کیا ایسا ممکن ہے؟"

"ہاں' اگر اس سلسلے میں سنجیدگی سے سوچا جائے اور کوئی ٹھوس منصوبہ بنایا جائے اور تم مجھ سے تعاون کرتی رہو تو میں تمہارے لئے ایک شاندار زندگی کا راستہ نکال سکتا ہوں۔"

"مجھے کس طرح تعاون کرنا ہوگا؟"

"جیسا منصوبہ ہوگا' اسی کے مطابق تمہاری دلچسپی اور توجہ کی ضرورت ہوگی۔ پھر میں جو کہوں گا اُس پر عمل کرنا ہوگا۔"

"کچھ معلوم تو ہو کہ تم کیا کہوگے اور مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"سب سے پہلے تو یہ سمجھ لو' شرافت سے سیدھی سادی محنت سے دولت حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لئے جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا ہوتا ہے۔ کبھی اپنی مرضی اور مزاج کے خلاف بھی کام کرنا پڑتا ہے۔"

"میں سمجھنے کی کوشش کروں گی کہ تمہاری ان باتوں کے پیچھے اور کیا کچھ سمجھنے کے لئے رہ گیا ہے' ویسے ایک بات تمہیں بھی سمجھادوں کہ میں دولت کی خاطر سب کچھ کرسکتی ہوں لیکن اپنے اندر کی عورت کو کبھی نقصان نہیں پہنچنے دوں گی۔ مجھے صرف وہی ہاتھ لگائے گا جو میرا جیون ساتھی ہوگا۔"

"پہلے دولت حاصل کرنے اور کچھ بننے کی بات کرو۔ ابھی تمہاری شخصیت ایک ایسے کاغذ کی طرح ہے' جس پر غربت اور پسماندگی کے الفاظ نمایاں ہیں۔ ایسی شخصیت کی حامل لڑکیاں گھر میں بیٹھی بوڑھی ہوجاتی ہیں۔ کوئی ان کی عصمت' آبرو اور شرافت کی داد دینے اور ان سے نکاح قبول کرنے نہیں آتا۔"

"تمہاری باتوں سے پتا چلتا ہے کہ تم عورت کی عزت کو اہمیت نہیں دیتے ہو۔"

"بہت اہمیت دیتا ہوں۔ ایسی بے شمار بہترین گلوکارائیں' بہترین اداکارائیں' بہترین سماجی کارکن اور بہترین لیڈی ڈاکٹرز وغیرہ ہیں' جنہوں نے کھلے عام کئی عشق کئے اور شہرت دولت حاصل کرنے کے لئے غلط راستے اختیار کئے۔ اُن پر بہت کم کیچڑ اچھالی گئی اور زیادہ تر پھولوں کے ہار ہی پہنائے گئے۔ ان کی تقریبات میں اعلیٰ حکام نے شرکت کی اور انہیں بڑے اعزازات سے نوازا گیا۔ ملک کے اندر اور باہر ان کی جتنی عزت اور پذیرائی ہوتی ہے ویسی عزت کسی نیک سیرت اور محدود وسائل رکھنے والی فنکارہ کو نہیں ملتی۔ تم

کہتی ہو' میں عزت کو اہمیت نہیں دیتا۔ میری نظروں میں وہی عزت ہے جو دنیا سے ملتی ہے۔ محلے کی عورتیں اگر کسی عورت کو بدچلن کہہ دیں تو بدنامی محدود ہوگی۔ اسی عورت کو علاقے کا ڈی سی یا اسمبلی کا کوئی ممبر نیک چلنی کا کاغذ لکھ کر دے دے تو اس کی نیک نامی اخبارات میں شائع ہوگی۔ عورت کبھی اپنے اعمال کے باعث نیک چلن یا بدچلن سمجھی جاتی تھی' اب بڑے آدمی کا لکھا ہوا کاغذ سرٹیفکیٹ ہوجاتا ہے۔"

کھانا آگیا۔ وہ کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ امبر نے پوچھا۔ "کیا تم نے بھی چور دروازے سے دولت حاصل کی ہے؟"

"ہاں۔ میں جیسا ہوں' ویسے ہی مشورے دے رہا ہوں۔ تم آج جہاں ہو' کل میں بھی وہاں تھا۔ میں نے جینے کے ڈھنگ بدلے' نظریات بدلے۔ نیکی کو دریا میں ڈال دیا پھر اُسے کنارے لگنے نہیں دیا۔ آج میں لاکھوں میں کھیل رہا ہوں۔"

وہ اس کی باتیں سنتی رہی۔ سوچتی رہی' کسی حد تک قائل ہوتی رہی۔ کھانے کے بعد انہوں نے آئس کریم کھائی۔ موضوع بدل بدل کر باتیں کرتے رہے پھر گھوم پھر کر دولت کے حصول کے موضوع پر آجاتے۔ یکایک امبر نے کہا۔ "چار بجنے والے ہیں۔ مجھے گھر جاکر ابا کے لئے کھانا تیار کرنا ہے۔"

پھر وہ بتانے لگی کہ کس طرح باپ کی لاعلمی میں گھر سے نکلا کرتی ہے اور یوں گھومنے پھرنے کے لئے پڑوسن خالہ کو رشوتیں دیتی رہتی ہے۔ شہزادے نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم ائرکنڈیشنڈ ہوٹل اور ائرکنڈیشنڈ کار سے نکل کر گھر کا چولہا جلاؤ اور اتنی سخت گرمی میں کھانا تیار کرو' میں یہاں سے کھانا پیک کراتا ہوں۔ آج اپنے ابا کو وہی کھلا دینا۔"

"کیا ابا سے جوتے کھلواؤ گے؟ وہ پوچھیں گے کہ اتنا عمدہ اور مہنگا کھانا کہاں سے لائی ہوں۔"

"کہہ دینا پڑوسن خالہ کے ہاں سے آیا ہے۔ اتنا کھانا ہوگا کہ تمہاری پڑوسن خالہ بھی خوش ہوجائے گی۔"

اس نے ایک ویٹر کو بلا کر کھانا پیک کرکے لانے کا حکم دیا۔ امبر نے ویٹر کے جانے کے بعد کہا۔ "یہ تم اچھا نہیں کررہے ہو۔ پہلی ملاقات میں مجھ پر اتنا بوجھ ڈال رہے ہو۔"

"مجھے غیر سمجھوگی تو میرا اپنا پن بوجھ محسوس ہوگا۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ لاکھوں روپے میں کھیلنے والا کوئی جوان تمہارا لائف پارٹنر بنے؟"

وہ سرجھکا کر مسکرائی' پھر بولی۔ "ہر وہ لڑکی جو شان و شوکت سے جینا چاہتی ہے وہ

ایسے ہی لائف پارٹنر کو آئیڈیل بنائے گی۔"

"لیکن کسی دولت مند جوان کے دل میں سمانے کے لئے خود کو اس کی اونچی سوسائٹی کے شایانِ شان بنانا ہوگا تاکہ اس ماحول میں تم اپنے آپ کو رئیس زادی کہہ سکو۔"

وہ تھوڑی دیر بعد کھانے کا پیکٹ لے کر کار کے پاس آئے۔ شہزادے نے اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ پیچھے کس کی تصویر خرید کر رکھی ہے؟"

"میری ہے۔ دیکھو گے؟"

"کیوں نہیں، تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ یہ تمہاری اپنی تصویر ہے۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر پچھلی سیٹ سے تصویر کو اٹھایا۔ اس کی ڈوری کھولی پھر لپٹے ہوئے اخبار کو ہٹا کر اسے دیکھنے لگا اور تعریفیں کرنے لگا۔ "بھئی بڑے کمال کی تصویر ہے۔ پورا پوز بڑا جذباتی ہے۔ رنگوں کی آمیزش خوب ہے لیکن ...."

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر اسے دیکھا، وہ بولی۔ "لیکن کیا؟"

"یہ کہ تم جتنی حسین ہو، آرٹسٹ اتنا حسن تصویر میں نہ لا سکا۔"

"رہنے بھی دو۔ میں اتنی حسین بھی نہیں ہوں، جتنی تعریفیں کر رہے ہو۔"

"تم نہ مانو۔ مگر آج سے میری نیندیں اُڑیں گی اور میں راتوں کو کروٹیں بدل بدل کر سوچتا رہوں گا کہ تمہیں اپنی طرح دولت مند کیسے بناؤں۔ جس دن گلبرگ، شادمان ٹاؤن یا ماڈل ٹاؤن میں تمہاری اپنی ایک کوٹھی، ایک کار ہو جائے گی اُس روز تم سے شادی کی درخواست کروں گا۔"

وہ شرما رہی تھی۔ مسکرا رہی تھی۔ خوابوں میں اُڑی جا رہی تھی۔ شہزادے نے گلیکسی سینما کے سامنے کار روکی تو اسے ہوش آیا کہ رحمان پورہ موڑ کے پاس پہنچ گئی ہے۔ وہ دوسرے دن ملاقات کرنے کا وعدہ کر کے جانے لگی۔ شہزادہ سلیم کار میں بیٹھا اسے گلی میں جاتا دیکھتا رہا۔ وہ مطمئن تھا کہ اس نے پہلی ملاقات میں اس حسینہ کے اندر دولت کی خاصی بارود بھر دی ہے۔ کل دوسری ملاقات تک اس کے اندر دھماکے ہوتے رہیں گے۔

جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو اس نے کار گلبرگ کی طرف بڑھا دی۔ اس چھوٹے علاقے سے گزر کر بڑے لوگوں کے علاقے کی سمت جانے لگا۔ یہ دستور ہے، آدمی چھوٹے سے بڑا ہوتا ہے۔ قد میں بڑا قدرت کرتی ہے۔ حیثیت میں چھوٹے سے بڑا وہ خود ہوتا ہے۔ شہزادہ سلیم اور اس کے باپ کلیم ٹھیکے دار کی زندگی میں بھی ایک ایسا موقع آیا تھا جب دونوں باپ بیٹے نے خود کو چھوٹی حیثیت سے نکال کر بہت بڑی حیثیت کے خانے

میں ڈال دیا تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے کار، کوٹھی اور بینک بیلنس والے ہوگئے تھے۔

کلیم نے برسوں پہلے ٹھیکے داری چھوڑ دی تھی کیونکہ ٹھیکے داری راس نہیں آئی۔ پھر بھی پرانے شناسا اُسے کلیم ٹھیکے دار ہی کہتے تھے۔ ایک دواساز کمپنی کو دواؤں کی تشہیر اور فروخت کے لئے ایک فیلڈ ورکر کی ضرورت تھی۔ اخبارات میں اشتہار شائع ہوا تھا کہ اس سلسلے میں ایک تجربہ کار جوان کی ضرورت ہے۔

کلیم اس ملازمت کی شرائط کے مطابق جوان نہیں تھا لیکن پینتالیس برس کی عمر میں بوڑھا بھی نہیں لگتا تھا۔ بچپن سے بتیس برس کی عمر تک پہلوانی کرتا رہا تھا۔ بڑا قد آور جوان لگتا تھا، پھر قدرت نے یہ مہربانی کی تھی کہ بال اب تک سفید نہیں ہوئے تھے۔ جلد کی رنگت سرخ و سفید تھی۔ پینٹ شرٹ اور نکٹائی لگا کر نکلتا تھا تو بالکل انگریز لگتا تھا۔

دواساز کمپنی کا ایک سپروائزر کلیم کا دوست تھا۔ اس نے بتایا کہ وہاں کی لیبارٹری میں درپردہ کچھ ایسی دوائیں بنتی ہیں، جو مالکان کو لاکھوں کا فائدہ پہنچاتی رہتی ہیں۔ اس کمپنی کا مالک پانچ برس پہلے مر چکا تھا۔ اب اُس کی بیوہ فرزانہ اس کی جوان بیٹی ثمینہ وہاں کا کاروبار سنبھال رہی تھیں۔

کلیم کے دوست نے کہا۔ "میں نے بیگم صاحبہ سے تمہاری بات کی ہے۔ فیکٹری میں آکر ملو۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔"

کلیم صرف ملازمت پر اکتفا کرنے والا بندہ نہیں تھا۔ اس کی دلچسپی یہ تھی کہ وہاں کچھ غیرقانونی دوائیں تیار ہوتی تھیں اور وہ سپروائزر کے تعاون سے ان دواؤں کو چور دروازوں سے نکال کر زیادہ سے زیادہ مال کما سکتا تھا۔ سپروائزر نے کہا۔ "کل انٹرویو کے لئے جاؤ تو یہ یاد رکھنا کہ بیگم صاحبہ کی جوان بیٹی ثمینہ ذرا خبطی ہے۔ بظاہر نارمل رہتی ہے۔ کبھی کبھی ذہنی رو بہک جاتی ہے۔ ماں بیٹی میں بنتی نہیں ہے۔ دونوں دفتر میں بھی جھگڑتی رہتی ہیں۔ ان کے جھگڑنے سے یوں لگتا ہے جیسے اس فیکٹری کے ٹکڑے ہو جائیں گے اور ماں بیٹی اپنا اپنا حصہ لے کر الگ ہو جائیں گی لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔ وہ جتنا لڑتی ہیں، اتنی ہی ایک دوسرے سے محبت بھی کرتی ہیں۔"

وہ دوسری صبح فیکٹری کی عمارت میں آیا۔ اپنے آنے کی اطلاع اندر بھیجی۔ چپراسی اندر گیا پھر باہر آکر بولا۔ "جاؤ، مگر پہلے یہ سرخ نکٹائی اتار کر جیب میں چھپالو۔ ثمینہ بی بی کو لال رنگ دیکھ کر غصہ آجاتا ہے۔"

اس نے ہدایت پر عمل کیا۔ نکٹائی جیب میں رکھ لی پھر دروازہ کھول کر ا[illegible] ہوئے بولا۔ "کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"

وہاں بڑے سے کمرے میں دو بڑی میزیں تھیں۔ دونوں میزوں کے پیچھے دو عورتیں ریوالونگ چیئر پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "اندر آکر اندر آنے کی اجازت حاصل کر رہے ہو۔ کیا عقل سے پیدل ہو؟"

"وہ بی بی جی! بات یہ ہے کہ باہر سے اجازت لیتا تو اندر میری آواز نہ آتی۔"

دوسری نے پوچھا۔ "اجازت حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جبکہ ہم نے چپراسی کے ذریعے اجازت دے دی تھی۔"

"مجھ سے غلطی ہوگئی' آئندہ نہیں ہوگی۔"

وہ دونوں کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ دونوں ہی جوان لگ رہی تھیں۔ شاید وہ میک اپ کا کمال تھا یا دولت کی فراوانی تھی' جس نے دونوں کو .... خصوصاً بیگم فرزانہ کو اب تک تروتازہ رکھا تھا۔ ان میں سے ایک نے دوسری سے کہا۔ "ممی! اس بندے کو میں نے بلایا ہے۔ مجھے سوالات کرنے دیں۔"

یوں پتا چلا کہ دائیں طرف ثمینہ بیٹھی ہوئی تھی۔ بائیں طرف بیٹھی ہوئی بیگم فرزانہ نے گھور کر کہا۔ "ثمینہ! میں نے کتنی بار سمجھایا ہے کہ دفتر میں مجھے ممی نہ کہا کرو۔"

"کیوں نہ کہوں؟ کیا آپ دفتر میں میری سہیلی یا بڑی بہن بن کر رہنا چاہتی ہیں؟"

"دیکھو' تم پھر وہی روز کا جھگڑا شروع کر رہی ہو۔ میں چاہتی ہوں' دفتر میں رشتے داری نہ ہو۔ ہم صرف بزنس پارٹنر کی حیثیت سے فرائض انجام دیں۔ اس طرح ہمارے درمیان لڑائی نہیں ہوگی۔"

"نان سینس۔ یہ کوئی عقل کی بات نہیں ہے۔ بزنس پارٹنر بھی لڑتے ہیں اور ماں بیٹی سے زیادہ لڑتے ہیں۔ پارٹنر ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ ہم ماں بیٹی کا جھگڑا بس وقتی جھگڑا ہے' ہوتا ہے پھر ختم ہو جاتا ہے۔"

"بے شک یہ تم نے عقل کی بات کی ہے۔ یوں ثابت ہوا کہ میری بیٹی ایب نارمل نہیں ہے۔"

"تو پھر آپ مجھے اس بندے کا انٹرویو تنہائی میں لینے دیں۔"

بیگم فرزانہ نے کلیم کو سر سے پیر تک ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ذرا دیر سوچتی رہی۔ ثمینہ نے کہا۔ "ممی! یہ بری بات ہے۔ آپ جو سوچ رہی ہیں' وہ میرا ارادہ نہیں ہے۔ میں تو بس اسے ملازم رکھنا چاہتی ہوں۔"

فرزانہ نے کہا۔ "خاموش رہو۔ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہارے کسی بکواس ارادے کے متعلق سوچ رہی ہوں۔"

"آپ ایسا ہی سوچتی ہیں اور مجھے پاگل سمجھتی ہیں۔"

"تم ہو۔ ضرور ہو مجھے اپنے پاگل پن سے پریشان کرتی رہتی ہو۔"

"پاگل تو آپ ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کہا ہے کہ میں ایب نارمل نہیں ہوں۔ اب اپنی زبان سے پھر رہی ہیں۔"

"کیا ایک اجنبی کے سامنے یوں جھگڑا کرنا کوئی دانائی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ اسے تھوڑی دیر کے لئے باہر بھیج دیا جائے۔ جب ہم کسی نتیجے پر پہنچ جائیں تب اسے بلائیں۔"

کلیم ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ دو پاگلوں کے درمیان پھنس گیا ہے۔ ثمینہ اسے دیکھ کر مسکرائی پھر بولی۔ "ینگ مین! تمہارا نام کیا ہے؟"

"بندے کو کلیم یزدانی کہتے ہیں۔"

"بہت اچھا اور بڑے آدمیوں جیسا نام ہے۔ تم کچھ خیال نہ کرو۔ تھوڑی دیر کے لئے باہر چلے جاؤ' میں پھر بلاؤں گی۔"

وہ باہر چلا گیا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد فرزانہ نے بیٹی کو گھور کر پوچھا۔ "تم اُس کے نام کی تعریف کیوں کر رہی تھیں۔ وہ یہاں ملازمت کرنے آیا ہے۔ اسے باہر جانے کا حکم دینا چاہیے تھا۔"

"ممی! ہوش کی باتیں کریں۔ کیا وہ ملازم لگتا ہے؟ میری آنکھوں سے دیکھیں کتنا گھبرو اور ہینڈسم ہے۔"

"اوہ گاڈ! تم پھر وہی حرکتیں کر رہی ہو۔ اگر لوگوں کے پتا چلے گا تو ہماری کیا عزت رہ جائے گی۔ لوگ ہم پر تھوکیں گے۔"

"ممی! ہمیشہ نیچے والوں پر تھوکا جاتا ہے۔ اوپر والوں پر کوئی اس لئے نہیں تھوکتا کہ اوپر سے تھوک اُن کے ہی منہ پر آتا ہے۔"

"پھر بھی بدنامی کی راہ پر نہیں چلنا چاہیے۔ تم پچھلے تین برسوں سے شوہر بدلتی آرہی ہو۔ یہ دسمبر کا مہینہ ہے۔ نیا سال شروع ہونے والا ہے۔ میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ تم نئے سال کے کیلنڈر کی طرح نیا شوہر کہیں سے پکڑ لاؤ گی اور تم اسے یہیں پکڑ رہی ہو۔"

"آپ مجھے کچھ کہنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانکیں۔ ڈیڈی کی موت کے بعد آپ نے دوسری شادی کی پھر تین برس بعد اُس سے طلاق لے لی۔ اب کسی تیسرے شوہر کی تلاش میں ہیں۔"

"تم جانتی ہو کہ میں اپنی اور تمہاری بھلائی کے لئے ایسا کرتی ہوں۔"

"اور آپ جانتی ہیں کہ میں نے پچھلے تین گدھوں سے طلاقیں لیں اور ہر ایک سے مہر کے پچیس پچیس لاکھ روپے وصول کئے۔ آپ فیکٹری کی پروڈکٹس بڑھانے کے لئے بینک سے قرضہ لیتیں تو یہ فیکٹری گروی رکھنی پڑتی۔ دس طرح کے جھمیلے ہوتے پھر اتنی بڑی رقم نہ ملتی۔ میں نے تین برس میں ان تینوں سے پچھتّر لاکھ روپے نچوڑ لئے ہیں۔"

اس عالم رنگ و بو میں کیسی کیسی بدبو تیار کی جاتی ہے' یہ ہر کوئی سمجھ نہیں پاتا۔ انسانی اقدار کو پامال کرنے اور منافع حاصل کرنے کی نئی راہیں ہموار کرنے کے لئے ایسے عجیب وغریب طریقے اختیار کئے جاتے ہیں' جنہیں دیکھنے کے لئے ایکسرے کی آنکھ لازمی ہوتی ہے۔ جب وہ انیس برس کی تھی تو ایک وڈیرا سیاست دان اس پر عاشق ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا' شادی نہ ہو۔ صرف تعلقات قائم رہیں۔ بیگم فرزانہ نے کہا۔ "آپ لوگ سیاسی پنچھی ہیں۔ آپ پانچ برس کے لئے آتے ہیں پھر پُھر ہو جاتے ہیں۔ ویسے پانچ برس بھی کوئی پورے نہیں کر پاتا۔ ذرا اٹھ کر ٹائلٹ کے لئے جاتا ہے تو دوسرا کرسی پر آ بیٹھتا ہے۔ اس لئے میں اپنی بیٹی کی عزت اور سلامتی کی ضمانت چاہوں گی۔"

"تم کیسی ضمانت چاہتی ہو؟"

"پہلی ضمانت تو یہ کہ ثمینہ سے باقاعدہ نکاح ہو گا اور آپ حق مہر کے طور پر پچیس لاکھ روپے ادا کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر یہ شادی راز میں رہے گی۔"

"چلو راز میں رہے گی لیکن کوئی گڑ بڑ ہو گی' ہماری عزت پر حرف آئے گا تو میں راز فاش کر دوں گی۔"

وڈیرے نے سوچا۔ پہلے چڑیا پنجرے میں آ جائے۔ میں اگلے سال متوقع الیکشن جیت لوں گا پھر ماں بیٹی کے پر کاٹ ڈالوں گا۔ اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ آگے بولو۔"

"مہر کے پچیس لاکھ روپے شادی سے ایک دن پہلے ادا ہوں گے۔"

"میں بڑی زمینوں کا مالک ہوں لیکن میرے پاس نقد لاکھوں روپے نہیں ہیں۔ میں پہلے ایک لاکھ دوں گا پھر الیکشن کے بعد.........."

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "مجھ سے الیکشن کی نہیں' شادی کی بات کرو۔ فلمساز فلموں اور سیاست دان الیکشن میں ساری پونجی لگا کر کنگال ہو جاتے ہیں۔ مجھے آپ کے ایم پی اے یا ایم این اے بننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ شادی سے پہلے پوری رقم ادا کر سکیں

ثمینہ کا دوسرا شوہر منشیات کا ایک اسمگلر قادر خان تھا۔ وہ بیگم فرزانہ سے ملاقات کرنے آیا تھا۔ ثمینہ اسے دیکھ کر عاشق ہو گئی تھی۔ وہ ایک طرح نفسیاتی مریضہ تھی۔ عمر رسیدہ لوگوں کو پسند کرتی تھی اور ایسے بوڑھوں میں جو زیادہ پسند آتا تھا اس سے شادی کرنے کی ضد شروع کر دیتی تھی۔

فرزانہ نے بیٹی کی پہلی شادی کو بڑے راز میں رکھا تھا اور اتنی ہی راز داری سے وہ معاملہ ختم کر دیا تھا۔ جب ثمینہ نے دوسری بار ایک عمر رسیدہ شخص کو جیون ساتھی بنانا چاہا تو اس نے کاروباری انداز میں سوچا کہ بیٹی خبطی ہے تو اس کے خبطی پن سے بھی منافع حاصل کرنا چاہیے۔

قادر خان چاہتا تھا کہ پوست سے افیون کشید کرنے کے مرحلے سے لے کر ہیروئن تیار کرنے تک جو رقیق مادہ نکلتا ہے' اس سے نشلی دوا کے طور پر انجکشن تیار کیے جائیں۔ اس نے سنا تھا کہ فرزانہ کی لیبارٹری میں بڑے ماہر اور تجربہ کار دوا ساز ہیں۔ وہ اس کے فارمولے کو عملی شکل میں لے آئیں گے۔

فرزانہ کے لیے یہ کوئی فارمولا نہیں تھا۔ وہ بہت عرصے سے ایسی دوائیں تیار کراتی آ رہی تھی۔ اس سلسلے میں قادر خان کو راز دار بنانا نہیں چاہتی تھی۔ اسے ٹرخا دینا چاہتی تھی لیکن بیٹی نے اسے اپنے حسن کا اسیر بنا لیا تھا۔ قادر خان آئندہ غیر قانونی دھندے کو مستحکم کرنے کے لیے ثمینہ سے شادی کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔

بیگم فرزانہ نے کہا۔ "چند شرائط کاغذ پر لکھ کر ان پر عمل کرنے کا معاہدہ کرو گے تو تمہیں داماد بناؤں گی۔"

پھر اس نے شرائط بیان کیں۔ پہلی شرط یہ تھی کہ مہر کی رقم پچیس لاکھ روپے ہو گی اور شادی سے پہلے ادا کی جائے گی۔ دوسری شرط کے مطابق اسے یہ لکھنا ہو گا کہ وہ ایک نہایت شریف آدمی ہے اور نہایت صاف ستھرا دوا سازی کا کام کرتا ہے۔ ثمینہ کی شرافت اور خاندانی نیک نامی سے متاثر ہو کر اس سے شادی کر رہا ہے اور یہ عہد کرتا ہے کہ کبھی غلط اور غیر قانونی دوائیں تیار نہیں کرے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا اور قانون کی نظروں میں مجرم ٹھہرا تو مجرم سے ثمینہ کا نکاح قائم نہیں رہے گا اور اسے معاہدے کے مطابق طلاق ہو جائے گی۔"

ایک اسمگلر کے لیے پچیس لاکھ کی رقم کچھ بڑی نہ تھی۔ اس نے رقم ادا کر دی۔ کاغذ پر لکھ دیا اور ثمینہ سے شادی کر لی۔

یہ طے ہو چکا تھا کہ غیر قانونی انجکشن تیار کرنے کی لیبارٹری دوسری جگہ ہو گی۔

قادر خان نے وہ جگہ خریدی اور وہاں لیبارٹری کی چار دیواری بنائی پھر اس میں ضروری سامان اور آلات لا کر رکھے۔ فرزانہ نے وعدہ کیا تھا کہ اس کی لیبارٹری کے ماہرین قادر خان کے ہاں جا کر پارٹ ٹائم کام کیا کریں گے۔ قادر لیبارٹری قائم ہونے اور کام شروع ہونے میں آٹھ ماہ لگ گئے۔ آئندہ دو ماہ میں ماہرین نے بڑے مؤثر نشیلے انجکشن تیار کیے۔ قادر خان کے تجربات نے کہا کہ وہ انجکشن ملکی اور غیر ملکی مارکیٹ میں دھوم مچا دیں گے اور کروڑوں روپے کا منافع دیتے رہیں گے۔

بیگم فرزانہ اپنی لیبارٹری سے سالانہ لاکھوں روپے کما لیتی تھی۔ اسے دولت سے زیادہ بیٹی سے پیار تھا۔ وہ اس نیم پاگل لڑکی کو ڈھیل دے کر پھر اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ گیارہ ماہ بعد اس نے اپنی لیبارٹری کے ماہرین کو تاکید کی کہ کل کوئی قادر خان کی لیبارٹری میں نہیں جائے گا اور یہ بات قادر خان کو معلوم نہ ہو۔

دوسرے دن پولیس کے ایک اعلیٰ افسر نے قادر لیبارٹری پر چھاپہ مارا۔ تقریباً چالیس ہزار انجکشنوں کی شیشیاں برآمد ہوئیں۔ قادر خان کو ہتھکڑی لگ گئی۔ وہ جیل پہنچ گیا۔ بیگم فرزانہ نے عدالت میں بیان دیا کہ اس نے اسے ایک شریف آدمی سمجھ کر داماد بنایا۔ اس نے یہ لکھ دیا تھا کہ صاف ستھری دوا سازی کا کام کرتا ہے اور اگر کبھی غلط اور غیر قانونی کام کرنے کے نتیجے میں مجرم ٹھہرایا جائے گا تو ایسی صورت میں ایک مجرم سے نکاح قائم نہیں رہے گا اور معاہدے کے مطابق طلاق ہو جائے گی۔

قادر خان کا وہ لکھا ہوا کاغذ عدالت میں پیش ہوا۔ اس کے بعد وہ جیل میں چلا گیا اور عدالت نے تسلیم کیا کہ طلاق ہو چکی ہے اور ثمینہ اس کی منکوحہ نہیں رہی ہے۔

تیسرا شوہر ایک فلم ساز تھا۔ بیگم فرزانہ نے سیاست داں سے پچیس لاکھ نچوڑ کر اسے زمینوں پر واپس بھیج دیا تھا۔ بے چارہ الیکشن میں ہار جانے کے بعد دو کوڑی کا نہ رہا تھا پھر اس نے قادر خان جیسے اسمگلر کو پھانس کر جیل پہنچا دیا تھا لہٰذا وہ فلم ساز کس گنتی میں تھا۔ بیگم فرزانہ کے دو ٹارگٹ ہوا کرتے تھے۔ پچیس لاکھ روپے اور گیارہ ماہ۔ ان ٹارگٹس میں کھیل تمام ہو جاتا تھا۔

اس نے گیارہ ماہ میں پچیس لاکھ وصول کر کے اس فلم ساز کی بھی چھٹی کر دی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایسے طریقہ کار سے مطلوبہ منافع ملتا رہے اور بیٹی کو رفتہ رفتہ عقل آ جائے کہ عشق محض دماغی فتور ہے۔ اسے عشقیہ جذبات کو دل سے نکال دینا چاہیے۔ یا پھر ماں سے چالاکی سیکھنا چاہیے۔

وہ چالاک تھی۔ بھاری منافع کی خاطر ماں کی ہدایات پر عمل کرتی تھی۔ مگر دماغ میں

عشق والا پرزہ ڈھیلا تھا۔ جو پسند آ جاتا تھا' اس سے شادی کرنے کے لیے ماں کے پیچھے پڑ جاتی تھی۔

اب چوتھا نمبر کلیم ٹھیکے دار کا تھا۔ جس نے ثمینہ کو اپنا نام کلیم یزدانی بتایا تھا۔ بیگم فرزانہ نے اسے دفتری کمرے سے باہر بھیج دیا تھا۔ اب بیٹی سے اس سلسلے میں بحث کر رہی تھی کہ وہ آخر کب تک ایسی نادانی کرتی رہے گی۔ اب اسے ایک اچھے خاندانی لڑکے سے شادی کر لینا چاہیے۔

ثمینہ کو کوئی جوان لڑکا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ فرزانہ نے کہا۔ "کلیم کچھ بوڑھا بھی لگتا ہے اور کنگال بھی۔ اسی لیے ملازمت کرنے آیا ہے۔"

"ممی! اب تک میں نے امیروں سے شادی کی لیکن میرا دل امیر اور غریب نہیں دیکھتا۔ اس بار ایک غریب پر دل آ گیا ہے تو میں کیا کروں؟ آپ گیارہ مہینے برداشت کر لیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ گیارہ سے بارہواں مہینہ ہونے نہیں دیں گی۔"

"میری جان! تم جو کہو گی' وہی کروں گی۔ میری ایک بات مانو۔ دوسرے کمرے میں جا کر تنہائی اور خاموشی سے غور کرو۔ اپنے دماغ سے اس موجودہ عشق کو نوچ کر پھینکنے کی کوشش کرو۔ میں آدھے گھنٹے بعد تمہارے پاس آکر آخری فیصلہ سنوں گی۔ تم باز نہیں آؤ گی تو اس کلیم یزدانی سے رشتہ کر دوں گی۔"

ثمینہ وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ فرزانہ پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ بیٹی کو کیسے غریبی کے عشق سے باز رکھے۔ جس کے لئے وہ مچل رہی ہے' اس کی جیب سے پچیس روپے بھی نہیں نکلیں گے۔ پچیس لاکھ روپے تو دور کی بات ہیں۔

وہ کلیم کو بیٹی کے راستے سے ہٹا سکتی تھی۔ ایسے ذرائع کی مالک تھی کہ بندہ غائب کرا سکتی تھی لیکن ڈاکٹر نے تاکید کی تھی کہ ثمینہ کو ذہنی صدمہ نہ پہنچایا جائے ورنہ وہ مکمل طور پر پاگل ہو جائے گی۔

وہ آدھے گھنٹے بعد دوسرے کمرے میں آئی۔ وہاں ثمینہ نہیں تھی۔ اس نے باہر آکر ملازم سے پوچھا۔ "بی بی جی کہاں ہیں؟"

ملازم نے کہا۔ "ابھی کسی صاحب کے ساتھ گئی ہیں۔"

فرزانہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے دفتر کے دروازے پر آئی۔ چپراسی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔ "یہاں جو کلیم یزدانی آیا تھا' وہ کہاں ہے؟"

"جی وہ بی بی جی کے ساتھ گیا ہے۔"

بس ایسے ہی موقع پر ماں اپنی بیٹی سے ہار جاتی تھی۔

ثمینہ کلیم کو کار میں بٹھا کر جانے کہاں کہاں گھومتی رہی۔ لنچ کے بعد واپس آئی پھر ماں کے گلے سے لگ کر بولی۔ "سوری ممی! آپ کو میرے یوں جانے سے تکلیف ہوئی ہو گی۔ مگر میں دل سے مجبور تھی۔ وہ باہر ہے' اسے بلاؤں؟"

"ذرا ٹھہرو۔ پہلے یہ بتاؤ۔ تم نے اسے یہاں سے لے جا کر کیا انٹرویو لیا؟"

"ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ اس نے بتایا۔ ایک بار اس نے شادی کی تھی۔ بیوی مر گئی ہے۔"

"اولاد تو ہو گی؟"

"کوئی اولاد نہیں ہے؟"

"اس کنگال کے پاس کچھ ہے بھی یا نہیں؟"

"رحمان پورہ میں ایک تین منزلہ کوٹھی ہے۔"

"وہ تیسرے درجے کے دولت مند لوگوں کا علاقہ ہے۔ وہاں اس کوٹھی کی قیمت زیادہ سے زیادہ چھ یا سات لاکھ ہو گی۔"

"کچھ تو ہے ممی! بالکل ہی کنگال نہیں ہے۔ آپ اپنی کاروباری تسکین کے لیے چھ لاکھ تو وصول کر سکیں گی۔"

"ٹھیک ہے' تم جاؤ۔ میں اسے بلا کر اپنے طور پر باتیں کروں گی۔"

وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ فرزانہ نے چپراسی کو بلا کر حکم دیا۔ "کلیم کو بھیج دو۔"

چپراسی باہر گیا۔ کلیم اندر آ گیا۔ فرزانہ نے کہا۔ "بیٹھو۔"

وہ بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا۔ "میری بیٹی سے کیا باتیں ہوئیں؟"

وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "میں کیا بتاؤں؟ جو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا' وہ مس ثمینہ کہہ رہی تھیں۔"

"وہ مثل تو سنی ہو گی' آگ لینے آئے تھے' پیغمبری مل گئی۔"

"فی الحال میرے ہاتھ خالی ہیں۔ نہ آتش ہے' نہ آتشِ شوق۔ مجھے اس در سے جو ملے گا' وہ لے جاؤں گا۔"

"یہ تو جانتے ہو گے کہ بڑے گھر کی لڑکی کے مہر کی رقم بھی بڑی ہوتی ہے۔"

"جی ہاں' کچھ اندازہ ہے۔"

"مہر کی رقم پچیس لاکھ روپے ہو گی؟"

"بیگم صاحبہ! میں اتنا دولت مند نہیں ہوں۔ میری ایک تین منزلہ کوٹھی رحمان

پورہ میں ہے۔ پندرہ برس پہلے ساڑھے تین لاکھ روپے میں بنوائی تھی۔ اب وہ بارہ چودہ لاکھ روپے کی ہو گئی ہے۔"

"تو پھر چودہ لاکھ لے آؤ اور کاغذ لکھ دو۔"

"کیسا کاغذ؟"

"وہ کاغذ جو دو جھوٹے انسانوں کے درمیان سچائی کی زبان بن جاتا ہے۔ میں انکوائری نہیں کرنے جاؤں گی کہ تم کہاں رہتے ہو اور کس حیثیت کے آدمی ہو۔ اگر جھوٹ بولو گے اور فراڈ کرو گے تو تمہارا لکھا ہوا کاغذ تمہیں پکڑے گا۔"

"مجھے کیا لکھنا ہو گا؟"

"یہی کہ تم مہر کی رقم پچیس لاکھ روپے ادا کرو گے۔ اس سلسلے کی نصف رقم اپنی کوٹھی کی صورت میں ادا کر رہے ہو اور اسے ثمینہ کے نام لکھ رہے ہو۔ اگر کوٹھی بارہ لاکھ میں فروخت ہو گی تو باقی تیرہ لاکھ کی ادائیگی تم پر واجب ہو گی۔ اگر کبھی طلاق ہو گی تو یہ رقم تم ادا کرو گے۔"

"بیگم صاحبہ! یہ کاغذ لکھ کر میں کنگال ہو جاؤں گا۔"

"کنگال نہیں ہو گے۔ ایک کروڑ پتی بیوی کے شوہر بن جاؤ گے۔ وہ کبھی تم سے طلاق نہیں مانگے گی۔ تم ساری زندگی عیش و عشرت میں گزارتے رہو گے۔"

"مس ثمینہ کروڑ پتی کیسے ہو سکتی ہیں' وہ تو آپ کی سرپرستی میں ہیں' آپ کی محتاج ہیں۔"

بیگم فرزانہ نے دراز کھول کر ایک دستاویز نکالی۔ پھر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے پڑھ لو' اس عدالتی دستاویز کے مطابق ثمینہ اس دوا ساز کمپنی یعنی فرزانہ لیبارٹری میں ستر فیصد کی حصے دار ہے اور میرا حصہ تیس فیصد ہے۔"

کلیم اسے لے کر پندرہ بیس منٹ تک توجہ سے پڑھتا رہا۔ پھر قائل ہو کر بولا۔ "میں مطمئن ہوں۔ آپ یہ بتائیں' شادی کے بعد کیا فیکٹری کی آمدنی کا کچھ حصہ میں اپنی ذات پر خرچ کر سکوں گا؟"

"تم فیکٹری کا کام سنبھالو گے۔ اس کی آمدنی میں اضافہ کرو گے یا آمدنی بحال رکھو گے تو ایک مخصوص رقم تمہیں ملتی رہے گی۔ مثلاً ہر ماہ ثمینہ اور میں دس دس ہزار روپے لیتے ہیں۔ تمہیں بھی ماہانہ جیب خرچ ملے گا۔"

کلیم سوچنے لگا' کوٹھی اور کاریں ہوں گی۔ ماہانہ دس ہزار کی آمدنی ہو گی۔ اگر وہاں غلط دوائیں بنتے دیکھ لوں گا تو میری آمدنی میں کئی گنا اضافہ ہو گا۔

اس نے سونے کی چڑیا کو پھانسنے کے لیے جھوٹ کہہ دیا تھا کہ اولاد نہیں ہے جبکہ جوان بیٹا شہزادہ سلیم موجود تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ شادی کے بعد بیٹا کہاں جائے گا۔ کیونکہ کوٹھی ثمینہ کے نام کر رہا تھا اور وہ خود گھر داماد بننے والا ہے۔

اس نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔ "کراچی میں میری ایک بیوہ بہن ہے۔ میں اسے ماہانہ خرچ پانچ ہزار روپے بھیجا کرتا ہوں۔ یہ رقم مجھے شادی کے پہلے مہینے سے ہی ملنی چاہیے۔"

"تمہاری بہن ہے، تم اسے ماہانہ پچاس ہزار بھی دے سکتے ہو۔ ہم تمہاری بہن کے ذمے دار نہیں ہیں۔ ویسے جب وہ کوٹھی ثمینہ کے نام لکھ دو گے تو تمہیں شادی کرنے کے لیے پچیس ہزار روپے دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو دس ہزار روپے ملتے رہیں گے۔ توجہ سے کام نہیں کرو گے۔ ڈیوٹی سے غیر حاضر رہا کرو گے تو اسی حساب سے تنخواہ کاٹ کر دی جائے گی۔"

وہ دل ہی دل میں بولا۔ "بڑھیا بہت چالاک بنتی ہے۔ مگر بیٹی نادان اور خبطی ہے۔ مجھ پر مرمٹی ہے۔ میں اسے اس طرح مٹھی میں رکھوں گا کہ ماں بیٹی کا روز کا جھگڑا علیحدگی کی صورت میں ختم کرا دوں گا۔"

یہ طے پایا کہ وہ دوسرے دن کوٹھی کے کاغذات لائے گا اور بیگم فرزانہ کے وکیل کی موجودگی میں وہ کوٹھی ثمینہ کے نام لکھنے کے علاوہ مہر کی باقی ادائیگی کے سلسلے میں بھی تحریری معاہدہ کرے گا۔ خصوصاً یہ لکھے گا کہ وہ ایک نہایت شریف آدمی ہے اور رزقِ حلال پر ایمان رکھتا ہے اگر کبھی وہ بے ایمانی کرے گا یا کسی غلط کام کے نتیجے میں مجرم ٹھہرایا جائے گا تو اس مجرم سے ثمینہ کا نکاح قائم نہیں رہے گا۔ اس معاہدہ کی رُو سے از خود طلاق ہو جائے گی۔

کلیم نے وہاں سے واپس گھر جاتے ہوئے غور کیا۔ یہ تحریر لکھنے میں اس کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ یہ محض کاغذی کارروائی سمجھ میں آ رہی تھی کیونکہ وہاں کے سپروائزر کے ذریعے معلوم ہوا تھا کہ فرزانہ لیبارٹری میں غلط دوائیں تیار کی جاتی ہیں۔ یوں بیگم فرزانہ خود مجرمانہ دھندا کر رہی تھی تو اسے کیسے مجرم ٹھہراتی؟ وہ گھر کا بھیدی بن کر ماں بیٹی کی لنکا ڈھا دیتا۔

اس نے گھر پہنچ کر تالا کھولا۔ پھر دروازہ کھول کر اندر آیا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ کر ثمینہ کے متعلق سوچنے لگا۔ بڑھاپے میں ایک جوان لڑکی عاشق ہو جائے تو اس بوڑھے کی کھوپڑی الٹ جاتی ہے۔ وہ پہلے ہی دعوے کرتا تھا کہ ابھی بوڑھا نہیں ہوا ہے۔ آج

کل کے دو نوجوانوں کو اپنی دونوں بغلوں میں دبوچ لے تو وہ نکل نہیں پائیں گے۔ ثمینہ نے خود ہی اس کے قریب آ کر اور اس سے شادی کی تمنا کر کے اس کے بڑھاپے پر جوانی کی تصدیقی مہر لگا دی تھی۔

وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا بلکہ صوفے میں بھی نہیں سما رہا تھا۔ کبھی اٹھ رہا تھا، کبھی ٹہل رہا تھا اور کبھی پھر بیٹھ جاتا تھا۔ جوان بیٹا گھر میں داخل ہوا تو خوشی سے ناچتے ہوئے مور کو اپنے بھدے پاؤں نظر آئے۔ یہ بات دماغ میں بیٹھ گئی کہ ثمینہ کو اگر جوان بیٹا نظر آئے گا تو اس کی عمر سے بطور باپ بزرگانہ عمر کا حساب مل جائے گا۔

وہ ڈانٹ کر بولا۔ "کہاں آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔ انتظار کرتے کرتے دوپہر سے شام ہو گئی ہے۔"

بیٹے نے کہا۔ "ابا! ذرا آگے پیچھے دیکھ کر جھوٹ بولا کر۔ میں تمام دن اسی کمرے میں رہا۔ ابھی آدھا گھنٹا پہلے لسی پینے گیا تھا۔"

"مجھے آج جھٹلا رہا ہے اور وہ جو روز آوارہ گردی کرتا ہے؟ کیا یہ بھی جھوٹ ہے؟"

"ابا تیری ٹھیکے داری نہ رہی اور کوئی نیا روزگار نہیں مل رہا ہے تو اس کا غصہ مجھ پر کیوں اتارتا رہتا ہے؟"

"میں بے روزگار رہنے والا بندہ نہیں ہوں۔ کل یہ کوٹھی بیچ رہا ہوں۔ پھر جو رقم آئے گی، اس سے بہت بڑا کاروبار کرنے والا ہوں۔"

"یہ کوٹھی بیچنے کا فیصلہ غلط ہے۔ ہمارے پاس یہی ایک جائیداد رہ گئی ہے۔"

"ایسی جائیداد برے وقت پر کام آتی ہے۔ تم دیکھ لینا، چند ہی مہینوں میں ہزاروں گز کے پلاٹ پر اس سے بھی شاندار کوٹھی بنا لوں گا۔"

"نہیں ابا! میں اسے بیچنے نہیں دوں گا۔"

"کیسے بیچنے نہیں دے گا؟ کیا یہ تیرے باپ کی کوٹھی ہے؟ آں.......... ہاں باپ کی ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ میرے معاملے میں ٹانگ اڑائے گا تو عاق کر دوں گا۔ پھر تُو میرا بیٹا نہیں رہے گا۔"

بیٹا سر جھکا کر دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ باپ کا محتاج تھا۔ باپ کے گھر میں مفت کی روٹیاں توڑ رہا تھا۔ ہزار دو ہزار کی ملازمت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کوئی ایسا کام کرنا چاہتا تھا، جس میں محنت کم اور رقم اندھا دھند ملتی رہے لیکن ایسا کام کہاں ملتا ہے، اس جگہ کا پتا اسے نہیں مل رہا تھا۔

کلیم نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بیٹا کم از کم ایک ہفتے تک اس کے قریب رہے اگرچہ وہ مجبور اور تابعدار بیٹا تھا۔ اس کے باوجود بیٹے کی موجودگی ہی نقصان پہنچا سکتی تھی۔

اس نے پوچھا۔ ”تُو ملازمت کے سلسلے میں اسلام آباد جانے والا تھا؟“

”وہاں جانے کے لیے پیسے لگتے ہیں۔“

”تُو نے کہا تھا‘ وہاں کسی دوست کے ہاں رہ سکتا ہے۔ میں تجھے ایک ہزار دے رہا ہوں۔ تُو صبح چلا جا بلکہ ابھی رات کو فلائنگ کوچ سے جانا چاہیے۔“

”بات کیا ہے ابا! تُو مجھے اس طرح کیوں بھگا رہا ہے؟“

”بکواس مت کر۔ مجھے تیری ملازمت کی فکر ہے۔ جتنی جلدی جائے گا‘ اتنی جلدی ملازمت ملے گی۔“

اس نے جیب سے پانچ سو کے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ ایک ہزار رکھ لے۔“

بیٹا اپنے باپ سے سیانا تھا۔ اس کی عقل نے کہا۔ ”اگر ابا مجھے یہاں سے دور بھیجنا ضروری سمجھتا ہے تو اس سے بھی زیادہ دے سکتا ہے۔ اس نے کہا۔ ”جس دوست کے پاس جا کر رہوں گا‘ وہ ہوٹل میں کھاتا ہے۔ مجھے بھی ہوٹل میں کھانا ہو گا‘ ایک ہزار میں کچھ نہیں ہو گا۔ اسلام آباد کے ہوٹل بہت مہنگے ہیں۔“

”اچھا دو ہزار لے اور دفع ہو جا۔“

”جس کمپنی میں ملازمت ملنے والی ہے۔ اس کا ہیڈ کلرک پانچ ہزار رشوت مانگ رہا تھا‘ میرے دوست نے اسے تین ہزار میں راضی کیا ہے۔“

”یعنی دو ہزار تیرا جیب خرچ اور تین ہزار روپے رشوت کے لیے‘ کل پانچ ہزار؟ کیا میں گدھا ہوں کہ تجھ جیسے گدھے پر اتنی رقم خرچ کروں؟ تجھے کبھی ملازمت نہیں ملے گی۔ تجھے یہیں مرنا چاہیے۔“

”یہاں کیسے مروں؟ کل یہ کوٹھی نہیں رہے گی۔ اگر میں رات کو چلا جاؤں گا تو وہاں ملازمت ملتے ہی مستقل رہنے کا ٹھکانہ بنالوں گا۔“

کلیم بھی یہی چاہتا تھا کہ بیٹا اسلام آباد سے واپس نہ آئے۔ شادی کے بعد وہ ایک دن کے لیے بیٹے کے پاس جائے گا اور اسے اپنی شادی کی خبر سنائے گا پھر تاکید کرے گا کہ کبھی فرزانہ کی لیبارٹری کے قریب نہ آئے اور نہ کبھی باپ بیٹے کا رشتہ ظاہر کرے۔ یہ بات وہ اب بھی کہہ سکتا تھا لیکن اندیشہ تھا کہ بیٹا باپ کی شادی کے خلاف ہو جائے گا اور

بنتا ہوا کام بگاڑ دے گا۔

اس نے پانچ ہزار دے کر اس کے اسلام آباد والے دوست کا پتا نوٹ کیا پھر تاکید کی ”یہاں واپس نہ آنا۔ میں ایک ہفتے کے اندر خود چلا آؤں گا۔ وہاں تجھے اور دو ہزار دوں گا۔ پیسوں کے لیے پھر نہ چلے آنا۔ ذرا صبر سے میرا انتظار کرنا۔“

شہزادہ سلیم نے اس کی تمام ہدایات پر سعادت مندی سے‘ عمل کرنے کا یقین دلایا۔ پھر اٹیچی کیس میں تمام ضروری سامان رکھ کر باپ سے رخصت ہو گیا۔ گامے شاہ کی ایک گلی میں اس کے تین دوست ایک مکان میں مشترکہ کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے تھے۔ شہزادہ نے ان کے پاس آ کر کہا۔ ”مجھے بھی اس مکان کا چوتھائی کرایہ دار بنا لو۔ آج سے میں یہیں رہوں گا۔“

ایک نے پوچھا۔ ”کیا باپ سے جھگڑا ہو گیا ہے؟“

”نہیں یار! حالات سے جھگڑا ہے۔ جوان بیٹا ہزاروں روپے کمائے تو گھر میں عزت ہوتی ہے ورنہ اپنا باپ گھر کے کسی معاملے میں نہ شریک کرتا ہے اور نہ ہی مشورہ لینا ضروری سمجھتا ہے۔“

”بھئی‘ تم بھی تو شہزادوں کی طرح سوچتے ہو۔ کوئی چھوٹی نوکری کرنا نہیں چاہتے۔ افسری تمہیں مل نہیں سکتی ایسی صورت میں مَیں بھی تمہارا باپ ہوتا تو ناراض ہو جاتا۔“

اس بات پر سب قہقہے لگانے لگے۔ وہ دو کمروں کا مکان تھا۔ اس نے ایک کمرے میں اپنے ایک ساتھی نواز کے ساتھ رات گزاری۔ اس سے کہا۔ ”نواز! تمہارے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ اگر تم چاہو تو روزانہ تمہیں سو روپے کی آمدنی ہو سکتی ہے۔“

”سو روپے؟ وہ بھی روزانہ؟“

”ہاں‘ تمہارے پاس جو موٹر سائیکل ہے۔ اسے پندرہ گھنٹوں کے لیے کرائے پر دو اور مجھ سے روز صبح سو روپے لے لیا کرو۔“

”نہیں یار! پندرہ گھنٹے بہت ہوتے ہیں۔ اس حساب سے روپے کم ہیں۔“

”نواز! دوستی کا خیال کرو۔ سو تمہیں دوں گا اور شاید سو سے زیادہ کا پیٹرول جل جایا کرے گا۔“

”ایسا کیا کام ہے کہ روز پندرہ گھنٹوں کے لیے گاڑی لے جایا کرو گے؟“

”کچھ اپنا ضروری کام ہے۔ انکار نہ کرو۔ چاہو تو پانچ دنوں کے پیشگی پانچ سو روپے لے لو۔“

اس نے اسی وقت جیب سے پانچ سو کا ایک نوٹ نکال کر دیا تو نواز کا انکار کمزور پڑ

گیا۔ اس نے دوسری صبح سات بجے موٹر سائیکل سنبھالی۔ ایک پیٹرول پمپ سے ٹنکی فل کروائی۔ پھر رحمان پورہ والی کوٹھی کے قریب سے گزرتا ہوا تھوڑی دور جا کر رک گیا۔ گزرتے وقت اس نے دیکھا تھا کوٹھی کے بیرونی دروازے پر تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ یعنی باپ ابھی گھر میں تھا اور اگر واقعی مکان فروخت کرنے کا ارادہ تھا تو ایک آدھ گھنٹے میں باہر نکلنے والا تھا۔

کلیم ایک گھنٹے بعد باہر آیا۔ دروازے پر تالا لگا کر پیدل چلتا ہوا مین روڈ پر پہنچا۔ وہاں سے ایک رکشے میں بیٹھ کر شاہدرہ سے آگے ایک لیبارٹری کے احاطے کے اندر چلا گیا۔ تعاقب کرنے والا بیٹا باہر رہ گیا۔ وہ سوچنے لگا' ٹھیکے دار باپ کا دوا ساز کمپنی سے کیا تعلق ہے؟

تقریباً ایک گھنٹے بعد اس احاطے سے ایک کار نکلی۔ اسٹیئرنگ سیٹ پر ایک حسین دوشیزہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ کلیم بیٹھا ہوا نظر آیا۔ بیٹے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اسے آنکھوں سے دیکھ کر یقین نہیں آرہا تھا کہ باپ کو بڑھاپے میں جوانی مل رہی ہے لیکن شام تک ان کے پیچھے دوڑتے رہنے کے بعد یقین ہو گیا۔ یہ سمجھ میں آگیا کہ باپ دوسری شادی کرنے کے لیے بیٹے کو اسلام آباد بھیج رہا تھا۔

اس نے تعاقب کے دوران گلبرگ والی وہ کوٹھی دیکھی' جہاں بیگم فرزانہ اپنی بیٹی کے ساتھ رہتی تھی۔ کلیم ثمینہ کے ساتھ اس کوٹھی میں گیا تھا۔ شہزادہ سلیم وہاں سے کچھ دور جا کر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ صبح سے دوپہر ہو گئی۔ بیگم فرزانہ اپنے وکیل کے ساتھ دوسری کار میں آئی۔ آدھے گھنٹے بعد وکیل باہر آگیا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ پھر شام کے چار بجے مولوی صاحب دو آدمیوں کے ساتھ آئے۔ وہ تینوں کوٹھی کے اندر چلے گئے۔ مولوی صاحب کے ہاتھ میں ایک بڑا سا رجسٹر دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ نکاح پڑھانے والے قاضی ہیں۔ آدھے گھنٹے بعد وہ تینوں باہر آگئے۔

لوگ اندر جا رہے تھے اور باہر آرہے تھے۔ ایک باپ ہی ایسا تھا' جو گھسنے کے بعد نکل نہیں رہا تھا۔ شہزادہ سلیم نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔ پھر ذرا آگے جا کر مولوی صاحب کے سامنے گاڑی کو ٹرن دے کر کہا۔ "جناب! میں آپ ہی کے پاس جا رہا تھا۔ سوچا تھا مسجد جا کر پوچھ لوں گا۔"

مولوی صاحب نے کہا۔ "میں مسجد کے ساتھ ہی ایک حجرے میں رہتا ہوں۔ فرمائیے میرے لائق کوئی خدمت؟"

"کل مغرب کے بعد میرے بھائی کا نکاح پڑھانا ہے۔ وہ جو فرزانہ لیبارٹری والے

ہیں نا؟ آپ شاید انہیں جانتے ہوں.........."

"جی ہاں۔ میں ابھی ان کی بیٹی کا نکاح پڑھا کر آرہا ہوں۔"

شہزادے نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا آپ نے فرزانہ بیگم کی بیٹی کا نکاح پڑھایا ہے؟ کون سی بیٹی کا؟ بڑی کا یا چھوٹی کا؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا کہ وہ بڑی بیٹی تھی یا چھوٹی۔ مگر صاحب زادے تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"جناب! اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ فرزانہ بیگم کی چھوٹی بیٹی سے کل میرے بھائی کا نکاح ہونے والا ہے۔"

"تعجب ہے' جب اتنا قریبی رشتہ ہے تو آپ لوگوں کو آج کے نکاح میں شریک کیوں نہیں کیا گیا؟ ویسے بڑی رازداری سے یہ نکاح پڑھوایا گیا ہے۔"

"مولوی صاحب! آپ پر خدا مہربان ہو۔ آپ دولہا کا نام بتا دیں۔"

"دولہا کا نام کلیم یزدانی تھا۔"

"بس جناب! شکریہ۔"

وہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے وہاں سے چلا آیا۔ پہلے تو جی میں آیا تھا کہ ابا ابا پکارتا ہوا کوٹھی میں گھس جائے۔ پھر سوچا یہ نادانی ہو گی۔ پتا نہیں بڈھا کیا کھیل کھیل رہا ہے۔ شاید کوئی لمبا ہاتھ مار رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو باپ کے ساتھ بیٹے کو بھی فائدہ پہنچے گا۔

وہ گامے شاہ والے مکان میں پہنچ کر سوچ میں ڈوبا رہا۔ رات کو کروٹیں بدل بدل کر اس بات پر کڑھتا رہا کہ وہ گبھرو جوان ہو کر ابھی تک کنوارا ہے اور وہ بڈھا۔ وہاں سہاگ رات منا رہا ہے۔ ایسے بوڑھے ہر صوبے' ہر شہر میں پائے جاتے ہیں جو جوان بیٹوں اور جوان بیٹیوں کی شادیاں نہیں کرتے۔ اپنے سہرے کے پھول کھلاتے رہتے ہیں۔

یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ بڑے میاں اس بازی میں.......... تین منزلہ کوٹھی نہ ہار چکے ہوں۔ اکثر بوڑھے سوچتے ہیں کہ انہیں تو اب دنیا سے جانا ہی ہے۔ پھر اولاد کے لئے مال و اسباب کیوں چھوڑ جائیں۔ ان میں حوصلہ ہو گا تو وہ خود اپنی زندگی کا سامان کر لیں گے۔ کلیم نے بھی یہی سوچ کر اپنی آخری پونجی داؤ پر لگا دی ہو گی۔

شہزادہ سلیم نے دوسری صبح فیصلہ کیا۔ "ابا سے ضرور ملنا چاہئے اور لڑ جھگڑ کر اپنا حق وصول کرنا چاہئے۔"

وہ رنگ میں بھنگ ڈالنا نہیں چاہتا تھا' باپ نے بیٹے کو دور رکھ کر اپنی شادی [illegible] تھی تو اس میں ضرور کوئی مصلحت ہو گی' لہٰذا اس نے باپ کے نئے سسرالیوں کے سامنے [illegible]

اس سے ملاقات نہیں کی۔ ٹیلیفون ڈائریکٹری میں فرزانہ لیبارٹری کے فون نمبر تلاش کیے۔ ایک صفحے پر لیبارٹری کے علاوہ کوٹھی کے فون نمبر بھی درج تھے۔ شہزادے نے انہیں نوٹ کیا۔ پھر اس نے پبلک کال آفس میں آ کر لیبارٹری کے نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ ہونے پر کسی شخص نے نام پوچھا پھر کام پوچھا' تب کہا۔ "کلیم صاحب نہیں ہیں۔"

اس نے دوسری بار کوٹھی کا فون نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی کلیم کی آواز سنائی دی "کلیم یزدانی اسپیکنگ۔"

شہزادے نے چہک کر کہا۔ "ارے ابا! تو انگریزی بولنے لگا ہے۔ اللہ تیرے بچے کو بھی ایسی ہی ترقی دے۔"

کلیم صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر باتھ روم کی جانب دیکھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ثمینہ غسل کرنے گئی تھی۔ وہ دبی ہوئی آواز میں بولا۔ "تو؟ یہ تو ہے' یہ........ یہ تجھے میرا پتا کیسے معلوم ہو گیا؟"

"جیسے بھی معلوم ہو گیا۔ یہ بتا کیسی ہے؟"

"کیسی نہیں' کیسے ہو؟ باپ سے پوچھا جاتا ہے' ابا کیسے ہو؟"

"میں اماں کو پوچھ رہا ہوں۔"

"آں؟ اماں؟ یعنی کہ تو یہ بھی جانتا ہے؟ گدھے کے بچے! تو کہاں ہے؟"

"میں لاہور میں پیدا ہوا' لاہور ہی میں ہوں۔ کیا آ جاؤں؟"

"خبردار! ہرگز نہ آنا۔ میری خوشیوں کے دشمن! میں نے تجھے اسلام آباد جانے کو کہا تھا۔"

"ابا! لاہور میں وزارت مل رہی ہو تو اسلام آباد جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"بکواس مت کر۔ ادھر ہرگز نہ آنا۔ میں ہنی مون کے لئے پہاڑی علاقوں میں جا رہا ہوں۔ ایک ہفتے کے بعد آؤں گا تو تجھ سے ملاقات کروں گا۔"

"ایک ہفتے کی نہیں' ابھی کی بات کر۔ میرا کیا بنے گا؟ تو نے اپنی کوٹھی یقیناً اس دلہن کے نام کی ہو گی۔"

وہ فون پر دبی دبی سرگوشی میں بولا۔ "جو کر رہا ہوں' اس میں ہم دونوں کا بھلا ہے۔ میں تجھے ہر ماہ پانچ ہزار روپے دیا کروں گا۔ تجھے خوش ہونا چاہئے کہ تیرا باپ ایک بہت بڑی فیکٹری کا مالک بننے والا ہے۔ اگر میں مالک بن جاؤں گا تو تو بھی شاندار کوٹھی میں رہے گا اور کاروں میں گھوما کرے گا۔"

"پتا نہیں ایسا کب ہو گا' ابھی مجھے پانچ ہزار کی ضرورت ہے۔"

"ابے کل ہی تو میں نے پانچ ہزار دیئے تھے۔"

"رقم کی بہت سخت ضرورت آ پڑی ہے۔ ضرورت بیان کروں گا تو گھنٹوں لگ جائیں گے اور میری رُوداد ختم نہیں ہو گی۔ کوئی دولہا ہنی مون کے لئے جاتے کسی کی رُوداد سننے میں وقت ضائع نہیں کرتا۔"

"میں سب سمجھتا ہوں' تو میری مجبوری سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ٹھیک ہے' تجھے پانچ ہزار مل جائیں گے۔"

"کب ملیں گے؟ ہنی مون سے پہلے ادا کرو۔"

"کیا مصیبت ہے۔ سوچنے تو دے کہ رقم کیسے ادا کروں۔ تجھے کوٹھی اور فیکٹری میں نہیں آنا چاہئے۔"

وہ ذرا خاموش رہا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ میں کوٹھی کے ایک ملازم رحمت علی کو پانچ ہزار دے جاؤں گا۔ اسے تاکید کر دوں گا کہ تو شام کو کوٹھی میں آئے گا اور اپنا شناختی کارڈ دکھا کر رقم لے جائے گا۔"

"ابا! شناختی کارڈ میں باپ کی جگہ تیرا نام لکھا ہو گا۔ میں یونیورسٹی والا کارڈ دکھاؤں گا۔ اس میں میری تصویر ہے' تیرا نام نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ملازم سے زیادہ باتیں نہ کرنا۔"

"تو ملازم سے کچھ تو کہے گا کہ میں کون ہوں؟ اور کس لئے پانچ ہزار لے رہا ہوں۔"

"میں کہہ دوں گا کہ تو میرا دوست ہے۔ میں تیری ضرورت پوری کرنے کے لئے وہ رقم دے رہا ہوں اب میں ریسیور رکھ رہا ہوں۔ وہ آنے والی ہے۔"

"کون آنے والی ہے؟"

"تیری ماں اور کون؟ کیوں میرے منہ سے یہ رشتہ اگلواتا ہے؟ اور یاد رکھ۔ شام چھ بجے سے پہلے کوٹھی میں نہ آنا۔"

ثمینہ باتھ روم کا دروازہ کھول کر کمرے میں آ رہی تھی۔ کلیم نے ریسیور رکھ دیا۔ اس نے پوچھا۔ "کس سے باتیں کر رہے تھے؟"

"میرا ایک دوست تھا۔ بے چارہ ضرورت مند ہے۔ میں نے کہا ہے' وہ شام چھ بجے یہاں آ کر ہمارے ملازم سے پانچ ہزار لے جائے۔"

وہ بولی۔ "ممی کا نمبر ملاؤ۔ میں بات کروں گی۔"

اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ "ہیلو ممی! میں کلیم بول

رہا ہوں۔"

فرزانہ نے کہا۔ "نان سینس! تم عمر میں مجھ سے بھی بڑے ہو۔ خبردار! اپنی اوقات میں رہو اور مجھے میڈم کہا کرو۔"

"جی بہت اچھا۔ یہ آپ کی صاحب زادی بات کرنا چاہتی ہیں۔"

بیگم فرزانہ نے بیٹی کی آواز سنی' پھر پوچھا۔ "میری جان! خوش ہو؟"

"بہت خوش ہوں ممی! ابھی کلیم کے ساتھ نتھیا گلی جا رہی ہوں۔ وہاں دل نہ لگا تو کالام یا کاغان وغیرہ کی طرف جاؤں گی۔"

"دو ہفتوں سے زیادہ کا ٹور نہ رہے۔ میں تنہا فیکٹری کی ذمے داریاں سنبھال نہیں پاؤں گی۔"

"اوکے ممی! میں دو ہفتوں میں واپس آ جاؤں گی۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ بیگم فرزانہ نے کریڈل پر ہاتھ رکھ کر ریسیور رکھ کر کچھ سوچا پھر دوسرے نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ قائم ہونے پر بولی۔ "میں ہوں فرزانہ۔"

دوسری طرف سے ایک مرد کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "ہاں فری! کیسی ہو؟"

وہ خوش ہو کر مسکرانے لگی۔ جب وہ فری کہتا تو یوں محسوس کرتی تھی جیسے سولہ برس کی ہو گئی ہو۔ اس نے کہا۔ "مزے میں ہوں' آپ کو یاد کر رہی ہوں۔ ثمینہ گرمیاں گزارنے پہاڑی علاقوں میں گئی ہے۔ آج سے میں تنہا رہوں گی۔"

"سوری فری! میں نہیں آ سکوں گا۔"

"کیا آپ مجھ سے بے زار ہو گئے ہیں؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ تم میری پوزیشن کا خیال کرو۔ مجھ جیسا بڑا عہدے دار تمہاری کوٹھی میں بار بار دیکھا جائے گا تو اخبارات اسکینڈل بنا دیں گے۔ میں کئی بار کہہ چکا ہوں' جتنی جلدی ہو سکے شادی کر لو' یہ تمہارے لیے بھی بہتر ہے اور تمہارے کاروبار کے لئے بھی۔"

"سات ماہ پہلے تم نے میرے دوسرے شوہر کو گرفتار کیا اور مجھے اس سے نجات دلائی۔ اب اتنی جلدی شادی کروں گی تو لوگ کیا کہیں گے۔"

"اونچی سوسائٹی میں پیٹھ پیچھے کیچڑ اچھالی جاتی ہے اور منہ پر تیسرے چوتھے شوہر کی مبارک بادیاں دی جاتی ہیں۔ کاروباری ذہنیت رکھنے والی عورتیں رشک کرتی ہیں کہ ہر شادی کے بعد بزنس میں منافع کا گراف اوپر چلا جاتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر شادی صرف کاروبار کا ہی نہیں' دل کا بھی معاملہ ہے۔ کسی پر

دل آئے گا تو.........."

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "فری! میں ایک ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنے جا رہا ہوں۔ کل فون کروں گا۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ بیگم فرزانہ نادان نہیں تھی۔ سمجھ گئی کہ بڑے صاحب نے پیچھا چھڑایا ہے۔ یہ عمر ایسی ہوتی ہے کہ سب ہی پیچھا چھڑاتے ہیں۔ وہ ایک سرد آہ بھر کر ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹک گئی پھر اس کرسی پر دائیں سے بائیں اور پھر بائیں سے دائیں گھومنے لگی۔

وہ ابتدا ہی سے کاروباری ذہنیت کی حامل تھی۔ ایسی ذہنیت چور دروازوں سے کاروبار کے گُر سکھاتی رہی۔ اس نے دولت مند بننے کے لئے پندرہ برس کی عمر میں ہی ایک فیکٹری کے عمر رسیدہ مالک سے شادی کر لی تھی اور اس فیکٹری کو اپنے نام کرا لیا تھا۔ سولہ برس کی عمر میں ثمینہ پیدا ہوئی۔ اس کے بعد اس نے ماں بننے سے گریز کیا۔ کیونکہ وہ خود کو ہمیشہ کمسن اور تروتازہ بنائے رکھنے کی عادی تھی۔ جب ثمینہ چودہ برس کی اور وہ تیس برس کی ہوئی تو شوہر چل بسا۔ تیس برس کی عورت بھرپور جوان ہوتی ہے۔ پہاڑ جیسی جوانی گزاری نہیں جاتی۔ اس نے ڈھائی برس بعد دوسری شادی کر لی۔

یہ دوسری شادی کاروبار کے لئے بھی لازمی تھی۔ پہلے شوہر کے وقت سے ہی فرزانہ اور بڑے صاحب کی پکی دوستی تھی۔ نشہ آور دوائیں تیار کرنے کے معاملے میں بڑے صاحب کی پشت پناہی حاصل تھی۔ ان کے عہدے اور رعب و دبدبے کے باعث پولیس والے کبھی فیکٹری میں جھانکنے نہیں آتے تھے۔

پھر بڑے صاحب کا مشورہ تھا۔ "پولیس والوں کو خوش رکھا کرو۔ میں ریٹائر ہو جاؤں گا تو پھر یہ تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔"

فرزانہ نے ایک نئی لیبارٹری قائم کی۔ اس لیبارٹری کو اپنے دوسرے شوہر سے منسوب کیا۔ پھر وہاں تیار ہونے والے مال میں پولیس کا بھی ایک بڑا حصہ رکھ دیا۔ تین برس میں دوسرے شوہر کے تیور بدل گئے۔ اس نے کہا۔ "فرزانہ! لیبارٹری میرے نام سے ہے۔ کاروبار میرا ہے۔ میں پولیس والوں سے بنائے رکھتا ہوں اور منافع تم لے جاتی ہو۔ مجھے ماہانہ صرف دس ہزار روپے دیتی ہو۔ اب میں اُلو بن کر نہیں رہوں گا۔ آئندہ میری لیبارٹری کی تمام آمدنی میری ہو گی۔"

فرزانہ نے بڑے صاحب کے پاس آ کر کہا۔ "یہ کم بخت اپنی اوقات بھول گیا ہے۔ پوری لیبارٹری پر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔"

بڑے صاحب نے کہا۔ ”وہ لیبارٹری اسی کے نام ہے اور وہی مالک ہے۔ تم قانونی طور پر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گی۔ اس لئے اس پر غیر قانونی حملہ کرو۔“

”وہ کیسے؟“

”پہلے اس سے طلاق لو۔ اس کے چند دنوں بعد اس کی لیبارٹری پر چھاپا پڑے گا۔“

”میں نے اس لیبارٹری کی چاردیواری تعمیر کرنے کے لئے اپنے میاں کو تین لاکھ روپے دیئے تھے۔“

”تمہیں چھ لاکھ سے زیادہ مل جائیں گے۔ وہاں پندرہ بیس لاکھ کا مال ہوگا۔ پولیس کی رپورٹ کے مطابق پانچ لاکھ کا مال پکڑا جائے گا۔ چھ لاکھ تمہارے ہوں گے۔ باقی پولیس والوں کے اور وہ طلاق دینے والا میاں جیل میں ہوگا۔“

فرزانہ نے اس مشورے پر عمل کیا۔ دوسرے شوہر سے کہا۔ ”اگر تم اپنی لیبارٹری کا منافع نہیں دوگے تو پھر طلاق دو۔“

لاکھوں کے منافع کے سامنے فرزانہ کیا چیز تھی۔ اس نے طلاق دے دی۔ اسے خوش فہمی تھی کہ پولیس والوں سے اس کا پکا لین دین ہے۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی لیکن انہوں نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی۔ اسے ہتھکڑی پہناتے ہوئے کہا۔ ”بڑے صاحب کا حکم ہے۔ انسدادِ منشیات کی مہم جاری ہے اور ہمیں اپنی کارکردگی دکھانی ہے۔“

جو مال پکڑا گیا' وہ منصوبے کے مطابق تقسیم ہوگیا' فرزانہ' بڑے صاحب اور پولیس والے خوش ہوئے۔ سرکار بھی خوش ہوئی کہ منشیات کی لعنت ختم ہورہی ہے۔ مجرم کو جیل میں پہنچا دیا گیا۔ لیبارٹری کو بڑے صاحب کے حکم سے سیل کردیا گیا پھر اسے نیلام کردینے کا حکم صادر کیا گیا۔ تاکہ وہاں نئی صنعت قائم کی جاسکے۔ نیلامی صرف سرکاری رپورٹ میں ہوئی۔ اس لیبارٹری کو فرزانہ نے ایک فرضی نام سے خرید لیا۔

اب وہ لیبارٹری والی چاردیواری پچھلے پانچ ماہ سے خالی پڑی تھی۔ ایک مرغے کا انتظار تھا کہ کوئی اپنے مطلب کے مطابق مجبور بندہ آئے۔ شوہر بنے اور اس لیبارٹری کو سنبھالے۔ یوں بھی اسے ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ ڈھیر ساری دولت کمانے کے ساتھ ساتھ دن رات کا ساتھی نہ ہو تو زندگی کا دن عید ہوتا ہے لیکن رات شب برات نہیں ہوتی۔

پھر اس کی عمر ہی کیا تھی' کُل چھتیس برس کی تھی۔ پندرہ برس میں شادی ہوئی تھی۔ سولہ برس میں بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ اب وہ بیٹی بیس برس کی تھی۔ اس حساب سے فرزانہ ابھی جوانی کے سفر میں تھی چھتیس برس میں' عورت خوش حال ہو۔ مسرتوں سے

کھیلتی ہو تو وہ بوڑھی نہیں ہوتی۔ اسے بیٹی کے ساتھ دیکھ کر کوئی ماں نہیں سمجھتا تھا۔ وہ بڑی بہن لگتی تھی۔ کہتے ہیں' دولت سے جوانی نہیں خریدی جاسکتی۔ فرزانہ نے تو خریدی ہوئی تھی اور کہاوت کو جھوٹ ثابت کررہی تھی۔

وہ شام کو کار ڈرائیو کرتی ہوئی کوٹھی کے احاطے میں پہنچی۔ کار سے اتر کر دیکھا۔ ملازم کے پاس ایک خوبرو اور قد آور جوان کھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی یوں لگا جیسے مرغا ہے اور اس کے دروازے پر بانگ دینے آیا ہے۔

اس نے ملازم کو آواز دی۔ ”رحمت' ادھر آؤ۔“

وہ تیزی سے چلتا ہوا آیا۔ ”جی بیگم صاحبہ؟“

”وہ کون ہے؟ یہاں کیوں آیا ہے؟“

”بیگم صاحبہ! یہ صاحب کا دوست ہے۔“

”کون صاحب؟“

”وہ جو ہمارے کلیم صاحب ہیں۔ بی بی جی کے میاں۔ وہ پانچ ہزار روپے دے کر گئے تھے کہ میں ان صاحب کو دے دوں۔ میں ابھی انہیں رقم دے کر باہر نکال رہا ہوں۔“

”میں نے اسے باہر نکالنے کو نہیں کہا ہے۔ اتنا زیادہ کیوں بولتے ہو؟“

”غلطی ہوگئی۔ معافی چاہتا ہوں۔“

”اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔“

وہ حکم دے کر کوٹھی کے اندر آئی۔ پھر ایک کمرے میں آکر پردے کے پیچھے سے دیکھا۔ رحمت اسے ڈرائنگ روم میں لے جارہا تھا۔ وہ اپنی خواب گاہ میں آگئی۔ اے سی کو آن کیا۔ ریکارڈر میں ایک کیسٹ لگا کر اسے آن کیا۔ کمرے کی محدود فضا میں دھیمی دھیمی موسیقی اور ٹھنڈک پھیلنے لگی۔ پھر وہ الماری سے ایک عمدہ جوڑا نکال کر باتھ روم میں چلی گئی۔

شہزادہ سلیم ڈرائنگ روم میں بیٹھا وہاں کے قیمتی آرائشی سامان کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا' ایسی رئیسانہ زندگی کے مناظر یا تو فلموں میں نظر آتے ہیں یا خوابوں میں۔ ایسی خوش قسمتی حقیقی زندگی میں نہیں ملتی۔

پھر یہ بیگم صاحبہ نے مجھے یہاں بٹھائے رکھنے کو کیوں کہا ہے؟ کہیں ہمارا بھید تو نہیں کھل گیا ہے؟ ابا نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اس کے سسرالیوں کے سامنے نہ جاؤں۔ ویسے میں خود نہیں آیا ہوں۔ یہاں بلایا گیا ہوں اب جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔

وہ بڑے شاہانہ انداز سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ شہزادہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ ایسی صاف ستھری، گوری اور چمکتی ہوئی سی تھی جیسے دودھ سے نہا کر آئی ہو۔ اس نے کہا "بیٹھو۔"

وہ فوراً بیٹھ گیا۔ وہ اسی صوفے پر اس سے ایک بالشت کے فاصلے پر بیٹھ گئی۔ اس کے وجود سے پرفیوم کی دھیمی دھیمی سی، جذباتی انگڑائی لیتی ہوئی خوشبو آرہی تھی اور اسے مسحور کررہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "نام کیا ہے؟"

"شہزادہ سلیم۔"

"واقعی شہزادے ہو یا صرف نام شہزادہ ہے۔"

"ابھی تو صرف نام ہے۔ قسمت مہربان ہوگی تو شہزادہ بھی بن جاؤں گا۔"

"کیا کرتے ہو؟"

"فی الحال کچھ نہیں۔ پرنس بننے کا راستہ ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"اپنے ماں باپ اور رشتے داروں کے متعلق بتاؤ۔"

"میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ بالکل تنہا ہوں۔"

"کلیم یزدانی سے کیسے دوستی ہوئی تھی؟"

"جس بات پر دوستی ہوئی، وہ دنیا کے لئے معمولی مگر میرے لئے اہم تھی۔ میرے باپ کا نام بھی کلیم یزدانی تھا۔"

"یہ تو عجیب اتفاق رہا۔ تم نے باپ کے نام سے متاثر ہوکر دوستی کرلی۔"

"جی ہاں۔ ہم ایک دوسرے کے برے وقتوں میں کام آتے تھے۔ آج مجھے پانچ ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ کلیم نے کہا تھا کہ میں یہاں آکر اس کے ملازم سے لے جاؤں۔ اسی لئے میں یہاں آیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے، میرا یہاں آنا آپ کو ناگوار نہیں گزرا ہے۔ اس لئے آپ اتنی عزت دے رہی ہیں۔"

"تمہیں اس سے بھی زیادہ عزت مل سکتی ہے۔ اگر تم ایک کاغذ لکھ دو۔"

"کیسا کاغذ!"

"یہی کہ تم ایک شریف اور ایماندار نوجوان ہو۔ اگر بیگم فرزانہ یعنی کہ میں تم پر اعتماد کروں تو تم کبھی میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گے اور کبھی مجھے دھوکا نہیں دو گے۔"

"میں نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ پھر آپ تو بہت اچھی ہیں۔ بھلا آپ کو کیوں دھوکا دوں گا اور کیوں دوں گا کیا آپ کسی معاملے میں مجھ پر بھروسا کرنا چاہتی ہیں؟"

"ہاں، میں ابھی بتاتی ہوں۔"

اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے۔ شہزادہ اسے چور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ رابطہ قائم ہونے کے بعد بولی۔ "میں فرزانہ بول رہی ہوں۔ ضروری بات سن لیں۔"

دوسری طرف سے بڑے صاحب نے کہا۔ "ہاں بولو۔ مگر خدا کے لئے جلدی۔ میں ابھی باہر جانے والا ہوں۔"

وہ بولی۔ "ایک نوجوان میرے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ میں اس پر بھروسا کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

بڑے صاحب نے کہا۔ "اس سے نیک چلنی کا کاغذ لکھواؤ اور اس کی تین تصویروں کے ساتھ کل صبح میرے دفتر میں بھیج دو۔ کل سے وہ پولیس کی نظروں میں رہا کرے گا۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

اس نے ریسیور رکھ کر شہزادے کی طرف رخ کیا، پھر پوچھا۔ "میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟"

وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ آپ کے حسن کی تعریف کروں گا تو گستاخ کہلاؤں گا۔"

"ایک ہی صوفے پر بیٹھنے کے بعد تم غریب نہیں رہے۔ میرے برابر ہو۔ کیا مجھ سے شادی کرو گے؟"

"ارے باپ رے........" وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ فرزانہ گھبرا کر صوفے کے کنارے کھسک آئی۔ پھر بولی۔ "کیا ہوا؟ باپ کو کیوں پکار رہے ہو؟"

"بیگم صاحبہ! میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو ایسے وقت اسے باپ یاد آتا۔ یا شاید میں نے ٹھیک طرح نہیں سنا ہے۔ آپ اپنی زبان مبارک سے پھر ایک بار وہی بات کہنے کی زحمت گوارا کریں۔"

"میں سمجھ گئی، تمہیں یقین نہیں آرہا ہے میں پھر واضح الفاظ میں پوچھ رہی ہوں، مجھ سے شادی کرو گے؟"

وہ حیرت زدہ سا اسے دیکھتے دیکھتے صوفے پر بیٹھنے لگا۔ پھر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہی ایک بالشت کا فاصلہ تھا۔ وہ حسین اور دولت مند عورت اس کی دست رس میں تھی۔ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ ایسا کیوں چاہتی تھی؟

اس نے پوچھا۔ "آپ مجھ سے کیوں شادی کرنا چاہتی ہیں؟ میں آپ کے لئے بالکل اجنبی ہوں۔"

وہ بولی "اکثر مسلمان عورتوں کے دولہا سہاگ رات سے پہلے تک اجنبی ہوتے ہیں۔"

"میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ میری نیکی اور شرافت کی ضمانت دینے والا کوئی نہیں ہے۔"

"تم جس کاغذ پر اپنا چال چلن لکھ کر دوگے' وہی تمہارا ضمانت نامہ ہوگا۔ میں کل صبح تمہیں بڑے صاحب کے دفتر لے جاؤں گی۔ وہاں تم اپنے ہاتھ سے اپنا کیریکٹر سرٹیفکیٹ لکھو گے اور تین تصویریں پیش کروگے۔ اس کے بعد مجھے تمہاری طرف سے کوئی اندیشہ نہیں رہے گا۔"

"لیکن مجھ میں ایسی کیا بات ہے کہ آپ مجھ ہی کو پسند کر رہی ہیں؟"

"اپنی اپنی آنکھ ہوتی ہے۔ کسی کو حور پسند آجاتی ہے کسی کو لنگور پسند آجاتا ہے......... جبکہ تم لنگور نہیں' بہت ہی خوبرو اور گبھرو جوان ہو۔ پھر یہ کہ غریب اور تنہا ہو۔ شادی کے بعد سدا میرے ہی رہوگے۔"

"اوہ خدایا! میں کیا کروں' مجھے یقین کیوں نہیں آرہا ہے؟"

بیگم فرزانہ نے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔ "یقین آیا؟"

وہ انکار میں سرہلا کر بولا۔ "میں ایسے ہی خواب دیکھتا ہوں' ایک دولت مند حسینہ میرا ہاتھ پکڑتی رہتی ہے۔"

وہ اس کا ہاتھ اپنے چہرے کے قریب لائی۔ پھر اس کی ایک انگلی پکڑ کر اس نے اسے دانتوں کے درمیان رکھ کر اسے کاٹا تو وہ چیخ پڑا۔ "آہ! ہا......... ہاں' یقین آگیا۔ مگر ایک بات ہے۔"

"اب کیا بات ہے؟"

"کیا آپ اس کی ساس ہیں؟ یعنی کہ اس کلیم یزدانی کی؟"

"ہاں تمہیں میری عمر کا حساب کرلینا چاہئے۔ پہلے اپنی عمر بتاؤ۔"

"میں پورے چھبیس برس کا ہوں۔"

"میں پورے چھتیس برس کی یعنی تم سے دس برس بڑی ہوں۔ اکثر عورتوں میں کمسنی کا حسن ہوتا ہے۔ میرے اندر دولت کا حسن بھرا ہے۔"

وہ بولا۔ "عورت کتنی ہی بڑی ہو' مرد سے چھوٹی ہوتی ہے۔ میں آپ سے عمر نہیں رشتہ پوچھ رہا تھا۔ آپ کلیم کی کیا لگتی ہیں؟"

"ساس ہوں' میری بیٹی ثمینہ اس کی بیوی ہے۔"

"پھر تو پتا نہیں' ہمارا نکاح جائز ہوگا یا نہیں؟"

اس نے گھور کر پوچھا۔ "جائز کیوں نہیں ہوگا؟"

"وہ......... وہ اصل بات یہ ہے کہ میرا باپ یعنی کہ میرے باپ کا نام کلیم یزدانی ہے۔ ہماری شادی ہوگی تو آپ کے سسر کا نام بھی کلیم ہوگا اور داماد کا نام بھی۔"

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "تو کیا ہوا؟ بہت سے لوگ ہم نام ہوتے ہیں۔ سسر اور داماد کے ہم نام ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

وہ اب تک اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔ پھر اس نے بھی پکڑ لیا۔ اسے ہاتھوں میں لے کر دولت کے وزن کو سمجھنے لگا۔ جس ڈرائنگ روم کی مہنگی آرائش تھوڑی دیر پہلے پرائی تھی اب اپنی لگ رہی تھی۔ کوٹھی' کار' عورت اور عورت کی کمائی سب اپنی ہو رہی تھی۔ عیش و عشرت کی زندگی کا آغاز ہو رہا تھا۔ ایسے میں آدمی جائز اور ناجائز کے جھگڑے میں نہیں پڑتا۔

پھر بھی اس مسئلے پر غور کیا۔ اس رات کوٹھی کے ملائم اور آرام دہ بستر پر لیٹ کر اسے اپنے محلے کا دینو چاچا یاد آیا۔ اس کی ایک بیٹی تھی۔ بیوی مرچکی تھی۔ دینو نے ایک بیوہ عورت سے شادی کی۔ وہ بیوہ عورت اپنے پہلے شوہر کا بیٹا ساتھ لائی تھی۔ بعد میں اس بیٹے کی شادی دینو کی بیٹی سے کردی گئی تھی۔ اس حساب سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ عورت اور اس کی بیٹی پرائی ہو۔ ان سے خون اور دودھ کا کوئی رشتہ نہ ہو تو باپ بیٹے ان سے شادی کرسکتے ہیں۔

دوسرے دن وہ فرزانہ کے ساتھ بڑے صاحب کے سامنے حاضر ہوا۔ وہیں بیٹھ کر پکے کاغذ پر لکھا کہ وہ ایک شریف اور ایمان دار نوجوان ہے۔ ماضی میں اس کا کردار بے داغ رہا ہے۔ اس نے کبھی قانون کے خلاف کوئی کام نہیں کیا اور نہ ہی آئندہ کرے گا۔ اگر کبھی بے ایمانی اور فراڈ کرے گا اور ایک مجرم کی حیثیت سے گرفتار ہوگا تو اس مجرم سے فرزانہ کا نکاح قائم نہیں رہے گا اور اس معاہدے کی رُو سے ازخود طلاق ہوجائے گی۔

نکاح کے بعد بیگم فرزانہ نے موبائل فون کے ذریعے بیٹی کو خوشخبری سنائی۔ "بیٹی! میں نے بھی شادی کرلی ہے۔ تمہارے نئے ڈیڈی بہت اچھے ہیں۔ تم ان سے مل کر بہت خوش ہوگی۔"

"اوہ ممی! مجھے یہ سن کر خوشی ہو رہی ہے کہ اب آپ تنہا نہیں رہیں گی۔"

"تمہارے میاں کلیم کو بھی خوشی ہوگی۔ کیونکہ میں نے اس کے دوست سے شادی کی ہے۔"

ثمینہ نے فون کا اسپیکر آن رکھا تھا۔ اس طرح کلیم بھی ماں بیٹی کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے تعجب سے کہا۔ "میرا کون دوست ہے؟ ذرا اپنی ممی سے اس کا نام پوچھو۔"

ثمینہ نے پوچھا۔ اسپیکر سے فرزانہ کی آواز آئی۔ "اس کا نام شہزادہ سلیم ہے۔"

"ارے باپ رے..........." کلیم اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

ثمینہ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"وہ.......... وہ بات تو کچھ نہیں ہے۔ میں اس شہزادہ صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

ثمینہ نے کہا۔ "ممی! فون ڈیڈی کو دیں۔ میرے میاں بات کریں گے۔"

اُدھر سے باپ نے اِدھر سے بیٹے نے فون پکڑا۔ آواز آئی۔ "ہیلو۔ میں شہزادہ بول رہا ہوں۔"

وہ ثمینہ کے سامنے نہ گرج سکتا تھا نہ اتنی دور سے برس سکتا تھا۔ بڑے ضبط و تحمل سے بولا۔ "شہزادے کے بچے! تُو اس خاندان میں کیسے گھس آیا؟"

"مقدر نے گھسایا میں گھُس آیا۔"

"تم بالکل گدھے ہو۔"

ثمینہ نے اس سے فون چھین کر کہا۔ "مائنڈ یور لنگویج پلیز' آپ کو میرے باپ کا احترام کرنا چاہئے۔"

ادھر سے شہزادے نے ثمینہ کو کہا۔ "کوئی بات نہیں بیٹی! ہم بے تکلف دوست رہ چکے ہیں اس لئے ایک دوسرے کو گدھا کہہ سکتے ہیں۔"

بیگم فرزانہ نے فون لے کر کہا۔ "پھر بھی رشتوں کا احترام کرنا چاہئے۔ ثمینہ! اپنے میاں کو سمجھا دو۔ آئندہ اپنے سسر کو عزت سے مخاطب کیا کرے۔"

کلیم یزدانی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ادھر شہزاد سلیم مسکراتے ہوئے اپنا سر کھجانے لگا۔

اس دنیا میں صرف وہ نہیں ہوتا ہے' جو قدرت چاہتی ہے۔ وہ بھی ہوتا ہے' جو کاغذ کہتا ہے۔

قدرت نے ایک لکیر کھینچی کہ کلیم باپ ہے اور سلیم بیٹا۔

باپ بیٹے نے جو کاغذات لکھے' ان کی رُو سے جو بیٹا تھا' وہ اپنے باپ کا سسر ہوا اور جو باپ تھا' وہ اپنے بیٹے کا داماد ہوا۔

اور جو ساس تھی' اسے کاغذ نے بہو بنا دیا۔

اور جو باپ کے رشتے سے ماں تھی' اسے کاغذ نے بیٹی بنا دیا۔

کاغذ تو بے داغ ہوتا ہے' اس پر کوئی سا دھبا لگا دو۔ کاغذ تو سادہ ہوتا ہے' اس پر کوئی سا رنگ چڑھا دو۔

آدمی رنگ دار کاغذ کے گل بناتا ہے اور یہی کاغذ بڑے بڑے گل کھلاتا ہے۔

ارے آدم زاد! جب تُو ماں کے پیٹ سے آیا تو تیرے تن کا کاغذ سادہ تھا۔ جب قبر کے پیٹ میں گیا تو تن کا کاغذ میلا تھا۔ کیا سفید بے داغ کفن پہنانے سے کاغذ کا میل چھپ جاتا ہے؟

☆=========☆=========☆

شہزادہ سلیم نے کبھی چھوٹی سی بارہ برس کی امبر کو رحمان پورہ کی گلیوں میں کھیلتے دیکھا تھا۔ اب جو آٹھ برس بعد دیکھا تو وہ غنچے سے گُل اور گُل سے گلزار ہوگئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی دماغ میں یہ بات پتھر کی طرح لگی کہ وہ بوڑھی فرزانہ کی دھوپ میں جل رہا ہے اور آج تک اسے کنواری محبوبہ کی زلفوں کی چھاؤں نصیب نہیں ہوئی ہے۔

وہ فرزانہ کے موٹی جلد والے ہاتھ پکڑتا تھا۔ اس نے کار میں امبر کی کوری کلائی پکڑنے کے بڑے جتن کئے مگر وہ ہاتھ نہ آئی۔ اسے اور تڑپا دیا۔ اس کے اندر بے چینی بھر دی اور یہ سمجھا دیا کہ وہ سستی نہیں' بہت مہنگی ہے اور جو مہنگی ہوتی ہے' وہی مرد کے لئے چیلنج بن کر اس کی نیندیں اُڑاتی ہے۔

اس نے فرزانہ کے ساتھ ابھی چار ماہ گزارے تھے۔ وہ اس کی ہر ضرورت پوری کرتی تھی۔ اسے گھومنے پھرنے کے لئے ایک کار دی تھی۔ ماہانہ دس ہزار روپیہ دیا کرتی تھی' جو خرچ نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ زیادہ وقت فرزانہ کے ساتھ گزارتا تھا۔ کسی مہنگے ہوٹل میں کھانے کا بل وہ ادا کرتی تھی۔ شاپنگ وہ کراتی تھی۔ حتیٰ کہ کار کے پٹرول کے لئے بھی رقم جیب سے نہیں جاتی تھی۔ ایسی رقمیں کریڈٹ کارڈز کے ذریعے ادا ہوجاتی تھیں۔

مرد کی ایک فطرت ہوتی ہے' وہ چاہتا ہے اس کا ہاتھ اوپر رہے۔ وہ دینے والا ہو اور عورت لینے والی ہو۔ اس کی محتاج ہو اور ہر معاملے میں اس کی مشکور ہو۔ اسی لئے پہلی بار امبر کو ایک ہزار کا نوٹ دے کر اسے دلی راحت ملی۔ اس نے فائیو اسٹار ہوٹل میں اسے کھانا کھلایا اور گھر کے لئے کھانا بند ہوا کر بھی دیا۔ وہ لڑکی جو پہلی ملاقات میں محبوبہ بن رہی تھی' اس کی ذات پر خرچ کرتے ہوئے پہلی بار وہ خود کو مرد سمجھ رہا تھا۔

اور اب اس کی یہ دلی آرزو تھی کہ وہ اُدھر فرزانہ کا زر خرید رہے اور اِدھر امبر کا خریدار بنا رہے۔ امبر کے لئے ایسا کچھ کرے کہ وہ ہمیشہ احسان مند رہ کر اس سے محبت کرتی رہے۔ امبر رحمان پورہ کے قریب کار سے اتر کر چلی گئی تھی اور وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا گلبرگ کی سمت جاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ایک عورت کی عنایت سے بہت کچھ ملا

ہے' اسی عورت کی بے رخی اس سے سب کچھ چھین سکتی ہے۔ اس سے پہلے اسے اپنا الگ سے کوئی کاروبار شروع کرنا چاہئے۔ کوئی ایسا کاروبار جس میں دیانت داری کم سے کم اور منافع زیادہ سے زیادہ ہو۔

فرزانہ نے اسے لیبارٹری قائم کرکے اپنا ذاتی کاروبار کرنے کا موقع دیا تھا۔ پچھلے ماہ سے وہاں نشہ آور دوائیں بننے لگی تھیں۔ شہزادہ اس لیبارٹری کا واحد مالک و مختار تھا لیکن اس کی آمدنی فرزانہ کے ہاتھوں میں جاتی تھی۔ جس طرح کمانے والا مرد' بیوی کی ضرورتیں پوری کرتا ہے اسی طرح فرزانہ اس کی ضرورتیں پوری کررہی تھی۔ وہ ایک شہزادے جیسی زندگی گزارتے ہوئے اس حقیقت کو سمجھ رہا تھا کہ اس ملک میں کبھی فوجی حکومتیں بھی آتی جاتی رہتی ہیں۔ اگر پھر فوج آئے گی اور لیبارٹری پر چھاپا مارے گی تو بڑے صاحب اور ان کی پولیس اسے گرفتاری سے بچا نہیں سکے گی۔ فرزانہ کا بھی کچھ نہیں بگڑے گا کیونکہ کاغذ کے مطابق وہ فرزانہ لیبارٹری کی قانونی اور جائز دوائیں بنانے والی مالکہ کہلائے گی اور کاغذ کے مطابق شہزاد نشہ آور دوائیں تیار کرنے والی لیبارٹری کا مالک ثابت ہوگا۔ فرزانہ نے بڑی محبت سے اسے پھولوں کی ہتھکڑی پہنائی تھی۔ ان پھولوں میں لوہا پرویا ہوا تھا۔

امبر سے ملنے کے بعد شہزادے میں کوئی اپنا الگ سے ایک کاروبار شروع کرنے کی لگن پیدا ہوگئی تھی۔ کوئی ایسا کاروبار جو صرف اس کا اور امبر کا ہو اور بیچ میں فرزانہ کا کانٹا نہ چبھتا ہو۔ وہ سوچتا اور کار ڈرائیو کرتا ہوا اپنی عالی شان کوٹھی کے احاطے میں پہنچا۔ لان کی ہری ہری گھاس پر ایک چھوٹی سی میز اور چار کرسیاں تھیں۔ ایک کرسی پر کلیم یزدانی بیٹھا ایک اخبار پڑھ رہا تھا۔ ثمینہ ایک پیالی میں چائے انڈیل رہی تھی۔ شہزادہ کار سے اتر کر ان کی طرف آیا تو وہ بولی۔ ”یو آر ان ٹائم ڈیڈی' چائے تیار ہے۔“

کلیم نے ناگواری سے بیٹے کو دیکھا' جو اس کی بیوی کا ڈیڈی کہلا رہا تھا۔ ثمینہ نے پوچھا۔ ”تم میرے ڈیڈی کو اس طرح منہ بنا کر کیوں دیکھ رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”میں تمہارے باپ کو نہیں' اخبار کی ان تصویروں کو دیکھ رہا ہوں۔“

ثمینہ نے چائے کی پیالی شہزادے کو دی۔ پھر کلیم سے اخبار لے کر دیکھتے ہوئے بولی ”ہاں۔ میں دیکھ چکی ہوں۔ ان تصویروں کی نمائش ہورہی ہے۔ اس نمائش کی کئی تصویریں لاکھوں روپے میں فروخت ہوچکی ہیں۔“

کلیم نے ناگواری سے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تصویروں میں ایسی کیا بات ہے کہ ایک ایک تصویر پچاس ہزار' لاکھ اور دو لاکھ روپے میں فروخت ہوجاتی ہے۔“

شہزادے نے کہا۔ "برخوردار! یہ آرٹ ہے آرٹ' تمہارے جیسا ٹھیکے دار اسے نہیں سمجھے گا۔"

وہ بھڑک کر بولا۔ "کتنی بار کہا ہے' مجھے برخوردار نہ کہو۔ میں تمہارا........."

وہ بولتے بولتے ثمینہ کو دیکھ کر رک گیا۔ پھر بات بدل کر بولا۔ "میں تمہارا بیٹا نہیں داماد ہوں۔"

ثمینہ نے کہا۔ "داماد بھی تو بیٹے ہی جیسا ہوتا ہے' ڈیڈی تمہیں کتنے پیار سے برخوردار کہتے ہیں۔"

شہزادہ بولا۔ "بیٹی ثمینہ! میں چاہتا ہوں' تمہارا میاں مجھے پیار سے ابا کہے۔ مگر یہ برخوردار میری یہ دلی آرزو پوری نہیں کرتا ہے۔"

"کلیم! یہ بری بات ہے۔ چلو میرے ڈیڈی کو ابا کہو۔"

"ثمینہ! تم بھی اس کی باتوں میں آجاتی ہو۔ ابا کہنا کیا ضروری ہے؟"

"میں کہہ رہی ہوں اس لئے تمہیں کہنا پڑے گا۔"

ثمینہ وہاں نہ ہوتی تو وہ بیٹے سے لڑ پڑتا۔ کم بخت پہلے تو سسر بن گیا۔ اب باپ کو مجبور کر رہا ہے کہ اسے ابا کہے۔ وہ ثمینہ کے ٹکڑوں پر پل رہا تھا۔ بیوی کے سامنے دُم ہلاتے رہنا لازمی تھا۔ اس لئے بھونکنے کے انداز میں بولا۔ "ابا۔ ابا۔ ابا۔ ابا! کتنی بار کہوں ابا ابا؟"

ثمینہ اس کی طرف پیالی بڑھا کر بولی۔ "بس کافی ہے۔ لو چائے پیو۔"

شہزادہ چائے پینے کے دوران اخبار میں شائع ہونے والی تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایسی آڑی ترچھی لکیروں سے بنی ہوئی تصاویر تھیں کہ خاک سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ وہ بولا۔ "آرٹ کو آرٹسٹ ہی سمجھ سکتا ہے۔ یہ تو میری سمجھ سے باہر ہیں۔ جو لوگ لاکھوں روپے میں خرید کر لے جاتے ہیں' شاید وہ بھی سمجھ نہیں پاتے ہوں گے۔"

ثمینہ نے ہنس کر کہا۔ "یہی بات ہے۔ بے انتہا دولت مند خواتین اور مرد حضرات اپنی دولت کی نمائش کے لئے تصاویر کی نمائش میں جاتے ہیں اور انہیں یوں خریدتے ہیں جیسے ان تصاویر کی روح کو سمجھ رہے ہوں۔"

کلیم نے کہا۔ "اس طرح فوٹو گرافر ان کی تصویریں اتارتے ہیں اور رپورٹرز اخبار میں لکھتے ہیں کہ کروڑ پتی اور ارب پتی حضرات وہ تصاویر خرید کر آرٹ کی سرپرستی فرما رہے ہیں۔"

شہزادہ سلیم چائے کی چسکیاں لے رہا تھا اور ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ایسے وقت

نگاہوں کے سامنے امبر کا وجود انگڑائیاں لے رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھائے اپنے جوڑے کو درست کر رہی تھی۔

امبر کی تصویر یاد آئی تو عقل نے سوال کیا۔ اگر اس کی کئی تصویروں کی نمائش کرائی جائے تو کیا وہ لاکھوں میں فروخت ہوں گی؟

ہونا چاہئیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں کاروباری انداز رچ بس گیا ہے۔ پھر مصوری کو منافع بخش کاروبار کیوں نہیں بنایا جا سکتا؟

ضرور بنایا جاسکتا ہے۔ اس نے سوچا۔ "سرمایہ دار بننے کے لئے مزدوروں کی محنت اور فن کاروں کا فن خریدا جاتا ہے۔ یہ ملوں اور کارخانوں میں مزدور اپنی توانائی بیچ رہے ہیں۔ اس لئے مل مالکان اور کارخانہ دار دولت مند ہو رہے ہیں۔ فرزانہ نے ایک ناجائز دھندے کے لئے میرا نام خریدا ہے۔ وہ مجھے دس ہزار دے کر لاکھوں کما رہی ہے۔ اگر میں بھی کسی مصور کو خرید لوں۔ اسے پانچ دس ہزار دوں اور اس کی تصویروں سے لاکھوں کماؤں تو کیا یہ منافع خوری کا منصوبہ کامیاب رہے گا؟

وہ اسی وقت سے اس منصوبے کو ذہن میں پکانے لگا۔ رات کو کروٹیں بدل بدل کر سو گیا۔ پھر صبح ہی اٹھ کر اپنی کار میں بیٹھ کر رحمان پورہ میں آیا۔ فرزانہ کسی ضروری کام سے کراچی گئی ہوئی تھی۔ اس لئے وہ آزاد تھا۔ اس نے سات برس پہلے امبر کا مکان دیکھا تھا۔ پچھلے روز امبر نے بتایا تھا کہ وہ اب بھی اسی مکان میں رہتی ہے۔ اس نے کار وہاں سے بہت دور روکی تھی۔ پھر اس نے ایک چھوٹے سے کاغذ پر لکھا۔ "میں گلی کے موڑ پر ہوں' ؎ شتاب کہ نہیں تاب اب جدائی کی۔ تمہارا ڈبل ایس۔"

اس نے محلے کے ایک لڑکے کو بلایا۔ پھر اسے دس روپے کا ایک نوٹ دیتے ہوئے پوچھا۔ "وہ تین منزلہ کوٹھی کے سامنے جو مکان ہے اور جس کا دروازہ سبز رنگ کا ہے۔ وہاں جاکر ایک کام کرو گے؟"

لڑکے نے کہا۔ "وہاں تو امبر باجی رہتی ہے۔"

"اچھا تو تم باجی کو جانتے ہو۔ یہ پرچی لو اور اسے لے جاکر باجی کے ہاتھ میں دو۔ کسی اور کو نہ دینا۔"

وہ لڑکا دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے امبر کو وہ کاغذ کا ٹکڑا دیا پھر کہا۔ "ادھر ایک کار والا بیٹھا ہے اس نے دیا ہے۔"

امبر نے اسے کھول کر پڑھا۔ بڑا غصہ آیا کہ پتا نہیں کس لفنگے نے یہ لکھ بھیجا ہے۔

وہ دوپٹا اٹھا کر گلے میں ڈالتی ہوئی بولی۔ "چل ذرا دیکھوں' کون یہاں محلے والوں کے

جوتے کھانے آیا ہے۔"

وہ لڑکے کے ساتھ مکان سے باہر آئی۔ پھر دور کھڑی ہوئی کار کو دیکھتے ہی پہچان گئی۔ پھر پرچی میں لکھے ہوئے نام کا مخفف سمجھ میں آیا۔ ڈبل ایس سے شہزادہ سلیم کا نام بنتا تھا۔ وہ مسکرائی۔ پھر مکان کے اندر آکر اس پرچی کے پیچھے لکھا۔ "گلیکسی کے سامنے۔"

وہ پرچی لڑکا لے گیا۔ اس نے گنگناتے ہوئے دروازے کو اندر سے بند کیا پھر لباس تبدیل کرنے لگی۔ اپنی جیت پر بے اختیار مسکرانے لگی۔ کل پہلی ملاقات ہوئی تھی' آج دیوانہ دروازے تک چلا آیا تھا۔ اگرچہ وہ بھی کل سے اس کے متعلق سوچتی رہی تھی اور دعا مانگتی رہی تھی کہ یہی کوٹھی اور کار والا اس کے نصیب میں لکھا جائے۔

وہ گلیکسی کے سامنے سڑک کے کنارے کار میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا اور کاروباری منصوبے پر ہر پہلو سے غور کر رہا تھا۔ اس نے آکر کھڑکی کے شیشے پر دستک دی تو وہ چونک پڑا۔ اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آکر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "کیا مجھے محلے میں بدنام کرو گے؟ وہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ "ضرورت تھی' اس لئے دوڑا چلا آیا۔ کیا میری بے تابی سے نہیں سمجھ رہی ہو کہ تم میری اہم ضرورت بن گئی ہو۔"

"تم سمجھا رہے ہو تو سمجھ لیتی ہوں۔"

"کل میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں اپنی طرح دولت مند بنانے کی تدبیر کروں گا۔ ایک تدبیر ذہن میں آئی ہے۔ تم میرے ساتھ اس تدبیر پر عمل کرو گی؟"

"پہلے معلوم تو ہو' تم کرنا کیا چاہتے ہو؟"

"ایک سیدھا سادہ سا فراڈ ہو گا۔ اس میں ہماری بہت کم رقم لگے گی لیکن منافع زیادہ ہو گا۔ میرا اندازہ ہے' میرے زیادہ سے زیادہ پچاس ہزار روپے خرچ ہوں گے۔ اس کے بعد ہم لاکھوں کمائیں گے۔"

"آخر کرنا کیا ہے؟"

"کل تم نے اپنی وہ پینٹنگ دکھائی تھی۔ وہ مصور اپنے فن میں مہارت رکھتا ہے۔ اگر ہم اس کی تمام تصویریں فٹ پاتھ کے ریٹ سے خریدیں اور انہیں آرٹ گیلری کی زینت بنا کر نمائش کریں تو وہ لاکھوں میں بک جائیں گی۔"

وہ شہزادے کو دیکھ رہی تھی پھر بولی۔ "تمہاری بات دل کو لگ رہی ہے۔ تمہیں بڑی دور کی سوجھی ہے لیکن اس مصور کو اگر معلوم ہو گا کہ ہم اس کی تصویریں اونے پونے خرید کر ہزاروں لاکھوں میں بیچ رہے ہیں تو وہ ہمارے پیچھے پڑ جائے گا۔"

وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ "میں ایسے گمنام فنکاروں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ اپنی مفلسی اور تنگ دستی کی طرح سکڑے ہوتے ہیں۔ خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ ان میں اتنا حوصلہ نہیں ہوتا کہ ہم جیسوں کو چیلنج کر سکیں۔ فرض کرو' اس مصور نے ہمارے خلاف کچھ بولنے کا حوصلہ بھی کیا تو اسے خریدنے میں دیر نہیں لگے گی۔ ایسے مصوروں کی قیمت ان کی اپنی تصویروں سے بھی کم ہوتی ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"اپنے شاندار مستقبل کی طرف۔ یہ مستقبل اس فٹ پاتھ سے شروع ہو رہا ہے' جہاں سے تم نے وہ تصویر خریدی تھی۔ اس مصور کی جتنی تصویریں وہاں ہوں گی' ہم وہ تمام خرید لیں گے۔ اس دکان دار سے مصور کا پتا ٹھکانا بھی معلوم کر لیں گے۔"

"اس مصور کا نام اے ساگر ہے۔"

"کیا تم اسے جانتی ہو؟"

"نہیں۔ تصویر کے نیچے اے ساگر لکھا ہوا تھا۔ یہی اس کا نام ہو گا۔"

اس نے ایک جگہ کار روک کر کہا۔ "یہاں سے ہم پیدل جائیں گے۔ یہ فٹ پاتھ کے دکان دار کار والوں کو دیکھ کر مال کی قیمت بڑھا دیتے ہیں۔"

وہ کار سے باہر آئے پھر اسے لاک کر کے پیدل چلتے ہوئے اس تصاویر بیچنے والے کے پاس آگئے۔ کئی تصاویر کے درمیان دو تصویریں ایسی نظر آئیں' جن کے نیچے اے ساگر کا نام لکھا ہوا تھا۔ دونوں تصویروں میں علامہ اقبالؒ کے شاہین کو دکھایا گیا تھا۔ ایک تصویر کے نیچے درج تھا۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

دوسری تصویر کے نیچے شاہین کے لئے لکھا گیا تھا۔

جھپٹنا' پلٹنا' پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

دونوں تصاویر علامہ مرحوم کے اشعار کی بھرپور ترجمانی کر رہی تھیں۔ شہزادہ اور امبر نے ایک ایک تصویر اٹھا کر قیمت پوچھی۔ بوڑھے دکاندار نے پیشانی پر ہتھیلی کا چھجا بنا کر انہیں دیکھا۔ پچھلے روز امبر کو دیکھنے کے باوجود وہ نہ پہچان سکا۔ اس نے کہا۔ "ایک تصویر کے دو سو روپے۔"

شہزاد نے کہا۔ "دو سو بہت ہیں۔ اگر سو روپے کے حساب سے دو گے تو ہم اور

تصویریں بھی خرید لیں گے۔"

امبر کو یوں مول تول کرتے ہوئے اچھا نہیں لگا۔ کل اس نے دکاندار کے منہ سے "تین سو" نکلتے ہی تین سو روپے ایک تصویر کے دے دیئے تھے۔ وہ شہزادے سے کہنا چاہتی تھی کہ دو سو روپے مناسب ہیں' ادا کردو۔ مگر پھر چپ ہوگئی۔ دکان دار نے ذرا سی حجت کے بعد ڈھائی سو روپے میں دونوں تصویریں دے دیں۔

شہزادے نے پوچھا۔ "کیا اس مصور کی اور تصویریں ہیں؟"

"ہاں جی۔ ادھر اوپر بہت سی ہیں۔ بکتی نہیں ہیں۔ اس لئے اُدھر ڈال دی ہیں۔"

کاؤنٹر کے پیچھے تصویریں ایک کے اوپر ایک رکھی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں وہاں جاکر تصویریں چھانٹنے لگے۔ اے ساگر کی بنائی ہوئی تیرہ تصویریں وہاں رکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اسی فٹ پاتھ کے ریٹ سے ساری خرید لیں۔ پھر شہزادے نے پوچھا۔ "باباجی! یہ آرٹسٹ کہاں رہتا ہے؟"

وہ آنکھیں سکیڑ کر شہزادے کو دیکھنے اور سوچنے لگا۔ دکاندار ایسی باتیں راز میں رکھتے ہیں' گاہکوں کو دستکاروں اور فن کاروں تک' پہنچنے نہیں دیتے کیونکہ اُدھر جاکر کوڑیوں کے مول خریدیں گے تو ادھر دکانوں میں اُلّو بولیں گے۔

امبر نے کہا۔ "باباجی! تمہیں اعتراض ہو تو نہ بتاؤ۔ ہم تو اس لیے پوچھ رہے ہیں کہ تم سے خریدی ہوئی تصویروں میں کچھ تبدیلیاں کرانا چاہتے ہیں۔"

وہ بولا۔ "نہیں جی۔ اس میں کوئی اعتراض کی گل نہیں ہے۔ دراصل یہ فن کار لوگ من موجی ہوتے ہیں سُکّے پتوں کی طرح اڑتے پھرتے ہیں۔ اب اس کا ٹھور ٹھکانا کیا بتاؤں۔ ذرا سوچنے دو۔"

اس نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کیں۔ پھر انہیں کھول کر پتا ایسے بتانے لگا جیسے ان کی انگلیاں پکڑ کر مطلوبہ جگہ لے جارہا ہو۔ اس نے کہا۔ "لوجی! اس بخت آپ مال روڈ پر ہیں یہاں سے رشکا پکڑ کے ٹیشن کو چلیں۔ لوجی! اب ہم ٹیشن کے متھے پر پہنچ گئے۔ پہنچ گئے ناجی!"

امبر نے کہا۔ "ہاں' سامنے چورنگی ہے۔ آگے بولو؟"

وہ بولا۔ "ایک پاسے ٹانگا اسٹینڈ ہے۔ دوسرے پاسے دیکھیں تو نولکھا بزار دا گیٹ ہے۔"

شہزادے نے کہا۔ "بالکل ٹھیک ہے۔ وہاں سے لنڈا بازار شروع ہوتا ہے۔"

بابے نے کہا۔ "لوتے پھر گل ہی مک گئی۔ وہاں آپ کسی سے بھی پچھیں باؤ فنکار

کہاں رہتا ہے' وہ آپ کو انگلی پھڑ کے اس کے دروازے پر پہنچادے گا۔"

شہزادہ اپنی کار کے پاس آیا۔ پھر اسے ڈرائیو کرکے تصاویر کی دکان کے پاس آگیا۔ جتنی تصاویر خریدی گئی تھیں۔ ان کا وزن زیادہ ہوگیا تھا۔ انہیں اٹھا کر لے جایا نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا کار وہاں لانی پڑی۔ ان سب کو ڈکی میں اور پچھلی سیٹ پر رکھا گیا۔ واپسی میں شہزادے نے کہا۔ "آج ہم نے پندرہ خریدی ہیں اور ایک تمہارے گھر میں ہے۔ کُل سولہ ہوگئیں۔ نمائش کے لیے کم از کم تین تصاویر جمع کرنی ہوں گی۔"

وہ نمائش کی بات پر پریشان ہوگئی۔ آرٹسٹ کے سلسلے میں خدشات جوں کے توں تھے۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور کس مزاج کا بندہ ہے' نمائش کے دوران آکر گڑبڑ کرسکتا تھا۔ وہ بولی۔ "شہزادے! اچھی طرح سوچ لو۔ تم اسے مفلس اور بدحال سمجھ رہے ہو۔ ممکن ہے' وہ ایسا ہی ہو لیکن پیٹ بھرا بدمعاش اور خالی پیٹ غریب دونوں خطرناک ہوتے ہیں۔"

اس نے مسکرا کر کہا۔ "خطرات سے کھیلنے والے ہی دونوں ہاتھوں سے مال کماتے ہیں۔ تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔ کل میں بہت مصروف رہوں گا۔ تم کسی وقت آرٹسٹ کے پاس چلی جانا اور اس کے حالات معلوم کرلینا۔ میں تم سے شام کو ٹھیک چار بجے گلیکسی کے سامنے ملوں گا۔ تم آرٹسٹ کے سلسلے میں جو معلومات حاصل کروگی۔ اس کی روشنی میں ہم اس سے سودے بازی کریں گے۔ ہماری کوشش یہی ہوگی کہ ہمارے منصوبے سے وہ بالکل بے خبر رہے۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔ یہاں اس کی تصاویر کی نمائش ہوگی اور اسے کیا خبر نہیں ہوگی؟"

"امبر! میں اتنا احمق نہیں ہوں۔ نمائش یہاں نہیں کراچی میں ہوگی۔ وہاں اونچی سوسائٹی کے کچھ لوگ میرے دوست بن گئے ہیں۔ ان دوستوں کے تعلقات ایسے امیر کبیر لوگوں سے ہیں' جو نمائشی جذبوں کی تسکین کے لیے دولت خرچ کرنے کے مواقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں اندازہ ہوچکا ہے کہ وہ مصور کنگال ہے۔ اس لیے فٹ پاتھ پر تصویریں بیچ کر جاتا ہے۔ وہ کنگال اتنی دور کراچی نہیں جائے گا۔"

"میں بھی نہیں جاسکوں گی۔ ابا اتنی دور جانے کی کبھی اجازت نہیں دیں گے۔"

"میں نے پہلے کہا تھا کہ تمہارا تعاون ضروری ہے۔ اگر تم نے اس منافع بخش منصوبے میں ساتھ نہ دیا تو دولت مند بننے کا خواب محض خواب ہی رہ جائے گا۔ کیا کراچی میں تمہارا کوئی رشتے دار نہیں ہے؟"

"میری پھوپی ہیں۔ اگر میں ضد کروں گی تو ابا مجھے وہاں لے جائیں گے۔ پھر وہاں پھوپی کی نگرانی ہوگی۔ تمہارے ساتھ اس منصوبے میں کیسے شریک رہوں گی؟"

"تدبیر سوچنے سے تدبیر سمجھ میں آتی ہے۔ پھر ایسے معاملات میں مکاری سے سوچنا پڑتا ہے۔ جھوٹ اور فریب کی روشنی میں راہ تلاش کرو گی تو وہاں جانے کا راستہ ٹل جائے گا۔"

"میری تو عقل کام نہیں کرے گی۔"

"تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر لو۔ ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو۔ پھر مرغیوں کے ڈربے جیسے چھوٹے سے مکان میں رہ کر بچے پالتے پالتے مرجاؤ۔"

"مجھے طعنے نہ دو۔ تم ہی کوئی تدبیر سوچو۔"

"میں اپنے کاروبار میں مصروف رہتا ہوں۔ تمہیں اپنے معاملے میں خود ہی سوچنا اور ہیرا پھیری والی چالیں چلنا ہوں گی۔ ورنہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔"

"تم مجھے مایوس کر رہے ہو کیا اسی طرح ساتھ دیا جاتا ہے؟"

اس نے سڑک کے کنارے کار روک دی' پھر کہا۔ "سوری۔ میں تمہیں مایوس نہیں ہونے دوں گا۔ تم میں صرف حوصلے کی کمی ہے۔ بہت جلد ہمت ہار جاتی ہو۔ میرے مشورے پر عمل کرو۔ یہ عہد کر لو کہ تم ضرور کوئی راستہ نکال لو گی۔ یقین کرو' عورت اپنی ضد سے تقدیر بھی بدل دیتی ہے۔"

"یوں حوصلہ دو گے تو میں ضرور کچھ کر گزروں گی۔"

"جانتی ہو' میں ایک اور مسئلے میں الجھا ہوا تھا کہ نمائش میں کس بندے کو آرٹسٹ بنا کر پیش کروں گا۔ کیونکہ آرٹ گیلری میں آرٹسٹ کی موجودگی لازمی ہوتی ہے۔"

"واقعی یہ مسئلہ ہے۔ اگر اصل آرٹسٹ کو ہم سامنے لائیں گے تو تصویروں کو بھاری قیمتوں پر فروخت ہوتے دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ وہ اس دھندے میں آدھے حصے کا طلب گار ہو سکتا ہے۔"

"اور بعد میں خود مختار ہو کر ہمیں ٹھینگا دکھا سکتا ہے۔ ہم کسی بھی تیسرے شخص کو راز دار بنائیں گے اور وہ آگے چل کر پرابلم پیدا کرے گا۔ یوں ہمارا منصوبہ قابلِ عمل نہیں رہے گا۔ کیا مجھے بھی تمہاری طرح مایوس ہو جانا چاہیے؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "تم مایوس ہونے والوں میں سے نہیں لگتے۔"

"ہاں' یہی میں تم سے بھی کہنا چاہتا ہوں۔ مایوسی آگے بڑھنے کے راستے روک دیتی ہے۔ جب سے تم نے آرٹسٹ کا نام "اے ساگر" بتایا ہے۔ تب سے آرٹسٹ کو نمائش

میں پیش کرنے کا مسئلہ حل ہو رہا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"ایسے کہ اے ساگر تم ہو۔"

"میں! یہ......... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"جو تمہارا نام ہے' وہی کہہ رہا ہوں۔ کیا اے سے امبر نہیں ہوتا اور ساگر تمہارا تخلص یا تمہاری عرفیت نہیں ہو سکتی۔"

"ہاں۔ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر........."

"مگر یہ کہ عورت دکان کے کاؤنٹر پر مال بیچنے کھڑی ہو تو وہ مال منہ مانگے داموں بکتا ہے۔ عورت شاعرہ ہو تو اسے ہوائی جہاز کا ٹکٹ پیش کر کے مشاعروں میں مدعو کیا جاتا ہے۔ اے ساگر کی تصویریں تم سے منسوب ہوں گی تو ان کی قیمتوں کو پر لگ جائیں گے۔ ہمیں جو مالی فائدہ پہنچے گا' وہ الگ ہے۔ تمہیں ملک گیر شہرت حاصل ہو گی۔ ہو سکتا ہے ہمیں ملک سے باہر بھی جانا پڑے۔"

"شہزادے! تم ہوا میں اُڑے جا رہے ہو۔ کچھ میری بھی تو سنو۔"

"چلو سناؤ۔"

"میں تصویر کشی اور رنگ آمیزی کے سلسلے میں کچھ نہیں جانتی ہوں۔"

"تو جان لو گی۔ نمائش ایک یا دو ماہ بعد ہو گی۔ یہ تو ہماری ابتدائی تیاریاں ہیں۔ اس دوران تم یہ تصاویر دیکھ کر اے ساگر کے دستخط کرنے کی مشق کرو گی۔ اتنے قدر دانوں کو آٹو گراف دیتے وقت تمہیں یہی دستخط کرنے ہوں گے۔"

"یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے مگر........."

"تم اگر مگر میں پڑ جاتی ہو۔ بھئی' میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔ مصوری سے متعلق تھوڑی سی معلومات مجھے بھی ہے مثلاً یہ کہ جس اسٹینڈ پر کینوس رکھ کر تصویر بنائی جاتی ہے' اسے ایزل کہتے ہیں۔ برش' کلر پلیٹ اور مختلف رنگوں کے نام تمہیں بھی معلوم ہوں گے۔ جو مختلف رنگوں کو مکس کرنے والا چاقو ہوتا ہے اسے پیلچر کہتے ہیں۔ میں اور بہت کچھ سیکھ کر آؤں گا اور تمہیں مصوروں کے انداز میں بولنا سکھاتا رہوں گا۔"

امبر نے پوچھا۔ "یہ اتنی ساری تصویریں کہاں رکھی جائیں گی؟ ابا مجھ سے پوچھے گا تو میں جواب کیا دوں گی؟"

"اس کی فکر نہ کرو۔ میں فی الحال اپنی فیکٹری کے گودام میں حفاظت سے رکھوں گا۔"

وہ گلیکسی کے پاس گاڑی روک کر بولا۔ ''کل میں چار بجے شام کو اسی جگہ انتظار کروں گا۔''

وہ دوسرے دن ملنے کا وعدہ کر کے چلی آئی۔ اس کے دماغ میں بہت سی باتیں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ شہزادے کی ٹھوس پلاننگ کے پیشِ نظر توقع تھی کہ ایک تصویر پانچ دس ہزار میں بھی جائے گی تو منافع ایک لاکھ روپے سے زیادہ ہو گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دن بدل جائیں گے۔ جس طرح شہزادہ سلیم رحمان پورہ سے اٹھ کر گلبرگ پہنچا ہے' وہ بھی بڑے لوگوں میں پہنچ جائے گی۔

اتنی توقعات کے باوجود یہ بات کھٹک رہی تھی کہ چوری پکڑی جائے گی۔ فراڈ کھلے گا تو اسے ساگر کا نام اپنانے کے جرم میں وہ پکڑی جائے گی۔ شہزادہ یم اگر فریبی نکلا تو یہ کہہ کر صاف بچ جائے گا کہ وہ بھی امبر کو سچ مچ مصورہ اور اسے ساگر سمجھ کر دھوکہ کھا رہا تھا۔ یہ معاملہ ایسا تھا کہ اسے شہزادے پر بھروسا کرنا پڑتا اور اب اصلی مصور سے بھی مل کر اس کے مزاج اور اس کی حیثیت کو سمجھنا ضروری ہو گیا تھا۔

ایک دو ملاقاتوں میں کسی کی فطرت کھل کر ظاہر نہیں ہوتی۔ شہزادے کے بارے میں اتنی ہی تصدیق ہوئی کہ وہ ایک کو دس بنانے کا ہنر جانتا ہے۔ جب وہ ایک کو دس بنائے گا تو اسے بھی پانچ ضرور دے گا۔ وہ خوب سمجھ رہی تھی کہ وہ اسے حاصل کرنے تک اپنے احسانات کے دباؤ میں رکھے گا اور اگر یہ حاصل نہ ہوئی تو ہو سکتا ہے کہ اس منصوبے کی دلدل میں پھنسا کر چھوڑ جائے۔ اس کی پیشانی پر نہیں لکھا تھا کہ وہ ساتھ نباہنے والوں میں سے ہے۔

دوسری طرف وہ مصور تھا' جس کی تصاویر کو وہ اپنے نام سے منسوب کرنے کا ارادہ کر رہی تھی۔ یہ اندیشہ تھا کہ وہ نامعلوم آرٹسٹ اس کے پیچھے پڑ جائے گا۔ یہ نام کمانے نکلے گی' وہ بدنام کرے گا۔ اسی طرح وہ صرف شہزادے کے ہی نہیں اس آرٹسٹ کے دباؤ میں بھی رہے گی۔ یوں دونوں کے درمیان سینڈوچ بننا دانش مندی نہ ہوتی۔ عقل نے سمجھایا' کسی ایک کے دباؤ سے خود کو آزاد رکھے۔ اس طرح مشکل حالات میں صرف ایک سے نمٹنا رہ جائے گا۔ وہ دہری بلاؤں سے محفوظ رہے گی۔ یہ سوچ کر وہ دوسری صبح مصور کی طرف چل پڑی۔ وہ شہزادے کے مقابلے میں کمزور لگ رہا تھا۔ مگر بہت اہم تھا۔

اس نے نولکھا بازار کی ایک گلی میں پہنچ کر اسے ساگر کا پتا پوچھا تو معلوم ہوا' وہاں سبھی اسے جانتے ہیں اور اسے باؤ فنکار کہتے ہیں۔ ایک بزرگ نے کہا۔ ''بیٹی! میں اُدھر جا رہا ہوں' میرے ساتھ آؤ۔''

امبر نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ ''باباجی! یہ باؤ فنکار کیسا بندہ ہے؟''

''بڑا نیک بندہ ہے۔ اپنے حال میں مست رہتا ہے۔ نہ دنیا کی خبر رکھتا ہے نہ دین کی۔ جب وہ اس گلی سے گزرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں بھٹک رہا ہے۔ غفلت میں زندگی گزار رہا ہے۔ مگر یہ فنکار بڑا گہرا ہے۔ غفلت میں بھی ہوشیاری کی باتیں کرتا ہے۔''

وہ ایک دومنزلہ عمارت کے سامنے رک گیا پھر بولا۔ ''یہ نیچے پرچون کی دکان ہے۔ اوپر والے حصے میں وہ رہتا ہے۔ یہ پوڑیاں چڑھ کے چلی جاؤ۔''

''کیا وہ موجود ہو گا؟''

''نہ ہو' تب بھی اس کا دروازہ کھلا ہو گا۔ وہاں صرف تصویریں ہی تصویریں ہیں۔ اس لیے کوئی چور نہیں آتا۔ ہماری دنیا میں کم از کم فنکاروں کو یہ اطمینان ہے کہ کوئی چور ان کا فن نہیں چراتا۔''

بزرگ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے مگر ان کی بات پتھر کی طرح لگی کیونکہ وہ اس فنکار کا فن اور اس کا نام چرانے آئی تھی۔ بزرگ کا یہ خیال غلط تھا کہ فن کے شہ پارے چرائے نہیں جاتے۔ مونا لیزا کی آفاقی شہرت رکھنے والی تصویر کئی بار چرائی گئی اور لاکھوں ڈالر میں بیچی گئی۔ اس تصویر کی کئی نقلی کاپیاں پینٹ کی گئیں اور اصل کہہ کر فروخت کی گئیں۔ جہاں لاکھوں ڈالرز کا منافع ہوتا ہو' وہاں ڈکیتی اور فراڈ ضرور ہوتا ہے۔ امبر کسی مصور کا فن چرانے والی پہلی چور نہیں تھی۔

وہ پرانا سا مکان ساگر کے باپ دادا نے بنوایا تھا۔ اب اس کا کوئی نہ رہا تھا۔ اس نے نچلا حصہ پرچون والے کو کرائے پر دے دیا تھا۔ اوپر تین کمرے تھے تینوں کمروں میں تصویریں بکھری پڑی تھیں۔ کچھ دیواروں پر آویزاں تھیں کچھ فرش پر دیواروں سے ٹکی ہوئی تھیں اور کئی ایک کے اوپر ایک رکھ دی گئی تھیں۔

وہ ایک مصور ہی نہیں' ایک اچھا فوٹو گرافر بھی تھا۔ جس منظر سے متاثر ہوتا تھا' اس کی تصویر فوراً اتار لیتا تھا۔ پھر اسے پرنٹ کرانے کے بعد کینوس پر پینٹ کرتا تھا۔ اس وقت سامنے ایزل پر ایک کینوس فریم رکھا ہوا تھا۔ اس کینوس پر امبر کا اسکیچ بنا ہوا تھا۔ اس کے خیالوں میں ایک ہری بھری وادی تھی۔ ایک درخت کی شاخ پھولوں کے بوجھ سے جھک رہی تھی۔ امبر گھاس پر کھڑی نیم رقصیدہ انداز میں گردن اٹھائے شاخ سے جھک آنے والے پھول کو چوم رہی تھی۔

وہ بڑے ہی خوب صورت اور رومان پرور خیال کو کینوس پر اسکیچ کر رہا تھا۔ وہ اس

کے دماغ میں اتنی گہرائی تک اتری ہوئی تھی کہ جب بھی اسے سوچتا تھا تو وہ تصور میں وضاحت کے ساتھ چلی آتی تھی۔ جیسے روبرو آگئی ہو۔ وہ اسے بیٹھنے کو کہتا تو وہ بیٹھ جاتی تھی۔ لیٹنے کو کہتا تو ایک ادائے ناز سے لیٹ جاتی تھی۔ اس کی فرمائش پر شاعرانہ ادائیں دکھاتی تھی اور وہ تمام اداؤں کو باری باری پینٹ کرتا جاتا تھا۔

وہ ان لمحات میں بڑی گہرائی اور پوری سچائی سے اسے سوچ رہا تھا۔ تب ہی وہ روبرو آگئی۔ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "بس وہیں رک جاؤ۔"

وہ رک گئی، کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی محویت کو دیکھ کر خاموش رہی اس نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں، جس وقت تم پھول کو بوسہ دو تو تمہارے پیچھے کالی گھٹا چھا جائے۔ اس لیے اپنی بندھی ہوئی زلفیں کھول دو۔ انہیں اپنے گورے مکھڑے کے پس منظر میں کالی گھٹا بنا دو۔"

"میں کیوں ایسا کروں؟ پراندہ اور چوٹی کھول کر بال بکھرا کر پگلی کیوں بن جاؤں؟"

وہ بولتی ہوئی قریب آئی۔ وہ چونک کر ایک قدم پیچھے چلا گیا۔ شدید حیرانی اور بے یقینی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ امبر بھی حیرانی سے خود کو کینوس میں دیکھ رہی تھی۔ اگرچہ ابھی رنگ نہیں بھرا گیا تھا تاہم پنسل اسکیچ سے ہی صاف اس کا چہرہ نمایاں تھا۔

اس نے سوالیہ نظروں سے ساگر کو دیکھا۔ ساگر کے پیچھے بھی دیواروں پر وہی تھی۔ ایک تصویر میں ندی کے گھاٹ پر بیٹھی تھی اس کے گورے پاؤں شفاف پانی کے اندر یوں جھلک رہے تھے جیسے پانی میں دودھ مل رہا ہو، مگر گھل نہ رہا ہو۔

دوسری تصویر میں ایک آبشار کا خوب صورت منظر تھا۔ وہ آبشار کی پھواروں میں بھیگ رہی تھی اور بھیگا ہوا لباس بھیگے بدن سے چپک کر اسے فتنہ سے قیامت بنا رہا تھا۔ ایک اور تصویر میں وہ مینا و ساغر لیے خیام کی رباعی پیش کر رہی تھی۔

وہ کمرے میں گھوم گھوم کر جدھر دیکھ رہی تھی، اُدھر وہ ہی وہ تھی۔ آج تک کسی نے اس کے حسن و جمال کی تعریف ایسے نہیں کی ہو گی جیسے وہ تصویروں کی زبانِ بے زبانی سے کر رہا تھا۔ وہ تصویریں کہہ رہی تھیں کہ دیوانہ اسے صدیوں سے جانتا ہے۔ جب وہ پہلی بار جنت میں پیدا کی گئی تھی، تب ہی اس نے درخت کے پتے پر اس کی شبیہ اتار لی تھی اور اپنے دل کے کینوس پر چھاپ لی تھی۔ تب سے اب تک نولکھا بازار کی اس گلی میں یہی عمل دہرا رہا ہے۔

وہ دونوں بڑی دیر تک گم صم رہے۔ یہ مصور کا ہنر دیکھتی رہی۔ مصور قدرت کا

کمال دیکھتا رہا۔ پھر وہ بڑی دیر بعد بولی۔ "یہ.........یہ سب کیا ہے؟ یہ تو میری تصویریں ہیں۔ میں.........میں تو کبھی آبشار میں نہیں بھیگی۔ کبھی لبِ دریا نہیں گئی۔ کبھی مینا و ساغر نہیں اٹھایا۔ تم نے یہ تصویریں کیسے اتاریں؟ کیا آج سے پہلے بھی تم نے مجھے دیکھا تھا؟"

وہ ایک پالش اکھڑی ہوئی پرانی کرسی پیش کرتے ہوئے بولا۔ "بیٹھ جاؤ۔ جب بھی تصویر بناتا ہوں، تم کھڑے کھڑے تھک جاتی ہو۔"

وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں تصویر نہیں ہوں۔"

"خدا کے لئے تصویر ہی رہو۔"

"مگر کیوں؟"

"آدمی جس کی تمنا کرتا ہے وہ اکثر خیالوں میں ملتی ہے۔ حقیقت میں نہیں ملتی۔ دل دُکھاتی ہے۔"

وہ بولی۔ "کوئی ضروری نہیں ہے کہ جس کی تمنا ہو، وہ مل جائے۔"

"نہ ملے۔ میں پھول کو اس کی شاخ سے الگ نہیں کرنا چاہتا۔ دور سے آنے والی خوشبو چاہتا ہوں۔ تم میرے خیالوں کا بدن ہو، اسے میں تو کیا کوئی بھی نہیں چھوئے گا۔ یہ بدن کبھی میلا نہیں ہو گا، کبھی بوڑھا نہیں ہو گا۔ تیرے حسن کو زوال نہیں ہے۔"

"پلیز میری الجھن دور کرو۔ تم نے مجھے دیکھے بغیر یہ تصویریں کیسے بنا ڈالیں؟"

"میں نے دو برس پہلے تمہیں دیکھا تھا اور اپنے کیمرے میں محفوظ کر لیا تھا۔ میرے پاس تمہارا وہی ایک فوٹوگراف تھا جسے انلارج کرانے کے بعد دن رات دیکھتا رہتا تھا پھر اس چہرے کو سرتاپا مجسم کر کے کبھی ندی کنارے اور کبھی آبشار کی پھواروں میں لے جاتا تھا۔ میں جہاں چاہتا ہوں وہاں تمہیں لے جاتا ہوں۔ جس روپ میں چاہتا ہوں، اس روپ میں، رنگ میں سدا بہار بنا دیتا ہوں۔ تمہارے مختلف انداز کی درجنوں تصویریں میرے کمرے میں ہیں۔"

وہ تیزی سے چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں آئی پھر اسے یوں لگا جیسے آئینہ خانے میں چلی آئی ہو۔ چاروں طرف دیواروں پر اور ایزل وغیرہ پر اس کے حسن و شباب کی جلوہ سامانی تھی۔ وہ اپنے آپ کو طرح طرح کے روپ و رنگ اور ناز و انداز میں دیکھ کر مسرتوں سے بھر گئی تھی۔ اس نے کہا۔ "تم نے مجھے کوہ قاف کی پری، جنت کی حور، خیام کی رباعی اور نہ جانے کیا کیا بنا دیا ہے۔ کیا تم دیوانے ہو۔ کیا تمہارا اور کوئی کام نہیں ہے؟"

"کام وہ ہو، جو کرتے کرتے عبادت بن جائے۔ پھر کسی کام کی حاجت نہ رہے۔"

"تمہاری گزر بسر کیسے ہوتی ہے؟"

"کیا بتاؤں کیسے ہوتی ہے؟ صبح ہوتی ہے' تمہارے دیدار کا ناشتا کرتا ہوں۔ پیاس لگتی ہے' تمہاری آنکھوں سے پی لیتا ہوں۔ نیند آتی ہے' تمہیں بچھا لیتا ہوں' سردی لگتی ہے۔ تمہیں اوڑھ لیتا ہوں۔"

"بس کرو' تم مجھے پاگل کر دو گے۔ میں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی ہوں۔ تم نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ کیسے کیسے جہان میں پہنچا دیا ہے۔ میں اپنی مسرتوں کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں کسی ملک کی شہزادی ہوتی تو تمہیں بہت بڑی جاگیر عطا کرتی۔ اگر ملکہ ہوتی تو پوری سلطنت تمہارے حوالے کر کے یہ تصویریں لے جاتی۔"

"ان تصویروں کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ تم میرے روبرو آئی ہو' قیمت ادا ہو گئی ہے۔ تم یہاں سے جو چاہو لے جاؤ یہ سب کچھ تمہارا ہے۔"

"اگر میں تمام تصویریں لے جاؤں گی؟"

"تو میں ان سے زیادہ بنا لوں گا۔ میرے اندر تمہارے لاکھوں جلوے ہیں جو کینوس پر آتے رہیں گے۔"

"فن کار! تمہاری محبت اور دیوانگی دیکھ کر میں شرمندہ ہو رہی ہوں میں محبت کے جواب میں تمہیں کچھ نہیں دے سکوں گی۔"

"اگر میں کچھ لوں گا تو وہ معاوضہ ہو گا اور میں کہہ چکا ہوں' میری کسی ایک تصویر کی قیمت بھی کوئی ادا نہیں کر سکے گا۔ تم بھی ادا نہیں کر پاؤ گی۔"

"میں ہمیشہ تمہاری عزت کروں گی۔"

"یہ تمہارا عمل ہو گا۔"

"تم نے میری ایک تصویر فٹ پاتھ کے ایک دکاندار کو دی تھی۔ اس کی قیمت تو لی ہو گی۔"

"میں نے آج تک تمہاری کوئی تصویر کسی کو نہیں دی' ہاں یہاں سے ایک تصویر گم ہو گئی ہے۔ تمہاری باتوں سے سمجھ میں آتا ہے کسی نے چرا کر بیچ دی ہے۔ آج سے میں دروازے پر تالا لگاؤں گا۔ تعجب ہے میں نے پہلے کیوں نہ سوچا کہ تم میرا قیمتی سرمایہ ہو اور تمہیں کوئی چرا لے جائے گا۔"

"فن کار دن رات محنت کرتا ہے۔ روٹی کپڑے اور تھوڑی آسائش کے لئے۔ میں یہ تصویریں مفت لے جاؤں گی تو تمہارا کیا بنے گا؟"

"جو تصویریں لے جاؤ گی' وہ تمہاری ہوں گی۔ میں اپنی ضرورت کے لئے دوسرے موضوعات پر تصویریں بنا کر فروخت کرتا ہوں۔"

"کچھ معلوم ہے۔ میں نے کل فٹ پاتھ سے تمہاری بنائی ہوئی پندرہ تصویریں خریدی ہیں۔"

"تمہیں میری تصویروں سے دلچسپی کیوں ہے۔؟"

"میں غریب ہوں۔ اونچے خواب دیکھتی ہوں۔ تمہاری تصویریں اچھی خاصی قیمتوں پر فروخت کر کے اپنے خواب پورے کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں تمہیں خیالوں میں بناتا سنوارتا رہتا ہوں۔ یہ تصویریں حقیقی زندگی میں تمہیں سنوار سکتی ہیں تو ان سے اپنے سارے ارمان ضرور پورے کرو۔"

"تم واقعی عظیم فنکار' عظیم انسان اور سچے دیوانے ہو۔ کیا میری ایک بات مانو گے؟"

"میں تمہیں خوشیاں دینے والی ہر بات مانوں گا۔"

"میں تمہاری تصویروں سے کاروبار شروع کرنے والی ہوں۔ تمہیں اپنے کاروبار میں حصے دار بنانا چاہتی ہوں۔"

وہ ہنسنے لگا پھر وہ ہنستے ہنستے اس کی ایک تصویر کے پاس گیا پھر تصویر سے بولا۔ "سنتی ہو' تمہارا بدن میرے پاس آیا ہے۔ کہتا ہے' میں تمہارا کاروبار کروں۔ یہ تو منہ پر گالی دینے والی بات ہو گئی۔ وہ اور مرد ہوں گے جو عورتوں کو بازار میں بٹھا دیتے ہیں۔ میں مر جاؤں گا پر تمہارا دھندا نہیں کروں گا۔"

امبر نے سر جھکا کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ اسے شرم آ رہی تھی۔ وہ قریب آ کر بولا۔ "تم شرمندہ کیوں ہوتی ہو۔ تم کوئی بے جان تصویر تو ہو نہیں کہ تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہو گی۔ تمہارا کوئی خواب نہیں ہو گا۔ تم اپنے خواب ضرور پورے کرو لیکن میں اور میری تصویر والی خواب نہیں دیکھتے' اس لئے کاروبار بھی نہیں کرتے۔ جہاں سے کاروبار شروع ہوتا ہے' وہاں سے فراڈ شروع ہو جاتا ہے اور فنکار کی موت واقع ہو جاتی ہے۔"

اس نے چہرے پر سے دونوں ہاتھ ہٹا لئے۔ اسی طرح سر جھکائے آہستگی سے بولی۔ "تمہاری طرح گوشہ تنہائی میں جینے والا کوئی کوئی ہوتا ہے۔ میں ہنستی' کھلکھلاتی' جاگتی جگمگاتی زندگی چاہتی ہوں۔"

"تمہیں ضرور ایسا چاہنا چاہئے۔ جاؤ کوئی سوزوکی لے آؤ اور تمام تصویریں لاد کر لے جاؤ۔"

بات کر رہی ہوں۔ میرا وہ کزن پکا بزنس مین ہے۔ وہ نہیں چاہے گا کہ بعد میں کوئی مسئلہ کھڑا ہو۔ وہ قیمت دے گا یا تم سے کاغذ پر لکھوائے گا۔"

"کاغذ! ہاہاہا۔ ہاہاہا.........." وہ ہنسنے لگا پھر بولا۔ "قیمت کے بارے میں کہہ چکا ہوں کہ یہ انمول ہیں اور انہیں، صرف تم ہی لے جا سکتی ہو۔ رہ گیا کاغذ، تو یہ انسان کے منہ پر جوتا ہے۔ جب آدمی کی زبان جھوٹی پڑتی ہے تب کاغذ کا لکھا سچ کہلاتا ہے۔ مجھ جیسے لوگ ابھی اس دنیا میں ہیں، جنہیں اپنی سچائی کی ضمانت دینے کے لئے کاغذ لکھنا نہیں پڑتا کہ ہماری زبان، کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔"

"لیکن وہ میرا کزن.........."

"اپنے کزن کو ادھر نہ لانا۔ یہ جگہ فنکاروں اور دلداروں کی ہے۔ یہاں کسی بزنس مین کو نہیں آنا چاہئے۔ آؤ میں تمہیں نیچے تک چھوڑ آؤں۔"

وہ اس کے پیچھے سیڑھیاں اترتی ہوئی گلی میں آئی، پھر بولی۔ "تم بہت اچھے ہو میں تمہارے پاس آتی رہوں گی۔"

وہ پرچون والے کو مخاطب کر کے بولا۔ "چاچا! آئندہ میرے دروازے پر تالا رہے گا۔ چابی تیرے پاس چھوڑ جایا کروں گا۔ تو اس بی بی جی کو پہچان لے، جب بھی یہ آئیں، تو چابی انہیں دے دیا کرنا۔"

چاچا نے عینک درست کرتے ہوئے کہا۔ "جب یہ سیڑھیاں چڑھ کر جا رہی تھی، تب ہی میں نے پہچان لیا تھا، یہ تیری تصویروں والی ہے۔"

وہ سر جھکا کر مسکراتی ہوئی اس گلی سے سڑک پر آ گئی۔ دماغ سے یہ بوجھ اتر گیا تھا کہ آرٹسٹ اس کے لئے مصیبت بنے گا۔ وہ تو بالکل سادے کاغذ کی طرح تھا۔ اس کاغذ پر کوئی گالی لکھی ہوتی تو وہ گالی امبر پر پڑتی۔ وہ تو ایسا سچا فنکار تھا کہ اپنی انا کے کاغذ پر احسان کا ایک لفظ کسی کو لکھنے نہیں دیتا تھا۔

ساگر نے اس کے سر سے بوجھ اتارا تھا لیکن اپنے کردار سے اس کے احساسات کو چابک ماری تھی، وہ کچھ شرمندہ سی تھی اور کچھ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئی تھی۔

ایسے وقت اپنی کمتری کو بھولنے کے لئے لازم ہوتا ہے کہ آگے والے کو برتری کے معیار سے نیچے گرایا جائے اس نے سوچا ساگر اچھا ہے۔ خود آرٹسٹ ہے مگر بیچارہ سا ہے، گھر میں بیٹھنے کے لئے ایک اچھی سی کرسی نہیں ہے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر دو دن کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ معمولی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا۔ شہزادہ سلیم کی کار کے پاس آ کر کھڑا ہوتا تو غریب محتاج دکھائی دیتا۔ یہ بھی کوئی زندگی گزارنے کا طریقہ ہے

کہ خیالی تصویروں کو خوب بنائے اور سنوارے اور خود اپنا چہرا اور حلیہ بھک منگوں کی طرح بنائے رکھے۔

امبر کو اس کا ایک ہی کمال اچھا لگا کہ اس نے برش اور رنگوں کے ذریعے اسے خوابوں اور خیالوں کی شہزادی بنا دیا تھا۔ اس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے تھے اگر اس کا دیوانہ تھا تو "اونہہ۔" حسن کے سب ہی دیوانے ہوتے ہیں اگر وہ تمام تصویریں ایک پیسہ بھی دیئے بغیر دے رہا تھا تو یہ کوئی فراخدلی نہیں تھی۔ حسن کے حضور جان کا نذرانہ دیا جاتا ہے وہ تصویریں دے رہا تھا تو کون سے دو جہاں دے رہا تھا۔ دولت شہزادہ سلیم کی کاروباری ذہانت سے ملنے والی تھی۔

وہ سڑک کے کنارے کھڑی سوچ رہی تھی۔ ایک کار اس کے بالکل قریب آ کر رکی تو وہ ایک دم سے گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ غصے میں کچھ بولنا چاہتی تھی۔ پھر وہ کار پہچان گئی۔ وہ نئی کار ذکیہ کی تھی مگر کار میں ذکیہ نہیں صرف اعظم تھا۔ وہ کھڑکی کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے بولا۔ "یوں تن کر کھڑی رہو گی تو گاڑیاں سے گاڑیاں ٹکرانے لگیں گی۔"

وہ ایک ہاتھ کھڑکی پر رکھ کر جھک گئی۔ جھکنے سے شانے کا دوپٹہ پھسل کر کلائی کی طرف چلا آیا۔ بھری بہار کا منظر نمایاں ہو گیا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ "آپ اور ذکیہ کے بغیر؟"

وہ جواباً مسکرا کر بولا۔ "جب وہ میکے جاتی ہے تو یہ برابر والی سیٹ خالی ہو جاتی ہے۔ آجاؤ۔"

اس نے دوسری طرف کا دروازہ کھولا۔ وہ کار کے آگے سے گھوم کر اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اس روز ذکیہ بتا رہی تھی کہ تم سے تلخ کلامی ہو گئی تھی۔ تم نے اس سے کہا تھا کہ میں بیوی کی عدم موجودگی میں تم سے لفٹ لیتا ہوں۔"

"مجھے پاگل کتے نے کاٹا ہے کہ میں خواہ مخواہ ایسی بات کہہ دوں۔ ذکیہ مغرور اور بددماغ ہو گئی ہے۔ پہل اس نے کی، مجھے الزام دیا کہ میں بے حیا اور اس کے شوہر کو یعنی آپ کو پھانس رہی ہوں اور آپ مجھ پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتے ہیں۔ کیا ایسی توہین کے بعد میں غصہ برداشت کر سکتی تھی! میرے بھی منہ میں جواب آیا وہ کہہ دیا۔"

"تم عورتوں میں یہی خراب ہے جب آپس میں لڑتی ہو تو ایک دوسرے کے شوہروں کا کچا چٹھا بیان کر دیتی ہو۔"

"میرا نہ کوئی شوہر ہے نہ میں عورت ہوں۔ لڑکی ہوں۔"

"ہاں لڑکی ہو مگر تم سے ڈر لگتا ہے پھر کبھی ذکیہ سے جھگڑا ہو گا تو کہہ دو گی کہ

تمہیں کار میں لئے گھومتا ہوں۔"

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "بڑے ڈرپوک شوہر ہو۔ میں وعدہ کرتی ہوں آج کی بات ذکیہ سے کبھی نہیں کہوں گی۔"

پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ "ذکیہ سے لڑنے کے بعد مجھے بہت دُکھ ہوا۔ سوچتی ہوں کسی وقت مل کر معافی مانگ لوں گی۔ وہ مجھ سے بڑی ہے اور دل کی بہت اچھی ہے۔"

"وہ تم سے تپی ہوئی ہے۔ بہتر ہو گا' پہلے دور ہی دور سے فون پر اس کا غصہ ٹھنڈا کرو۔ بائی دا وے' کھانے کا وقت ہو گیا ہے' کیا ارادہ ہے؟"

"کھانے کے وقت کھانے کا ہی ارادہ ہے۔"

اس نے چائنیز ریستوران کے سامنے کار روک دی پھر اسے لاک کر کے ریستوران کے اندر آئے وہاں بڑی ٹھنڈک اور خاموشی تھی۔ میزوں کے اطراف سر جھکائے کھانا کھاتے لوگ سر اٹھا کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ اعظم کو فتح و کامرانی کا احساس ہوا۔ بے اختیار اٹھنے والی نگاہیں اس کے ساتھ چلنے والی حسینہ کو یوں دیکھ رہی تھیں جیسے وہ ٹرافی جیت کر لے جا رہا ہو۔ ساتھ میں بیوی نہ ہو ایک نئی چیز ہو تو دنیا کو دکھانے اور للچانے کے کام آتی ہے۔

وہ دونوں ایک میز کے اطراف آکر بیٹھ گئے۔ ویٹر نے پانی کے دو گلاس لا کر رکھے پھر آرڈر نوٹ کر کے چلا گیا۔ اس دوران وہ سوچتی رہی کہ ذکیہ یا صرف اعظم کا سہارا لے کر کراچی جا سکتی ہے۔ دونوں قریبی عزیز ہیں۔ ان کے ساتھ جانے سے ابا کو اعتراض نہیں ہو گا۔

اعظم شوخ اور للچائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی شوخی سے بولی۔ "کیا آپ ذکیہ کی موجودگی میں مجھے یوں دیکھ سکتے ہیں؟"

وہ ہنس کر بولا۔ "میں اس کے سامنے اندھا ہو جاتا ہوں۔"

"یعنی کہ بیوی سے ڈرتے ہیں؟"

"کوئی بھی شوہر اچھی اور وفاداری بیوی سے ڈرتا نہیں ہے بلکہ بیوی کی انا اور اعتماد کو بحال رکھنے کے لئے اس کی دلجوئی کرتا ہے۔"

"یہ تو بیوی کو دھوکا دینا ہوا؟"

"ہاں اسے دھوکہ کہہ سکتے ہیں۔ تم مجھے بدنیت کہہ سکتی ہو لیکن بحیثیت شوہر مجھے دنیا کی حسین ترین عورت بھی یہ کہہ دے کہ میں ذکیہ کو چھوڑ کر اسے اپنا لوں تو میں حسینہ کو ٹھکرا دوں گا کیوں کہ وفا صرف بیوی سے ہی ملتی ہے۔"

یہ امبر کی کھلی توہین تھی۔ اس روز ذکیہ نے توہین کی تھی' آج اعظم کر رہا تھا۔ اس کے جی میں آیا کہ اٹھ کر چلی جائے یا اسے منہ توڑ جواب دے۔ وہ بیٹھی رہی کیوں کہ ویٹر آگیا تھا اور کھانے کی ڈشیں رکھ رہا تھا۔ اس میں کچھ وقت لگا۔ اتنی دیر میں عقل آئی کہ وہ اعظم کو نہ پھانس رہی ہے' نہ ذکیہ سے چھین رہی ہے۔ وہ تو اپنے ایک منصوبے پر عمل کرنے آئی ہے' اسے تحمل سے کام لے کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہئے۔

وہ ویٹر کے جانے کے بعد بولی۔ "آپ کی اس بات پر ابھی مجھے غصہ آ رہا تھا۔ میں نے آپ سے یہ کبھی نہیں کہا کہ آپ میرے ہو جائیں اور ذکیہ کو چھوڑ دیں۔"

"پلیز! امبر! تم اسے اپنی توہین نہ سمجھنا۔ میں نے دوسری حسیناؤں کی بات کی ہے۔"

"اب آپ باتیں نہ بنائیں۔ میں بالکل ناراض نہیں ہوں اور اس حقیقت کو خوب سمجھتی ہوں کہ آپ جیسے محتاط رہنے والے شوہر کسی دوسری سے پارٹ ٹائم محبت کرتے ہیں۔ اپنی بیوی کی فل ٹائم محبت نہیں دیتے۔"

"دراصل میں یہی کہنا چاہتا تھا۔ میں تمہیں اس حد تک چاہتا ہوں کہ اس چاہت کا اثر ذکیہ پر نہ پڑے اور کسی طرح بھی اس کے جملہ حقوق پر آنچ نہ آئے۔"

"آپ کا محتاط رہنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ کیا اس شہر سے دور ہم کہیں تفریح کے لئے چل سکتے ہیں؟"

"دل تو بہت چاہتا ہے لیکن بزنس مین ہونے کے ناتے ہر شہر میں میرے شناساؤں کی بڑی تعداد ہے۔ ویسے بھی تمہارے ساتھ اس لئے پروگرام نہیں بنا سکتا کہ ایک ہفتہ بعد ذکیہ اور اپنے بیٹے کے ساتھ کراچی جا رہا ہوں۔"

وہ خوشی سے میز پر ہاتھ مار کر بولی۔ "کیا واقعی؟"

چیونٹی اُڑنا چاہے تو اسے بھی پر لگ جاتے ہیں۔ امبر کو نئی اڑان کے لئے اعظم مل رہا تھا۔ وہ بولا۔ "تم کیوں خوش ہو رہی ہو؟ تم نے شاید توجہ سے نہیں سنا' میں ذکیہ کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

"اچھی طرح سنا ہے۔ میں بھی کراچی جانے والی ہوں۔ ابا کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ تنہا کیسے جاؤں گی؟ اب وہ مجھے ذکیہ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دیں گے۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "بھئی یہ بات تم ذکیہ سے کرو اور خدا کے لئے اس سے یہ نہ کہنا کہ میں نے کراچی جانے والی بات تم سے کہی ہے۔"

وہ فکر میں مبتلا ہو گیا۔ پچھلی بار ذکیہ نے تاکید کی تھی۔ "آئندہ آپ امبر سے بات

بھی نہ کریں۔ وہ کہیں نظر آئے تو اس سے کترا جائیں۔"

وہ نظر آئی تو وہ کترا نہ سکا۔ یوں کھنچا چلا آیا جیسے لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ پتا نہیں قدرت نے مرد کے دماغ میں وہ کیسا کیڑا پیدا کیا ہے' جو عورت کو دیکھ کر کلبلاتا ہے۔ جو کھلونا ہاتھ آنے والا نہ ہو' اس کے لئے بچے سے بوڑھے تک مچلتے ہیں۔ ایک ضد سی ہو جاتی ہے کہ اسے کسی بھی قیمت پر حاصل کرے۔ اعظم کے لاشعور میں امبر کے لئے ضد تھی۔ جب وہ پندرہ برس کی کچی کلی تھی' تب ہی اس کی شوخیوں اور اداؤں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ اس نے کلی سے پھول بنتے اور اپنی توجہ کو طلب بنتے دیکھا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے دور رہے۔ اس آگ میں نہ جلے پھر بھی ہوس کی آگ بڑی ظالم ہوتی ہے' دور سے بھی آنچ دیتی ہے بلکہ دور سے رہ کر زیادہ جلاتی ہے۔

امبر سے رخصت ہونے کے بعد اس نے پھر عہد کیا کہ آئندہ اس سے کبھی نہیں ملے گا اور ذکیہ کے اعتماد کو دھوکا دے کر اپنی ہنستی بستی گھریلو زندگی کو جہنم نہیں بنائے گا۔

وہ بیچارہ آوارگی سے بچنا چاہتا تھا۔ غلطی کا احساس کرتا تھا۔ بیوی سے محبت کرتا تھا۔ کبھی کبھی لڑکھڑا جانے والوں کا بھی ایمان ہوتا ہے۔ آدمی کا ایمان کیا ہے؟ کاغذ کا سجدہ ہے۔ ہوس کے بہاؤ میں کاغذ کی ناؤ کی طرح کسی بھی گھڑی ڈوب سکتا ہے۔

امبر نے وہ دن بہت مصروف گزارا۔ شام کو چار بجے شہزادہ سے ملاقات کی۔ فرزانہ کراچی سے واپس آگئی تھی اس لئے وہ بڑی مشکلوں سے بہانہ کرکے دو گھنٹوں کے لئے آیا تھا۔ اس نے امبر سے کہا۔ "آج میں بہت مصروف ہوں۔ جاپان سے بزنس ڈیلنگ کے لئے ایک پارٹی آئی ہے۔ آج اس کے ساتھ ڈنر ہے' تم جلدی سے بتاؤ اس آرٹسٹ سے کوئی بات بنی؟"

"نولکھا بازار چلو۔ آج بڑی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔"

اس نے کار آگے بڑھا دی۔ وہ پوری تفصیل سے بتانے لگی کہ ساگر سے کیا باتیں ہوئیں اور کیسے معاملات طے ہوئے ہیں۔

وہ بولا۔ "ساگر تمہیں مفت تصویریں دے رہا ہے وہ بعد میں پرابلم بن جائے گا۔"

"نہیں بنے گا۔ وہ فقیری مزاج کا بندہ ہے۔ اسے مال و دولت کی ہوس نہیں ہے۔ سابقہ پلاننگ کے مطابق میں مصور اے ساگر بن کر فراڈ نہیں کروں گی۔ ہم اصل ساگر کو ہی پیش کریں گے۔ وہ خود کبھی اپنی نمائش کے لئے نہیں آئے گا۔ ہمارا بیان ہو گا کہ وہ قلندر ہے۔ گوشۂ گمنامی میں رہتا ہے۔ لوگوں کی بھیڑ میں نہیں آتا۔"

"اگر کبھی آجائے اور بڑی رقم کا مطالبہ کرے تو؟"

"پلیز' مجھ پر بھروسا کرو۔ وہ میرا دیوانہ ہے۔ میرے اشاروں پر چلے گا۔"

وہ ڈرائیو کرتے ہوئے اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا اور کچھ سوچ رہا تھا۔ امبر نے کہا۔

"ایک اور اچھی خبر ہے۔ کل میں کراچی جانے کے سلسلے میں مایوس ہو رہی تھی۔ آج یہ مسئلہ حل ہو چکا ہے میں ایک ہفتے بعد کراچی جا سکتی ہوں۔"

وہ اسے ذکیہ اور اعظم کے متعلق بتانے لگی۔ اس نے کہا۔ "تم جتنی لگن اور مستعدی سے کام کر رہی ہو اس سے کامیابی کی امید بندھ گئی ہے۔"

وہ سوچنے لگا' اسے بھی کراچی جانے کے لئے فرزانہ سے جھوٹ بولنا ہو گا۔ جھوٹ اور فریب کے بغیر دولت مند بیوی سے چھپ کر نیا دھندا نہیں کر سکے گا۔

وہ امبر کے ساتھ ساگر کے مکان میں آیا پھر وہاں سے تیس بہترین تصویریں اپنی کار میں رکھ کر لے گیا۔ امبر تھوڑی دیر کے لئے وہاں رک گئی۔ ساگر نے کہا۔ "تم میری دلجوئی کے لئے ٹھہر گئی ہو۔ تمہارے دل میں یہ بات ہے کہ کسی کے گھر سے کچھ لے جا کر قیمت نہ ادا کی جائے تو کم از کم دو میٹھے بول ہی بولے جائیں۔"

"تم میرے خواب پورے کرنے کے لئے جتنی فراخدلی سے پیش آ رہے ہو اور عملی تعاون کر رہے ہو' میں اس کے جواب میں تمہیں کچھ دے نہیں سکتی اور تم مال و زر کی خواہش نہیں رکھتے ہو ایسے میں میٹھے بول ہی بول سکتی ہوں۔"

"تم مجھے کچھ نہ دیتے ہوئے بھی بہت کچھ دے رہی ہو۔ کل تک میں تمہاری تصویریں بناتا تھا.......... تمہاری آواز پہلے نہیں سنی تھی' کل سے میرے کانوں میں تمہاری آواز کا ترنم گھل رہا ہے۔ آئندہ تمہاری تصویریں بناؤں گا تو وہ میرے کانوں میں تمہارے لہجے کا رس گھولتی رہیں گی۔"

"تم عجیب دیوانے ہو۔ اب میری تصویروں سے باتیں بھی کیا کرو گے۔ تمہاری طرح شاید کوئی مجھے اتنی شدت اور دیوانگی سے نہیں چاہے گا۔"

"دنیا دیوانوں سے خالی نہیں ہے۔ جو محبت کرے اور محبت کا صلہ نہ چاہے' وہ دیوانہ ہے۔"

"اگر میں صلہ دینا چاہوں تو؟"

"تو ایسا صلہ کبھی نہ دینا جس سے خریدا جاتا ہے یا ممنونِ احسان کیا جاتا ہے۔"

"ایسا صلہ کیا ہو سکتا ہے' جو احسان یا کسی غرض سے خالی ہو؟"

"یہ خدا سے پوچھو۔ وہ پیدا کرتا ہے اور صلہ نہیں چاہتا۔ وہ اذان کے الفاظ کہہ دیتا ہے کہ تم جو نمازیں پڑھتے ہو اپنی فلاح کے لئے پڑھتے ہو۔ اپنی پیدائش کے عوض خدا کو

کچھ نہیں دے پاتے۔ ازل سے بندہ اسی کوشش میں ہے' شاید اس معبود کو کچھ دے پائے۔ اس دینے کے جہاد میں وہ اپنے جیسے بندوں کو کچھ دینا سیکھ لیتا ہے۔ شاید تم بھی بے غرض ہو کر کچھ دینا سیکھ لو۔"

"میں تمہاری باتیں سمجھنے کی کوشش کروں گی۔"

"جب لالچ اور ہوس سے خالی ہو جاؤ گی تو سب کچھ سمجھ لو گی۔"

یہ بات امبر کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اگر آ جاتی تو ساگر کی صرف باتیں ہی اچھی نہ لگتیں وہ بھی اچھا لگتا مگر کیا کرے کہ قیمتی لباس پہنے' قیمتی کار میں بیٹھنے والا اور ہزار ہزار کے نوٹ خرچ کرنے والا شہزادہ بہت متاثر کر رہا تھا۔

شہزادہ فیکٹری پہنچا تو فرزانہ نے پوچھا۔ "تم کہاں چلے گئے تھے؟ مجھے تمہاری یہ آزادی اچھی نہیں لگتی۔"

وہ کار کی ڈکی سے ایک تصویر نکال کر دکھاتے ہوئے بولا۔ "پہلے ان تصویروں کو دیکھو۔"

وہ ذرا قریب ہو کر دیکھتی ہوئی بولی۔ "واہ' بہت اچھی پینٹنگ ہے۔ کہاں سے لائے ہو؟"

وہ دوسری پھر تیسری تصویریں دکھاتے ہوئے بولا۔ "میرا ایک غریب دوست ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی تصویروں کی نمائش کروں۔ یہ ایک ایک پینٹنگ کئی کئی ہزار میں فروخت ہو گی۔ اس بے چارے کو رقم بھی ملے گی اور شہرت بھی۔"

وہ اس کا بازو تھام کر بولی۔ "اوہ میرے شہزادے! میں تم پر شبہ کر رہی تھی کہ تم مجھے دھوکہ دے کر کسی آوارہ کے ساتھ گھومنے لگے ہو مگر تم تو بہت ہی نیک کام کر رہے ہو۔"

"فری! میری جان! پتا نہیں تم میں کیا کشش ہے؟ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کاش کہ میں شاعر ہوتا تو تم پر غزل لکھتا اور ٹی وی ریڈیو پر گاتا۔ لوگ پوچھتے کہ کس حسینہ کے دیوانے ہو تو میں ان کی آٹوگراف بک پر تمہارا نام لکھتا چلا جاتا۔"

وہ مسکرانے لگی۔ اپنی تعریف سبھی کو اچھی لگتی ہے۔ تعریف کی تعریف یہ ہے کہ عورت اسے کھا کر جوان رہتی ہے اور یہ عورت کی عقل کو کھا کر ہمیشہ نئی اور سچی لگتی ہے۔

وہ بولا۔ "میں ان کی پہلی نمائش کراچی میں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم اجازت دو تو میں ایک ہفتہ یا دس دنوں کے لئے کراچی چلا جاؤں۔"

"کب جاؤ گے؟"

"پہلے تو دو دنوں کے لئے پرسوں جاؤں گا اور وہاں انتظامات کر کے آؤں گا پھر ایک ہفتہ بعد نمائش کے لئے اپنے دوست ساگر کو لے جاؤں گا۔"

"یہاں تو کام بہت ہے۔ میں نہیں جا سکوں گی۔"

اس نے دل میں کہا۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے پھر زبان سے کہا۔ "میری جان! میں وہاں دس دنوں تک تمہارے بغیر کیسے رہوں گا۔ ٹھیک ہے' دس دنوں کے لئے نہ سہی دو دنوں کے لئے چلو۔"

وہ فیکٹری میں کام کی زیادتی کے لئے ایک دن بھی کہیں نہیں جا سکتی تھی لیکن وہ روٹھ گیا۔ رات کو فرزانہ نے تنہائی میں منایا اور وعدہ کیا کہ وہ صرف دو دنوں کے لئے جائے گی۔ روٹھنے والا مان گیا وہ خوش ہو گئی۔ شوہر کا بچے کی طرح روٹھ جانا پھر بیوی کی رشوت لے کر مان جانا' اسے بہت اچھا لگا تھا۔ ہائے بیچاری بیویاں۔

امبر نے جنرل پوسٹ آفس کے ذریعے ذکیہ سے رابطہ کیا پہلے ذکیہ کی والدہ کی آواز سنائی دی۔ امبر نے کہا۔ "بڑی اماں! میں امبر بول رہی ہوں۔ ابھی ذکیہ کے گھر فون کر رہی تھی وہاں کسی نے اٹینڈ نہیں کیا تب سمجھ گئی وہ آپ کے پاس آئی ہو گی۔"

"ہاں بیٹی! یہ میرے پاس بیٹھی ہے۔ تم کیسی ہو؟ تمہارے ابا کیسے ہیں؟"

"ابا خیریت سے ہیں۔ آپ کی دعاؤں سے میں بھی ٹھیک ہوں۔ اگلے ہفتے کراچی جانے والی ہوں۔"

"عجیب اتفاق ہے ذکیہ بھی کراچی جانے والی ہے۔"

ذکیہ نے پوچھا۔ "امی کس سے باتیں کر رہی ہیں؟"

"بیٹی! امبر ہے۔ لو اس سے باتیں کرو۔"

"میں اس سے بات نہیں کروں گی۔ آپ فون بند کر دیں۔"

امبر نے کہا۔ "میں سب سن رہی ہوں۔ اس سے کہیں فون بند کیا تو گھر چلی آؤں گی۔"

ذکیہ کی ماں نے اس کی بات دہرائی' وہ ریسیور کان سے لگا کر بولی۔ "میں نے تجھ سے کہہ دیا تھا آئندہ ہم سے تعلق نہ رکھنا۔"

"زیادہ غصہ نہ دکھاؤ۔ میں زہر لگتی ہوں تو مجھے زہر دے دے' میرے مرنے سے تعلق ختم ہو جائے گا۔"

"بکواس نہ کر۔ کیوں فون کیا ہے؟"

ذکیہ! قسم کھا کر کہتی ہوں جب سے تُو ناراض ہو کر گئی ہے میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ جب میں نے اپنا رشتہ کرنے کی ذمے داری تجھے دی تھی تو یہ بات مجھے اعظم صاحب سے نہیں کہنا چاہئے تھی۔ دیکھ میں غلطی مان رہی ہوں، کیا چھوٹی بہن کو معاف نہیں کرے گی؟"

ذکیہ کا دل صاف ہو گیا، وہ نرم پڑ کر بولی۔ "اچھا ٹھیک ہے، یہ تُو امی سے کیا بول رہی تھی؟ کیا کراچی جا رہی ہے؟"

"ہاں پھوپی کے پاس جانا چاہتی تھی۔ ابا مجھے تنہا جانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ اب مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"کیسے حل ہو جائے گا؟"

"تُو بھی تو جا رہی ہے نا۔ تیرے ساتھ جاؤں گی تو ابا خوش بھی ہو گا اور مطمئن بھی۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "وہ امبر! بات یہ ہے کہ ہم اے سی کمپارٹمنٹ میں جائیں گے، تُو کباب میں ہڈی نہ بن۔"

"میرے نہ جانے سے کیا تم میاں بیوی کو سفر میں تنہائی ملے گی؟ اس کمپارٹمنٹ میں درجنوں مسافر ہوں گے۔ وہ کباب میں ہڈی نہیں بنیں گے؟ صرف میں بن جاؤں گی۔ صاف کیوں نہیں کہتی کہ تُو نے مجھے معاف نہیں کیا ہے۔"

"میں نے معاف کر دیا ہے۔"

"پھر اعتراض کیا ہے؟"

"وہ بات یہ ہے کہ اعظم راضی نہیں ہوں گے۔"

"اپنے میاں کو سمجھاؤ کہ میں اپنے پیسوں کا ٹکٹ لے کر جاؤں گی۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ جاؤں گی اگر ایک ہی کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے پر میاں صاحب کو اعتراض ہو گا تو میں لوئر اے سی میں سفر کروں گی مگر تم ابا کو تو یہ یقین دلا سکتی ہو کہ میں اسی ٹرین میں جا رہی ہوں، جس میں تم دونوں رہو گے۔ مجھے سفر کے دوران سرپرستی چاہئے۔"

ذکیہ مجبوراً قائل ہو گئی۔ وہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اعظم اپنے ساتھ لے جانا چاہے گا تو اسی ٹرین میں امبر کے سفر کرنے پر بھی اعتراض کرے گا۔ یہ اعتراض چونکہ احمقانہ ہوتا اس لئے سفر کے دوران سرپرستی سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ شکست خوردہ انداز میں بولی۔ "ٹھیک ہے، میں اعظم سے بات کروں گی۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ کراچی جانے کا مرحلہ بھی تقریباً طے ہو گیا تھا۔ رات کو بستر

پر لیٹ کر وہ سوچنے لگی، باپ جانے کی اجازت دے دے گا لیکن کسی مجبوری کے باعث انکار بھی کر سکتا ہے اس لئے کوئی ایسی بات ہو جائے کہ انکار کی گنجائش ہی نہ رہے۔

اپنے باپ کے متعلق یہ جانتی تھی کہ وہ اسے خود کراچی چھوڑنے نہیں جائے گا کہ جس کمپنی میں وہ کام کر رہا تھا وہاں ملازمین کی چھانٹی ہو رہی تھی۔ یہ چھٹی پر جاتا تو نوکری سے چھٹی ہو جاتی۔

وہ بستر پر کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی۔ کوئی تدبیر نہیں سُوجھ رہی تھی۔ اٹھ کر بیٹھ گئی پھر لیٹ گئی۔ کسی مسئلے پر سر کھپاتے وقت یہی ہوتا ہے۔ سوچو تو آگے بڑھنے کے کئی راستے نکل آتے ہیں۔ اسے یہ تدبیر سُوجھی کہ پھوپی کو بیمار کر ڈالا جائے۔ کراچی سے خط آنا چاہئے کہ وہ سخت بیمار ہیں۔ ایسا خط سچ مچ نہیں آ سکتا تھا ہاں مگر جھوٹا کاغذ لکھا جا سکتا تھا۔

وہ پھوپی کی تحریر ہو بہو نقل نہیں کر سکتی تھی مگر اس میں بھی مکاری کا پہلو نکال سکتی تھی۔ وہ پہلو یہ تھا کہ بیمار کبھی خط نہیں لکھتا، کسی سے لکھواتا ہے۔

کئی دنوں سے پھوپی کا ایک خط آیا ہوا تھا۔ باپ نے اس کا جواب لکھنے کی تاکید کی تھی اور اس نے تازہ ترین مصروفیات کے باعث کہہ دیا تھا کہ جواب لکھ کر پوسٹ کر چکی ہے۔ وہ اکثر خط و کتابت کے معاملے میں جھوٹ بول دیا کرتی تھی۔ کیوں کہ اسے پھوپی اور ان کے بیٹے اکبر علی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پھوپی جس خط میں بھی شادی کی تاریخ مانگتی تھیں، وہ خط امبر غائب کر دیتی تھی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر منجی سے اتر کر دبے پاؤں چلتی ہوئی آنگن سے کمرے میں آ گئی۔ وہاں میز پر رکھے ہوئے لیمپ کو روشن کیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ دراز کو کھول کر پھوپی کے پاس سے آئے ہوئے لفافے اور خط کو نکالا۔ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ لفافے پر لگی ہوئی ڈاک کی مہر کچھ مٹی ہوئی تھی۔ اس کی درج شدہ تاریخ پڑھی نہیں جا سکتی تھی۔ وہ پھوپی کی طرف سے ایک خط لکھ کر اس لفافے میں رکھ کر باپ کو پیش کر سکتی تھی۔ اس ملک کے محکمہ ڈاک کا یہ کمال تھا کہ خطوط سب ہی پڑھ لیتے ہیں، ڈاک کی مہر کوئی نہیں پڑھ پاتا۔

امبر نے سطروں والا ایک کاغذ نکالا پھر اسے کلپ بورڈ پر رکھ کر لکھنے لگی۔

"بھائی شرفو! السلام علیکم۔

بعد سلام عرض ہے کہ پتر اکبر علی کو جدہ میں بہت اچھی ملازمت مل گئی ہے۔ وہ آپ کی قدم بوسی کے لئے لاہور جانا چاہتا تھا لیکن وقت کم تھا اور جانے کے سلسلے میں

مسائل بہت تھے۔ اس لئے آپ سے ملاقات نہ کر سکا۔ اس کے جاتے ہی میں بیمار پڑ گئی ہوں۔ اچھی خاصی چلتی پھرتی تھی' اب بستر کی ہو کر رہ گئی ہوں۔ محلے پڑوس والے کبھی جھانکنے اور کبھی خیریت پوچھنے آجاتے ہیں۔ دن کو تو کوئی نہ کوئی آجاتا ہے مگر راتوں کو بے یارومددگار رہ جاتی ہوں۔ کوئی منہ میں پانی ڈالنے والا نہیں ہوتا۔ اب ہاتھ پاؤں میں پہلی سی جان نہیں رہی ہے۔

یہ خط بھی پڑوسن سے لکھوا رہی ہوں اور آپ سے التجا کر رہی ہوں کہ میری تنہائی اور مجبوریوں کا خیال کریں اور امبر بیٹی کو پہلی گاڑی سے یہاں بھیج دیں۔ آپ اسے لے آئیں تو مجھے خوشی ہوگی' کوئی مجبوری ہو تو کسی بھروسے والی فیملی کے ساتھ گاڑی میں بٹھا دیں۔ وہ ہماری پڑھی لکھی ہوشیار بیٹی ہے۔ یہاں خیریت سے پہنچ جائے گی۔

ایسے برے حالات میں آپ کا اور امبر کا ہی سہارا ہے۔ آپ اس خط کے جواب میں میری امبر کو بھیج دیں۔

اس تھوڑے لکھے کو بہت سمجھیں۔ امبر پر میرا پورا حق ہے' میں اپنی بیٹی کا انتظار کر رہی ہوں۔ فقط آپ کی بہن بلقیس۔"

اس نے لکھنے کے بعد اس پر نظرِ ثانی کی۔ وہ جتنی خوبصورتی سے لکھا کرتی تھی' تحریر کو اتنا ہی بگاڑ کر لکھا تھا تاکہ وہ پھوپی کی پڑوسن کا خط لگے۔ اس نے جھوٹے کاغذ کو تہہ کیا پھر اسے کراچی سے آئے ہوئے لفافے میں رکھ دیا۔

اس کے بعد اپنے معمول کے مطابق ڈائری کھول کر بیٹھ گئی۔ پچھلی رات اس نے ساگر سے ہونے والی ملاقات کے متعلق لکھا تھا۔ اپنے تاثرات بیان کئے تھے۔ واضح الفاظ میں لکھا تھا کہ آج تک کسی نے ساگر سے زیادہ متاثر نہیں کیا ہے۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس دیوانے کی محبت میں خاک ہو جاتی مگر یہ دل اور دماغ صرف فن کو اور دیوانگی کو نہیں مانتا مال و زر بھی مانگتا ہے اس لئے وہ شہزادہ سلیم کو مانگتی ہے۔

اس نے ڈائری کے دوسرے صفحے پر لکھا۔ "آج ساگر سے میں نے تیس عدد تصویریں لیں۔ میں اس کے بدلے اس کے سامنے شرمندہ سی ہو گئی۔ وہ میری محبت میں حاتم طائی ہے۔ اس نے بہت کچھ دے کر کچھ بھی نہیں لیا۔

"ہاں' آج میں نے اس میں ایک تبدیلی دیکھی ہے۔ آج اس نے شیو کیا تھا۔ بالوں میں کنگھی کی تھی اور اجلا سا لباس پہنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں آؤں گی۔

"اس کا مطلب ہے' میری ذات سے اسے صفائی اور سلیقہ ملا ہے۔ آج میں نے بھی اسے کچھ دیا ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ میری ذات سے آئندہ بھی وہ کچھ نہ کچھ حاصل

کرتا رہے۔

"بیچارہ صرف تصویریں بناتا ہے اس کی مثال ٹکسال میں نوٹ چھاپنے والے کی سی ہے۔ کاریگر ٹکسال میں نوٹ چھاپتے ہیں لیکن اپنے ہاتھوں سے انہیں خرچ نہیں کر سکتے۔ انہیں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں خرچ کرنا شہزادے کو آتا ہے اور میں اس سے سیکھ رہی ہوں۔

"وہ تصویریں کینوس پر بناتا رہے گا اور ہم وہ کاغذ حاصل کرتے رہے گے' جسے سکہ رائج الوقت کہا جاتا ہے۔"

☆=========☆=========☆

شہزادہ سلیم نے نمائش کو کامیاب بنانے کے لئے زبردست انتظامات کئے تھے۔ نمائش سے دو دن پہلے اخبارات میں اے ساگر کا بھرپور تعارف پیش کیا گیا۔ اس کی بنائی ہوئی رنگین تصاویر شائع کی گئیں۔ صحافیوں اور فوٹو گرافروں کو اعشائیہ دیا گیا۔ ٹی وی پر بھی وقفہ وقفہ سے اشتہار آتا رہا جس کے نتیجے میں نمائش توقعات سے زیادہ کامیاب رہی۔

اس نمائش کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان تصویروں میں پینٹ کی جانے والی حسینہ امبر وہاں موجود تھی۔ بوڑھے رئیس اور نوجوان رئیس زادے امبر کو دیکھنے آتے' اس کی تصویروں کی تعریف کرتے تھے اس سے آٹو گراف لیتے تھے اور اپنی پسند کی تصویر خریدنے کے لئے پیشگی رقم ادا کرتے تھے۔

شہزادے سلیم نے پہلے ہی دن بھانپ لیا تھا کہ امبر کی موجودگی سے تصویروں میں جان پڑ گئی ہے۔ ان کی قیمتیں آسمان سے باتیں کریں گی کیوں کہ وہاں دانشور کم آرہے تھے۔ دولت لٹانے والے تماش بین ٹائپ کے دل پھینک رئیس زیادہ آرہے تھے اور امبر کی ذات سے دلچسپی لے رہے تھے۔ شہزادے نے تصاویر کی قیمت ایک لاکھ روپے سے شروع کی اور بعض تصاویر پر دو لاکھ اور تین لاکھ کی پرچیاں لگا دیں۔

آرٹ گیلری کے منتظمین نے کہا۔ "بہت زیادہ قیمتیں ہیں۔ تصویریں رہ جائیں گی لیکن دو ہی دنوں میں بارہ تصویروں پر فروخت شدہ ہونے کی پرچی لگ گئی یعنی دو دنوں میں پندرہ لاکھ کا منافع ہو رہا تھا۔ خوشی کے مارے امبر کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ وہ گیلری میں تتلی کی طرح اُڑتی پھر رہی تھی۔ تصویریں خریدنے والے اس کے ساتھ تصویر اتروانے کی فرمائش کرتے تھے اور وہ اُن کے ساتھ کیمرے کے سامنے آجاتی تھی۔

شہزادہ دور سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ گڑبڑ ہو گئی۔ اس حسینہ کو اپنی قدر و قیمت معلوم ہو گئی ہے۔ اگر اسے حاصل نہ کیا تو پھر کوئی رئیس اسے اڑا لے جائے

گا۔ کتنے ہی قدر دان اُسے لنچ اور ڈنر پر مدعو کر رہے تھے اور وہ ٹال رہی تھی کہ وہ نمائش کے بعد انہیں ٹائم دے سکے گی۔

انہوں نے ہوٹل شیرٹن میں قیام کیا تھا۔ اس رات شہزادے نے اس کے کمرے میں آکر کہا۔ "یہ میں کیمرا لایا ہوں۔ ہماری بھی کچھ یادگار تصویریں ہونی چاہئیں۔"

وہ صوفے پر انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔ "اوہ شہزادے' میں بہت تھک گئی ہوں۔"

"تھکن کو بھول جاؤ۔ میں کاروباری باتیں کرنے آیا ہوں۔"

"ہاں کاروبار کے لئے تو میں رات بھر جاگنے کو تیار ہوں۔ تم نے مجھے آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ دو ہی دن میں لکھ پتی بن جاؤں گی۔"

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اگلی نمائش' لندن' پیرس اور فرینکفرٹ میں ہوگی۔ تم کروڑ پتی حسینہ کہلاؤ گی۔ پاکستان کے باہر ان ملکوں میں تمہارا بینک بیلنس رہے گا۔"

وہ اُس کے پاس آگئی اور اُس کا بازو تھام کر بولی۔ "تم میرے آئیڈیل شہزادے ہو۔ میں ساری زندگی تمہارے قدموں میں گزار دوں گی۔"

وہ اسے بازوؤں میں بھر کر بولا۔ "کامیابی کے پہلے زینے پر ہمارا درمیانی فاصلہ ختم ہونا چاہئے۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ ہمیں جلد سے جلد شادی کر لینا چاہئے۔"

"نہیں امبر! میری پلاننگ کے مطابق تمہیں شادی نہیں کرنا چاہئے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے شادی کیوں نہیں کرنا چاہئے؟"

"کیا تم دیکھ نہیں رہی ہو کہ نمائش میں آنے والے تمہاری ذات میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ میرا خیال ہے' یہ دنیا کی پہلی نمائش ہے کہ خیالی تصویروں کی حسینہ بنفسِ نفیس گیلری میں موجود رہتی ہے۔ تصاویر کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن اُن کی قیمت تمہیں دیکھ کر ادا کی جا رہی ہے۔"

"ہاں میں سمجھ رہی ہوں۔ لوگ تصویریں دیکھنے کے بعد مجھے یوں دیکھتے ہیں' جیسے خیال مجسم ہوگیا ہو۔ جیسے میں ان کے دماغوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی' اچانک سامنے آگئی ہوں۔"

"تمہیں اُن کی حیرت کو برقرار رکھنا چاہئے۔ انہیں یہ یقین رہنا چاہئے کہ تم اچھوتی ہو۔ کسی نے تمہیں ایک انگلی سے بھی چھو کر نہیں دیکھا ہے اور یہ کہ تم لاحاصل ہو۔"

"ہاں' اس سے اہمیت اور قدر و قیمت بڑھتی ہے' میں اچھوتی رہوں گی .... تو آئندہ نمائش میں بھی قیمتیں بڑھیں گی۔"

"اسی لئے تمہیں شادی نہیں کرنا چاہئے۔ کیا تم نے فلمی ہیروئنوں کو نہیں دیکھا۔ وہ فلمی شادیاں کرتی ہیں اور فلموں سے ریٹائر ہونے تک کنواری کہلاتی ہیں۔"

"وہ تو دھوکا دیتی ہیں۔ بیچارے فلم بین نہیں جانتے کہ وہ پسِ پردہ نجی زندگی میں کیا گل کھلاتی ہیں۔"

"اسی طرح تمہارے قدردانوں کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ ہم بند کمرے کیا گل کھلانے لگے ہیں۔"

مگر شہزادے! یہ تو گناہ ہے۔"

"تم باپ کو دھوکا دے کر آئی ہو' یہ کون سا اچھا عمل ہے۔ ان لاکھوں روپے کا حقدار ساگر ہے۔ کیا تم اُس کا حق چھین کر جرم نہیں کر رہی ہو؟"

وہ کچھ بولنا چاہتی تھی لیکن اس نے بولنے نہیں دیا۔ بڑی خاموشی سے خاموش کردیا۔ لکھ پتی بننے کے بعد کروڑ پتی بننے کے سبز باغ دکھانے لگا۔ اتنی دولت کے انبار میں لیٹ کر سمجھوتا ہو جاتا ہے۔ یہ سمجھوتا اس کے حق میں تھا کہ بے انتہا دولت بھی ملے گی اور وہ بڑھاپے تک کنواری بھی کہلائے گی۔

یہ جو نکاح کا کاغذ لکھا جاتا ہے' یہ عورت کو ایک مرد کی جاگیر بنا دیتا ہے۔

یہ کاغذ سرخ سگنل بن کر کہتا ہے' اسٹاپ! اس کی تمنا نہ کرو۔ اس کے جملہ حقوق محفوظ ہو چکے ہیں۔

موجودہ منافع بخش کاروبار کا تقاضا تھا کہ "قبول ہے" کا کاغذ نہ لکھا جائے۔ وہ سب کے لئے کنواری رہے۔ سب اس کی تمنا کریں اور وہ سب کے لئے لاحاصل ہو۔ صرف شہزادے کا ماحصل رہے۔

وہ دوسری صبح دیر تک سوتی رہی۔ آنکھ کھلی تو بہت خوش تھی۔ اسے اب دولت کے ساتھ شہزادے کا پیار بھی مل رہا تھا۔ وہ اٹھ کر باتھ روم میں گئی۔ دیر تک نہاتی' شرماتی' مسکراتی اور کبھی گنگناتی رہی پھر اچھا سا لباس پہن کر فون کے ذریعے ناشتے کا آرڈر دیا۔ اس کے بعد ڈائری کھول کر بیٹھ گئی۔

جب اس کے اندر تحریک پیدا ہوتی تھی اور جب اس کے اندر مسرتیں ترغیب دیتی تھیں کہ لکھو تو وہ بڑے جذبوں میں ڈوب کر لکھنے لگتی تھی۔ ڈائری اس کی سہیلی تھی' جو بات وہ کسی سے نہیں کہہ سکتی تھی' وہ ڈائری سے کھل کر کہہ دیا کرتی تھی۔ اس نے کاغذ کے سینے میں پچھلی رات کے رنگین و سنگین لمحات نقش کردیئے۔ ایک مدت گزر جائے تب ڈائری اٹھا کر پڑھو تو گزری ہوئی ملاقاتوں کی کھٹی میٹھی باتیں بہت مزہ دیتی ہیں۔

دروازے پر دستک سن کر اٹھ گئی۔ بستر کے پاس جاکر ڈائری کو تکئے کے نیچے رکھا پھر دروازے کے پاس آکر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"ویٹر۔" اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ ناشتے کی ٹرالی اندر پہنچا کر چلا گیا۔ دروازے کے پاس ہی اخبار پڑا ہوا تھا اُسے اٹھا کر دیکھا۔ رنگین صفحات پر ساگر کی بنائی ہوئی تصویروں کے ساتھ امبر کی بھی کئی تصویریں چھپی تھیں۔ وہ ناشتے کو بھول کر جلدی جلدی پڑھنے لگی۔ اسے شاعر کا تخیل اور مصور کی رنگ آمیزی کا امتزاج لکھا گیا تھا۔ پچھلے دو دنوں میں اخبارات کے رپورٹرز نے اس سے طرح طرح کے سوالات کئے تھے۔ وہ سوالات اور ان کے دلچسپ جوابات بھی شائع ہوئے تھے۔ اس سے پوچھا گیا تھا کہ مصور اے ساگر سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ کیا وہ اس کے خیالوں اور خوابوں کی ملکہ ہے؟ امبر نے جواب دینے سے پہلے شہزادے کو دیکھا تھا پھر کہا تھا۔ میں خیال ہوں کسی اور کا' مجھے سوچتا کوئی اور ہے۔

شہزادہ دروازہ کھول کر اندر آیا۔ اُس کے ہاتھوں میں کئی اردو انگریزی اخبارات تھے' وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ "میری جان! تمہاری خبریں سیاسی خبروں پر بھی حاوی ہوگئی ہیں۔ تم ہر اخبار کے پہلے صفحہ پر ہو اور پتا ہے' تم تو سو رہی تھیں' صبح سے کئی فون آچکے ہیں۔ ایک فلم پروڈیوسر اور تین اشتہاری کمپنی کے مالکان تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"کیا تم چاہتے ہو' میں ماڈل گرل بن جاؤں؟"

"ہرگز نہیں۔ فلم' ٹی وی اور اشتہارات میں تمہاری ہلکی سی جھلک بھی نہیں آنی چاہئے۔ ان تمام ذرائع سے جو شہرت اور کچھ رقم ملتی ہے اس کے مقابلے میں تم پینٹنگز کے ذریعے ہزار گنا کما رہی ہو۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو مگر ہائے مجھے نیلی بننے کا بڑا شوق ہے۔"

"فلم والے ایسا خون چوسیں گے کہ نیلی تو نہیں پیلی ہوجاؤ گی۔ ایک بہت بڑی اشتہاری کمپنی کا مالک میرے کمرے میں بیٹھا ہے' اس کے ساتھ ایک صحافی بھی ہے۔ تمہیں یہ "گر" سمجھا چکا ہوں کہ شہرت حاصل کرنا ہو تو صحافیوں کو ناراض نہیں کرنا چاہئے۔ اُس صحافی کی وجہ سے میں اس شخص کو وہاں بٹھا کر آیا ہوں۔"

"کیا میں اُس سے ملاقات کروں؟"

"ہاں' تم اشتہاری کمپنی کے مالک کو کم اور صحافی کو زیادہ اہمیت دینا اور ذرا باتیں بنا کر کہہ دینا کہ بیرونی ممالک میں تصاویر کی نمائش کرکے واپس آؤ گی تو صحافی کی خاطر اشتہاری فلم سائن کرو گی۔ ایسے لوگوں کو اسی طرح ٹالا جاتا ہے اور خوش بھی رکھا جاتا

ہے۔"

وہ آئینے کے سامنے بیٹھ کر میک اپ کرتے ہوئے بولی۔ "یہ لباس ٹھیک ہے؟"

"پرفیکٹ ہے۔ بڑی دھانسو لگ رہی ہو۔"

"تم بھی ساتھ رہو گے؟"

"اپنے قدردانوں کے مزاج کو سمجھو' ایسے لوگ کباب میں ہڈی نہیں چاہتے۔ تم تنہا ملاقات کروگی تو انہیں ڈھکی چھپی محبوبیت کا احساس ہوگا۔"

اس نے تیار ہوکر آئینے میں مختلف زاویوں سے خود کو دیکھا پھر مطمئن ہوکر شہزادے کے کمرے میں چلی گئی چونکہ وہ دیر تک سوتی رہی تھی اس لئے روم میڈ نے اس کے کمرے کی صفائی نہیں کی تھی اور اسی لئے شہزادے نے ان کی ملاقات کا انتظام اپنے کمرے میں کیا تھا۔

امبر کے جانے کے بعد اس نے ٹرالی سے ایک پیسٹری اٹھا کر کھائی' پانی پیا پھر تھکے ہوئے انداز میں بستر پر آکر لیٹ گیا۔ اس بستر پر پچھلی رات یاد آرہی تھی۔ ماضی اور حال کا' کھنڈر اور تاج محل کا' فرزانہ اور امبر کا فرق صاف ظاہر تھا۔ اس نے امبر کو ہوا کے تازہ جھونکے کی طرح محسوس کرتے ہوئے انگڑائی لی پھر تکئے کو اٹھا کر اُسے بازوؤں میں دبوچنا چاہا تو وہ ڈائری نظر آگئی۔

ابھی اسے ڈائری کی اہمیت معلوم نہیں تھی۔ اس نے اس لئے اٹھایا کہ محبوبہ نہ ہو تو ڈائری محبوبہ کا بدن لگتی ہے۔ اس نے اس بدن کو سینے سے لگا لیا۔ اسے ہونٹوں تک لاکر چوما پھر اسے کھول کر دیکھا۔ ورق گردانی کے دوران جگہ جگہ سے تحریر پڑھی۔ بڑی دلچسپ لگی۔ یہ اندازہ ہوا کہ وہ طبیعت کی روانی کے مطابق ڈائری لکھا کرتی ہے پھر تو اس نے پچھلی رات کی بھی ہوشربا کہانی لکھی ہوگی۔ اس نے اس روز کی تاریخ کا صفحہ کھول کر دیکھا تو اندازہ درست نکلا۔

اس نے نہایت خوبصورت انداز میں حکایتِ شب کو لفظوں کی زبان دی تھی۔ اپنی تمام مسرتوں اور جذبوں کو بڑی دیوانگی اور بڑی روانی سے لکھتی چلی گئی تھی۔ اس تحریر سے بالکل واضح تھا کہ وہ دنیا والوں کی نظر میں اچھوتی' ان ٹچ ایبل اور نایاب رہے گی لیکن اس کے دن اور اس کی راتیں صرف شہزادے کے لئے وقف رہیں گی۔

وہ تحریر دو صفحات پر مشتمل تھی۔ شہزادے نے وہ ورق نکال کر انہیں تہہ کرکے جیب میں رکھ لیا۔ پچھلی رات اس نے خودکار کیمرے سے اپنی اور اس کی کئی جذباتی تصویریں کھینچی تھیں۔ پہلے تو وہ راضی نہیں تھی لیکن رفتہ رفتہ بے تکلفی بڑھتی گئی' حجاب

اٹھتا گیا تو کیمرے کی آنکھ رازدار بنتی گئی۔ یہ سب کچھ آسانی سے نہیں ہو جاتا اس کے لئے حالات پیدا کئے جاتے ہیں۔ ان معاملات میں عورت کی سب سے بڑی نادانی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے چاہنے والے پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کر لیتی ہے۔ خود کو حوالے کرتے وقت سوچتی ہے کہ یہ میرے ساتھ جو سلوک کرتا ہے کرے' اب تو یہی میرا سب کچھ ہے اس کے بعد کوئی دوسرا میری زندگی میں نہیں آئے گا۔ یہ تو اپنا مستقبل پڑھنے اور غائب کی باتیں جاننے والا دعویٰ ہو گیا کہ دوسرا کوئی زندگی کے کسی موڑ پر نہیں آئے گا۔ تقدیر کبھی کسی کی مرضی سے نہیں لکھی جاتی۔

شام کو گیلری میں پچھلے دو دنوں سے زیادہ رونق تھی۔ اسے دیکھنے اور اسے چاہنے والوں کی اتنی بھیڑ تھی کہ وہ ایک چھوٹے سے دفتری کمرے میں آ کر بند ہو گئی تھی کیوں کہ قدردان اس کے زیادہ سے زیادہ قریب ہو کر تصویریں کھنچوانے اور اسی بہانے اسے چھونے کی کوششیں کرتے تھے۔ وہ بند کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ منتظمین نے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ بھیڑ نہ لگائیں۔ قطار میں کھڑے ہو کر اپنی باری آنے پر مس امبر سے ملاقات کریں۔

یوں مردوں اور عورتوں کی دو قطاریں ہو گئی تھیں۔ لوگ آتے تھے اور اس سے آٹوگراف لیتے تھے۔ اس کے ساتھ تصویر کھنچوانے کی فرمائش کرتے تھے اور سوالات بھی کرتے تھے۔ وہ جواب دیتی تھی۔ "میری تصویریں اخباروں اور رسالوں میں مل جائیں گی اور آپ کے سوالات ایسے ہیں' جن کے جوابات میں پہلے ہی اخبارات کے ذریعے دے چکی ہوں۔"

لڑکیاں آٹوگراف لینے کے بعد اسے چھونے یا مصافحہ کرنے کی فرمائشیں کرتی تھیں اور وہ مسکرا کر ان سے مصافحہ کرتی تھی پھر وہ کھڑکی کے سامنے ذکیہ اور اعظم کو دیکھ کر چونک گئی' بولی۔ "اری تُو قطار میں لگ کر آئی ہے! چل اندر آجا۔"

پھر اس نے چپراسی سے کہا۔ "ان دونوں کو اندر آنے دو۔"

ابھی چند ہفتے پہلے وہ ذکیہ کی کوٹھی' کار اور اس کا شاہانہ انداز دیکھ کر متاثر ہوئی تھی۔ یہ اکثر سوچتی تھی کہ اس کے بھی دن پھریں گے یا نہیں؟ اب ایسے دن پھرے تھے کہ ذکیہ خود اُس سے ملنے آئی تھی۔ وہ اندر آ کر بولی۔ "یہ تو کیا کرتی پھر رہی ہے۔ کسی مداری کے تماشے میں بھی اتنی بھیڑ نہیں لگتی ہو گی۔"

امبر نے ٹھنڈی بوتلیں لانے کا حکم دیا۔ اعظم نے پوچھا۔ "یہ مصور کون ہے؟ یہ کب سے تمہیں پینٹ کر رہا ہے۔ تصویروں کی تعداد سے پتا چلتا ہے' تم یہ پلاننگ برسوں

سے کرتی آ رہی تھیں۔"

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ "یہ بتائیں' میری پلاننگ کیسی رہی؟"

"تم نے حیران کرنے اور لوگوں کی نیندیں اڑا دینے والا کام کیا ہے۔ میں اور ذکیہ تمہیں اخبارات میں دیکھ کر ایسے حیران ہوئے کہ یقین ہی نہیں آیا۔"

ذکیہ نے کہا۔ "میں یقین کرنے آئی ہوں کہ یہ تُو ہی ہے۔"

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "سب مجھے چھو کر دیکھتے ہیں کہ میں ساگر کی تصویر ہوں یا حقیقت؟ تُو بھی چھو کر دیکھ لے۔"

وہ امبر کا کان پکڑ کر بولی۔ "یہ چھو رہی ہوں اور پوچھ رہی ہوں' تُو نے ہمارے کاندھوں پر بندوق رکھ کر کیوں چلائی ہے؟ چاچا نے تجھے ہمارے بھروسے یہاں بھیجا تھا۔ میں پھوپی سے جا کر مل چکی ہوں۔ تُو نے ان کے دروازے پر قدم بھی نہیں رکھا ہے۔ تو نے تنہا کہاں قیام کیا ہے؟"

اعظم اسے چور نظروں سے دیکھتا جا رہا تھا۔ اس کی خیالی تصویر دیکھنے کے بعد وہ خواب و خیال سی لگ رہی تھی۔ لوگ اسے ایک ذرا چھونے کے لئے بے تاب ہو رہے تھے اور وہ برسوں سے اس کے قریب ہونے کے باوجود اسے چھو نہیں پایا تھا۔ آج اسے اپنی شرافت اور بزدلی پر افسوس ہو رہا تھا۔ وہ پچھتا رہا تھا اور سوچ رہا تھا یہ تنہا نہیں ہے' اس کے ساتھ ضرور کوئی شخص ہے۔

وہ بولا۔ "تم اتنی بڑی اور کامیاب نمائش کے انتظامات تنہا نہیں کر سکتیں۔ تمہارے ساتھ اور کون ہے؟"

وہ بولی۔ "میں نے ایک شعر پڑھا تھا' وہ یاد نہیں ہے۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ تنہائی اور بے سرو سامانی کی فکر نہ کرو۔ سفر شروع کرو۔ راہ میں ہم سفر ملتے رہیں گے۔ ہاں' یاد آ گیا۔ وہ شعر ہے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

ذکیہ نے کہا۔ "امبر! اعظم کا یہ سوال اہم ہے۔ اسے ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔ تیرے ساتھ کون ہے؟"

"میرے ساتھ میرا بزنس پارٹنر شہزادہ سلیم ہے۔ وہ آئندہ لندن' پیرس اور فرینکفرٹ میں تصاویر کی نمائش کرنے والا ہے۔"

"تُو چاچا کو دھوکا دے کر لاہور سے کراچی آ گئی لیکن ملک سے باہر کیسے جائے گی؟"

"اباکو سمجھاؤں گی کہ مجھ پر پابندیاں عائد نہ کرے یا پھر میرے ساتھ نمائش میں رہا کرے۔"

"اب چاچا کی یہ عمر نہیں رہی کہ تیرے ساتھ ملک سے باہر بھٹکتے رہیں۔ کیا وہ اپنی بیٹی کی نمائش دیکھنا گوارا کریں گے۔"

"گوارا نہیں کریں گے تو میں یہاں جیسے تنہا آئی ہوں' ملک سے باہر بھی تنہا جاؤں گی۔ مجھے کامیابی و کامرانی کا جو راستہ ملا ہے' اسے نہیں چھوڑوں گی۔"

"تُو نے فون پر اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے مجھ سے معافی مانگی تھی۔ اب سمجھ میں آیا کہ تجھے غلطی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ تُو کراچی آنے کے لئے ہمیں فریب دے رہی تھی۔"

"تُو کچھ بھی سمجھ لے۔ میں مطمئن ہوں کہ میری ذات سے تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے لیکن شاید میری ترقی اور خوشحالی سے دکھ پہنچ رہا ہے۔ میں وہی فٹ پاتھ پر کھڑی رہنے اور تجھ سے لفٹ لے کر تیری ائرکنڈیشنڈ کار میں بیٹھنے والی بدحال امبر ہوتی تو تجھے خوشی ہوتی۔"

"میں شاید اس وقت تجھ سے حسد کرتی' جب مجھ سے زیادہ بلندی پر جاتی مگر تُو پہلے جہاں تھی' اس سے بھی نیچے گر گئی ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا' آج آخری بار کہتی ہوں کہ آئندہ ہم سے کوئی تعلق نہ رکھنا کیوں کہ جس انداز میں تُو ملک کے اندر اور باہر رسوائیاں مول لینے کا سامان کر رہی ہے اس کے بعد تجھے دولت تو ملے گی لیکن مجھ جیسی بیاہتا عورت کی عزت اور شرافت نصیب نہیں ہو گی۔"

وہ اٹھ کر اعظم سے بولی۔ "چلیں۔ آج سے یہ ہمارے لئے اور ہم اس کے لئے مر چکے ہیں۔"

اعظم بڑے ارمانوں سے آیا تھا مگر بہت مایوس ہو کر ذکیہ کے ساتھ چلا گیا۔ شہزادہ چپراسی کے ساتھ ٹھنڈی بوتلیں لے کر آیا پھر بولا۔ "یہ کن مہمانوں کے لئے منگوائی گئی ہیں؟"

"وہی ذکیہ اپنے میاں کے ساتھ آئی تھی۔ جل کُڑھ کر گئی ہے۔ آؤ بیٹھو' ہم پی لیں۔"

"بوتلیں رہنے دو۔ ایک صاحب ملنے آ رہے ہیں۔ انہوں نے تین لاکھ میں تمہاری ایک تصویر خریدی ہے۔ بہت امیر و کبیر وڈیرا ہے۔ کوشش کرنا ملاقات مختصر رہے۔"

وہ باہر گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک پکی عمر کا قد آور شخص اندر آیا۔ اس نے امبر کو دیکھ

کر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے! جو سنا اور دیکھا' وہی پایا۔ لگتا ہے تصویر زندہ ہو کر سامنے آ گئی ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "آیئے تشریف رکھئے۔ آپ کے لئے بوتل حاضر ہے۔"

وہ ایک صوفے پر بیٹھ کر بولا۔ "تمہارا زیادہ ٹائم نہیں لوں گا ابھی تمہاری ایک تصویر تین لاکھ میں لی ہے۔ وہ مجھ سے پیشگی مانگ رہے تھے' میں نے پوری رقم ادا کر دی۔"

وہ بولی۔ "آپ کا شکریہ۔ آپ بہت باذوق ہیں۔ فن کو سمجھتے ہیں۔"

"نہیں' صاف کہتا ہوں۔ مجھے ادب اور ارٹ کو سمجھنے کی فرصت نہیں ملتی۔ میں نے تو تصویر میں صرف تمہیں دیکھا ہے اور تمہاری قیمت دی ہے۔"

"پلیز' آپ ایسی بات نہ کریں۔ قیمت بازاری عورتوں کی دی جاتی ہے۔"

"میری بات کو غلط نہ سمجھو۔ کوئی دولت مند کسی بازاری عورت کو ایک نظر میں تین لاکھ روپے نہیں دیتا۔ میں تمہیں ایک شریف گھرانے کی لڑکی سمجھ کر آیا ہوں۔ کسی تمہید کے بغیر کہہ دوں کہ تمہیں ڈیفنس میں ایک کوٹھی' ایک کار اور ماہانہ تیس ہزار روپے ادا کرتا رہوں گا۔"

امبر غصے سے سرخ ہو گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "میں پھول مار رہا ہوں' پتھر لگے تو برداشت کرو کیوں کہ ہر نمائشی چیز کی قیمت لگائی جاتی ہے۔ میرا نام جمال احمد لاشاری ہے' ٹیلیفون ڈائریکٹری میں میرا نمبر اور پتا آسانی سے مل جائے گا۔ سودا منظور ہو تو فون کا نمبر گھما دینا۔"

یہ کہتے ہی وہ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کی باتوں کے دوران امبر کو عقل آ گئی تھی کہ اسے باتیں سنائے گی' ہنگامہ کرے گی تو شہرت کو نقصان پہنچے گا پھر یہ بات اخبارات میں بھی آ جائے گی۔ وہ اندر ہی اندر غصے سے تلملانے لگی۔ شہزادے کا انتظار کرنے لگی۔

وہ بہت دیر بعد آیا۔ اسے دیکھتے ہی پھٹ پڑی۔ "کہاں چلے گئے تھے اور کس بدمعاش کو میرے پاس بھیج دیا تھا؟ کیا تمہیں غیرت نہیں ہے؟ کیا میں تمہاری عزت نہیں ہوں؟"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ تصویر کے ساتھ ساتھ تمہاری قیمت بھی لگائے گا۔ وہ باہر جا کر مجھ سے ایسی باتیں کرنے لگا جیسے میں دلال ہوں۔"

"تم نے یہ بات برداشت کیسے کی؟ میں بیوی ہوتی تو کیا برداشت کر لیتے؟"

"بیوی ہونے یا نہ ہونے کی کیا بات ہے؟ تم ہر حال میں میرے لئے اہم ہو۔ گر وہ لاہور میں ہوتا تو میں اس کی زبان کھینچ لیتا اسے گولی مار دیتا۔"

"یہ لاہور نہیں ہے' پاکستان تو ہے۔ کیا وہاں میرے محافظ رہ سکتے ہو یہاں نہیں ر

سکتے؟"

"امبر! سمجھا کرو۔ صوبے بدلنے سے ذرائع بدل جاتے ہیں۔ مزاج بدل جاتے ہیں۔ ایک صوبے کا پاکستانی' دوسرے صوبے میں جا کر آدھا پاکستانی ہو جاتا ہے کیوں کہ اسے پنجابی' پٹھان' سندھی یا بلوچی کہا جاتا ہے۔ جب اپنے ہی ملک کے کسی صوبے میں پاکستانی آدھا رہ جائے تو اس کی طاقت اتنی بھی نہیں رہتی کہ وہ اپنی عورت کی بے عزتی پر غصہ دکھا سکے۔"

وہ خاموش رہ کر ٹھنڈی بوتل پینے لگی۔ اسے یہ بات چبھ رہی تھی کہ جمال احمد لاشاری نے اسے نمائشی کہا تھا اور یہ کڑوی حقیقت سنائی تھی کہ ہر نمائشی چیز کی قیمت لگائی جاتی ہے اسی لئے اس نے تصویر کا فن دیکھ کر نہیں اس کے حسن و شباب کو دیکھ کر قیمت ادا کی تھی۔

اب اسے یہ کڑوا گھونٹ پینا تھا۔ اس لئے وہ خود کو سمجھا رہی تھی' دنیا والے میری قیمت لگائیں گے' میں اپنا آپ بیچ نہیں رہی ہوں۔ شہزادے کے سوا کوئی مجھے چھو نہیں سکتا۔ میں انمول ہوں۔ لاحاصل ہوں۔ یہ کتے کھسیانے ہو کر بھونکتے رہیں گے۔ مجھے بدنام کرتے رہیں گے اور مجھ پر دولت لٹاتے رہیں گے۔

وہ خود کو اسی انداز میں تسلی دے رہی تھی لیکن بدنامی اور دولت کی بات پر ذکیہ کی بات یاد آئی اس نے بڑے فخر سے کہا تھا۔ "تجھے دولت تو ملے گی لیکن مجھ جیسی بیاہتا عورت کی عزت اور شرافت نصیب نہیں ہو گی۔"

وہ رات کو شہزادے کی طرف کروٹ لے کر بولی۔ "ہمیں شادی کر لینا چاہئے۔"

"اس سے کیا ہو گا؟"

"میں ذکیہ کی طرح فخر سے خود کو بیاہتا کہہ سکوں گی۔ میں اونچی سوسائٹی میں قدم رکھ رہی ہوں۔ مجھے دولت کے ساتھ عزت بھی چاہئے۔"

"لیکن وہ شہرت اور قیمت نہیں ملے گی جو تصاویر کی کنواری حسینہ کو دیکھ کر لگائی جاتی ہے۔ جب تک قدر دانوں کی دانست میں تمہارے تن کا کاغذ کورا ہے' تم بیش قیمت اور نایاب ہو۔ اگر یہ معلوم ہو گا کہ 'کاغذ پر میرے دستخط ہو چکے ہیں تو تمہاری قیمت گرتی چلی جائے گی۔"

"قیمت گرنے دو۔ تصاویر کی جو قیمتیں ہمیں ملتی رہیں گی وہی میرے لئے قابلِ قبول ہوں گی۔"

وہ پریشان ہو گیا۔ فرزانہ کو چھوڑ کر اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ فرزانہ کا

کاروبار جما جمایا تھا۔ مستقل لاکھوں روپوں کی آمدنی تھی۔ آمدنی ادھر بھی تھی لیکن پائیدار نہیں تھی۔ اے ساگر فقیر منش تھا قلندر کا کیا بھروسا' وہ تصویریں بنانا چھوڑ سکتا تھا۔ ساگر اور امبر پارٹ ٹائم بزنس کے لئے ہی موزوں تھے۔

اس نے کہا۔ "شادی ضروری نہیں ہے۔ ذرا صبر کر لو۔ تمہیں بیاہتا گھریلو عورتوں سے زیادہ عزت ملے گی۔"

"یہ میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ باہر شہرت پانے والیوں کو گھریلو عورت جیسی عزت نہیں ملتی' ہم عورتوں کو دو میں سے کوئی ایک راستہ چننا پڑتا ہے۔ گھر کے اندر عزت ہے' شہرت نہیں ہے۔ باہر شہرت ہے۔ عزت نہیں ہے۔"

"تم تو عزت کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ میں تمہاری بات پر غور کروں گا۔ ابھی موڈ خراب نہ کرو۔"

"اچھا یہ بتاؤ۔ وہ وڈیرا کہہ رہا تھا کہ تین لاکھ روپے نقد دیئے ہیں۔"

"ہاں' وہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ میرے بریف کیس میں ہیں۔"

"تم نے اپنے پاس کیوں رکھے ہیں؟ کیا اس لئے کہ میں بیوی نہیں پرائی ہوں۔"

"میں تمہیں بیوی سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ ایسا کیوں سوچتی ہو؟"

"تو پھر میں بیوی کی طرح لڑ جھگڑ کر میاں کے بریف کیس سے ساری رقم لے لوں گی۔"

"بھئی وہ رقم ہماری ہے۔ ہم دونوں کے پاس رہے گی۔"

"دونوں کے پاس رہنے کا مطلب یہ ہوا ففٹی ففٹی؟"

"نہیں' نہیں تمہیں بیس فیصد ملے گا اور میں اسی فیصد لوں گا۔"

وہ ایکدم سے اٹھ کر بیٹھ گئی پھر بولی۔ "یعنی جو تین لاکھ ابھی ملے ہیں' ان میں سے صرف ساٹھ ہزار مجھے ملیں گے اور تم دو لاکھ چالیس ہزار لو گے؟"

"ہاں' میں نے نمائش میں اور پبلسٹی میں پونے دو لاکھ روپے خرچ کئے ہیں۔"

"کیوں بے پر کی ہانک رہے ہو۔ کیا پبلسٹی میں پونے دو لاکھ خرچ ہو سکتے ہیں؟"

"لاکھوں کیا کروڑوں بھی خرچ ہوتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے ٹی وی کے ذریعے پبلسٹی کتنی مہنگی پڑتی ہے مگر اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلتا ہے بلکہ توقع سے زیادہ منافع ملتا ہے۔ جیسا کہ ہمیں مل رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم اپنے پونے دو لاکھ روپے رکھ لو اس کے بعد ففٹی ففٹی کی پارٹنر شپ رہے گی۔"

"امبر! جو بڑی رقم لگا کر کاروبار شروع کرتا ہے' وہی کاروبار کا مالک اور بڑا پارٹنر ہوتا ہے۔ اگر میں رقم نہ لگاتا اور یہ نمائش آرگنائز نہ کرتا پھر سوچو' تم کہاں ہوتیں؟"

"میں اے ساگر کو دریافت نہ کرتی اور تمہیں منافع حاصل کرنے کی توقع نہ ہوتی تو تم رقم کبھی نہ لگاتے۔ تم نے مجھ پر احسان نہیں کیا ہے۔ اس کاروبار میں' میں نے تم سے کم محنت نہیں کی ہے۔ یہ لاکھوں روپے صرف تصویروں کی ہی نہیں' میری بھی نمائش کے ذریعے حاصل ہو رہے ہیں۔"

"تم فضول جھگڑا کر رہی ہو۔ میں تمہاری بہتری کے لئے تمہیں بیس فیصد دے رہا ہوں تاکہ تم عیش و عشرت سے رہو۔ باقی اسی فیصد بھی تمہارے ہی ہوں گے لیکن میرے پاس رہا کریں گے۔ میں تمہارے لئے کوٹھی اور کار وغیرہ خریدوں گا۔"

"اگر ہمارا نکاح نامہ ہوتا تو تم میرے مجازی خدا ہوتے پھر تم کاغذ پر لکھ کر دیتے کہ تمہاری ساری کمائی میری ہے اور اس کی دوسری حقدار نہیں آئے گی تو میں بھروسا کر لیتی۔ ابھی ہمارے درمیان اعتماد کا کون سا رشتہ ہے۔"

"میں کاغذ لکھ دوں گا کہ میرے تمام بینک بیلنس کی حقدار تم ہو۔"

"یہ کس رشتے سے لکھ دو گے؟ میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ تمہارا وہ باپ کلیم ٹھیکیدار کہاں ہے؟ اس کے علاوہ اور تمہارے کتنے رشتے دار ہیں' جو بعد میں قانونی طور پر حقدار کہلائیں گے۔ تمہارے لکھے ہوئے کاغذ کو قانون تسلیم نہیں کرے گا۔"

"تم تو گھوم پھر کر شادی کی بات پر آ جاتی ہو۔ ٹھیک ہے' صبح فیصلہ کریں گے ابھی تو رنگ میں بھنگ نہ ڈالو۔"

اس نے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ وہ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بولی۔ "خبردار مجھے ہاتھ نہ لگانا۔" وہ پلنگ سے اتر کر فرش پر کھڑی ہو گئی۔ پھر بولی۔ "چلو اٹھو میرے بستر سے' نکلو میرے کمرے سے اور بریف کیس سے ڈیڑھ لاکھ لا کر دو۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "ہوش میں رہو۔ تم پیسوں کی خاطر میری توہین کر رہی ہو۔ کیا تمہیں صرف دولت سے پیار ہے' مجھ سے نہیں ہے؟"

"میں نے اپنا تن من دے کر محبت کا ثبوت دیا ہے۔ تم نے کیا ثبوت دیا ہے؟ یہ لاکھوں کا کاروبار شروع کر کے ہاتھی کے دانت مجھے دکھا رہے ہو اور اصل منافع خود کھا رہے ہو؟"

"دیکھو امبر! اگر تم یہی روپیہ رکھو گی تو دوسری نمائش نہیں ہو سکے گی۔"

"تم ہوتے کون ہو دوسری نمائش لگانے والے؟ تصاویر میری' آرٹسٹ میرا' دیکھنے

والے مجھے دیکھنے آتے ہیں' رقم لٹانے والے مجھ پر رقم لٹا رہے ہیں۔ اگر تم پونے دو لاکھ روپے کے بعد منافع وصول کرو گے تو میرے دلال کہلاؤ گے اور دلال کو حصہ نہیں دیا جاتا۔ تھوڑا سا کمیشن دیا جاتا ہے۔ میرا احسان مانو کہ میں نصف حصہ دے رہی ہوں۔ جاؤ اور سیدھی طرح ڈیڑھ لاکھ لے آؤ۔ ورنہ ...."

"ورنہ کیا کرلو گی؟"

"اخبارات کے ذریعے بیان دوں گی کہ تم مصور اے ساگر کی تمام رقم ہڑپ کرنے والے ہو اور میں قانونی کارروائی کر کے اس غریب مصور کو اس کا پورا حق دلانے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

وہ بستر سے اترا اور سر جھکا کر اس کے کمرے سے جانے لگا۔ بعض لوگوں کے جھکے ہوئے سر کا مطلب شکست خوردگی نہیں ہوتا' بلکہ مصلحت اندیشی ہوتی ہے۔ شہزادے کے پاس اس کی قابلِ اعتراض تصویریں تھیں۔ ڈائری کا ایک ایسا کاغذ تھا جو اس کی دوشیزگی اور جھوٹی پارسائی کا بھانڈا پھوڑتا تھا۔

وہ پل بھر میں خود سری کے غبارے سے ہوا نکال سکتا تھا۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی۔ ساگر نے اسے ایک خیالی اور اچھوتی دوشیزہ بنا کر شہرت دی تھی۔ شہزادہ اسے گنہگار ثابت کر کے ساری شہرت کو خاک میں ملا سکتا تھا۔ وہ شادی کی ضد کر رہی تھی' کوئی اس بے حیا کو شریکِ حیات بنانا گوارا نہ کرتا کیوں کہ حسن کی پوجا گھر کی چار دیواری سے باہر ہوتی ہے۔

لیکن شہزادے کی بھی کچھ کمزوریاں تھیں۔ وہ امبر کے بیانات کے حوالے سے اخبارات کے ذریعے بدنام نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ایسے کئی اخبارات فرزانہ کی کوٹھی اور فیکٹری میں پہنچتے رہتے تھے۔ ایسے میں امبر کا کچھ نہ جاتا۔ فرزانہ اپنے ساتھ ہونے والے فراڈ کے جرم میں اسے جیل پہنچا دیتی۔

یہ واضح ہو چکا تھا کہ امبر آئندہ خود ہی کوئی آرگنائزر تنخواہ پر رکھ کر تصاویر کی نمائش جاری رکھے گی۔ شہزادے سے یہ حق چھین لے گی لیکن موجودہ نمائش کے اختتام تک وہ کوئی جھگڑا یا بدنامی نہیں چاہے گی۔ مصلحت اندیشی یہی تھی کہ وہ صبر کرے اور جو منافع ملے' اسے وصول کر لے۔ ایک اندازے کے مطابق چالیس لاکھ کا منافع ہونے والا تھا۔ جس کی وہ آدھی رقم حاصل کر سکتا تھا۔

وہ بریف کیس سے ڈیڑھ لاکھ روپے نکال کر' اس کے کمرے میں آیا۔ اسے رقم پیش کرتے ہوئے بولا۔ "میری جان! غصہ تھوک دو۔ کبھی کبھی جھگڑا ہوتا رہے تو محبت

بڑھتی رہتی ہے۔"

وہ رقم لے کر گن رہی تھی اور اس کی باتیں سن رہی تھی پھر بولی۔ "اس جھگڑے کے بعد تمہاری محبت کتنی بڑھ گئی ہے؟ کیا اتنی بڑھ گئی ہے کہ مجھ سے شادی کر سکو گے؟"

"ہاں' ٹھیک ہے۔ ہو جائے گی۔ لاہور پہنچ کر شادی کی تاریخ مقرر کر لیں گے۔"

"وہاں پہنچ کر ایک ہفتے کے اندر شادی ہو گی اور جب تک نہیں ہو گی' ہم ایک دوسرے کے لئے نامحرم رہیں گے۔"

"یہ کیا فضول باتیں کر رہی ہو؟ ہمارے درمیان کوئی پردہ نہیں رہا ہے۔ یہ محرم اور نامحرم ...."

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "میں شادی سے پہلے تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گی۔ جاؤ یہاں سے۔"

اس نے سمجھانے منانے کی کوشش کی لیکن وہ دروازے کے پاس جا کر اسے کھول کر بولی۔ "بحث نہ کرو۔ چلے جاؤ۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

وہ کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے سوچا تھا' جب تک ہوٹل میں قیام ہے' عیش کر لے پھر کون احمق اس سے شادی کرے گا۔ وہ فرزانہ کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

امبر دروازہ اندر سے لاک کر کے بستر پر آ گئی۔ اس کے دل کو زبردست صدمہ پہنچا تھا۔ آئیڈیل شہزادے نے لالچ' خود غرضی اور کاروباری ذہنیت کا مظاہرہ کر کے دل توڑ دیا تھا۔

اس نے پچھلی رات مسرتوں کے ہجوم میں ڈائری لکھی تھی۔ آج وہ زخم کھا کر لکھنے بیٹھی۔ ڈائری کھول کر سوچا کہ پچھلی رات کا صفحہ نوچ کر پھینک دے مگر وہ ورق پہلے ہی غائب تھا۔ اس کے نوچنے سے پہلے ہی وہ نوچ لیا گیا تھا۔

اس نے حیرت سے اور غور سے دیکھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ کوئی ورق پھاڑ کر لے گیا ہے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایسا کون کر سکتا ہے؟ وہی کر سکتا ہے' جو کمرے میں آتا ہے اور شہزادہ ہی آتا ہے۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے سے نکل کر اس کے دروازے تک پہنچی۔ کال بیل کے بٹن کو دبایا۔ ذرا انتظار کیا پھر بیل کو دبایا۔ آخر دروازہ کھل گیا۔ وہ امبر کو دیکھ کر مسکرایا پھر بولا۔ "میں جانتا تھا' میرے بغیر نہیں رہ سکو گی۔"

وہ اندر آ کر بولی۔ "میری ڈائری کا وہ ورق کہاں ہے؟"

وہ حیرانی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ "کون سی ڈائری! کون سا ورق؟"

"اب میں تمہاری مکاریوں کو خوب سمجھنے لگی ہوں۔ وہ ورق تم نے میری ڈائری سے نکالا ہے۔ انکار نہ کرو۔ مجھ سے بلیک میلنگ کا کھیل نہ کھیلو۔ اوہ خدایا! میں جذبات میں کیسی اندھی ہو گئی تھی۔ انکار کرنے کے باوجود تمہارے ساتھ تصویریں اتراوتی رہی۔ کہاں ہیں وہ تصویریں؟"

"جب تمہاری آنکھ کھل ہی چکی ہے تو سنو' میں نے ان تصویروں کو اور تمہارے گناہ نامے کو بڑی حفاظت سے رکھا ہے۔ میری عقل نے مجھے سمجھایا تھا کہ ان تین دنوں میں تمہارے لاکھوں چاہنے والے پیدا ہو گئے ہیں۔ ایسے میں کسی وقت بھی تمہارے تیور بدل سکتے ہیں اور دیکھ لو کہ تمہارے تیور کیسے بدلے ہیں۔"

"میں کاروبار میں تمہاری بے ایمانی کے باعث بدظن ہوئی ہوں۔"

"ہاں' میری عقل نے یہ بھی سمجھایا کہ آرٹسٹ تمہارا دیوانہ ہے اور وہ تصاویر خریدنے والے بھی تمہارے دیوانے ہیں۔ اس کاروبار میں میری حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے لہٰذا مجھے اہمیت اور برابر کی حیثیت کو منوانے کا کوئی کھیل کھیلنا چاہئے۔ ہم دونوں خوب ملے ہیں۔ چالاکی' جھوٹ اور دغابازی میں دونوں کا دماغ خوب کام کرتا ہے۔ دیکھ لو کہ میں نے کیسے تمہاری دکھتی ہوئی رگ پکڑی ہے۔"

"اگر میری تحریر اور میرے فوٹو گراف سے مجھے بدنام کرنا چاہو گے تو تمہاری بھی بدنامی ہو گی۔ ان تصویروں میں تم بھی میرے ساتھ ہو۔"

"ایسا نہیں ہو گا کہ میں بھی بدنام ہو جاؤں اور تمہیں بھی بدنام کروں۔ میں نے وہ چیزیں اس لئے سنبھال کر رکھی ہیں کہ تم مجھے کاروبار سے نکال باہر نہ کرو۔ مجھے کاروبار میں حصے دار نہ بناؤ گی تو میں تصویروں والی خیالی دوشیزہ کے لئے دعویٰ کروں گا کہ وہ پارسا نہیں ہے۔ میری داشتہ ہے۔ تم کسی سے شادی کرنا چاہو گی تو وہ شرمناک تصویریں تمہارے دلہا کے پاس پہنچ جائیں گی۔ جب میں بہت مجبور ہو جاؤں گا تو تمہارے ساتھ بدنام ہونے کے لئے قدم اٹھاؤں گا۔ بہتر ہے عقل سے کام لو۔ سدا کنواری اور لاحاصل کہلاتی رہو۔ اسی میں ہماری چاندی ہے۔"

وہ بڑی نفرت سے بولی۔ "تم بہت کمینے نکلے شہزادے! میں اگرچہ بری طرح پھنس گئی ہوں تاہم یہ بات باعثِ اطمینان ہے کہ تمہارے ہاتھوں میں میری جو کمزوری ہے' وہی تمہاری بھی کمزوری ہے۔ ہم ڈوبیں گے تو ایک ساتھ اور کنارے لگیں گے تو ایک ساتھ۔"

"تو پھر کیا خیال ہے۔ میرے کمرے میں رہ جاؤ۔"

"ہرگز نہیں۔ مجھے تمہارے وجود سے گھن آرہی ہے۔ میں صرف ماننے والی باتیں مانوں گی۔ تمہیں اس کاروبار سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر نہیں پھینکوں گی۔ تم ففٹی پرسنٹ کے پارٹنر رہو گے۔"

وہ اسے نفرت سے دیکھتی ہوئی اس کے کمرے میں سے نکل آئی۔ اپنے کمرے میں آکر دروازہ بند کرنے کے بعد وہیں کھڑی رہی۔ یہ سوچ سوچ کر دماغ پھٹ رہا تھا کہ اس نے محبت سے خود کو اس کے سپرد کیا تھا اور وہ کاروبار میں حصے دار بن کر رہنے کے لئے اس کی بے آبروئی کو مئوثر ہتھیار بنا رہا تھا۔ اس بات پر غصہ آرہا تھا کہ عزت کا سرمایہ بھی لوٹا اور پچاس فیصد کا پارٹنر بھی بن رہا تھا۔

وہ کمرے میں آکر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ بیٹھنے اور لیٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اندر کی بے چینی کہہ رہی تھی' شہزادہ مرجائے تب ہی چین آئے گا۔ اور شہزادہ مرنے والا نہیں تھا کیونکہ کسی کے کوسنے یا بددعا دینے سے بدمعاش کبھی نہیں مرتے۔

کافی دیر بعد عقل آئی کہ غصہ کرنے سے اپنے ہی اندر ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ اپنا ہی نقصان ہوتا ہے جب تک اندر سے غصہ کم نہیں ہوگا' سکون نہیں ملے گا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی پشت سے ٹیک لگا کر شہزادے کو دماغ سے نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔ ادھر سے دھیان ہٹانے کے لئے ساگر کو یاد کیا۔ اس کی سادگی نے' اس کی باتوں نے اور اس کی بے لوث محبت نے ایسے وقت بڑا سہارا دیا۔ وہ تو اسے سوچتے سوچتے ذرا سی دیر میں شہزادے کو بھول گئی۔

اس نے ساگر سے دوسری ملاقات میں پوچھا۔ "اگر میں تمہیں صلہ دینا چاہوں تو؟"

ساگر نے جواب دیا تھا۔ "ایسا صلہ نہ دینا' جس سے کسی کو خریدا جاتا ہے یا ممنون احسان کیا جاتا ہے۔"

اس نے یہ باتیں یاد کرکے سوچا۔ آہ! شہزادے نے کتنا برا صلہ دیا ہے۔ میں کسی کے سامنے یہ دکھڑا رو بھی نہیں سکتی۔ کیا ایسے معاملے میں عورت ہی روتی ہے؟ مرد کا کچھ بگڑتا کیوں نہیں ہے؟

یہ فرسودہ سی بات ہے کہ مرد شہ زور ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بازی پلٹ جائے' مقدر مہربان ہو جائے تو عورت شہ زوری بن جاتی ہے۔ جیسے فرزانہ اسی شہزادے پر غالب تھی' جو امبر کی کمزوری سے کھیل رہا تھا۔ اگر امبر کو معلوم ہو جاتا کہ اس فریبی نے ایک دولت مند بوڑھی سے شادی کی ہے اور وہ بوڑھی اسے لات مار دے تو وہ دو کوڑی کا نہ

رہے تو یہ معلومات حاصل ہونے کے بعد وہ شہزادے سے پوچھتی' بولو! میری تصویریں اور ڈائری کا ورق واپس دیتے ہو یا فرزانہ کے پاس جا کر تمہیں فٹ پاتھ پر پہنچا دوں؟ وہ بے چاری نہیں جانتی تھی۔ اس لئے زخم کھا رہی تھی۔

نمائش مقررہ دنوں تک جاری رہ کر اختتام کو پہنچی۔ امبر کے حصے میں اٹھارہ لاکھ روپے آئے۔ اتنی دولت پاکر اسے خوشی تو ہوئی مگر وہ دلی مسرتیں نہیں ملیں' جو شہزادے کی محبت کے ساتھ ساتھ مل سکتی تھیں۔ اس نے پہلی بار کھلے ہاتھوں سے شاپنگ کی۔ پہلی بار ہوائی جہاز میں سفر کیا اور لاہور پہنچی۔ اب اس کے اندر سے یہ ڈر نکل گیا تھا کہ باپ کیا کہے گا؟ اس نے تو پھوپی کو صورت بھی نہیں دکھائی تھی۔ اتنی دور کراچی جا کر جھوٹے منہ خیریت بھی نہیں پوچھی تھی۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ ابا کے کسی سوال کا جواب دینے سے پہلے وہ تمام اخبارات اور رنگین رسائل اس کے سامنے رکھ دے گی۔ وہ بیٹی کی تصویریں دیکھ کر اور جلی حروف میں اس کی تعریفیں پڑھ کر بہت کچھ سمجھ جائے گا۔ باقی وہ فیصلہ کن انداز میں کہہ دے گی کہ وہ چار دیواری سے باہر' پاکستان سے باہر بہت دور دور تک پرواز کرنے جا رہی ہے۔ اس معاملے میں کوئی پابندی برداشت نہیں کرے گی۔ اگر ابا بدنامی سے ڈرتا ہے تو وہ گلبرگ کی اونچی سوسائٹی میں جا کر رہے گی' جہاں کوئی کسی کی جوان بیٹیوں اور بہنوں پر کیچڑ نہیں اچھالتا۔ دولت مند طبقے میں یہی ایک اچھی بات ہے کہ ادھر بدنامی نہیں پھٹکتی۔

مگر وہاں باپ تک پہنچنے سے پہلے بہت کچھ ہو چکا تھا۔ چار روز پہلے اس کی پھوپی کراچی سے آگئی تھی۔ اپنے بھائی یعنی' امبر کے ابا کے پاس پہنچ کر بولی۔ "امبر کہاں ہے؟"

"وہ تو تیری تیمارداری کے لئے کراچی گئی تھی۔ تُو نے لکھا کہ تو بہت بیمار ہے۔"

"بیمار ہوں میرے دشمن۔ وہ لڑکی ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ تُو جانتا ہے' ذکیہ کی ماں مجھ سے خدا واسطے کا بیر رکھتی ہے۔ ہم نے برسوں سے ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھی۔ برسوں بعد ذکیہ میرے گھر آئی تھی اس سے پتا چلا کہ تیری بیٹی کیا کھیل کھیل رہی ہے' یہ دیکھو۔"

بہن نے اپنی اٹیچی سے ایک رسالہ اور دو اخبار نکال کر بھائی کے سامنے پھینک دیے۔ پوری رفتار سے چلنے والے پنکھے کے نیچے رسالے کے اوراق پھڑپھڑائے اور امبر کی تصاویر کی جھلکیاں پیش کرنے لگے۔ اخبارات کے رنگین صفحات کمرے کی محدود فضا میں اُڑتے ہوئے بیٹی کی بے حیا اڑان کا اشارہ دینے لگے۔

وہ تصویریں گونگی تھیں مگر بہن کی زبان بول رہی تھی۔ "بھائی! میں نے بھائی کے

مرنے کے بعد کہا تھا کہ دوسری شادی کر لے۔ امبر کی ماں سوتیلی ہو گی مگر تیرے پیچھے اس کی نگرانی کرے گی لیکن تُو نے بیٹی کی محبت میں شادی نہیں کی۔ صبح سے شام تک نوکری پر جاتا رہا اور اسے باہر دیدے مٹکانے کی آزادی دے دی۔"

وہ دیدے پھیلائے خلا میں تک رہا تھا۔ اس کے پاس بولنے کے لئے کچھ نہیں رہا تھا۔ بیٹی پر اعتماد کر کے ایک غریب کا سارا غرور ہار گیا تھا۔ بہن نے پوچھا۔ "اب خاموش کیوں ہے' بول اب تیری بیٹی سے کون شادی کرے گا۔ خدا کا شکر ہے اس نے میری بہو بننے سے پہلے اس کی اصلیت دکھا دی۔ میرا بیٹا بال بال بچ گیا۔ تجھے میری باتیں زہر لگ رہی ہوں گی لیکن تیری بیٹی کو ذرہ برابر افسوس نہیں ہو گا۔ وہ جن آسمانوں پر اُڑ رہی ہے' وہاں لڑکیاں شادی نہیں کرتیں' عیش کرتی ہیں اور دولت و شہرت کے نشے میں باپ کی اور پورے خاندان کی نیک نامی پر تھوکتی رہتی ہیں۔"

وہ بڑی دیر تک بولتی رہی۔ بھائی کو طعنے دیتی رہی پھر خود ہی رونے لگی۔ بھائی تب بھی خاموش رہا۔ اس نے بہن کے آنسو نہیں پونچھے۔ بوڑھے باپ کے ہاتھوں سے آنسو پونچھنے والا شرم کا رومال چھوٹ کر کہیں چلا گیا تھا۔

یہ شرم کیا ہے؟

بے شرمی کے منہ پر طمانچہ مارنے کے لئے شرم پیدا ہوئی۔ مگر پیدا ہوتے ہی بے شرمی کے طمانچے کھانے لگی۔

اس کے باوجود تہذیب کی یہ شرط ہے کہ انسان شرم کے رومال سے بے شرمی کی غلاظت پونچھے گا' تب مہذب کہلائے گا۔"

شرم کو سب سے اہم اور سب سے ضروری قرار دینے کے لئے دنیا کے ہر ذی روح کو بے شرمی کے عمل سے وجود میں لایا گیا تاکہ مرد اپنی ماں' بہنوں اور بیٹیوں سے شرمائے اور عورت اپنے باپ' بھائیوں اور بیٹوں کی شرم رکھے۔

عورت اگر استعارے میں گندم ہے اور علامت میں شجرِ ممنوعہ ہے تو تہذیب کے کلام میں شرم نقطۂ آغاز ہے۔

جس طرح کلام پاک سے بدبخت کو ہدایت نہیں ملتی' اسی طرح کم ظرف کو شرم نہیں ملتی۔ شرم وہ وحی ہے' جو صرف حساس دلوں پر اترتی ہے۔

یہ وحی بوڑھے باپ کے دل پر اتری اور اس کا دم نکل گیا۔

جب امبر وہاں پہنچی تو سوم کے چنے پڑھے جا رہے تھے۔ پھوپی نے ایک بند لفافہ اسے دیتے ہوئے کہا۔ "بھائی نے آنکھ بند ہونے سے پہلے یہ لکھا ہو گا۔ ہمیں اس کے

سرہانے سے ملا تھا۔"

امبر نے اسے کھول کر آنسو بھری آنکھوں سے پڑھا۔ لفافے کے اوپر لکھا تھا۔ "یہ صرف اس کے لئے ہے' اسے اور کوئی نہ کھولے۔"

وہ لفافے کو سینے سے لگا کر رونے لگی۔ پھر اس نے اپنے کمرے میں جا کر اسے چوما اور کھولا پھر اس کے اندر سے تہہ کئے کاغذ کو نکالا۔ پتا نہیں اس کاغذ کی وہ آخری تحریر کیا ہو گی۔ ایک مرنے والے نے اسے بڑے جذبوں سے لکھا ہو گا۔

اس نے تہہ کھول کر دیکھا۔ وہ کاغذ سادہ تھا۔ اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ہر پہلو سے وہ اجلا اور بے داغ تھا۔ اس پر قلم کا ایک نقطہ بھی نہیں تھا۔ اس نے پھوپی کے پاس آ کر پوچھا۔ "کیا آپ نے اسے کھولا تھا؟"

"نہیں۔ میرے بھائی نے لکھا تھا' اسے کوئی نہ کھولے۔ یہ مرحوم کا حکم تھا یا خواہش تھی۔ میں نے اسے کھول کر نہیں پڑھا ہے۔"

"پھوپی جان! اس میں پڑھنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"خبردار! مجھے پھوپی جان نہ کہنا۔ میں نے سامان باندھ لیا ہے۔ جا رہی ہوں' ہمارا اب تجھ سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔"

وہ پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس سادے کاغذ کو دیکھنے لگی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ باپ نے کچھ لکھا کیوں نہیں؟ صرف لفافے پر لکھا تھا کہ اس کے لئے ہے۔ نام نہیں لکھا تھا کہ کس کے لئے ہے؟ مگر پھوپی نے بھی سمجھ لیا کہ باپ کا اشارہ بیٹی کی طرف ہے۔ جب بزرگ ناراض ہوتے ہیں تو ناراضی ظاہر کرنے کے لئے اس کا نام نہ لیتے ہیں' نہ لکھتے ہیں' اشارے سے مطلوب کو واضح کر دیتے ہیں۔

شاید کسی نے آج تک کسی کو سادہ کاغذ نہیں بھیجا ہو گا۔ کاغذ کا وجود اس لئے ہے کہ اس پر دعا لکھی جائے۔ کوئی کم ظرف ہو تو اس پر گالی بھی لکھ دے۔ مگر کچھ تو لکھ دے کہ کاغذ لکھنے کے لئے ہوتا ہے۔

باپ نے نہیں لکھا' شاید بیٹی کا نام لکھتے وقت اسے شرم آ رہی تھی۔

شاید باپ......... دل سے بیٹی کو بددعا نہ لکھ سکتا تھا۔

نصیحت بھی نہیں لکھ سکتا تھا۔ ایسی کوئی نصیحت لکھنے کا وقت گزر چکا تھا۔

وہ دھواں دار الفاظ بھی نہیں لکھ سکتا تھا' جو اس کے اندر بھرے ہوئے تھے اور جو کاغذ پر آنے سے پہلے اس کا دم نکال رہے تھے۔

پھر بھی اس نے سادہ کاغذ یونہی نہیں چھوڑا تھا۔ اسے ضمیر کی آنکھ پڑھ سکتی تھی۔

کاغذ صرف پڑھنے کے لئے نہیں ہوتا' سمجھنے کے لئے بھی ہوتا ہے

اور باپ کا ارسال کردہ کاغذ پڑھنے کے لئے نہیں' سمجھنے کے لئے تھا۔ وہاں ایک نادیدہ تحریر تھی کہ بیٹی! جب تُو پیدا ہوئی تو ایسی ہی سادی اور بے داغ تھی۔

یا پھر اس پر لکھا تھا۔

کیا داغ داغ کرتے ہو؟
میں داغ دار ہوں' تم داغ دار ہو۔
بے داغ گر ہے تو وہ پروردگار ہے۔

مرحبا اے کاغذ! تُو تحریر سے خالی اور سادہ رہے' تب بھی ہمارے معبود کی پاکیزگی بیان کرتا ہے۔

☆==========☆==========☆

شہزادہ لاہور پہنچ کر گامے شاہ کے اس مکان میں آیا' جہاں اس نے تین دوستوں کے ساتھ کچھ عرصہ قیام کیا تھا۔ ان میں سے ایک راز دار دوست نواز تھا۔ اس نے نواز کو ایک چھوٹا سا بریف کیس دیتے ہوئے کہا۔ "یہ میری امانت ہے اپنے پاس رکھو۔ میں بعد میں آکر لے جاؤں گا۔"

اس نے دوست کو خوش کرنے کے لئے اسے دو شرٹس اور شیونگ کا سامان پیش کیا' کہا۔ "یاد ہے نواز! تم لوگ مجھے طعنے دیتے تھے کہ شہزادوں کی طرح سوچتا ہوں اور کوئی چھوٹی موٹی نوکری نہیں کرنا چاہتا۔ افسری بھی مجھے نہیں ملے گی۔ دیکھو آج میں افسروں سے بھی بڑا ہوں۔"

"ہاں بھئی' تیری تو ٹور ہی نرالی ہوگئی۔ آخر تُو کرتا کیا ہے؟"

ایک اور دوست نے کہا۔ "میں نے ایک بار تجھے کسی خاتون کے ساتھ کار میں دیکھا تھا۔"

"وہ میری دولت مند بیوی ہے۔ جس کار میں تم نے دیکھا' وہ کار بھی میری تھی۔ ابھی اچانک کراچی سے آیا ہوں۔ اس لئے اپنی کار ائرپورٹ پر نہ منگوا سکا۔ ٹیکسی میں آیا ہوں۔"

سب اسے دولت مند بیوی حاصل کرنے کی مبارک باد دینے لگے' وہ اٹھ کر بولا "میں جلدی میں ہوں۔ پھر اطمینان سے باتیں کروں گا۔ خدا حافظ۔"

وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر کوٹھی میں آیا۔ اس کے باپ کلیم یزدانی نے پوچھا۔ "تُو کہاں گیا

تھا؟"

"تُو ایسے کیوں پوچھ رہا ہے؟ کیا میں تیرا پابند ہوں؟"

"رشتہ بھول جانے یا اسے نہ نبھانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ میں آج بھی تیرا باپ ہوں اور تُو میرا بیٹا ہے تجھے میرا ادب کرنا چاہئے۔"

"ابا! آہستہ بول۔ اگر ماں بیٹی میں سے کسی نے سن لیا تو یہ عیش و عشرت کی زندگی خاک میں مل جائے گی۔"

"وہ ماں بیٹی گھر میں نہیں ہیں۔ کہیں گئی ہوئی ہیں۔ یہ تو بتا دے کس چکر میں ہے۔ اتنے دنوں تک کہاں رہا؟"

"میں نے ایک نیا کاروبار شروع کیا ہے۔ لاکھوں روپے کا منافع ہو رہا ہے۔ میں بہت جلد کروڑوں روپے کمالوں گا۔ پھر لاہور چھوڑ کر لندن یا پیرس میں رہوں گا۔"

"بہت اونچا اُڑ رہا ہے' ذرا نیچے آجا۔"

"تُو بوڑھا ہے۔ تھک گیا ہے' اسی کوٹھی میں اپنے آخری دن گزار کر چلا جائے گا۔ لیکن میری عمر نئے جہان دریافت کرنے کی ہے۔ میں جلد ہی بوڑھی بیوی کی زنجیریں توڑ کر چلا جاؤں گا۔"

"جو میں جانتا ہوں' وہ تُو نہیں جانتا۔ ان ماں بیٹی کے ذرائع بہت وسیع ہیں۔ بہت دور تک ان کی پہنچ ہے۔ میں اتنے عرصے میں ان کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہا ہوں۔ میری بیوی ثمینہ مجھ سے پہلے تین شادیاں کر چکی ہے اور تُو اپنی بیوی کا تیسرا شوہر ہے۔ یہ ماں بیٹی جب چاہتی ہیں' اپنے شوہروں کو لات مار کر یہاں سے نکال دیتی ہیں۔"

"اگر ایسا ہے تو میں دانائی سے کام لے رہا ہوں۔ یہاں سے لات کھا کر نکلنے سے پہلے ہی دوسری جگہ میرے قدم جم چکے ہوں گے۔ تُو اپنی خیر منا۔"

"میں نے بھی ہیرا پھیری سے کئی لاکھ جمع کئے ہیں۔ یہاں سے کنگال ہو کر نہیں جاؤں گا۔"

کار کا ہارن سنائی دیا۔ باپ بیٹے نے کھڑکی کے پاس آکر باہر دیکھا۔ ماں بیٹی کار میں آئی تھیں۔ وہ فوراً ہی کھڑکی سے پلٹ کر تیزی سے چلتے ہوئے کمرے سے نکلے۔ راہداری سے گزر کر ڈرائنگ روم میں آئے۔ وہاں سے گزر کر باہر برآمدے میں پہنچے۔ وہ دونوں کار سے اُتر رہی تھیں۔ یہ دونوں اپنی اپنی بیویوں کا استقبال کرتے ہوئے اپنے اپنے انداز میں میاں مٹھو کی بولیاں بولتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے۔ ثمینہ کلیم کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ فرزانہ وہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر بولی۔ "کراچی سے کب

آئے؟"

"بس ابھی چلا آرہا ہوں۔ اوپر کمرے میں چلو۔ میں نے تمہارے لئے اتنی شاپنگ کی ہے کہ دیکھ کر حیران رہ جاؤ گی۔"

"کراچی میں تمہارا کاروبار کیسا رہا؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "تم بھول رہی ہو۔ میں کاروبار کے لئے نہیں' ایک غریب دوست کی پینٹنگز کی نمائش کے لئے گیا تھا۔"

"ہاں' میں نے اخبارات میں تصویریں دیکھی تھیں۔ وہ لڑکی کچھ زیادہ ہی حسین ہے۔"

"ایں؟" وہ ذرا ہچکچایا پھر مسکرا کر بولا۔ "اس اخبار والی کی بات کر رہی ہو۔"

"ہاں' اخبار والی ایسے کہہ رہے ہو' جیسے اسے جانتے ہی نہیں ہو۔"

"میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ آرٹسٹ کی آئیڈیل ہے۔ اس نے مختلف انداز میں اسے پینٹ کیا ہے۔"

"اور کچھ نہیں جانتے؟"

"اور کیا جان سکتا ہوں؟ تم پوچھنا کیا چاہتی ہو؟"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شہزادے نے ریسیور اٹھایا وہ بولی۔ "مجھے دو۔ میرے آدمی کا فون ہے۔"

وہ ریسیور لے کر سننے لگی۔ سننے کے دوران شہزادے کو دیکھتی جا رہی تھی اور "ہوں ہاں" کرتی جا رہی تھی پھر اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ سیدھے یہیں چلے آؤ۔"

وہ ریسیور رکھ کر صوفے سے اٹھ گئی پھر سخت لہجے میں بولی۔ "یہیں بیٹھے رہو۔ میں چینج کر کے آتی ہوں۔"

وہ چلی گئی۔ شہزادے کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ کچھ ہونے والا تھا۔ فرزانہ کے بدلے ہوئے تیور بتا رہے تھے کہ امبر اور اس کے تعلقات کے بارے میں وہ بہت کچھ جان گئی ہے۔

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ ایسے وقت کلیم یزدانی کمرے میں آیا پھر بولا۔ "تیری بیوی بہت نک چڑھی ہے۔ ہمیشہ غصے میں رہتی ہے۔"

"ابا! میں محسوس کر رہا ہوں کہ معاملہ کچھ بگڑ رہا ہے۔ کیا فرزانہ تجھ سے کچھ کہہ رہی تھی؟"

"میں ثمینہ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے کمرے میں آکر مجھے ڈانٹ کر کہا' اے

ڈرائنگ روم میں جاؤ۔ میں اپنی بیٹی سے ضروری باتیں کروں گی۔ میں نے پوچھا کیا داماد سے اس طرح بولا جاتا ہے؟ یہ سنتے ہی اس نے میرے منہ پر طمانچہ مار دیا۔ اگر ثمینہ میرا ساتھ دیتی تو میں طمانچے کا جواب طمانچے سے دیتا لیکن وہ ماں کی طرف سے بولی کہ جب ممی کہہ رہی ہیں' ڈرائنگ روم میں جاؤ تو پھر جاؤ۔ میں یہاں آگیا ہوں' مگر غصے کی آگ میں جل رہا ہوں۔"

"ابا! تو کیسا مرد ہے' تو نے ایک عورت کا تھپڑ کھا لیا؟"

"میں نے ساس کا عذاب سمجھ کر سہہ لیا اور تو کیسا بیٹا ہے کہ باپ کی توہین برداشت کر رہا ہے۔"

"بیٹا تو اسی وقت مر گیا تھا جب یہاں چپ چاپ شادی کرنے آیا تھا۔ یہاں تو میں تیرا سسر ہوں۔ تیری ساس نے ایک گال پر مارا ہے' دوسرے گال پر سسر کا حق ہو گیا ہے۔ اگر فرزانہ حکم دے گی کہ داماد کی پٹائی کرو تو بتاؤ' میں انکار کیسے کروں گا۔ کیا ہم ماں بیٹی کے کسی حکم سے کبھی انکار کر سکتے ہیں؟"

فرزانہ نے ڈرائنگ روم میں آکر کہا۔ "ہاں' تمہارے جیسا فرماں بردار شوہر بیوی کا حکم نہیں ٹالتا ہے۔ میں حکم دیتی ہوں' ان کی پٹائی کرو۔"

باپ بیٹے نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر بیٹے نے عاجزی سے کہا "رہنے دو فرزانہ! اس نے کوئی غلطی کی ہے تو اسے معاف کر دو۔"

وہ غصے سے بولی۔ "اس کی سفارش نہ کرو۔ میرے حکم کی تعمیل کرو۔" وہ باپ بیٹے دولت کے حصول کے لئے کمینے بن چکے تھے۔ پھر بھی ہر کمینے کے اندر تھوڑا سا آدمی زندہ رہتا ہے۔ مذہب اور تہذیب کے حوالے سے تھوڑی سی شرم و حیا کی رمق رہتی ہے۔ وہ بڑی سے بڑی ذلالت کر سکتا تھا مگر باپ پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس نے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ سر جھکا لیا۔

ماں نے بیٹی کو ذو معنی مسکراہٹ سے دیکھا پھر کہا۔ "کوئی بات نہیں شہزادے! تم کلیم کو نہیں مارو گے لیکن کلیم تمہاری پٹائی کر سکتا ہے۔ ثمینہ! تم کلیم کو حکم دو۔"

ثمینہ نے پوچھا۔ "کلیم! تم نے ممی کا حکم نہیں سنا۔ ماں کا حکم بیٹی کا حکم ہے۔ چلو اس کی پٹائی کرو۔"

کلیم نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہاری ممی کا سہاگ ہے۔ تمہارے ڈیڈی ہیں۔ یہ تم کیسا حکم دے رہی ہو؟"

"میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔ جو کہہ رہی ہوں' وہ کرو۔"

باپ بیٹے نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ بیٹے کی آنکھوں نے کہا۔ "ابا! مجھے مار۔ تُو بچپن میں بھی مارتا تھا' باپ کا حق ہوتا ہے' وہ بیٹے کو بڑھاپے میں بھی تھپڑ مار سکتا ہے۔"

باپ نے ہلکے ہاتھوں سے بیٹے کے سر پر مارا' بازو پر مارا پھر پیٹھ پر بھی مارا۔ فرزانہ نے کہا۔ "شہزادے! یہ رشتے میں چھوٹا ہو کر تمہیں مار رہا ہے۔ ہلکے ہاتھوں سے ہی سہی' تم بھی اسے آہستگی سے مارو۔ داماد تم پر ہاتھ اٹھا کر گستاخی کر رہا ہے۔"

دونوں باپ بیٹے چونک کر اسے دیکھنے لگے وہ بولی۔ "تم لوگ یہ سمجھتے رہے کہ یہ بات تمام عمر چھپا کر اپنا اُلو سیدھا کرتے رہو گے۔ میں نے ذرا سی بے پروائی کی۔ تم دونوں کے بارے میں زیادہ چھان بین نہیں کی۔ دونوں سے کاغذات لکھوا کر مطمئن ہو گئی۔ اتنی عمر گزار کر تجربہ ہوا کہ کاغذ پر سب کچھ لکھوانے کے بعد بھی بہت کچھ سمجھنے کے لئے رہ جاتا ہے۔"

شہزادے نے کہا۔ "میں نے کلیم پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اس سے تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ہم باپ بیٹے نہیں ہیں۔"

وہ چیخ کر بولی۔ "اگر نہیں ہو تو اس کے منہ پر تھوکو۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ بیٹا کیسے باپ کے منہ پر تھوکتا ہے۔ تم دونوں نے ہم ماں بیٹی کو جس ذہنی اذیت میں مبتلا کیا ہے اس کی ایسی سزا ملے گی کہ باپ بیٹے کو پکارتا رہے گا اور بیٹا باپ کو آوازیں دیتا رہے گا پھر بھی کوئی کسی کو سزا سے نجات نہیں دلا سکے گا۔"

شہزادے نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "ابا! کھیل تمام ہو چکا ہے۔ یہاں سے چلو۔"

وہ دونوں اپنی اپنی شریکِ حیات سے منہ پھیر کر جانے لگے۔ یہ بے حیائی' بے غیرتی اور مال و زر کے لالچ کا کھیل ایسا تو نہیں تھا کہ آسانی سے ختم ہو جاتا؟ انہوں نے آسان سمجھا تھا اس لئے آسانی سے جا رہے تھے لیکن باہر پہنچتے ہی ٹھٹک گئے۔ ایک پولیس افسر اور چھ سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ افسر نے کہا۔ "واپس جاؤ۔"

انہیں یہ یاد آ گیا کہ فرزانہ کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ وہ افسر سے کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکے۔ واپس ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ دونوں ماں بیٹی آرام سے صوفوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ افسر نے اندر آ کر کہا۔ "بیگم صاحبہ! میں بڑے صاحب کے حکم کے مطابق ان دونوں کی تصویریں رحمان پورہ لے گیا تھا۔ جس نے بھی تصویریں دیکھیں' انہیں باپ بیٹا کہا۔ یہ دونوں پکے بدمعاش ہیں۔"

فرزانہ نے کہا۔ "یہ مجھے دھوکہ دے کر کراچی گیا تھا اور وہاں نمائش کی آڑ میں

ایک لڑکی کے ساتھ دن رات شیرٹن میں رہتا تھا۔ اس گدھے کو اتنی عقل نہیں آئی کہ اخبارات میں ایک حسین لڑکی کی تصویریں دیکھ کر مجھے شبہ ہو سکتا ہے اور میں شبے کی تصدیق کرا سکتی ہوں۔"

ثمینہ نے کہا۔ "ممی! وہ دوسری بات ہے۔ مگر آپ کو ان کے باپ بیٹے ہونے کا شبہ کیسے ہوا؟"

"میں نے سوچا نہیں تھا یہ باپ بیٹے ہوں گے۔ میں نے اس ذلیل سے دھوکہ کھانے کے بعد سوچا کہ اس کا ماضی معلوم کرنا چاہئے کہ یہ دھوکے باز آیا کہاں سے ہے؟ میری فرمائش پر بڑے صاحب نے انکوائری کرائی تو بھید کھل گیا۔"

"ممی! مجھے بہت غصہ آ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے' ان پر تھوک دوں۔ کیا تھوکنے سے ان کا کچھ بگڑ جائے گا؟"

"نہیں بیٹی! تھوک ضائع ہو گا۔ ہم جوتے ماریں گے تو ہمارے ہاتھ دُکھیں گے۔ آفیسر! تم ہمارا کلیجہ ٹھنڈا کرو۔"

اس نے سپاہیوں کو بلا کر حکم دیا۔ "مارو ان کتوں کو۔"

ان کی پٹائی شروع ہو گئی۔ دو سپاہی تھکنے لگے تو وہ پیچھے ہٹ گئے۔ دوسرے دو سپاہی آ کر لات' گھونسے اور ڈنڈے مارنے لگے۔ سپاہیوں کو مارنے کا ہنر آتا ہے۔ وہ زخم لگنے اور خون رسنے نہیں دیتے۔ ہڈیوں پر مارتے ہیں' جوڑ جوڑ ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ بیٹے نے باپ سے کبھی ایسی مار نہیں کھائی ہو گی اور باپ نے تقدیر کے ڈنڈے ایسے نہیں کھائے ہوں گے۔

وہ ہاتھ جوڑ رہے تھے' گڑگڑا رہے تھے۔ رحم کی بھیک مانگ رہے تھے۔ پھر ان میں گڑگڑانے کی بھی سکت نہ رہی۔ وہ فرش پر پڑے پڑے کراہنے لگے۔ افسر نے کہا۔ "بس کرو۔ ان کو اپنے پیروں پر چل کر حوالات تک جانے کے قابل رہنے دو۔"

فرزانہ نے کہا۔ "آفیسر! انہیں بتا دو کہ ان کے خلاف کیا کیس بنایا گیا ہے؟"

"کیس یہ ہے کہ آج صبح نو بجے شہزادہ لیبارٹری پر چھاپہ مارا گیا۔ وہاں سے کئی ہزار ایسے انجکشنوں کی شیشیاں برآمد ہوئیں جن میں نشہ آور دوائیں تھیں۔ اس لیبارٹری کا مالک شہزادہ سلیم ایک عرصے سے دواؤں کے نام پر نشے کا زہر پھیلا رہا تھا۔ وہ لیبارٹری میں موجود نہیں تھا۔ پتا چلا کراچی گیا ہے۔ جب معلوم ہوا کہ وہ واپس آ گیا ہے تو ہم نے دوپہر اسے اور اس کے باپ کو گلبرگ کی ایک کوٹھی سے گرفتار کر لیا۔ لیبارٹری میں کام کرنے والوں کی گواہی کے مطابق بیٹے کے ساتھ باپ بھی اس دھندے میں شریک تھا۔"

وہ ان دونوں کو ہتھکڑیاں پہنا کر لے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ثمینہ نے کہا۔

"ممی! ان کمینوں نے ہم سے فراڈ کیا' اس کا رپورٹ میں کہیں ذکر نہیں تھا۔"

"کیا ضرورت ہے بیٹی! وہ تو ایسے ہی لمبی مدت کے لئے جیل جائیں گے۔ ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا' اس کا ذکر ہماری زبان سے نہیں ہونا چاہئے۔ مقدمے کے دوران خود ہی یہ بات سامنے آئے گی کہ باپ بیٹے نے ہم سے کتنا بڑا دھوکہ کیا تھا۔"

ان ماں بیٹی کے بھی غیر قانونی اور غیر اخلاقی اعمال کی فہرست طویل تھی لیکن ان پر کوئی حرف نہیں آرہا تھا۔ دنیا میں ایسے بے شمار مجرم اور گناہ گار ہیں' جو اپنے منطقی انجام تک اس لئے نہیں پہنچتے کہ ان کے پیچھے مضبوط ہاتھ ہوتے ہیں۔ یہ ہاتھ انہیں قانونی گرفت سے اور دوسری آفات سے بچاتے رہتے ہیں۔

معاشرے کے ایسی منفی کردار قسمت کے بھی دھنی ہوتے ہیں۔ ان پر کوئی قدرتی آفت نازل نہیں ہوتی۔ بددعا دینے سے بھی ان پر بجلی ٹوٹ کر نہیں گرتی۔ وہ کسی حادثے میں بھی اپاہج نہیں ہوتے۔ بڑے آرام سے طبعی عمر گزار کر دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

ثمینہ کا پہلا وڈیرا سیاست دان شوہر پچیس لاکھ روپے اس پر نچھاور کرنے کے بعد الیکشن ہار گیا تھا۔ وہ سیاست میں کم اور عشق میں زیادہ رقم ہارا تھا۔ ان ماں بیٹی کو اٹھوا کر کسی ویرانے میں لے جا کر ان کی بوٹی بوٹی چیل کووں کو کھلانا چاہتا تھا لیکن بڑے صاحب سے ڈرتا تھا۔ ان پر آسانی سے حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے کسی مناسب موقعے کا انتظار کر رہا تھا۔

ثمینہ کا دوسرا شوہر سمگلر قادر خان تھا۔ دو برس بعد اسے رہائی ملنے والی تھی۔ وہ دن رات قسمیں کھاتا رہتا تھا کہ رہائی ملتے ہی ماں بیٹی کو گولی مار دے گا۔ پھر وہاں سے فرار ہو کر علاقہ غیر میں چلا جائے گا۔

فرزانہ کا دوسرا شوہر بھی جیل میں تھا۔ وہ جس طرح لاکھوں کا نقصان اٹھا کر اور فرزانہ سے فریب کھا کر ذلیل وخوار ہوا تھا۔ اس کے پیش نظر وہ بھی اپنی رہائی کا منتظر تھا۔ پوری سزا کاٹ کر باہر آنے کے بعد فرزانہ کا گلا کاٹنے کی قسم کھا چکا تھا۔

ان ماں بیٹی کی موت کہیں سے بھی آسکتی تھی۔ مگر ابھی نہیں آرہی تھی۔ پتا نہیں بڑے صاحب کب ریٹائر ہوتے۔ ان کے کرسی چھوڑتے ہی ماں بیٹی کی شامت آجاتی۔

ایک روز مقدمے کی کارروائی کے دوران ایک برقع پوش خاتون عدالت میں آئی۔ وہ کلیم یزدانی کی بڑی سالی اور شہزادہ سلیم کی بڑی خالہ تھی۔ اس نے بیان دیا کہ اس کی بہن کو یعنی کلیم کی بیوی کو اولاد ہوتے ہی مر جاتی تھی۔ جب تین بچے ہوئے اور مر گئے تو

کلیم اپنی بیوی کو گالیاں دینے اور مارنے پیٹنے لگا۔ جب وہ چوتھی بار حاملہ ہوئی تو اسے میکے بھیج کر کہہ دیا کہ اولاد زندہ رہے تو واپس آنا۔ ورنہ میکے میں ہی رہنا۔ اسے طلاق بھیج دی جائے گی۔

وہ بے چاری بدنصیب تھی۔ میکے پہنچنے کے بعد تین ماہ کا حمل ضائع ہو گیا۔ اس کی بڑی بہن چار بچوں کی ماں تھی اور پانچواں پیدا کر رہی تھی۔ اس کی ایک بیٹی اور تین بیٹے تھے۔ پانچواں بھی ایک بیٹا ہوا۔ اس نے چھوٹی بہن کو طلاق سے بچانے کے لئے اپنا بیٹا اس کی گود میں دے دیا۔ شہزادہ سلیم وہی بیٹا تھا۔

یہ راز شہزادے کے ننھیال والوں نے چھپا رکھا تھا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ بیٹے نے باپ کی ساس سے اور باپ نے بیٹے کی سوتیلی بیٹی سے شادی کی تھی اور عدالت انہیں مذہبی حوالے سے غیر اخلاقی اور مکروہ فعل کی مرتکب قرار دے رہی ہے تو شہزادہ سلیم کی اصل ماں سچ بیانی کے لئے حاضر ہو گئی۔ اس خاتون کے بیان نے انہیں دوگنی سزا سے بچا لیا۔ وہ باپ بیٹے صرف نقلی دوائیں تیار کرنے کے جرم میں جیل چلے گئے۔

جیل میں سگی ماں ملاقات کرنے آئی۔ شہزادے نے کہا۔ "میں یہ شکایت نہیں کروں گا کہ تم نے مجھے پیدا کر کے دوسروں کے حوالے کیوں کر دیا۔ میں تمہارے پیار بھرے دل اور جذبات کو سمجھتا ہوں۔ تم نے چھوٹی بہن کی زندگی برباد ہونے سے بچائی تھی۔"

"بیٹے! میں نے محبت اور نیکی کے جذبے سے تمہیں دے تو دیا تھا مگر بہن کی موت کے بعد پچھتانے لگی۔ میں نے پہلے تمہیں اپنی محبت سے محروم کیا۔ پھر جس گود میں دیا' وہ بھی چار سال بعد چل بسی۔ تم دونوں ہی طرف سے ماؤں کی ممتا سے محروم رہے۔ اب جیل سے آؤ گے تو تمہیں کلیجے سے لگاؤں گی اور جتنے محروم رہے ہو' اس سے کہیں زیادہ ماں کی محبت دوں گی۔"

"میرا ایک اہم بریف کیس ایک دوست کے پاس رکھا ہوا ہے۔ میں اس کا نام اور پتا بتا دیتا ہوں۔ تم اسے جا کر بتاؤ کہ میں جیل میں ہوں میرا بریف کیس تمہیں دے دے۔ اگر تم پر بھروسا نہ کرے تو مجھ سے آکر ملے۔ میں تمہارا تعارف کراؤں گا تو وہ تمہیں دے دے گا۔"

ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ وہ نواز کا نام اور پتا پوچھ کر چلی گئی۔ شہزادہ جس دن وہ بریف کیس نواز کو دے کر گیا تھا۔ اسی دن نواز اور اس کی دونوں ساتھیوں کی نیت بدل گئی تھی۔ ایک نے کہا۔ "نواز! تمہیں بریف کیس یہاں نہیں رکھنا چاہئے۔"

نواز نے پوچھا۔ "تم نے شہزادے کے سامنے اعتراض کیوں نہیں کیا؟"

"بھئی اس کے جانے کے بعد یہ اندیشہ پیدا ہو رہا ہے کہ اس میں کوئی غیر قانونی سامان ہو سکتا ہے۔"

"یار! کیسی باتیں کرتے ہو؟ تمہارا کیا خیال ہے' شہزادہ کوئی غیر قانونی دھندا کرتا ہے؟"

"کر سکتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں چند ہی ماہ میں کیسا امیر کبیر ہو گیا ہے۔ کیا اسے زمین سے خزانہ مل گیا ہے یا آسمان سے اس پر نوٹوں کی بارش ہو رہی ہے؟"

دوسرے ساتھی نے کہا۔ "اگر پولیس کو شبہ ہو گا اور وہ بریف کیس کا لاک توڑ کر اسے کھولیں گے اور پھر اس میں قابلِ گرفت سامان نکلے گا تو ہم تینوں تھانے' پولیس' عدالت اور جیل کے چکر میں پڑ جائیں گے۔"

"ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس میں کیا رکھا ہوا ہے؟"

نواز نے پوچھا۔ "کیسے معلوم ہو گا؟ پتا نہیں اس نے کن مخصوص نمبروں سے اسے لاک کیا ہے۔"

"سیدھی سی بات ہے۔ ہم لاک توڑ دیں گے۔ انارکلی میں ایسے درجنوں بریف کیس ملتے ہیں۔ بعد میں ایک نیا لا کر شہزادے کا سامان اس میں رکھ کر لاک کر دیں گے۔ وہ آ کر ہمارے مخصوص نمبروں سے کھولنے کی کوشش کرے گا تو کہہ دیں گے کہ وہ لاک کھولنے کا اپنا مخصوص نمبر بھول گیا ہے۔"

آخر یہ فیصلہ ہو گیا کہ اسے توڑ دیا جائے گا۔ نواز پیچھے ہٹ کر بولا۔ "یہ میرے پاس امانت ہے۔ میں نہیں توڑوں گا۔"

اسے دوسرے نے توڑا۔ پھر کھول کر دیکھا تو چند ساعتوں تک تینوں دم بخود رہ گئے۔ پانچ پانچ سو کے نوٹوں کی گڈیاں بڑی ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ ان پر ایک بڑا سا لفافہ نظر آ رہا تھا۔ وہ تینوں قریب آ گئے۔ انہوں نے اتنی دولت اپنے بالکل قریب کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ان سب نے انہیں چھو کر دیکھا۔ پھر گڈیاں اٹھا لیں۔ انہیں گننے لگے۔ گنتے گنتے سانس لینا بھولنے لگے لیکن گنتی سانسوں سے زیادہ اہم ہو گئی تھی۔ پھر ایک نے گہری سانس لے کر کہا۔ "یہ چار لاکھ ہیں۔"

دوسرے نے کہا۔ "یہ نو لاکھ روپے ہیں۔"

تیسرے نے کہا۔ "اور یہ پانچ لاکھ ہیں۔ کُل اٹھارہ لاکھ روپے ہیں۔"

"اوہ خدایا! میں پہلی بار اتنے لاکھ روپے ایک جگہ دیکھ رہا ہوں۔"

"یار! یہ اصلی ہیں نا؟"

"اصلی ہیں' ان میں عید مبارک نہیں لکھا ہوا ہے۔"

"شہزادے نے اتنے روپے یہاں کیوں رکھے؟ اس کے پاس کوٹھی ہے۔ وہاں حفاظت سے رکھ سکتا تھا۔"

"میری عقل کہتی ہے' وہ اپنی دولت مند بیوی کو لوٹ رہا ہے۔ وہاں کی رقم یہاں لا کر چھپا گیا ہے۔"

"ہم بھی لوٹ سکتے ہیں۔"

شبیر نے کہا۔ "ٹھیک کہتے ہو۔ اسے تقسیم کریں گے تو ہر ایک کے حصے میں چھ لاکھ آئیں گے۔"

نواز نے کہا۔ "یہ امانت میں خیانت ہو گی۔ مگر میں ضرور کروں گا کیونکہ ساری عمر کلرکی نہیں کر سکتا۔ چھ لاکھ روپے سے کوئی بہت بڑا کاروبار کر لوں گا۔ یہ رقم میں نے چرائی نہیں ہے۔ یہ خود چل کر میرے پاس آئی ہے اور جب دولت خود بخود ملے تو اسے ٹھکرانا نہیں چاہئے۔"

ایک نے لفافہ اٹھا کر کہا۔ "اس میں بھی کچھ ہے۔"

اس نے لفافہ چاک کیا' اندر سے تصویریں نکلنے لگیں۔ وہ تصویریں اگرچہ عریاں نہیں تھیں لیکن وصال کے ایک ایک لمحے کی عکاس تھیں۔ انڈین فلموں کا بے لگام رومانس تھا۔ وہ تینوں بڑی دلچسپی سے دیکھنے اور بے باک تبصرہ کرنے لگے پھر ایک نے ڈائری کا ورق اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔ دونوں ساتھی مزے لے لے کر سننے لگے۔

نواز نے کہا۔ "بھئی ماننا پڑے گا۔ یہ شہزادہ زندگی کا صحیح لطف اٹھا رہا ہے۔ یہ اخبارات میں شائع ہونے والی حسینہ جس کے لاکھوں شیدائی پیدا ہو گئے ہیں' یہ کم بخت شہزادے کی تنہائی آباد کرتی ہے۔"

شبیر نے ان سے تصویریں لے کر لفافے میں ڈال دیں۔ ڈائری کے ورق کو بھی اس میں رکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو دوستو! گناہ کرنا ہی صرف گناہ نہیں ہے۔ اسے دیکھنا بھی گناہ ہے۔ اسے دوبارہ ٹیپ سے چپکا دیا جائے۔"

"یار! اتنی شرافت نہ دکھاؤ۔ تھوڑی دیر میں یہ بھی کہو گے کہ ہمیں یہ لاکھوں روپے نہیں لینے چاہئیں۔"

"میں ایسا نہیں کہوں گا۔ کیونکہ روپے ہم سب کی ضرورت ہیں۔ عورت ہم میں سے کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ پھر کیوں اسے دیکھا جائے یا اس کی تشہیر کی جائے۔ اسے میں نے لفافے میں بند کر دیا ہے۔ اسے یا تو جلا دو یا اسی طرح بند رہنے دو۔"

نواز نے وہ لفافہ لے کر کہا۔ "یہ میرے پاس رہے گا۔ ابھی رقم برابر کرو' میرے پاس چار لاکھ ہیں اور مجھے دو لاکھ اور دو۔"

ان تینوں نے چھ چھ لاکھ اپنے پاس رکھ لئے۔ شبیر نے کہا۔ "شہزادہ کسی وقت بھی آسکتا ہے۔ یہ جگہ فوراً چھوڑ دو۔ ہم میں سے ایک بھی یہاں رہے گا تو وہ ایک کے ذریعے باقی دو تک پہنچ جائے گا۔"

یہ اندیشہ سب ہی کو تھا کوئی شہزادے کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سب ہی اپنا اپنا مختصر سا سامان باندھنے لگے۔ نواز نے اپنی اٹیچی میں چھ لاکھ روپے کپڑوں کے درمیان چھپا کر رکھے۔ پھر اس بڑے لفافے کو اٹھا کر دیکھا' جس میں امبر قید تھی۔ وہ حسینہ جس کی تصاویر دیکھ کر سب ہی کی رال ٹپکنے لگی تھی۔ اگرچہ وہ دنیا کی کوئی نرالی حسینہ نہیں تھی لیکن رسالوں اور اخباروں میں رنگین تصاویر شائع ہو جائیں تو لڑکی کچھ غیر معمولی اور دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں نرالی سی لگتی ہے۔

نواز کا خیال تھا' وہ ان تصاویر سے اور ڈائری کے اس ورق سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور حسن کی بہتی گنگا میں اشنان کر سکتا ہے۔

☆=========☆=========☆

باپ کا سوم ہو جانے کے بعد وہ گھر سے نکلی۔ پھوپی جا چکی تھی۔ ذکیہ پہلے ہی ناراض تھی۔ شہزادے نے بڑا ہی شرمناک فریب دیا تھا۔ نہ کوئی رشتہ رہا تھا۔ جھوٹی تسلی کے لئے بھی کوئی سہارا دینے والا نہ تھا۔ ایسے وقت میں ایک ساگر ہی یاد آرہا تھا۔

وہ اس کے مکان میں آئی پھر اس کے روبرو پہنچتے ہی دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ ساگر نے کہا۔ "پلیز خود کو سنبھالو۔ آنسوؤں کو روکو۔ آؤ یہاں بیٹھو۔"

وہ اسی پرانی کرسی پر بیٹھ گئی۔ پہلی اور دوسری ملاقاتوں میں وہ کرسی بہت شکستہ سی' چھوٹی سی لگی تھی اب وہی کرسی مضبوط سہارے کے طور پر بیٹھنے کے لئے رہ گئی تھی۔ وہ ایسی بے غرض اور بے لوث کرسی تھی کہ اسے کوئی اس کے نیچے سے کھینچ نہیں سکتا تھا۔

وہ بولا۔ "میں تمہارے آنسوؤں کو کسی حد تک سمجھ رہا ہوں لیکن وضاحت چاہتا ہوں' کیوں رو رہی ہو؟"

وہ اسی طرح دوپٹے میں منہ چھپائے روتے ہوئے بولی۔ "میرا ابا فوت ہو گیا ہے۔"

ساگر نے اسے حیرانی اور بے یقینی سے دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا تم باپ کے لئے رو رہی ہو؟"

"ہاں' آج اس کی وفات کو چوتھا دن ہے۔ میں اس دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی

ہوں' میرا کوئی نہیں ہے۔"

وہ بولا۔ "مگر میں' میں ایک آرٹسٹ ہوں۔ ایک ایک لکیر اور ایک ایک لفظ کو سمجھتا ہوں۔ اپنے ملک کے رسم و رواج کو' اپنے ملک کی خواتین کے خوش ہونے اور ان کے ماتم کرنے کے انداز کو سمجھتا ہوں۔ ہماری عورتیں جب اپنوں کی موت پر روتی ہیں تو دوپٹے سے صرف آنسو پونچھتی ہیں۔ ان کے سروں پر گھونگٹ کی طرح آنچل ہوتا ہے۔"

وہ ذرا قریب ہو کر جھک کر بولا۔ "جب ہماری عورتیں اپنے کسی فعل پر شرمندہ ہوتی ہیں۔ جب کوئی شرمناک غلطی انہیں رلاتی ہے تب وہ دوپٹے سے منہ ڈھانپ کر روتی ہیں۔"

امبر نے یکلخت دوپٹے کو اپنے منہ سے ہٹا کر اسے بھیگی آنکھوں سے دیکھا۔ یکلخت احساس ہوا کہ باپ کی موت نہیں اپنی غلطی اسے رلا رہی ہے۔ اگر وہ دھوکہ دے کر کراچی نہ جاتی اور اگر اخبارات میں اس کی تصاویر شائع نہ ہوتیں تو باپ نہ مرتا۔ باپ شرم سے مر گیا' تب وہ شرم کے آنچل میں منہ چھپا کر رو رہی تھی اور اپنی حرکت کو خود نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ اسے تو وہی سمجھ سکتا تھا جو عورتوں کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک ادا کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتا ہو اور وہ ساگر تھا' جو اس کی ایک ایک ادا کی تصویریں بناتا آرہا تھا۔

وہ بولا۔ "انسان بے طرح جھوٹ بولتا ہے اور بے شمار فریبی چالیں چلتا ہے۔ فریب دینے کے لئے آنسوؤں کو بھی ذریعہ بنا لیتا ہے۔ آنسو کسی اور کے لئے بہاتا ہے' مگر روتا اپنی ذات پر ہے۔"

وہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ "میں حیران ہوں کہ تم میرے اندر کتنی گہرائی تک اتر گئے ہو۔ میرے مزاج کو اور مجھ سے سرزد ہونے والے نفسیاتی ردِعمل کو اس طرح سمجھ لیتے ہو کہ مجھے تم سے خوف آنے لگا ہے۔"

"خوف کے باوجود میرے پاس آئی ہو اور آتی رہو گی۔ میں نے اخباروں میں تمہیں شہرت کے آسمان پر پہنچتے دیکھا ہے۔"

"میں مزید شہرت حاصل کرنے کے لئے تم سے تصویریں مانگنے نہیں آئی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ یہاں سے جتنی تصاویر اٹھا کر لے جاؤں گی' تم اس سے اور زیادہ بناؤ گے۔ میری شہرت اور خوشحالی کو کسی بھی مقام پر رکنے نہیں دو گے۔ اس لئے میں کچھ مانگنے نہیں آئی ہوں۔"

"بے شک تمہیں مجھ پر اتنا اعتماد ہے۔ ابھی شاید اس لئے آئی ہو کہ کسی کے سامنے

روتے رہنے اور بولتے رہنے سے دل کا غبار نکلتا ہے۔"

"ہاں' میں نمائش کے دوران بہت خوش تھی۔ سوچتی تھی' لاہور پہنچتے ہی تمہارے پاس آکر اپنی کامیابی کا حال اپنی زبان سے سناؤں گی لیکن یہاں آتے ہی دنیا تاریک ہو گئی۔ ابا کی آنکھ بند ہوتے ہی پھوپی ساتھ چھوڑ کر چلی گئیں۔ رونے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اپنا کوئی آدمی ہو' جس کے سامنے ہم روئیں اور وہ ہمارے آنسو دیکھے اور ہمارے دلی صدمات کو سمجھے۔"

وہ ذرا چپ ہوئی' پھر بولی۔ "تمہارے پاس آکر رونے سے انکشاف ہوا کہ میں ابا کی وفات پر نہیں رو رہی ہوں۔ میں شرمندہ ہوں' اپنے اندر چھپ کر شرم سے روتی ہوں تو آنسو باہر نکل آتے ہیں۔"

"میرا دل کہتا ہے کہ تم ایک اچھی لڑکی ہو۔ تم نے پچھتاوے کے آنسو بہا کر ثابت کردیا ہے کہ تمہارا ضمیر زندہ ہے۔ تم پھر پچھتانے کا کوئی کام نہیں کرو گی۔"

"میں نے جان بُوجھ کر شرمندگی اٹھانے کا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ البتہ باپ کو سمجھنے میں غلطی کردی۔ یہ سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اس قدر شرم والا ہو گا اور مجھے شرمندہ کر جائے گا۔"

"جو ہو گیا' سو ہو گیا۔ اسے بھول جاؤ اور نئے حوصلوں سے نئی زندگی شروع کرو۔"

"میں اب اس محلے میں نہیں رہوں گی۔ تنہا اور جوان لڑکی کو دیکھ کر وہاں طرح طرح کی باتیں بنائی جائیں گی۔ بڑے لوگوں کے علاقے میں کوئی نہیں پوچھتا کہ ایک جوان لڑکی تنہا کیوں رہ رہی ہے اور کہاں آتی جاتی ہے۔ میں گلبرگ میں فی الحال ایک کوٹھی کرائے پر لینا چاہتی ہوں۔"

"اب بھی وہی آزادی چاہتی ہو' جس نے باپ کو مار ڈالا؟"

"ابا نے میری شہرت کو آوارگی سمجھا تھا۔ کیا رسالوں اور اخباروں میں شہرت پانے والی سبھی لڑکیاں آوارہ ہوتی ہیں؟ کیا تہذیب کے دائرے میں رہ کر آزادی اختیار نہیں کی جاسکتی؟"

"تم اپنے تہذیبی عمل سے ثابت کرتی رہو گی تو دنیا مانتی رہے گی۔"

"لیکن میں اس کوٹھی میں تنہا نہیں رہ سکوں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم آدھے حصے میں اپنا اسٹوڈیو بنالو۔"

"مجھے افسوس ہے۔ میں یہ کٹیا چھوڑ کر شاہی محل میں نہیں رہ سکوں گا۔"

"میں بالکل بے یار و مددگار ہوں' کیا میری بھلائی اور خوشحالی نہیں چاہو گے؟"

"میں تمہاری خوشحالی کے لئے مزید تصویریں بناچکا ہوں۔"

وہ اسے ایک ایک تصویر لا کر دکھانے لگا۔ ہر تصویر لاجواب تھی۔ ساگر نے امبر کی ذات میں ڈوب کر ہر تصویر کو شاہکار بنا دیا تھا۔ وہ بولی۔ "اگر میں دن رات تمہارے ساتھ رہوں گی تو تم مزید شاہکار تخلیق کرتے رہو گے۔"

"تم دن رات کس رشتے سے ساتھ رہو گی؟"

امبر نے سر جھکا لیا۔ اپنے سر پر آنچل رکھ لیا پھر دبی زبان سے کہا۔ "میں نے اتنا کہہ دیا' آگے تم کہو۔"

ساگر نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ پھر سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ "تم میری آئیڈیل ہو۔ مگر میرا مزاج فقیرانہ ہے اور تمہارا شاہانہ۔ میں گوشہ نشینی کا قائل ہوں اور تم شہرت کی دلدادہ ہو۔"

"گاڑی کے دو پہیئے الگ الگ پٹری پر دوڑتے ہیں مگر ساتھ ساتھ دوڑتے ہیں۔ گاڑی کو گرنے نہیں دیتے۔ تم اسٹوڈیو کی چار دیواری میں اپنے فن کا جادو جگایا کرو گے اور میں وہ جادو' نگر نگر لے جایا کروں گی۔ عورت اپنے مرد کی محنت پر فخر کرتی ہے۔ میں جہاں جاؤں گی' تم پر فخر کرتی رہوں گی۔"

وہ ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے پہلی ملاقات میں امبر سے کہا تھا۔ "تُو میرے خیالوں کا بدن ہے۔ اس بدن کو میں تو کیا کوئی بھی نہیں چھوئے گا۔ یہ بدن کبھی میلا نہیں ہو گا۔ کبھی بوڑھا نہیں ہو گا۔ تیرے حسن کو زوال نہیں ہے۔"

وہ دل سے چاہتا تھا کہ اس کے بدن کو کوئی میلا نہ کرے۔ وہ اس کے خیالوں میں خود کو زندہ رکھنا اور اپنے جذبوں کو بہلانا چاہتا تھا۔ مگر جس بدن کو دن رات پنسل اور برش سے بنایا کرتا تھا' اسے پالینے کی آرزو اس کے لاشعور میں تھی۔ وہ مصور آخر انسان تھا۔ اس کے جذبات تھے' جو تصاویر کی امبر کو روبرو زندہ دیکھ کر خواب سے بیدار ہو گئے تھے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اگلا قدم کیا ہونا چاہئے۔ دل کی تیز ہونے والی دھڑکنیں کہہ رہی تھیں کہ وہی ہونا چاہئے' جو وہ کہتی ہے اور عجب کہتی ہے' جنت سے نکلنے کو نہیں' جنت میں آنے کو کہتی ہے۔

وہ قریب آگئی۔ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "آج تک تمہاری پنسل اور برش مجھے چھوتے رہے۔ اب تم چھو کر دیکھو' تمہاری تصویر زندہ ہو گئی ہے۔"

اس نے چھو لیا۔ اسے پالیا' وہ ایک عرصے سے اس کے دماغ میں اتنی گہرائی تک

اتری ہوئی تھی کہ اسے جب بھی سوچتا تھا' وہ روبرو چلی آتی تھی۔ اس وقت اسے اپنی دھڑکنوں سے لگا لینے کے بعد بھی پالینے کا یقین نہیں ہو رہا تھا۔ پہلے جیسے احساسات تھے کہ وہ خوابوں اور خیالوں میں آئی ہے۔

اس نے پوچھا۔ "کیا یہ تم ہو؟"

"ہاں۔ میں خواب نہیں ہوں۔ خیال نہیں ہو' تمہاری امبر ہوں۔"

وہ یقین کرنے کی کوشش کرنے لگا' ہاں' وہی بدن ہے' جو رنگوں کے امتزاج سے حسن کا پیکر بن جاتا ہے۔

تخیل کی قوت سے یہ بدن مالا مال ہو جاتا ہے۔ کبھی سسی' کبھی ہیر' کبھی قوسِ قزاح کی لکیر بن جاتا ہے۔

اسے ڈھونڈو تو نہیں ملتا۔ پکارو تو خیالوں میں آجاتا ہے۔ مگر ہاتھ بڑھاؤ تو ہاتھ نہیں آتا۔

حسن تب تک حسن ہے' جب تک اچھوتا اور لاحاصل ہے۔ حسن کی تعریف یہ ہے کہ وہ خواب میں آئے' خواب گاہ میں نہ آئے۔

حجاب میں آتا رہے اور طلب بڑھاتا رہے تو زندہ اور پائندہ ہے۔ ہاتھ آجائے تو معمول کے مطابق برتنے والی چیز بن جاتا ہے۔

ساگر کے دل سے ایک آہ نکلی۔ "کاش تم میرے برش اور میری انگلیوں میں رہتیں۔ میرے بازوؤں میں نہ آتیں۔ مجھے تمہیں پالینے کی خوشی ہے لیکن خیالوں کی طلسماتی دوشیزہ کو کھو دینے کا صدمہ تا عمر رہے گا۔"

☆=========☆=========☆

دفتر میں بڑی افراتفری تھی۔ کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر افضال احمد کا ایک اہم کاغذ گم ہو گیا تھا۔ تمام کلرک' ٹائپسٹ اور اکاؤنٹنٹ کی میزوں' درازوں اور الماریوں میں تلاشی جاری تھی لیکن وہ کاغذ نہیں مل رہا تھا۔

مینیجر نے افضال احمد کے پاس آکر کہا۔ "سر! مجھے نواز پر شبہ ہے۔ آج وہ اپنے ساتھ اٹیچی لے کر آیا ہے جبکہ دفتر میں ایسی چیزیں لائی نہیں جاتیں۔"

افضال نے حکم دیا۔ "اسے اٹیچی کے ساتھ حاضر کرو۔"

مینیجر حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ نواز سے کچھ نادانی بھی ہوئی تھی اور کچھ دانائی سے بھی کام لیا تھا۔ دانائی یہ کی تھی کہ دفتر آنے سے پہلے اس نے بینک اکاؤنٹ میں چھ لاکھ جمع کر دیئے تھے۔ تصاویر والا لفافہ اٹیچی میں تھا اور اٹیچی سمیت اس لئے دفتر آیا تھا کہ وہ تنخواہ حاصل کرنے کا دن تھا۔ یہی اس کی نادانی تھی۔ اسے چھ لاکھ ملے تھے۔ اگر تنخواہ ڈیڑھ ہزار روپے حاصل نہ کرتا تو کیا فرق پڑ جاتا؟

"سر! میں نے مکان چھوڑ دیا ہے۔ یہاں ڈیوٹی کرنے کے بعد شام کی بس سے قصور جانے والا ہوں۔ اس لئے یہ سامان ساتھ لایا ہوں۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں۔ آپ کا وہ کاغذ میری اٹیچی میں نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے' نہیں ہو گا لیکن تلاشی لینے دو تاکہ مجھے اطمینان ہو۔"

اس نے ہچکچاتے ہوئے اٹیچی کھولی۔ پھر اس میں سے تصاویر والا لفافہ نکال کر اپنے ہاتھوں میں رکھتے ہوئے بولا۔ "آپ اٹیچی کی تلاشی لیں۔"

مینیجر نے اچھی طرح تلاشی لی۔ وہ مطلوبہ کاغذ نہیں ملا۔ صاحب نے پوچھا۔ "یہ لفافہ کیسا ہے؟"

"سر! اس میں میرے پرسنل کاغذات اور تصویریں ہیں۔"

"اسے کھول کر دکھاؤ۔"

اس نے پریشان ہو کر مینیجر کو دیکھا پھر ڈائریکٹر صاحب سے کہا۔ "میں سمجھ رہا ہوں۔ تلاشی دینی ہو گی لیکن ایک عرض ہے۔ اس لفافے کی چیزیں صرف آپ دیکھیں گے۔"

"ہوں' ٹھیک ہے" اس نے منیجر کو باہر جانے کا حکم دیا۔ جب وہ چلا گیا تو نواز نے لفافے کے منہ سے ٹیپ ہٹا کر اسے صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ صاحب نے اس لفافے کا منہ کھول کر اسے الٹ دیا۔ میز پر تصویریں گر گر کر بکھرنے لگیں۔ افضال احمد نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ پھر نواز پر نظر ڈالی۔ وہ دونوں ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑا تھا۔

افضال نے ایک ایک تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ........ یہ تو وہی ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ یہ تو امبر ہے' تم نے یہ تصویریں کہاں سے حاصل کیں؟ یہ نوجوان کون ہے؟"

اس نے تصویروں کے ساتھ نیگیٹو کو دیکھا۔ پھر ڈائری کے اس کاغذ کو پڑھا۔ اس دوران نواز کہہ رہا تھا۔ "یہ میرا ایک دوست شہزادہ سلیم ہے۔ پتا نہیں جناب! یہ چند مہینوں میں کیسے دولت مند بن گیا ہے۔ اس حسینہ کو یعنی کہ حسینہ کو........"

"شٹ اپ' کیا حسینہ حسینہ کی رٹ لگا رکھی ہے۔ جانتے ہو' ان تصویروں سے ایک شریف خاندان بدنام ہو جائے گا۔ برباد ہو جائے گا۔ اگر مجھے اس خاندان کی عزت کا خیال نہ ہوتا تو میں ابھی ان تصویروں کے ساتھ تمہیں پولیس کے حوالے کر دیتا۔"

وہ عاجزی سے بولا۔ "معافی چاہتا ہوں جناب! میں نے تصویریں ابھی تک نہ کسی کو دکھائی ہیں' نہ دی ہیں' آپ اطمینان رکھیں' بدنامی اس لفافے سے باہر نہیں گئی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اسی لئے میں تمہیں معاف کر رہا ہوں۔ کوئی اور تصویر یا کاغذ ہو تو اسے بھی یہاں میز پر رکھ دو۔"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں' بس یہی کچھ ہے۔"

"ٹھیک ہے ۔ جاؤ اور کسی سے اس سلسلے میں بات نہ کرنا۔ میں یہ لفافہ جلا ڈالوں گا۔"

وہ اٹیچی اٹھا کر چلا گیا۔ افضال احمد نے چپراسی کو بلا کر کہا۔ "کسی کو اندر نہ آنے دینا' میں مصروف ہوں۔ جب وہ کاغذ مل جائے تو انٹرکام کے ذریعے کہہ دینا۔"

وہ ایک لاکھ روپے کی ہنڈی کا کاغذ تھا۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کسی کو دیا ہے یا کہاں رکھا ہے۔ اب جو لفافے سے کاغذ نکلا تھا' وہ بھی کچھ کم قیمت اور کم اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ اس نے پہلی بار امبر کو اعظم کی بیوی کے ساتھ دیکھا تھا۔ پوچھنے پر اعظم نے کہا تھا۔ "میری سالی ہے۔ ذکیہ کی چچا زاد بہن ہے۔"

امبر ایسی تھی کہ للچائے ہوئے ذہنوں میں نقش ہو جاتی تھی۔ شریف اور عزت دار عیاشوں کے لئے بڑی مشکل ہے کہ وہ اشارے بازی یا بدمعاشی سے کسی مطلوبہ لڑکی کو

پھانس نہیں سکتے۔ آہیں بھر کر صبر کرتے رہتے ہیں۔ افضال احمد بھی صبر کر رہا تھا۔ پچھلے دنوں اخبارات میں امبر کی رنگین تصویریں دیکھیں اور ساگر کی خیالی پینٹنگز میں بھی دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ طلسم ہوشربا بن گئی تھی۔ عاشقانِ حسن و شباب کے لئے چیلنج بن گئی تھی کہ وہ مصور کے خیالوں سے نکل کر آنے والی لاحاصل ہے۔

وہ شہرت حاصل کرنے کے بعد پچھلے چار دنوں سے افضال احمد کے اندر ہلچل مچا رہی تھی۔ اس کی نیندیں اڑ رہی تھیں۔ ایسے میں وہ ڈائری کا ورق اور تصویروں والا لفافہ اس کے ہاتھ لگ گیا۔ گویا لاٹری لگ گئی۔ وہ خوش ہو کر ریوالونگ چیئر پر اِدھر سے اُدھر گھومنے لگا۔ سوچنے لگا' امبر کا پتا کیسے معلوم ہو؟ کیسے رابطہ کیا جائے کہ اپنی عزت پر حرف نہ آئے۔

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور کان سے لگا کر ہیلو کہا دوسری طرف بیوی کی آواز سن کر منہ کڑوا ہو گیا۔ جب کوئی شوہر نئی محبوبہ کے حسن و شباب پر شاعری فرما رہا ہو تو بیوی کو فون کی یا خطرے کی گھنٹی نہیں بجانا چاہئے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "آپ کی غائب دماغی نے سب کو پریشان کر رکھا ہے۔ بچوں سے لے کر بڑوں تک سب ہی گھر کا سارا سامان الٹ پلٹ کر ہنڈی کا وہ کاغذ تلاش کرتے رہے۔ پتا ہے' آپ نے اسے کہاں رکھا تھا؟ نہیں' بھلا آپ کو کیسے یاد آئے گا۔ یادداشت اتنی اچھی ہوتی تو ہم سب صبح سے بھوکے رہ کر اسے تلاش نہ کرتے۔ توبہ ہے' وہ آپ کے شیونگ بیگ میں رکھا ہوا تھا۔ آپ کے ایک لاکھ محفوظ ہیں۔ دفتر والوں پر بھی رحم کریں اور جلد گھر آ جائیں۔"

بیوی باتیں سنا کر چپ ہوئی تو بیٹی کی آواز سنائی دی۔ "پاپا! میں نائلہ بول رہی ہوں۔ ہنڈی کا وہ کاغذ میں نے ڈھونڈا ہے۔ اس لئے شام کو میرے لئے زیورات کا وہ سیٹ لے آئیں' جو میں نے پرسوں پسند کیا تھا۔"

وہ بیٹی کی فرمائش کو ٹالنا چاہتا تو فون پر طویل بحث شروع ہو جاتی۔ ابھی وہ بحث کے نہیں' امبر کے موڈ میں تھا۔ اس نے فرمائش پوری کرنے کا وعدہ کر کے ریسیور رکھ دیا۔ سوچنے لگا' اعظم سے امبر کے متعلق معلومات حاصل ہو سکتی ہیں لیکن سالی کے سلسلے میں پوچھ گچھ کرنے سے وہ برا منا سکتا تھا' پھر کیا کیا جائے؟

طلب شدید ہو تو آدمی کو ڈھٹائی پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرتے ہوئے سوچا۔ "میں اعظم کو یہ مبارک باد تو دے سکتا ہوں کہ اس کی سالی شہرت کی بلندیوں پر پہنچ رہی ہے۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ بات سے بات نکلے اور امبر کا پتا ٹھکانا معلوم ہو جائے۔"

رابطہ ملنے پر کسی خاتون کی آواز سنائی دی' افضال نے کہا۔ "میں مسٹر اعظم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"وہ کراچی گئے ہوئے ہیں۔ شاید کل آئیں گے۔"

"آپ ذکیہ بھابی سے بات کرا دیں۔"

"وہ بھی اپنے میاں کے ساتھ گئی ہوئی ہے۔"

"آپ شاید ذکیہ بھابی کی والدہ ہیں؟"

"جی ہاں۔ کوئی پیغام ہو تو دیں۔"

"پیغام تو نہیں مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔ آپ کی بھتیجی امبر نے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔"

"کیسی شہرت! میں تو کچھ نہیں جانتی۔"

"کیا آپ نے اخباروں میں امبر کی تصویریں نہیں دیکھی ہیں۔ ہم اس کے اعزاز میں ایک پارٹی دینا چاہتے ہیں۔ پلیز' آپ مس امبر کا پتا نوٹ کرا دیں۔"

"مجھے افسوس ہے' میں کسی اجنبی کو اپنے خاندان کا پتہ نہیں بتا سکتی۔ کل اعظم آئے تو پوچھ لینا۔"

دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ اس ناکامی نے شوق کو اور بھڑکا دیا۔ وہ میز پر گھونسا مار کر سوچنے لگا۔ ریوالونگ چیئر ادھر سے اُدھر ہونے لگی۔ چند منٹ کے بعد اس نے پھر ریسیور اٹھایا اور کراچی کے ایجنٹ سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے ایجنٹ نے کہا "جناب! میں آپ کے منیجر سے بات کرنے ہی والا تھا۔ میں نے تمام بقایا جات ادا کر دیئے ہیں اور نئے مال کا آرڈر........"

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "کاروباری مسئلے پر منیجر سے بات کرو۔ میں ایک دوسرے سلسلے میں میں تمہارا تعاون چاہتا ہوں۔"

"جناب! ہم خادم ہیں۔ تابعدار ہیں' حکم کریں۔"

"پچھلے ہفتے آرٹ گیلری میں مصور اے ساگر کی تصاویر کی نمائش ہوئی تھی۔ تم ابھی گیلری کے منتظمین سے فون پر رابطہ کرو یا خود جا کر ملو۔ یہ معلوم کرو کہ مس امبر اور اے ساگر کا رہائشی پتا کیا ہے؟"

"یہ تو بہت چھوٹا سا کام ہے جناب! ابھی ہو جائے گا۔"

"میں آفس میں ہوں اور تمہارے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔"

وہ ریسیور رکھ کر انتظار کرنے لگا۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی جواب ملا کہ گیلری میں

مصور اے ساگر کا پتا درج نہیں ہے کیونکہ وہ گوشہ نشین اور گمنام رہنا چاہتا ہے۔ مس امبر سے شہزادہ سلیم کی معرفت رابطہ کیا جاتا ہے اور شہزادہ سلیم گلبرگ لاہور میں رہتا ہے۔ اس کی کوٹھی کا نمبر اور فون نمبر بتا دیا گیا۔

افضال نے کوٹھی کے فون نمبر پر رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے فرزانہ نے پوچھا "ہیلو کون؟"

"میں مسٹر شہزادہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"وہ بات آپ مجھ سے کر سکتے ہیں۔"

"محترم خاتون! آپ کی نوازش ہو گی۔ شہزادے سے بات کرا دیں۔"

"کیا آپ اخبار نہیں پڑھتے؟ اگر نہیں تو آج کا اخبار پڑھ لیں۔"

ریسیور رکھ دیا گیا۔ افضال نے بڑبڑاتے ہوئے ریسیور کو رکھا۔ صوفوں کے پاس سنٹر ٹیبل پر اخبار پڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر وہاں جا کر اخبار اٹھایا۔ پھر چھوٹی بڑی خبروں کی ہیڈ لائن پڑھنے لگا۔ جلد ہی پتا چل گیا کہ پچھلے روز شہزادہ لیبارٹری میں پولیس نے چھاپہ مارا تھا اور نشیلی دواؤں کے ہزاروں انجکشن برآمد کئے تھے۔ شہزادہ سلیم اور اس کے باپ کلیم یزدانی کی حراست میں لے لیا گیا تھا۔

افضال اخبار کو ایک طرف پھینک کر ایک صوفے میں دھنس گیا۔ ایک گہری سانس لے کر سوچنے لگا۔ "یہ تو منشیات' تھانے اور پولیس کا چکر ہے اور امبر بدنامی کا گھر ہے۔ مجھے دور رہنا چاہئے۔"

وہ بڑی دیر تک صوفے میں دھنسا رہا۔ عقل بدنامی سے ڈرا رہی تھی اور دل اس حسینہ کے لئے تڑپ رہا تھا۔ اگر وہ من مار لیتا تب بھی رات کی نیند اور دن کا سکون غارت ہو جاتا۔ کھلونے کی چابی ہاتھ میں تھی ایسے میں کھلونے سے نہ کھیلے' اس پابندی پر ہوس راضی نہیں تھی۔

اس نے وہ لفافہ اٹھا کر الماری کے سیف میں چھپا دیا۔ ارادہ تھا کہ مختلف ذرائع سے امبر کے متعلق معلومات حاصل کرے گا۔ اگر وہ کسی پولیس کیس میں ملوث نہیں ہو گی تو وہ پھر اس میں دلچسپی لے گا۔

اس نے دوسرے دن اخبار پڑھا۔ اس میں شہزادے اور امبر کی کوئی خبر نہیں تھی۔ لاہور بڑا شہر ہے۔ پھر بھی اتنا بڑا نہیں ہے کہ ایک لڑکی کو تلاش نہ کیا جا سکے۔ اس نے اپنے دفتر کے ملازموں سے کہا تھا کہ کسی طرح مصور اے ساگر کا پتا ٹھکانہ معلوم کرو۔

دو دنوں کے بعد پتا معلوم ہو گیا۔ وہ نولکھا بازار کی اس گلی میں پہنچا۔ نیچے پرچون کی

دکان اور اوپر ساگر کی رہائش تھی۔ پرچون والے نے کہا۔ "ساگر نے شادی کر لی ہے۔ اب وہ گلبرگ میں رہتا ہے۔"

افضال نے کہا۔ "میں ان کی تصویروں کے نمائش کے سلسلے میں ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے پتا بتا سکتے ہو۔"

"ضرور جناب! آپ لکھ لیں۔ ساگر نے ہمیں لکھ کر دیا تھا۔ تاکہ میں اس کے قدردانوں کو یہ پتا بتا سکوں۔"

اس نے کوٹھی کا پتا اور فون نمبر نوٹ کر لیا۔ شام کا وقت تھا۔ اس نے نہر والی سڑک پر آ کر ایک کنارے کار کھڑی کی۔ پھر موبائل فون آپریٹ کرنے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ساگر نے امبر سے شادی کی ہے مگر یہ جانتا تھا کہ اس کی پینٹنگز کا امبر سے گہرا تعلق ہے۔ وہ ساگر کے ذریعے اس کے متعلق بہت کچھ معلوم کر سکتا تھا۔

رابطہ قائم ہو گیا ادھر اسے ایک رس بھری نسوانی آواز سنائی دی۔ "ہیلو۔ فرمایئے۔"

افضال نے کہا۔ "میں مسٹر ساگر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"وہ گھر پر نہیں ہیں۔ آپ پیغام دے سکتے ہیں۔"

"میں ان کی پینٹنگز کی آئیڈیل گرل امبر کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں وہی مس امبر بول رہی ہوں۔"

"کیا واقعی تم مس امبر ہو؟"

"اب میں مس نہیں مسز ساگر ہوں۔ آپ کس سلسلے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں؟"

"اگر تم امبر ہی ہو تو تمہاری چند تصویریں، ان کے نیگیٹو اور ڈائری کا ایک ورق میرے پاس ہیں۔"

دوسری طرف چپ لگ گئی۔ افضال نے انتظار کیا پھر پوچھا۔ "خاموش کیوں ہو؟ بات آگے بڑھاؤ۔"

وہ ڈوبتی ہوئی آواز میں بولی۔ "تم کون ہو؟"

"تمہارا ہمدرد بھی ہوں اور دیوانہ بھی۔"

"مم .... میں ابھی بتا چکی ہوں۔ میں ایک شریف اور عزت دار مصور کی بیوی ہوں۔"

"میری دعا ہے۔ دونوں کی جوڑی سلامت رہے مگر پتا نہیں مرد حضرات کو کس مٹی سے بنایا گیا ہے، ہمیں دوسرے کی بیوی اچھی لگتی ہے۔"

"میں .... میں تم سے التجا کرتی ہوں، وہ کاغذ اور تصویریں ...."

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "یہ چیزیں واپس کرنے کے لئے ہی میں نے رابطہ کیا ہے۔"

"کیا سچ کہہ رہے ہو؟"

"اس سلسلے میں آگے بات کرنے سے پہلے یہ بتاؤ، کیا شہزادے کے ساتھ منشیات کے دھندے میں شریک ہو؟"

"یہ بکواس ہے۔ میں ایسے کسی دھندے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ گرفتار ہو گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس نے جیل جانے سے پہلے وہ شرمناک چیزیں تمہارے حوالے کی ہیں۔"

"میں نے کبھی شہزادے کو دیکھا تک نہیں ہے۔ یہ چیزیں قسمت سے میرے ہاتھ لگ گئی ہیں۔ اب ایسا کرو کہ میں پندرہ منٹ میں تمہاری کوٹھی کے سامنے آ رہا ہوں۔ گیٹ کھلا ہو گا تو اندر آ جاؤں گا۔"

"نن .... نہیں، تم یہاں نہ آؤ۔ مجھے جگہ بتاؤ، میں آؤں گی۔"

"بات یہ ہے کہ میں بہت معروف اور عزت دار آدمی ہوں۔ راستے یا کسی پبلک پلیس میں کسی حسینہ کے ساتھ دیکھا جانا گوارا نہیں کروں گا۔"

"یہاں ساگر کسی وقت بھی آ سکتے ہیں، وہ تمہیں دیکھ کر کیا سوچیں گے؟"

"تم باتیں بنا سکتی ہو کہ میں اگلی نمائش ملک سے باہر کرانے کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔"

اس نے سوچا، اجنبی کو آنے دیا جائے۔ وہ یہاں اسے ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔ کیونکہ اسے کسی وقت بھی ساگر کے آنے کا اندیشہ رہے گا۔ وہ بولی۔ "آ جاؤ۔"

امبر ریسیور رکھ کر باہر آئی دربان سے بولی۔ "ایک مہمان آ رہا ہے۔ گیٹ کھلا رکھو۔"

وہ پندرہ منٹ کے اندر ہی پہنچ گیا۔ امبر اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ کر بولی "بیٹھو اور میری ایک بات اچھی طرح سن لو۔ میں بدنامی کا وہ سامان حاصل کرنے کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کر سکتی ہوں لیکن عزت نہیں دوں گی۔"

"کیا اس عزت پر گھمنڈ کر رہی ہو، جو شہزادے کو دے چکی ہو؟"

"میں نے ایک سچا مرد سمجھ کر اس پر بھروسا کیا تھا مگر تم جیسوں کو سمجھنا ناممکن ہوتا ہے۔ دھوکا ہی دھوکا ملتا ہے۔"

"ڈائیلاگ بولنے میں وقت ضائع نہ کرو، رسالوں اور اخباروں میں جس حسن و

شباب کی نمائش کی ہے' میں اس کا تمنائی ہوں۔ انکار کرو گی تو یہ ازدواجی زندگی نہیں گزار سکو گی۔"

"تم بہت عزت دار ہو۔ مجھے بدنام کرو گے تو کیا میں تمہیں چھوڑ دوں گی؟"

"پھر تو میں تمہارا اعمال نامہ کسی بدنام شخص کے حوالے کردوں گا۔ وہ تمہیں بڑے لوگوں کی کوٹھیوں میں پہنچاتے پہنچاتے کوٹھے تک پہنچادے گا۔"

امبر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میرے حسن کی نمائش مجھے مہنگی پڑ رہی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں آنے والے پہلے مرد پر اعتماد کیا' وہ اعتماد مجھے مہنگا پڑ رہا ہے۔"

وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "آنسو دکھاؤ گی اور مکالمے بولو گی تو ابھی اٹھ کر چلا جاؤں گا۔ صرف کام کی بات کرو۔"

امبر دوپٹے سے آنسو پونچھنے لگی۔ وہ بولا۔ "کل دن کے گیارہ بجے ایک بڑے ہوٹل کا ایک بڑا کمرا ہمارے لئے بک رہے گا۔ میں کل گیارہ بجے سے پہلے تمہیں فون پر اس ہوٹل کا نام اور کمرا نمبر بتا دوں گا۔ تم وہاں چار بجے شام تک رہ کر واپس آجاؤ گی۔ تمہارے شوہر کو کسی طرح کا شبہ نہیں ہوگا۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ امبر نے کہا۔ "میں اپنے لئے کچھ نہیں کہوں گی۔ اس معصوم کے لئے کہتی ہوں' وہ ایک بچے کی طرح معصوم اور ایک فرشتے کی طرح سچا اور پاکیزہ ہے۔ خدا کے لئے اس کی پاکیزگی پر کیچڑ نہ اچھالو۔ میں اس معصوم کو فریب دینا نہیں چاہتی۔ پلیز' مجھے مجبور نہ ...."

اس نے بات نہیں سنی۔ تیزی سے جاتے ہوئے بولا۔ "کل گیارہ بجے سے پہلے فون کا انتظار کرو۔"

وہ کار میں آکر بیٹھ گیا۔ پھر اسے ڈرائیو کرتا ہوا' اس کوٹھی کے احاطے سے نکل کر اپنی کوٹھی کی طرف جانے لگا۔ اسے امبر کے آنسوؤں نے ذرا متاثر کیا تھا۔ روتے وقت کچھ زیادہ ہی حسین لگ رہی تھی۔ تسکین کے جذبات کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک طرح یہ بھی ہے کہ عورت انکار کرے' تکرار کرے' روتی رہے' راضی ہوتی رہے۔ تو بے طرح دل میں سماتی جاتی ہے۔

اس نے گھر آکر غسل کیا۔ پھر لباس تبدیل کیا۔ بیوی اور بچے شاپنگ کے لئے گئے ہوئے تھے۔ رات کے آٹھ بجے واپس آئے۔ وہ سب بڑے خوش تھے۔ افضال نے بیوی سے پوچھا۔ "نائلہ بیٹی کہاں ہے؟"

"میں تو اسے گھر پر چھوڑ کر گئی تھی۔ ہاں یاد آیا' اپنی سہیلی خالدہ کے پاس سوشل اسٹڈیز کے نوٹس لینے گئی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے لیکن آٹھ بج چکے ہیں۔ میں ہزار بار کہہ چکا ہوں۔ جوان لڑکی کو مغرب کے بعد گھر سے باہر نہیں رہنا چاہئے۔"

"آپ تو ذرا سی بات پر بیٹی کے لئے پریشان ہو جاتے ہیں۔ میں ابھی فون کرتی ہوں۔"

وہ ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ افضال نے کہا۔ "تم اسے ذرا سی بات کہتی ہو۔ آئے دن جوان لڑکیوں اور بچوں کے اغوا کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اگر بیٹی پر کوئی آنچ آئی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

بیگم نے کہا۔ "ہیلو خالدہ! ہاں' ہاں میں نائلہ کی ممی بول رہی ہوں۔ نائلہ تمہارے پاس آئی ہے؟"

"جی ہاں' آئی تھی۔ مگر وہ تو شام کو پانچ بجے ہی نوٹس لے کر چلی گئی تھی۔"

بیگم نے ریسیور رکھتے ہوئے پریشان ہو کر افضال کو دیکھا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"نائلہ پانچ بجے خالدہ کے ہاں سے چل پڑی تھی۔ آخر یہ لڑکی کہاں چلی گئی ہے۔"

"اپنی خالہ کے ہاں گئی ہوگی۔"

خالہ کے گھر فون کیا گیا۔ رات گیارہ بجے تک وہ کار میں بیٹھ کر تمام رشتے داروں کے گھروں میں جھانک آئے۔ نائلہ کا کوئی سراغ نہ ملا۔ افضال احمد کے ہوش اُڑنے لگے۔ کوئی روپے دو روپے کی چیز گم نہیں ہوئی تھی۔ جوان بیٹی غائب ہوئی تھی۔

جوان بیٹی یا جوان بہن کیا ہوتی ہے؟ ان کا بھی ایک بدن ہوتا ہے جیسے امبر کا ہے لیکن بیٹی کے بدن کے حسن و شباب کے حوالے سے کوئی بات نہیں کرنا چاہئے۔ یہ شرم کی بات ہوتی ہے۔ یہ بات تہذیب کے خلاف ہوتی ہے۔ اس کے باوجود باپ شرم سے سوچ رہا تھا کہ کوئی عیاش اس کی بیٹی کا بدن بھی اسی طرح مانگ رہا ہوگا یا چھین رہا ہوگا جیسے وہ امبر کا طلب کر رہا ہے یا اس سے چھیننے والا ہے۔

امبر کے آنسوؤں نے اسے متاثر نہیں کیا تھا۔ کیا بیٹی کے آنسو کسی کو متاثر کریں گے؟ نہیں کریں گے۔ کیونکہ جوان لڑکی روتی اور التجا کرتی ہے تو اور زیادہ حسین اور پُرکشش لگتی ہے۔

اس نے ایک جگہ کار روک دی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگا۔ بیگم

نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے سمجھایا۔ "آپ حوصلہ نہ ہاریں۔ اللہ نے چاہا تو ہماری بیٹی کو کچھ نہیں ہو گا۔ ہم نے کسی کے ساتھ برائی نہیں کی ہے۔ کسی پر زیادتی نہیں کی ہے۔ اللہ دیکھ رہا ہے۔ وہی انصاف کرے گا۔"

بیوی کی اس بات پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس یقین کے ساتھ رونے لگا کہ واقعی اللہ دیکھتا رہتا ہے اور انصاف کرنے والا ہے۔ اب وہ بیوی سے کیسے کہے کہ اری نیک بخت! تو جو کہہ رہی ہے، وہی ہو رہا ہے۔ قدرت کبھی سزا دینے میں بہت دیر کرتی ہے اور کبھی پلک جھپکتے احساسات کے بدن پر کوڑے مارنے لگتی ہے۔

اس نے پولیس میں رپورٹ درج نہیں کی۔ ایسا کرنے سے جوان بیٹی اور منیجنگ ڈائریکٹر افضال احمد اخباروں کی خبر بن جاتے۔ ویسے ہی رشتے داروں سے پوچھتے پھرنے سے شرم آ رہی تھی۔ پورے خاندان کو دور تک معلوم ہو رہا تھا کہ نائلہ کسی دوسرے کے پاس ہے۔ انہوں نے صبح پانچ بجے تک لاہور کے تمام چھوٹے بڑے اسپتالوں میں جا کر معلوم کیا۔ شاید بیٹی کو کوئی حادثہ پیش آیا ہو لیکن وہ کسی بھی اسپتال کے کسی بھی بیڈ پر نظر نہیں آئی۔

جب وہ داتا دربار کے ایک قریبی اسپتال سے مایوس ہو کر آ رہے تھے تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ افضال نے گاڑی روک دی۔ گاڑی سے نکل کر تیزی سے چلتا ہوا داتا دربار میں داخل ہوا۔ مزار مقدس کو سلام کیا پھر جلدی جلدی وضو کر کے مسجد کے حصے میں آ کر سجدے میں گر پڑا۔ گرنے کی آخری جگہ یہی ہوتی ہے۔ خواہ کوئی سجدے میں گرے یا منہ کے بل گرے۔ خواہ اذان کی آواز پر آئے یا حالات کے جوتے کھا کر آنا پڑے۔ آنا ہی پڑتا ہے۔

اس نے پچھلی رات سے نہ کچھ کھایا تھا، نہ سونے کے لیے پلک جھپکائی تھی۔ سوا نو بجے دفتر میں آ کر آئرن سیف میں سے امبر کا لفافہ نکالا پھر اس کے فون نمبر ڈائل کیے۔ وہ داتا دربار میں نماز ادا کرنے کے بعد گناہوں سے توبہ کر چکا تھا اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہہ چکا تھا۔ "میرے معبود! میری بیٹی کی عزت اور ذلت تیرے ہاتھ میں ہے۔ میرے ہاتھوں میں امبر کی عزت ہے۔ میں اس کی عزت رکھوں گا۔ تُو میری نائلہ کی عزت رکھ لے۔"

دوسری طرف سے فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ بڑی دیر بعد ساگر کی آواز سنائی دی
"میں ساگر بول رہا ہوں، فرمایئے؟"
افضال وہ تصویریں ساگر کو پیش کر کے امبر کو شوہر کی نظروں سے گرانا نہیں چاہتا

تھا۔ اس نے کہا۔ "میں آپ کا بہت قدر دان ہوں۔ ملک سے باہر آپ کی پینٹنگز کی نمائش کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ میرے قدر دان ہیں، آپ کا شکریہ، لیکن نمائش کے معاملات میں آپ میری وائف سے باتیں کریں، وہ ابھی لبرٹی مارکیٹ گئی ہیں۔ آپ شام کو کسی وقت فون کر لیں۔"

اس نے ریسیور رکھ کر سوچا۔ شام تک یہ لفافہ میرے اندر آگ کی طرح دہکتا رہے گا۔ یہ جب تک رہے گا، مجھ پر عذاب نازل ہوتا رہے گا۔ وہ لفافہ لے کر دفتر سے نکل آیا۔ پھر کار ڈرائیو کرتا ہوا اس عمارت کے سامنے آیا، جہاں اعظم کا دفتر تھا۔

اعظم نے اسے دیکھتے ہی اٹھ کر استقبال کیا۔ مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "آؤ افضال! کیسے راستہ بھول پڑے؟ کچھ تھکے ہوئے پریشان لگ رہے ہو؟"

وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میری بیٹی نائلہ کل شام پانچ بجے سے لاپتہ ہے اور یہ مجھے اپنے اعمال کی سزا مل رہی ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو، کُھل کر بولو۔"

"میں نے تمہاری سالی امبر پر نیت خراب کی تھی۔ اس کی یہ کمزوریاں میرے ہاتھ لگ گئی تھیں۔"

اس نے لفافے سے تصویریں نکال کر دکھائیں۔ اعظم حیرانی اور شرم ساری سے دیکھنے لگا۔ امبر جتنی بھی گر چکی ہو، وہ اپنے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اپنے لیول کے ایک بزنس مین کے سامنے وہ توہین محسوس کر رہا تھا۔

افضال نے کہا۔ "میں یہ سب کچھ امبر کو واپس کر رہا تھا۔ اس سے فون پر رابطہ نہیں ہوا اور یہ اچھا ہی ہوا۔ تم یہ لفافہ ذکیہ بھابی کو دو تاکہ وہ چھوٹی بہن کو شرم دلائے اور آئندہ ایسی حرکتیں نہ کرنے کی تاکید کرے۔"

"افضال! یہ لفافہ کسی اور نے تو نہیں دیکھا ہے؟"

"میں نے دفتر کے ایک ملازم سے اسے حاصل کیا ہے اسے دھمکی دی ہے کہ وہ اس سلسلے میں کسی سے امبر کا ذکر کرے گا تو امبر کے ساتھ اس پر بھی پولیس کیس بنا دیا جائے گا۔"

اعظم نے بڑی عقیدت سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "میرے دوست! آج تم نے میرے خاندان کی عزت رکھ لی ہے اور مجھے اور ذکیہ کو ہمیشہ کے لیے خرید لیا ہے۔ ہم تمہارا یہ احسان........."

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "میرے احسان کا بدلہ دینا چاہتے ہو تو میری بیٹی کے لیے دعا کرو کہ وہ جہاں بھی ہو عزت و آبرو سے ہو۔"

اعظم نے کہا۔ "میں دل سے دعا کرتا ہوں۔ ذکیہ پانچوں وقت کی نمازوں میں دعائیں مانگے گی۔"

ان باتوں کے دوران افضال نے فون کے ذریعے بیوی سے رابطہ کیا' بیوی نے خوشی سے چیخ کر کہا' ہماری بیٹی مل گئی ہے۔ ابھی ڈاکٹر زبیری کا فون آیا تھا۔ نائلہ ڈاکٹر زبیری کی کار سے ٹکرا کر بری طرح زخمی ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر اسے اپنے گھر لے گیا تھا۔ اس کی وائف بھی ڈاکٹر ہے۔ دونوں نے اس کی مرہم پٹی کی پھر اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرتے کرتے سو گئے۔ دس بجے جاگنے کے بعد دیکھا تو نائلہ ہوش میں تھی لیکن چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھی۔ اس نے ڈاکٹر کو اپنا پتا اور فون نمبر بتا دیا تب اس نے ہمیں اطلاع دی ہے۔"

افضال کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ بیٹی تمام رات غائب رہی مگر عزت سے رہی۔ اس نے ریسیور رکھ کر آنسو پونچھے۔ اعظم کو خوشخبری سنائی۔ پھر مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں بیٹی کو لینے جا رہا ہوں۔ اسے گھر لانے سے پہلے داتا دربار لے جاؤں گا۔"

وہ اسے امبر کا پتا اور فون نمبر نوٹ کرانے کے بعد تیزی سے چلتا ہوا دفتر سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی اعظم نے ناگواری سے کہا۔ "بیٹی گم ہوئی تو فرشتہ بن کر میرے پاس آیا۔ ورنہ میرے خاندان کی عزت کی دھجیاں اڑا دیتا اور یار دوستوں میں پینے کے دوران مزے لے لے کر امبر کو فتح کرلینے کے قصے سناتا رہتا' نان سینس۔"

گیارہ بج گئے۔ امبر فون کا انتظار کر رہی تھی۔ پچھلی شام افضال نے کہا تھا کہ اسے فون پر ہوٹل کا نام اور کمرا نمبر بتائے گا لیکن اس سلسلے میں فون کی گھنٹی نہیں بج رہی تھی۔ وہ صبح نو بجے تھوڑی دیر کے لیے لبرٹی مارکیٹ گئی تھی۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا۔ وہ منی ریکارڈر جیب میں چھپ سکتا تھا۔ یا اسے لباس کے اندر کہیں رکھا جا سکتا تھا۔ امبر اس ریکارڈر کے چھوٹے کیسٹ اور سیل خریدنے گئی تھی۔ یہ عقل بعد میں آئی تھی کہ افضال کل شام جتنی بکواس کر گیا ہے۔ اگر اسے چپکے سے ریکارڈ کرلیتی تو یہ ثبوت ہو جاتا کہ وہ عزت دار مینجنگ ڈائریکٹر کس طرح ایک لڑکی کی عزت سے کھیلنے کے لئے اسے بلیک میل کر رہا ہے۔

وہ خود تو بدنام ہوتی۔ اس عزت دار کی عزت خاک میں بھی ملا دیتی۔ بے لوث محبت

کرنے والے ساگر کے کردار نے اسے اتنا متاثر کیا تھا کہ اس نے اس سچے عاشق کو دھوکہ نہ دینے کی قسم کھالی تھی۔ یہ عہد کیا تھا کہ جاہل اور نادان عورتوں کی طرح بلیک میل ہو کر ساگر کی امانت کسی کو نہیں دے گی۔ ایسے عیاشوں کی دکھتی رگ پکڑے گی۔ اگر ناکام ہوگئی تو پرائی سیج پر جانے سے پہلے یوں جان دے گی کہ سیج پر بلانے والا بھی بچ نہیں پائے گا۔ وہ لبرٹی مارکیٹ سے واپس آئی تو ساگر نے بتایا' کسی کا فون آیا تھا۔ اب وہ شام کو فون کرے گا۔ امبر نے کوٹھی کے ایک بڑے کمرے کو ساگر کا اسٹوڈیو بنا دیا تھا۔ وہ کمرا اوپر تھا۔ نیچے ٹیلی فون کی گھنٹی سنائی دی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی نیچے ڈرائنگ روم میں آئی۔ دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر فون کے پاس ٹیپ ریکارڈ کو فون کے اسپیکر کے پاس رکھا۔ اس کے بعد سپیکر اور ریکارڈر کے بٹن کو آن کیا۔

اس نے سوچا تھا' اگر فون افضال کا نہ ہوا تو وہ ریکارڈر کو آف کر دے گی۔ اس نے ریسیور کان سے لگا کر ہیلو کہا۔ اسپیکر سے اعظم کی آواز ابھری۔ "ہیلو! امبر' کیسی ہو؟"

وہ حیرانی سے بولی۔ "اعظم بھائی! آپ؟ آپ لوگوں نے تو مجھ سے تعلق ختم ...."

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "اعظم بھائی نہیں' صاحب کہو۔ تم ہمیشہ اعظم صاحب کہہ کر مخاطب کرتی آئی ہو۔"

"وہ میری نادانی تھی۔ آپ میری بڑی بہن کے شوہر ہیں۔ میرے لیے معزز اور محترم ہیں۔ اس لیے میں بھائی کہوں گی۔"

"ایسا کہنے سے پہلے سن لو کہ دیوانگی کی داستان وہی ہے۔ صرف کردار بدل گئے ہیں۔ کل افضال تمہیں بلیک میل کرنے آیا تھا۔ آج وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ تمہاری بدنامی کا تمام سامان میرے پاس ہے۔"

امبر نے ریکارڈر کی طرف دیکھا' پھر انجان بن کر پوچھا۔ "آپ کس بدنامی کی بات کر رہے ہیں؟"

"کیا فون پر ہی سننا چاہو گی۔ اپنے پاس نہیں بلاؤ گی؟"

"پہلے بتاؤ تو سہی' تمہارے پاس کیا ہے؟"

"تمہارے اور اس نوجوان کے شرم ناک فوٹو گرافس ہیں' جو تمہاری نمائش کا آرگنائزر تھا اور ڈائری کا ورق ہے' جس پر تم نے شبِ وصال کی رنگینیاں بیان کی ہیں۔ یہ تمام چیزیں تمہیں آوارہ' بدچلن اور بدکار ثابت کرتی ہیں جبکہ تم عزت حاصل کرنے کے لیے گلبرگ کی اونچی سوسائٹی میں آگئی ہو اور ساگر تمہیں آئندہ بھی شہرت کی بلندیوں

پر پہنچاتا رہے گا۔"

"یہ اچھا ہوا کہ بدنامی کا یہ سامان آپ کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ اب میں عزت کی زندگی گزار رہی ہوں۔ ایک نہایت ہی نیک اور شریف مرد کی شریکِ حیات ہوں۔ آپ بدنامی کا وہ سامان جلا ڈالیں۔"

"جلا کر خاک کردوں گا یا اسے کلیجے سے لگا کر اچھی طرح چھپا کر رکھوں گا۔ اس پر کسی کی نظر نہیں پڑے گی۔ بس تم میرے پاس آتی جاتی رہو اور میری برسوں کی پیاس بجھاتی رہا کرو۔"

"یہ آپ کیسی شرم ناک باتیں کر رہے ہیں اعظم بھائی؟"

"میں کہہ چکا ہوں' مجھے اعظم بھائی نہ کہو۔ میں دوست ہوں' یار ہوں۔"

"یہ سوچیں' میں آپ کی سالی ہوں۔"

"تم ذکیہ کی سگی بہن نہیں ہو۔"

"چچا زاد تو ہوں۔ ہم سب ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ میری بدنامی آپ کی بدنامی ہوگی۔"

"اسی لئے کہتا ہوں' بات مان لو۔ ورنہ میرا نہیں' ذکیہ کا خاندان تمہاری وجہ سے بدنام ہوگا۔"

"آپ یہ تو سوچیں' ذکیہ آپ کو دل و جان سے چاہتی ہے۔"

"بیویاں شوہروں کو چاہتی ہی ہیں۔ نہیں چاہیں گی تو جائیں گی کہاں؟"

"کیا آپ ذکیہ سے زیادہ میرے طلب گار ہیں؟"

"ہاں پچھلے کئی برسوں سے تمہیں دیکھ دیکھ کر للچا رہا ہوں۔ مگر ڈرتا تھا' تم سے ایسا تعلق رکھوں گا تو کہیں تم کبھی غصے میں ذکیہ کے سامنے مجھے بے نقاب نہ کردو۔ اب تمہاری بہت بڑی کمزوری میرے ہاتھ میں ہے۔ تم ذکیہ کے سامنے کبھی زبان نہیں کھولو گی۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"ذکیہ ماں بننے والی ہے۔ یعنی کئی مہینے میرے کسی کام کی نہیں رہے گی۔ تم اس کی کمی پوری کرتی رہو گی۔"

"کیا آپ نے اپنے اندر کا سارا میل فون پر اُگل دیا ہے یا کچھ باقی رہ گیا ہے؟"

"یہی کہنا رہ گیا ہے کہ تنہائی میں ملاقات کرو۔ میں جگہ بتا رہا ہوں' وہاں چلی آؤ۔"

"ذرا میری بھی سن لو۔ میں بھی کچھ سنا رہی ہوں۔"

اس نے ریکارڈر کو آف کیا پھر کیسٹ کو ریوائنڈ کیا۔ اس کے بعد کہا۔ "ذرا کان اچھی طرح صاف کرلو اور سنو۔"

اس نے اسے آن کرکے ریسیور کا ماؤتھ پیس ریکارڈ کے قریب کردیا۔

ادھر اعظم ریسیور کان سے لگا کر انتظار کر رہا تھا۔ جب ریکارڈر کی آواز ابھرنے لگی تو اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر گئیں۔ پھر سمجھ میں آگیا کہ تھوڑی دیر پہلے جو کچھ کہہ چکا ہے' اسے امبر نے ریکارڈ کرلیا تھا۔ گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ ریکارڈر کی آواز کہہ رہی تھی کہ وہ ایک عورت کی مجبوریوں سے کھیلنے کے لیے بلیک میلر بن گیا تھا۔ وہ اپنی زبان سے اعتراف کر رہا تھا کہ امبر کے لیے برسوں سے للچا رہا ہے اور ذکیہ کی محبت قابلِ ستائش اس لیے نہیں ہے کہ بیویاں تو محبت کرتی ہی ہیں۔ نہیں کریں گی تو جائیں گی کہاں؟

وہ کیسٹ ثابت کر رہا تھا کہ وہ باوفا شوہر نہیں ہے۔ وہ امبر کا عاشق بھی نہیں ہے۔ محض ہوس پرست ہے۔ وہ معزز شہری ہے لیکن ہوس پوری کرنے کے لیے گری ہوئی ذہنیت کا بلیک میلر بن جاتا ہے۔

پھر امبر کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو اعظم! اب تم صاحب رہے ہو نہ بھائی۔ یہ کیسٹ ذکیہ کے پاس پہنچے گا تو گھر کے نہیں رہو گے۔ سوسائٹی میں پہنچے گا تو گھاٹ کے نہیں رہو گے۔"

وہ مُردہ سی آواز میں بولا۔ "تم تو بہت مکار نکلیں۔"

"تمہارے یہ الفاظ بھی ریکارڈ ہو رہے ہیں۔"

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ "دوستی کرلو۔"

"میں تمہیں بھائی کہنا گوارہ نہیں کروں گی۔ دوستی کوئی بازاری عورت کرے گی۔ اگر تم نے ایک گھنٹے کے اندر میری بدنامی کا وہ تمام سامان واپس نہ کیا تو اس ایک گھنٹے کے بعد میں کیسٹ لے کر ذکیہ کے پاس پہنچ جاؤں گی۔"

"ایسی جلد بازی سے کام نہ لو۔ میری ایک کمزوری تمہارے ہاتھ آگئی ہے تو تمہیں اطمینان ہونا چاہیے کہ اب میں تمہارے مزاج کے خلاف کوئی بات نہیں کہوں گا۔ تمہارے پاس میری اور میرے پاس تمہاری دکھتی رگ ہے۔ اسے اسی طرح رہنے دو۔ غصہ تھوک کر ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔ دونوں کو ہی ایک دوسرے سے نقصان پہنچ سکتا ہے اور دونوں ہی عیش.........."

"یو شٹ اپ۔ گھڑی دیکھو اور ایک گھنٹے میں وہ سب کچھ لے کر یہاں پہنچو۔ ورنہ

میں آ رہی ہوں۔"

"میں یہاں دفتر میں ہوں' ایک ضروری معاہدہ کرنے کے بعد آؤں گا۔ تم ایک گھنٹے کی شرط نہ رکھو۔ سن رہی ہو نا؟"

اس کی آواز نہیں آئی۔ اس نے ہیلو ہیلو کہہ کر مخاطب کیا۔ وہ رابطہ ختم کر چکی تھی۔ اس نے ریسیور رکھ کر گھڑی دیکھی۔ بارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اس کے دفتر سے گلبرگ والی کوٹھی پون گھنٹے کے فاصلے پر تھی۔ وہ ابھی روانہ ہوتا تو مقررہ وقت پر امبر کے پاس پہنچ سکتا تھا۔ میز پر ضروری فائلیں پڑھنے اور دستخط کرنے کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ اگر ان فائلوں سے نمٹ کر نہ جاتا تو لاکھوں روپے کا نقصان ہو سکتا تھا۔

اس نے ایک ایک فائل پر سرسری نظر ڈالی اور ان پر دستخط کرنے لگا۔ پھر امبر کا لفافہ اٹھا کر دفتری عمارت سے باہر نکل آیا۔ کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کرتے ہوئے گھڑی دیکھی۔ پندرہ منٹ ضائع ہو چکے تھے۔ اس نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے سوچا "میں اس کے دباؤ میں نہیں ہوں۔ اس کی حیثیت ہی کیا ہے؟ حیثیت میری ہے اس نے تو اپنی عزت کو دو کوڑی کا بنا دیا ہے۔ اب اس کی جتنی بھی بے عزتی ہو گی اس کے لیے فرق نہیں پڑے گا۔ میں عزت دار ہوں مجھے اپنی عزت کو ہر قیمت پر بچائے رکھنا ہے۔"

ایک جگہ ٹریفک جام تھا۔ دور تک گاڑیاں آڑی ترچھی کھڑی ہوئی تھیں۔ اس نے واپس مڑ کر دوسرے راستے سے جانا چاہا تو پیچھے بھی کئی گاڑیاں آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ جب رفتہ رفتہ آگے بڑھنے کا راستہ ملنے لگا تو بیس منٹ ضائع ہو چکے تھے اور جب امبر کی کوٹھی کے سامنے پہنچا تو وہ آدھا گھنٹا لیٹ ہو چکا تھا۔ اس نے چوکیدار سے کہا۔ "اندر جا کر کہو اعظم آیا ہے۔"

چوکیدار اندر گیا پھر واپس آ کر اس نے گیٹ کھول دیا۔ اعظم نے کار کو باہر ہی چھوڑ دیا۔ احاطے کے اندر چلتے ہوئے ملازم سے پوچھا۔ "بیگم صاحبہ ہیں؟"

"جی نہیں' وہ دس پندرہ منٹ پہلے کہیں چلی گئی ہیں۔"

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ یہ سمجھ گیا کہ وہ اپنی ضد کے مطابق کیسٹ لے کر ذکیہ کے پاس گئی ہے۔ ملازم نے کہا۔ "صاحب اندر ہیں' تشریف لائیں۔"

اب تو بیوی کے سامنے جھوٹی پارسائی کا بھرم کھلنے کا یقین ہو گیا تھا۔ وہ ساگر کے سامنے پہنچ کر بولا۔ "جانتے ہو' میں کون ہوں؟"

ساگر نے کہا۔ "میں نہیں جانتا۔ آپ جانتے ہیں' اس لیے یہاں آئے ہیں۔"

"میں تمہاری بیوی کے ہزاروں عاشقوں میں سے ایک ہوں۔"

ساگر نے کہا۔ "آپ نے تعداد کم بتائی ہے۔ میری امبر کو چاہنے والے لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ کچھ معلوم تو ہو کہ آپ غصے میں کیوں ہیں؟"

"میں ایک عزت دار آدمی ہوں۔ وہ میری بیوی کو میری اصلیت بتانے گئی ہے۔ کیا مجھے غصہ نہیں آئے گا؟"

"تعجب ہے! غصہ کیوں آئے گا' آپ کو میری بیوی کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ وہ آپ کے عزت دار ہونے کی اصلیت بتانے گئی ہے۔"

"تم کیسی الٹی کھوپڑی کے مصور ہو۔ میری بات نہیں سمجھ رہے ہو۔ اگر تم میں ذرا سی بھی غیرت ہے تو اس لفافے سے تصویریں نکال کر دیکھو۔ وہ اُدھر مجھے ننگا کرنے گئی ہے۔ میں اِدھر تمہارے سامنے اس کی پارسائی کا بھانڈا پھوڑنے آیا ہوں۔ نکالو تصویریں اور دیکھو۔"

ساگر نے لفافے کو لے کر پوچھا۔ "کیا اس کا تعلق میری امبر سے ہے؟"

"اسے کھول کر تو دیکھو۔"

"کیا دیکھوں؟ تمہاری باتوں سے ظاہر ہے کہ اس کے اندر بے حیائی اور گناہ چھپا ہوا ہے۔ ہمارا دین ہمیں سکھاتا ہے کہ اپنی آنکھوں سے گناہ نہ دیکھو۔ دیکھنے سے شیطان ورغلاتا ہے اور گناہ پردے کے پیچھے یا لفافے کے اندر چھپا ہو تو اسے آشکار نہ کرو کیونکہ بھید کھولنے والا صرف وہی قادرِ مطلق خداوند کریم ہے۔"

"ارے تم کیسے مرد ہو؟ تمہیں ان تصویروں کو دیکھنا اور طیش میں آ کر بیوی کو قتل کر دینا چاہیے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔ "عورت کو قتل کرنا مردانگی نہیں ہے۔ مرد وہ ہے جو اپنے مقابل بے غیرت مرد سے مقابلہ کرے اور اس کا سر توڑے جو کسی عورت کی شرم رکھنے کے بجائے اسے تصاویر کے ذریعے ذلیل اور رسوا کرنا چاہتا ہے۔"

وہ آگے بڑھا' اعظم پیچھے ہٹ کر بولا۔ "دیکھو' رک جاؤ۔ ہم ہاتھا پائی کرنے والے بدمعاش نہیں ہیں۔ ہم شریف لوگ ہیں۔ عزت کی خاطر پیچھے ہٹ جاتے ہیں' مقابلہ نہیں کرتے۔ ہمیں بزدل نہ سمجھنا۔"

وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دروازے تک آ گیا' ساگر نے کہا۔ "میں نے آج تک کسی سے جھگڑا نہیں کیا۔ تم سے بھی نہیں کروں گا کیونکہ تمہیں اٹھا کر باہر پھینکنے کے لیے ملازم بہت ہیں۔"

بے چارے عزت دار کو اتنی ہی دھمکی کافی تھی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا کوٹھی کے

باہر آگیا۔ پھر احاطے کے اندر بھاگنے کے انداز میں چلتا ہوا گیٹ سے باہر جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ساگر اپنے ہاتھوں سے وہ لفافہ اٹھائے کوٹھی کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا کچن میں آیا۔ اس نے لفافے کو گیس کے چولہے کے پاس رکھا۔ پھر اسے ماچس کی ڈبیا اٹھا کر ایک تیلی سے سلگایا۔ آنچ کو تیز کیا۔ شعلوں کو بھڑکایا اس کے بعد لفافہ کو کھول کر دیکھے بغیر اسے چولہے میں ڈال دیا۔

لفافے میں جتنی تصویریں تھیں' انہیں اس لیے نہیں دیکھا کہ اس کے ذہن میں صرف ایک تصویر تھی۔ اس تصویر میں امبر کی یہ ادا تھی کہ وہ دوپٹے سے منہ ڈھانپ کر رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ ابا فوت ہو گیا۔ جبکہ وہ خود مر گئی تھی۔ ساگر کے پاس آکر نادانستگی میں اپنی حیا کا ماتم کر رہی تھی۔

جب کوئی بڑی شرم و حیا سے اپنی حیا کی موت پر روئے تو اس کا مطلب ہے' موت کے بعد بھی اس کے اندر کی حیا باقی ہے۔ ایک مرد کی ذہنی مردانگی یہ ہے کہ وہ اپنی عورت کو اس کی شرم سے پہچان لے۔ پھر کوئی کاغذی لفافہ کھولنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

صبح ہی سے بادل گھر کر آرہے تھے۔ آخر بارش ہونے لگی۔ اعظم کار ڈرائیو کرتا ہوا سوچ رہا تھا۔ اپنے گھر کیسے جائے؟ ذکیہ سے سامنا کیسے کرے؟ امبر اب تک اسے وہ کیسٹ سنا چکی ہو گی۔ ایک اچھے خوشحال گھرانے میں آگ لگا چکی ہو گی۔ لوگ خوش فہمی سے سوچتے ہیں کہ بیوی بچے خوش ہیں ہر طرح کا عیش و آرام ہے۔ باہر عیاشی کرتے رہیں گے تب بھی گھرانا خوشحال رہے گا۔ اگر کبھی آگ لگے گی تو اپنے اعمال سے نہیں' بلکہ امبر جیسی کوئی عورت گھر جلائے گی۔

اس نے اپنی کار کوٹھی سے کافی فاصلے پر روک دی۔ ونڈ اسکرین کا وائپر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں حرکت کر رہا تھا اور شیشے پر پھیلنے والے پانی کو صاف کرتا جا رہا تھا تاکہ ونڈ اسکرین پار' سامنے کا منظر صاف نظر آتا رہے۔ اب تک ذکیہ کے سامنے اس کا دامن صاف اور بے داغ تھا۔ وہ بیوی کی نظروں میں ایک مثالی شوہر تھا۔ اب وہ خود کو بے داغ کیسے ثابت کرے؟ کیا واقعی امبر نے ذکیہ کو اس کے خلاف بدگمان کر دیا ہو گا؟

تب اس نے دیکھا' جس گلی میں اس کی کوٹھی تھی' اس گلی سے ایک کار آرہی تھی۔ جب وہ گلی سے نکل کر کشادہ سڑک پر مڑنے لگی تو پچھلی سیٹ پر امبر واضح طور سے دکھائی دی۔ ڈرائیور بارش کی تیزی کے باعث کار دھیمی رفتار سے چلا رہا تھا۔ اس لیے

امبر کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔

تصدیق ہو گئی کہ امبر ابھی ذکیہ کے پاس گئی تھی اور اب اعظم کا کچا چٹھا سنا کر واپس جا رہی ہے۔ اس کے جی میں آیا کہ آگے جا کر اس کی کار کو روکے اور اس کی پٹائی شروع کر دے۔ یہ جھنجلائے ہوئے عزت دار آدمی کا ارادہ تھا۔ جس پر وہ کبھی عمل نہیں کر سکتا تھا۔ پھر یہ کہ امبر کی کوئی کمزوری اس کے ہاتھ میں نہیں رہی تھی۔ اب تو دانش مندی یہی تھی کہ اپنا گھر بچائے اور کسی طرح اپنی طرف سے ذکیہ کا دل صاف کرے۔

گھر جا کر ذکیہ سے نظریں ملانے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہیں سے فون پر پہلے بات کرے اس کا غصہ ٹھنڈا کرے پھر گھر جائے لیکن اس گلی کے ٹوٹے ہوئے ٹیلی فون کے تار بتا رہے تھے کہ یہ تدبیر کام نہیں آئے گی۔ سڑک کنارے پانی تالاب کی صورت میں جمع ہو گیا تھا۔ کئی بچے پانی میں کھیل رہے تھے۔ بارش تھم گئی تھی لیکن گرجتے ہوئے بادل کہہ رہے تھے کہ پھر برسنے والے ہیں۔

اس نے پاس رکھے ہوئے بریف کیس کو کھول کر ایک لیٹر پیڈ اور قلم نکالا۔ پھر لکھنے لگا۔ "میری ذکیہ! میں جانتا ہوں' آج میرا بدنما روپ دیکھ کر تمہارا دل صدمات سے چُور ہو گا۔ امبر نے جو کیسٹ تمہیں سنایا ہے' اس میں تم نے میری آواز سنی۔ میں نے اپنی زبان سے جو اعتراف کیا ہے۔ اب اس سے انکار کرنے کی گنجائش نہیں رہی ہے۔

"میں نے کیسٹ میں درست کہا ہے کہ بیویاں اپنے شوہروں کے ساتھ بندھی رہنے اور ان سے محبت کرتے رہنے پر مجبور ہیں۔ تم بھی غصے میں مجھے چھوڑ کر میکے جاؤ گی تو کتنے دنوں کے لیے؟ اپنے بیٹے کے لیے اور جو پیدا ہونے والی اولاد ہے' اس کے لیے اور شوہر سے وابستہ رہ کر اپنی نیک نامی بحال رکھنے کے لیے تمہیں واپس آنا ہی ہو گا۔

"میں یہ سطور اس لیے لکھ رہا ہوں کہ تم اسے پڑھ کر دانش مندی سے غصہ تھوک دو۔ میں جھوٹا اور فریبی ہوں' کوئی بات نہیں۔ مگر تمہارا شوہر ہوں اور شوہر رہوں گا۔ میں آدھے گھنٹے بعد آؤں گا۔ تب تک دوستی کا موڈ بنا لو یا کچھ دنوں کے لیے میکے چلی جاؤ' فقط تمہارا اپنا اعظم۔"

اس نے اس کاغذ کو تہ کیا۔ ایک بچے کو بلا کر اسے پانچ روپے دیئے پھر وہ تہ کیا ہوا کاغذ اسے دیتے ہوئے کہا۔ "وہ جو سفید رنگ کے گیٹ والی کوٹھی ہے۔ اس کے اندر جاؤ اور وہاں بیگم صاحبہ کو یہ خط دے دو۔"

بچے نے کہا۔ "میں آپ کے بیٹے پپو کو جانتا ہوں' لہٰذا اسے دے دوں گا۔"

"پپو سے کہنا یہ کاغذ اپنی امی کو جا کر دے دے۔"

بچہ دوڑتا ہوا جانے لگا۔ اعظم اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ سفید گیٹ کے پاس پہنچ کر رک گیا تھا۔ پھر ہاتھ ہلا کر کسی کو بلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ننھا سا ہاتھ گیٹ کی جالی سے باہر آیا۔ اعظم نے پہچان لیا وہ پپو ہی تھا۔ اس کوٹھی میں اور کوئی بچہ نہیں تھا۔ وہ ننھا سا ہاتھ خط لے کر چلا گیا۔

خط پہنچانے والے بچے نے واپس آکر بتایا کہ اس نے وہ خط پپو کو دے دیا ہے اور وہ اسے لے کر اپنی ماں کے پاس گیا ہے۔ اعظم کار سے باہر آکر وقت گزارنے لگا۔ گھڑی دیکھنے لگا۔ بعض اوقات آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں اور ذہن جو کچھ سمجھتا ہے' وہ درست نہیں ہوتا۔

اعظم نے آنکھوں سے دیکھا کہ امبر کار میں موجود تھی اور اس گلی سے گزر کر آئی تھی لیکن اس نے کوٹھی کے اندر جا کر ذکیہ سے ملاقات نہیں کی تھی۔ وہ بڑی کشمکش میں وہاں تک آئی تھی۔ پہلے تو بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ پھر سوچا کہ اعظم سیدھی طرح وہ لفافہ نہیں دے گا۔ ذکیہ اس سے وصول کر کے اسے جلا ڈالے گی۔

لیکن گلی میں پہنچ کر احساس ہوا کہ ذکیہ ماں بننے والی ہے۔ ایسے وقت اسے شوہر کی طرف سے کوئی ذہنی صدمہ نہیں پہنچنا چاہیے۔ یہ باتیں زچگی کے بعد بھی ذکیہ کے علم میں لائی جا سکتی تھیں۔ ایسا کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ اعظم لفافے کے ذریعے امبر کو بدنام کرے گا۔ اعظم کی کمزوری بھی امبر کے پاس تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے اور اس لیے امبر نے کوٹھی کے سامنے پہنچتے ہی ڈرائیور سے کہا۔ "گاڑی روکو اور واپس چلو۔"

یوں وہ کیسٹ ذکیہ تک نہیں پہنچا تھا۔ بیوی نے اپنے شوہر کی زبان سے بدکار ہونے کا اعتراف نہیں سنا تھا۔ حالات کبھی اچانک ہی بدل جائیں تو ظاہر ہونے والا جرم یا گناہ چھپ جاتا ہے۔ اس کے بھی اعمال ذکیہ سے چھپ رہے تھے لیکن اس نے لیٹر پیڈ کے کاغذ پر قلم سے لکھ کر اپنے لیے گڑھا کھودا اور اس گڑھے میں گرنے کے لیے وہ خط ذکیہ کے پاس بھیج دیا۔

اس نے آدھے گھنٹے کے بعد کار اسٹارٹ کی۔ اسے ڈرائیو کرتا ہوا گلی میں آیا۔ پھر اپنی کوٹھی کے سامنے پہنچا۔ کار سے اتر کر گیٹ کو کھولا۔ اس کے بعد پھر کار میں بیٹھ کر اسے ڈرائیو کرتا ہوا پورچ میں آگیا۔ ایک طرف لان پانی کے حوض کی طرح بھرا ہوا تھا۔ اس نے کار سے اتر کر دیکھا۔ پپو پانی میں کھیل رہا تھا۔ اس نے اُدھر دھیان نہیں دیا۔ کیونکہ سارا دھیان ذکیہ کی طرف تھا کہ اب اس سے سامنا ہونے والا تھا۔

وہ کوٹھی کے اندر آیا۔ ذکیہ اپنے کمرے میں ایزی چیئر پر نیم دراز تھی۔ پیٹ میں تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ وہاں سے کھڑکی کے باہر پپو کو پانی میں کھیلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ تکلیف برداشت کرنے کی کوشش میں اس کے چہرے سے دکھ کے اثرات نمایاں تھے۔ اعظم نے اسے دیکھ کر سمجھا' وہ ناراض ہے اور منہ پھیر کر آرام سے کرسی پر لیٹی ہوئی ہے۔

ذکیہ نے اسے دیکھا۔ ایسے ہی وقت پھر درد کی لہر اٹھی۔ اس کی صورت رونی سی ہو گئی۔ اعظم نے کہا۔ "میں سمجھ رہا ہوں کہ میری حرکتوں سے تمہیں تکلیف پہنچ رہی ہے۔"

ذکیہ نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "عورتیں اپنے نصیب میں ایسے ہی دکھ درد لکھوا کر آتی ہیں۔"

"اب مجھے طعنے نہ دو۔ تم نے کیسٹ میں میری بدکاریوں کا فسانہ سنا ہے۔ تمہیں جو صدمات پہنچ رہے ہیں ان کا احساس مجھے ہے۔ مگر میں طعنے سننا نہیں چاہتا۔ اس لیے پرچی لکھ کر بھیج دی تھی کہ جھگڑا نہ بڑھاؤ۔ مجھے بدکار قبول نہ کر سکو تو چند روز کے لئے میکے چلی جاؤ۔"

ذکیہ شدید حیرانی سے اعظم کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ اس سے نظریں چراتے ہوئے کھڑکی کے پاس چلا آیا تھا۔ باہر دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "تمہیں مجھ پر بڑا ناز تھا لیکن میں بھی دوسرے شوہروں کی طرح ڈشیں بدل کر کھاتا ہوں۔ اس کی چند شرم ناک تصویریں میرے ہاتھ لگ گئی تھیں۔ میں ان تصاویر کے ذریعے اسے بلیک میل کر کے اس پر جبر کرنا چاہتا تھا لیکن وہ تمہارے پاس پہنچ گئی اور وہ کیسٹ تم نے سن لیا۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ آپ کس کیسٹ کی بات کر رہے ہیں؟ میرے پاس کون آئی تھی؟ آپ کس پر جبر کرنا چاہتے ہیں؟"

وہ اس کی طرف پلٹ کر بولا۔ "میں امبر کی بات کر رہا ہوں۔ وہ ابھی تمہارے پاس آئی تھی؟"

"میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ کبھی اس کا نام میرے سامنے نہ لیا کریں۔ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ وہ میرے پاس آئی تھی؟ آپ جانتے ہیں کہ وہ آنا چاہے گی' تب بھی میں اسے گھر میں گھسنے نہیں دوں گی۔"

وہ اپنا سر سہلاتے ہوئے بولا۔ "کیا سچ کہہ رہی ہو۔ وہ یہاں نہیں آئی تھی؟ اس نے کوئی کیسٹ نہیں سنایا تھا؟"

"کیا آپ جاگتے میں خواب دیکھ رہے ہیں۔ دیکھیے میں کہے دیتی ہوں' میں آپ کے خواب میں بھی امبر کا وجود برداشت نہیں کروں گی۔ اور یہ کیسٹ کا کیا معاملہ ہے؟"

یہ واضح ہو گیا تھا کہ نہ امبر ادھر آئی ہے اور نہ بیوی نے وہ کیسٹ سنا ہے لیکن وہ کاغذ تو پڑھا ہو گا۔ ذکیہ ایزی چیئر سے اٹھ گئی۔ اس کے پاس آکر بولی۔ "مجھ سے کچھ نہ چھپائیں۔ اس کیسٹ کے متعلق بتائیں۔"

"مم......... میں کیا بتاؤں۔ تمہیں تو سب کچھ لکھ کر بھیج دیا تھا۔ پڑھ لینے کے بعد پوچھنے کے لیے رہ گیا ہے۔؟"

ذکیہ نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ "آپ نے جو لکھا سو لکھا۔ میں آپ کی زبان سے سننا چاہتی ہوں۔"

"تم عورتوں کی یہی عادت بُری ہے۔ بات ختم نہیں کرو گی اسے خواہ مخواہ طول دو گی۔ ٹھیک ہے۔ سننا چاہتی ہو تو سنو۔"

وہ سنانے لگا کہ کتنے برسوں سے امبر پر نیت خراب تھی۔ پھر کس طرح اس کی ڈائری کا ایک ورق اور تصویریں ہاتھ آگئیں۔ ان کے ذریعے اس نے امبر کو پھانسنا چاہا۔ امبر نے کمال چالاکی سے کیسٹ میں اس کی آواز ریکارڈ کر کے الٹا اسے پھانس لیا اور دھمکی دی کہ اس کی تصاویر واپس نہیں کرے گا تو وہ ذکیہ کو کیسٹ سنا دے گی۔

ذکیہ نے اس کا تمام کچا چٹھا سن کر کہا۔ "آپ کو ایسی حرکتیں کرتے شرم نہیں آئی.......... مگر مجھے شرم آرہی ہے۔ میں ایک ہی چھت کے نیچے دغاباز شوہر کے ساتھ نہیں رہ سکوں گی۔ ابھی میکے جا رہی ہوں۔ پپو! چلو اندر آؤ۔ ہم تمہاری نانی کے گھر جا کر رہیں گے۔"

ازدواجی زندگی کا وہ مضبوط ستون جسے اعتماد کہتے ہیں' وہ ٹوٹ گیا تھا۔ پپو جہاں پانی میں کھیل رہا تھا وہاں کاغذ کی ایک ناؤ تیر رہی تھی۔ اعظم نے چونک کر اس ناؤ کو دیکھا۔ وہ تیرتی ہوئی ڈگمگاتی ہوئی کھڑکی کے قریب آرہی تھی اور وہ اسی کاغذ کی بنی ہوئی جس پر اس نے ایک گھنٹا پہلے ذکیہ کو خط لکھا تھا۔

پپو نے اسے ماں تک نہیں پہنچایا تھا۔ اس کی ناؤ بنا کر پانی میں کھیل رہا تھا۔

یہ الزام محض بچوں پر ہے۔ ورنہ کاغذ کی ناؤ بڑے چلاتے ہیں اور اب ڈوبتے ہیں کہ تب ڈوبتے ہیں۔

==================